دہلی کی یادگار ہستیاں

اِس میں دہلی کے پہلوانوں، پٹے بازوں، بنوٹ
پنجہ کلائی کے فنکاروں، خوشنویسی کے استادوں
دستکاری کے کارخانوں، مفسّروں، واعظوں، مصوّروں،
صحافیوں، ادیبوں، دہلی کالج کے معلّموں و شعراء
اور معززشخصیتوں کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔

امداد صابری

ناشر: کامل صدّیقی و ریاض صدّیقی
چوڑیوالان۔ دہلی

سول ایجنٹ پاکستان: نعمتُ اللہ قادری
1/1 وحید آباد۔ کراچی

قیمت قسمِ اول: پچیس روپے

قیمت قسمِ دوئم: پندرہ روپے

مطبوعہ: جمال پرنٹنگ پریس۔ چھتہ شیخ منگلو
جامع مسجد۔ دہلی۔ ۶

سنِ اشاعت: ــــــــ ۱۹۷۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین "دہلی کی یادگار ہستیاں"

مجتبیٰ امداداللہ چشتی مرحوم

میری بڑی بہن امت البصیر کے بڑے لڑکے اور میرے بھانجے تھے۔ لنگوٹیے یار تھے۔ میرا بچپن اور جوانی ان کے ساتھ گذرا۔ انتہائی ظریف اور ہنس مکھ اور پُر مذاق طبیعت کے مالک تھے۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانے میں کراچی پہنچنے کے بعد ایک مجذوب کی قربت سے ان کی کایا پلٹ ہونی شروع ہوگئی اور دس بارہ سال کے عرصے میں وہ مجذوب بن گئے۔ اسی حالت جذب میں ان کی موت ہوئی۔

میں "دہلی کی یادگار ہستیاں" مجتبی امداداللہ چشتی مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں۔

امداد صابری

محلہ چوڑی والان۔ دہلی

جناب مجتبیٰ امداد اللہ چشتی دہلوی

چشتی صاحب دہلی کی صدیقی برادری سے تعلق رکھتے تھے، ان کے بزرگ بندہ بیراگی کے زمانے میں سرہند سے دہلی آئے اور محلہ چوڑی والان میں سکونت اختیار کی۔ ان کے پردادا حاجی امیرالدین صاحب گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والان میں رہتے تھے۔ پاپوش کے بڑے تاجر تھے، حج بیت اللہ کے لئے حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ میں قیام کیا اور وہیں فوت ہوئے اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

حاجی امیرالدین صاحب کے اکلوتے صاحبزادے حاجی نصیرالدین صاحب عرف حاجی کلن ہوئے، جو پاپوش کا کاروبار اپنے والد ماجد کے ساتھ کوٹھی میں کرتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد جامع مسجد کے قریب دکان لی۔ ان کے تعلقات جناب سید محمد صاحب امام جامع مسجد شاہی دہلی سے تھے، ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے اور امام صاحب کو ان سے ملے بغیر چین نہیں آتا تھا، تقریباً روزانہ ان کی دکان پر تشریف لاتے تھے۔ حاجی کلن روزانہ پنج وقتہ نماز جامع مسجد میں اپنے دوست کے پیچھے پڑھتے تھے۔ حاجی کلن زبان کے بڑے پابند تھے، جو بات کہہ دیتے اس پر قائم رہتے، بڑی سی بڑی طاقت ان کے ارادے کو بدل نہیں سکتی تھی۔ ایک مقدمے میں انھوں نے اپنے قریبی عزیز و رشتہ دار کے خلاف شہادت دی۔ ان کے دوست سید محمد صاحب کے صاحبزادے جناب سید احمد امام جامع مسجد کے خلاف کچھ لوگوں نے آواز اٹھائی انھوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مخالفوں کو مُنہ کی کھانی پڑی۔ دہلی کی مسجدوں کی مرمت اور دیکھ بھال میں کافی وقت صرف کرتے تھے، پیسہ بھی دل کھول کر لگاتے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۹ء کو دہلی میں ہوا حضرت خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

حاجی کلن صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے حافظ علیم الدین صاحب، حافظ

سعید الدین صاحب اور حافظ کریم الدین صاحب اور دو صاحبزادیاں۔ دوسری اہلیہ سے حافظ محمد عمر صاحب اور محمد صدیق صاحب اور تین صاحبزادیاں ہوئیں۔

امداد اللہ چشتی صاحب کے والد ماجد حافظ محمد عمر صاحب تھے، جنھوں نے حافظ درزی سے مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان میں قرآن مجید حفظ کیا۔ حافظ درزی دہلی کے بڑے مشہور و معروف استاد تھے، ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ حافظ صاحب قرآن شریف پڑھانے کو آخرت کا توشہ سمجھتے تھے، سیدھے سادھے آدمی تھے اور چاند تارے کی چوگوشہ ٹوپی اوڑھتے تھے، ان کے بھائی مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتے تھے۔ ان کے مدینہ منورہ میں فوت ہونے کے بعد حافظ درزی مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اور بھائی کی طرح مسجد نبوی میں جھاڑو دینے پر مامور ہوئے۔ مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حافظ محمد عمر صاحب اردو اچھی جانتے تھے، لکھ پڑھ لیتے تھے، کتابوں کے مطالعے کا شوق تھا، لیکن ان کی پوری عمر جائیداد کی دیکھ بھال میں گذری۔ غریبوں کی بڑی مدد کرتے تھے، ان کے وظیفے بھی مقرر کر رکھے تھے، جو خاموشی کے ساتھ ان کے گھروں میں خود جاکر پہنچادیا کرتے تھے۔ کافی یتیم بچوں کی انھوں نے پرورش کی، تعلیم دلوائی اور شادی بیاہ بھی کرایا۔

ایک غریب و مفلوک الحال انسان جس کو مخالفوں نے قتل کے مقدمے میں پھنسا دیا تھا۔ اس کے مقدمے کی پیروی ہائی کورٹ تک کی اور اس کو رہا کرالائے۔ دل کھول کر پانی کی طرح پیروی میں روپیہ بہایا ـــــــ مقدمہ بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بڑے بڑے تجربے کار مقدمہ باز ان سے مشورہ لینے آتے تھے۔ ان کے وکیل دہلی کے مشہور و معروف حافظ عبد العزیز ایڈوکیٹ تھے۔

حافظ محمد عمر صاحب کے حضرت العلامہ مولانا مولوی مفتی محمد مظہر اللہ صاحب مرحوم امام مسجد فتح پوری دہلی سے گہرے مراسم تھے، ان سے عقیدت رکھتے تھے، اکثر جمعہ کی نماز مسجد فتح پوری میں پڑھتے تھے۔ کوچہ ناہر خاں میں سکونت تھی ـــــــ پہاڑ گنج وغیرہ میں ان کی کافی جائیداد تھی۔ ان کی شادی ناقم الحروف کی بڑی بہن امۃ البصیر بنت حضرت العلامہ مولانا شرف الحق صاحب سے ہوئی۔ جن سے امداد اللہ چشتی ۳۰ اگست ۱۹۱۴ء کو مکان ۳۱۵ گلی جوتے والان محلہ چوڑی والان دہلی

میں پیدا ہوئے۔ امداد اللہ چشتی راقم الحروف کے بھانجے تھے جو مجھ سے ڈیڑھ مہینے بڑے تھے میری پیدائش ۱۶ راکتوبر ۱۹۱۴ئہ کی ہے۔ ان کے نانا مولوی شرف الحق صاحب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے، انھوں نے اپنے نواسے کا نام اپنے پیرومرشد کی نام کی مناسبت سے امداد اللہ تجویز کیا۔ امداد اللہ بچپن سے ہی ذہین وظریف تھے، ان کی خوش مزاجی ان کے ساتھیوں میں مشہور تھی، ان کی ہر بات میں مزاح وطنز ہوتا تھا، بات بات میں چٹکلے چھوڑتے تھے۔ عربک اسکول اجمیری گیٹ سے میٹرک کیا تھا۔

امداد اللہ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے، عربک اسکول کی فٹ بال ٹیم اور دوستوں نے جو گولڈن کلب بنا رکھی تھی اس میں کھیلتے تھے، ان کا ہیڈ غضب کا ہوتا تھا سنٹر فارورڈ پر کھیلتے تھے۔ ان کا یہ ہیڈ ٹیم کے نازک موقعے پر کام دیتا تھا۔ یہ اپنی ٹیموں کے لئے نعمت ثابت ہوتے تھے ان کی ہارنے والی ٹیم جیتنے والی ٹیم بن جاتی تھی۔

گورنمنٹ اسکول اور عربک اسکول کی فٹ بال ٹیموں کا میچ عربک اسکول اجمیری گیٹ کے گراؤنڈ میں ہو رہا تھا۔ عربک اسکول کی ٹیم گورنمنٹ اسکول کی ٹیم سے تین گولوں سے ہار رہی تھی، کھیل ختم ہونے میں پندرہ سولہ منٹ باقی رہ گئے تھے، کہ امداد اللہ نے اپنے ہیڈ سے تین گول اتارنے کے بعد جیتنے والا چوتھا گول کر دیا۔ گویا ہارنے والی ٹیم پندرہ منٹ میں جیتنے والی ٹیم بن گئی۔

اسی طرح پریڈ گراؤنڈ جامع مسجد میں جہاں مولانا آزاد پارک بن گیا ہے، ہماری گولڈن کلب کا فرینڈز کلب سے مقابلہ ہوا۔ فرینڈز کلب نے گولڈن کلب پر شروع میں دو گول کر دیئے تھے۔ گول اتارنے کی گولڈن کلب کے کھلاڑیوں نے بڑی کوشش کی، لیکن ناکام رہے، کھیل کے ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ امداد اللہ نے ان پانچ منٹ میں دو گول اتارنے کے بعد ایک گول اور کر دیا۔ تیسرا گول اس وقت کیا جب کھیل ختم ہونے میں ایک منٹ باقی تھا آخری گول بڑا خوب صورت کیا تھا، جس پر دیکھنے والوں نے تعجب وحیرت کا اظہار کیا۔

امداد اللہ بچپن سے اچھے کاموں کی طرف راغب تھے، برے کاموں سے بچتے تھے، جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ان کی یادداشت بلا کی تھی، جو خطرات کو سن لیتے تھے اس کو من وعن

صبح کو اسی واعظ کے لب ولہجے میں سنا دیا کرتے تھے۔

امداد اللہ چشتی، شیخ مختار، منظر الدین احمد، شیخ سلطان اور راقم الحروف امداد صابری تقریباً ہم عمر تھے اور قریبی رشتہ دار بھی تھے، یہ ایک ٹولی تھی جس نے بچپن اور نوجوانی کا حصہ ایک ساتھ گذارا۔ امداد اللہ ایک اچھے ادیب تھے، اعلیٰ پایہ کے مزاحیہ مضامین لکھتے تھے ان کے کئی مضمون رسالہ 'کہکشاں' دہلی میں شائع ہوئے۔ دہلی اور کراچی کے محکمہ ریڈیو میں ملازمت کی۔ شیخ مختار اور شیخ سلطان فلمی لائن میں چلے گئے۔ منظر الدین احمد نے سرکاری ملازمت پسند کی۔ راقم الحروف امداد صابری نے سیاست اور لکھنے پڑھنے پر توجہ دی، گویا ہم لوگ دنیوی دھندوں میں پھنس گئے۔ اور پھنسے ہوئے ہیں۔ لیکن امداد اللہ نے کراچی میں جاکر اپنے ساتھیوں سے علیحدہ راستہ اختیار کیا۔ کسی مجذوب کا ان پر اثر ہوا، اور یہ بھی مجذوب بن گئے۔ ایک دوست نے ان کے بارے میں کراچی سے لکھا تھا:

"امداد اللہ عرصے سے مجذوب ہیں اور ہر وقت حالتِ جذب میں رہتے ہیں۔ برسوں غائب رہتے ہیں پھر آجاتے ہیں، سینکڑوں لوگ پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور ضرورت مند مرادوں کو پہنچتے ہیں، ان کی کرامتوں کی دھوم ہے، وہ امداد جس کو آپ نے سوٹ بوٹ میں انتہا درجے کا اپٹوڈیٹ دیکھا ہوگا، خواب ہوگیا۔"

دولت وثروت سے امداد اللہ کو شروع سے لگاؤ نہیں تھا، بلکہ کچھ نفرت سی تھی۔ غریبوں کی حالت زار دیکھ کر ان کو دکھ ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کراچی میں پہنچنے کے بعد یہ وتیرہ اختیار کر لیا تھا کہ دفتر سے مہینے کی تنخواہ لے کر چلے اور راستے میں ضرورت مندوں کو تقسیم کر دی۔ ان پر جب سے جذب کی کیفیت طاری ہونی شروع ہوئی، اس وقت سے ان کے روحانی کرشمے ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جذب کی حالت میں دفتر میں صحیح کام کر نہیں سکتے تھے، چنانچہ جس افسر نے ان کی شکایت کی یا تو اس کے تبادلے کا آرڈر آیا یا اس کو ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔

ان کو اپنی والدہ اور اپنی بڑی بہن مخدومہ سے بے پناہ محبت تھی۔ مخدومہ کے انتقال سے

دو ہفتہ قبل انھوں نے اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ مخدومہ کا وقت آگیا ہے۔

میری بہن اور ان کی خالہ صفیہ سلطانہ ۱۹۶۵ء کے وسط میں اپنے صاحبزادوں واصف کمال اور حافظ اشرف کمال کے ساتھ کراچی گئی تھیں۔ حالت جذب میں حافظ اشرف کمال امداد اللہ سے ملنے گئے۔ اشرف کمال ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے، جن کو امداد اللہ نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ امداد اللہ ۱۹۴۷ء میں کراچی چلے گئے تھے۔ اشرف کو انھوں نے دیکھتے ہی کہا کہ تم خالہ صفیہ کے لڑکے ہو، کچھ باتیں کرنے کے بعد کہا تم میرے پاؤں دباؤ۔ لیکن ایک لمحے کے بعد ہی پاؤں دبانے سے منع کیا کہ تم قرآن حافظ ہو۔ ان کے اس قسم کے کافی واقعات مشہور ہیں۔

امداد اللہ حالت جذب میں کبھی سگریٹ پیتے، کبھی سگریٹ کے پیکٹ پر انگریزی لکھتے اور کبھی خاک اڑاتے رہتے تھے۔ لسبیلہ کے چوک میں چائے کی دکان ہے، وہاں اکثر بیٹھتے تھے۔ کبھی اچھے اور کبھی پھٹے ہوئے لیرہ لیرہ کپڑے پہنتے تھے، سر کے لمبے بال اور ناخن بھی لمبے رہنے لگے تھے۔ ان کی والدہ نے مکان کے نزدیک ہی ایک کمرہ ان کو رہنے کے لئے دیا تھا، کبھی کبھی اس میں چلے جاتے تھے۔ ان کی شادی مشرف بی بنت حاجی شفیق احمد صاحب سے ۱۹۳۶ء کو دہلی میں ہوئی۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کراچی میں ان کے کافی معتقد تھے جو ان سے فیض پاتے تھے۔ ۵۲ سال کی عمر میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ میوہ شاہ کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ معتقدین ان کا ہر سال عرس کرتے ہیں۔

امداد صابری

محلہ چوڑی والان دہلی

یکم مارچ ۱۹۷۱ء

سببِ تالیف

۱۹۴۷ء سے قبل اور اس کے بعد جتنے بھی اخبار اور رسائل میں نے جاری کئے اور کتابیں تصنیف کیں، ان میں دہلی کی انقلابی و ادبی و علمی شخصیتوں کے حالاتِ زندگی شائع کئے۔ گرچہ ان میں ادبی و علمی حضرات کے حالات بہت کم ہیں۔ چنانچہ رسالہ 'آزاد ہندوستان' دہلی کے نمبر نومبر ۱۹۴۹ء میں شیخ عطاء الرحمٰن ایڈووکیٹ کے، دہلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء میں "دہلی کالج کے چند شعراء" کے، اور عوامی رائے ۱۹۵۶ء دہلی میں ماسٹر شہاب الدین صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو عربک اسکول دہلی، ماسٹر فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو عربک اسکول دہلی اور سید سردار علی نقش بندی کے اور متحدہ محاذ دہلی ۱۹۶۴ء میں فیروز آرٹسٹ دہلوی کے حالات زندگی درج ہیں۔

میری کتب "فرنگیوں کا جال" میں مولانا ابوالمنصور کے "سیرت حاجی امداد اللہ اور ان کے خلفاء" میں مولانا سید امیر حمزہ اور مولانا کرامت اللہ صاحب کے "تاریخ صحافت اردو" میں مولوی نصرت علی ایڈیٹر "ناصر الاخبار" دہلی، منشی محمد دین ایڈیٹر "اخبار الاخیار" دہلی اور مولانا عبدالرحمٰن راسخ کے خاندان کے، "دہلی صدیقی کی برادری" میں شیخ کریم احمد صاحب بانی مدرسہ کریمیہ دہلی اور مولوی شرف الحق کے، "حجاز مقدس کے اردو شاعر" میں حاجی علی جان اور سید محمود امام جامع مسجد دہلی کے حالاتِ زندگی تحریر ہیں۔

۴ مارچ ۱۹۶۹ء کو جب حافظ منظر احمد صاحب مالک جنرل بوٹ ہاؤس کراچی کی صاحبزادی کی شادی میں شمولیت کے لئے میں کراچی گیا۔ اور ۱۱ مارچ ۱۹۶۹ء کو جناب علاء الدین خالدؔ مالک سندھ ہارڈ اکیڈمی کراچی سے ملا۔ تو انھوں نے مجھ کو دہلی کی علمی و ادبی شخصیتوں کے حالات زندگی لکھنے پر توجہ دلائی۔ اور انھوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ میں دہلی والوں کے حالاتِ زندگی کتابی شکل میں طبع کرا دوں گا۔ اس وقت سے میں نے اس کام کی طرف توجہ دی۔ اور

دہلی کے علمی و ادبی و معزز حضرات کے حالاتِ زندگی کے کھوج میں لگ گیا۔

۸؍اگست ۱۹۶۹ء کو جناب مولانا حامد علی قریشی مہتمم انجمن حیات الاسلام کراچی کے بالاخانہ پر کرزن گزٹ دہلی ۱۹۰۶ء کے فائل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ۱۵؍جولائی کے شمارے میں ایک مغل بچے کی شادی کا ایک جن عورت سے ہونے کا واقعہ درج تھا۔ وہ میں نے نقل کیا۔ اس میں کچھ تاریخی چیزوں کا اضافہ کرکے مضمون کی شکل دی۔ اس سلسلہ کا یہ میرا پہلا مضمون بعنوان "ڈیڑھ سو سال قبل کی دہلی کی ایک جھلک" ۲؍اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار "جنگ" کراچی میں شائع ہوا۔

کراچی سے جب دہلی پہنچا تو ۱۹۱۲ء کے کرزن گزٹ دہلی کے فائل سے دوارکا پہلوان اور احمد خاں پہلوان کی کشتی، دہلی کی قدیم پٹے بازی بنوٹ، پنجہ کلائی اور دہلی کے قدیم دستکاروں کے متعلق معلومات حاصل کی اور جب ان فنکاروں پر اخبار کراچی میں میرے مضامین چھپنے شروع ہوئے۔ تو جناب محمد الیاس صاحب جن کا تعلق دہلی کے حاجی ننواں تیلی کے خاندان سے ہے اور جو ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی سے ہجرت کرکے پاکستان میں سکھر (سندھ) میں چلے گئے۔ انھوں نے جب اخبار جنگ میں میرے یہ مضامین پڑھے تو اپنے بزرگ حاجی ننواں تیلی اور دہلی کے دوسرے بزرگوں کے حالاتِ زندگی لکھنے کے بارے میں مجھ کو لکھا۔ حاجی ننواں تیلی کے خاندان کے لوگ پھاٹک تیلیان اور گلی ننواں تیلی ترکمان گیٹ میں رہتے ہیں۔ میں حاجی ننواں تیلی کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لئے گلی ننواں تیلی میں اسی خاندان کے ایک فرد جناب محمد ناصر صاحب سے ملنے گیا۔ یہ حاجی ننواں تیلی کے تاریخی کارخانے میں کاروبار کرتے ہیں۔ انھوں نے حاجی ننواں تیلی کے خاندان کے حالات بتائے، ان کو میں نے قلم بند کیا۔ کچھ کتابوں اور اخباروں سے معلومات حاصل کرکے حاجی ننواں تیلی کے حالاتِ زندگی پر مضمون مکمل کیا۔

۲۷؍جنوری ۱۹۷۰ء کو مولوی مختار احمد صاحب اخوندجی کے مکان پر گیا۔ ان کا مکان فراشخانہ گلی اخوندجی میں ہے۔ ان سے ملا۔ انھوں نے مجھ کو اپنے خاندانی حالات تحریر کرائے اور "ریاض الانوار" مؤلفہ شاہ عبدالعزیز اخوندجی دکھائی، جس میں شاہ محمد عمر صاحب اخوندجی کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب سے بھی شاہ محمد عمر اخوندجی کے حالات لکھنے میں مدد ملی۔

۲۴؍مئی ۱۹۷۰ء کو میں حوض قاضی والی مسجد میں قاری محمد میاں صاحب کے ہمراہ مولانا

عبدالغفار صاحب مرحوم کے صاحبزادے مولوی ابوالفتح صاحب سے ملنے گیا وہ نہیں ملے تو ان کے چھوٹے بھائی مولوی ابوالفرح صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کو اپنی غرض بتائی کہ آپ کے خاندان کے لوگوں کے حالات درکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھ کو اس سلسلے میں "عظمتِ انسان" ایک کتاب اور "آوازِ مسلم" ایک کتابچہ عنایت کیا، جس میں مولوی عبدالغفار صاحب کے حالات اور ان کے خاندان کے حالات درج تھے۔ ان دونوں کتابوں اور "واقعات دارالحکومت دہلی" جلد دوم وغیرہ کی مدد سے مولانا عبدالغفار صاحب کے حالاتِ زندگی مرتب کیے۔

۳۰ مئی کو حکیم شریف الدین صاحب بقائی کے مکان چھتہ چھیپہ میم بازار چتلی قبر میں پہنچا۔ ان سے ان کے خاندان کے حالات معلوم کیے۔ وہ جو بتلاتے گئے وہ میں نے قلم بند کیے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے دواخانہ بقائی بازار چتلی قبر دہلی کی دوائیوں کی پرانی فہرست اور "مجموعہ بقائی" مؤلفہ حکیم بقاء اللہ دکھائی۔ فہرست میں ان کے خاندان کے حالات بہت ہی مختصر درج ہیں۔ ان کو میں نے نقل کیا اور ان کتابوں کی مدد سے حکیم بقاء اللہ صاحب کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے۔

۱۶ جون کو والد ماجد حضرت العلامہ مولانا شرف الحق صدیقی کے کتب خانے میں "مرحوم دہلی کالج" مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب کی تلاش کر رہا تھا کہ کیفیت خاندان چودھریان ایرن گوئی مؤلفہ نانک چند دیکھی۔ اس کا مطالعہ کیا تو ماسٹر نند کشور دہلوی کے خاندان کے حالات اس میں درج تھے۔ اس خاندان کے اکثر لوگوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ میں نے ماسٹر جی اور ان کے خاندان کے حالات اس میں سے نقل کیے۔

۱۴ اکتوبر کو پیر جی شمشاد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ محمد اعظم دہلوی کے حالاتِ زندگی ان سے معلوم کیے۔ انھوں نے دوسرے روز شجرہ خاندان منشی محمد عظیم اور "زیارت آثار شریف" مرتبہ پیر جی شمشاد اور پیر جی عبدالرشید صاحب فرقت صابری کی قلمی بیاض دی، جس میں فرقت صاحب کا کلام اور ان کے صاحبزادے مختار احمد خار دہلوی کی ایک غزل درج تھی۔ ان سے میں نے محمد اعظم صاحب کے حالات مرتب کیے۔

۱۵ اکتوبر کو فیروز آرٹسٹ دہلوی صاحب سے ان کے مکان گلی حکیم نعیم بیگ کوچہ فولاد خاں میں ملنے گیا۔ ان سے دہلی کے مصوروں کے حالات معلوم کیے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ مجھ کو جس قدر

بھی ان اصحاب کے حالات معلوم ہو سکیں گے میں ان کو تحریر کر کے آپ کو دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے ۳۰ر اکتوبر کو اپنے خاندان کے حالات کے ساتھ اپنے دونوں استاد محمد حسین مصور اور استاد رام ناتھ مصور کے حالاتِ زندگی تحریر کر کے مجھ کو عنایت کئے اور ان کی تصاویر بھی دیں۔

منشی ظہور احمد صاحب وحشی ایڈیٹر رسالہ "تجلی" دہلی اور منشی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ "مولوی" دہلی کی شخصیتیں ایسی نہیں ہیں جن کو فراموش کیا جا سکے۔ ان ہر دو حضرات کا اردو ادب میں ایک خاص مقام ہے ان کے حالاتِ زندگی کسی کتاب میں درج نہیں ہیں اور ان حضرات سے تعلق رکھنے والے کافی سے زیادہ اللہ کے پیارے ہو گئے یا پاکستان چلے گئے۔ جو ہندوستان میں رہ گئے ان میں مفتی شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر رسالہ "دین دنیا" دہلی اور مستحسن فاروقی صاحب ایڈیٹر رسالہ "آستانہ" دہلی ہی نظر آئے۔ اس لئے میں ۲۳ر نومبر ۱۹۷۰ء کو مفتی شوکت فہمی صاحب کے دفتر چھتہ شیخ منگلو گیا۔ انھوں نے منشی ظہور احمد صاحب اور منشی عبدالحمید صاحب کے حالات زندگی بتائے۔ منشی ظہور احمد صاحب شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ مولوی ظفر صاحب رسالہ "برہان" اور ندوۃ المصنفین کے منیجر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، وہ شاہ جہاں پور کے باشندے ہیں۔ اس تعلق کی وجہ سے ان سے ۲۵ر نومبر کو ان کے دفتر میں منشی ظہور احمد صاحب کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لئے گیا۔ ان کو جو حالات منشی صاحب کے معلوم تھے وہ انھوں نے بتائے۔

منشی عبدالحمید صاحب کا تعلق جناب مستحسن فاروقی صاحب سے تھا۔ اور موجودہ رسالہ "مولوی" ان کے اہتمام میں نکل رہا ہے۔ اس لئے ان کی خدمت میں ۲۷ر نومبر ۱۹۷۰ء کو رسالہ "آستانہ" کے دفتر جامع مسجد میں پہنچا۔ ان کو جس قدر منشی عبدالحمید صاحب کے حالاتِ زندگی معلوم تھے اور رسالہ "مولوی" اور مولوی بکڈپو کی فروختگی کے بارے میں جو علم تھا وہ انھوں نے بتایا۔ چنانچہ منشی ظہور احمد صاحب کے حالاتِ زندگی مفتی شوکت فہمی صاحب اور مولوی ظفر صاحب کی معلومات پر قلمبند ہوئے اور منشی عبدالحمید صاحب کے حالاتِ زندگی مفتی شوکت فہمی صاحب اور جناب مستحسن فاروقی صاحب کی معلومات کی بناء پر تحریر ہوئے۔

جناب مولوی محمد احمد صابری کا خاندان، دہلی میں قدیم سے آباد ہے۔ صابری صاحب سے ان کے خاندان کے حالات تحریر کرنے کے لئے تقاضے کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ یکم دسمبر ۱۹۶۸ء کو ان سے اپنی نشست شیا محل پر میری ملاقات ہوئی۔ وہیں میں نے ان کو تکلیف دی، اور ان سے معلوم کر کے ان کے خاندان کے حالات تحریر کئے۔ ان کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا احمد حسین ہے۔

مجھ جیسے مصروف آدمی سے کتاب مرتب کرتے وقت غلطیوں کا ہونا لازمی سا امر ہے۔ جس شخص کا ایک طرف خیال نہ ہو اور سیاسی الجھنوں میں الجھا ہوا ہو۔ یزیدی طاقتوں سے تن تنہا مقابلہ کر رہا ہو، وہ غلطیوں سے محفوظ رہے ناممکن ہے۔ اس لئے "دہلی کی یادگار ہستیاں" میں غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ اگر ان سے مجھ کو مطلع کر دیا جائے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح کر دی جائے گی۔

کراچی میں جناب علاء الدین خالد صاحب نے اور سکھر میں جناب محمد الیاس صاحب نے "دہلی کی یادگار ہستیاں" طبع کرانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اسی طرح جناب ریاض صدیقی اور کامل صدیقی وغیرہ حضرات نے بھی اپنے حلقہ احباب کی مدد سے اس کتاب کو شائع کرانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ مرتب ہونے کے بعد انہی حضرات نے اس کے چھپوانے کا بار اٹھایا۔ جس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی۔

اس کتاب کی ترتیب دینے اور معلومات فراہم کرنے میں جناب علاؤالدین خالد مالک اردو اکیڈمی سندھ کراچی، جناب محمد الیاس صاحب تاجر فروٹ سکھر، مولانا حامد علی قریشی مہتمم انجمن حیات الاسلام کراچی، محمد ناصر دہلوی، مولوی ممتاز احمد اخوندجی، مولوی ابوالفرح، حکیم شریف الدین صاحب مالک بقائی دواخانہ دہلی، پیرجی شمشاد دہلوی، فیروز آرٹسٹ دہلوی، مفتی شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر رسالہ "دین دنیا" دہلی، جناب مستحسن فاروقی صاحب ایڈیٹر "آستانہ" دہلی، جناب مولوی ظفر صاحب منیجر رسالہ "برہان" دہلی، قاری مصلح الدین مسعود صاحب کراچی اور جناب محمد احمد صابری صاحب نے اعانت فرمائی میں ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

"دہلی کی یادگار ہستیاں" میں جن کتابوں سے مدد لی گئی اور اخذ کیا گیا۔ ان کے

نام یہ ہیں:

(۱) ریاض الانوار مؤلفہ شاہ عبدالعزیز اخوندجی

(۲) واقعاتِ دارالحکومت دہلی،
مؤلفہ مولوی بشیرالدین احمد دہلوی

(۳) آثار دہلی، مؤلفہ مولوی ابومحمد سید
عبدالعزیز دہلوی۔

(۴) تذکرہ مستورات نادری، مؤلفہ دُرگا
پرشاد نادر دہلوی۔

(۵) اردوئے معلیٰ، مؤلفہ مرزا غالب

(۶) وقائع عبدالقادر رامپوری

(۷) رجسٹر قلمی مرتبہ حافظ عبدالقادر دہلوی

(۸) خم خانہ جاوید مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی

(۹) آثار الصنادید مؤلفہ سرسید مرحوم

(۱۰) قیصر التواریخ مؤلفہ سید محی الدین

(۱۱) روزنامچہ جیون لال مرتبہ خواجہ حسن نظامی

(۱۲) طبقات الشعراء مؤلفہ مولوی کریم الدین

(۱۳) حیاتِ شاہ ابوالخیر مؤلفہ بخش اللہ

(۱۴) بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ مرتبہ خواجہ حسن نظامی

(۱۵) مرحوم دہلی کالج مؤلفہ مولوی عبدالحق

(۱۶) وصال الجمیل مؤلفہ شاہ محمد امان الرحمٰن

(۱۷) انتخاب یادگار مؤلفہ امیر مینائی

(۱۸) کلیات جدولیہ فی احوال اولیاء اللہ

(۱۹) آوازِ مسلم مرتبہ مولوی ابوالفتح

(۲۰) عظمت انسان مؤلفہ مولوی ابوالفرح

(۲۱) مزارات اولیاء دہلی مؤلفہ مولوی محمد عالم شاہ

(۲۲) مصنفین اردو مؤلفہ سید زوار حسین

(۲۳) کیفیت خاندان چودھریان ایرن گوئی
مؤلفہ نانک چند۔

(۲۴) دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں
مؤلفہ امداد صابری۔

(۲۵) شجرہ خاندان منشی محمد عظیم

(۲۶) زیارت آثار شریف مرتبہ پیرجی شمشاد

(۲۷) دیوان قلمی پیرجی عبدالرشید فرقت دہلوی

(۲۸) آبِ حیات مؤلفہ مولانا محمد حسین آزاد

(۲۹) تذکرہ کاملانِ رامپور
مؤلفہ حافظ احمد علی شوق۔

(۳۰) کرزن گزٹ دہلی ۱۵ جولائی ۱۹۰۶ء

(۳۱) رسالہ آزاد ہندوستان دہلی نومبر ۱۹۴۹ء

(۳۲) اخبار عوامی رائے دہلی ۱۹۵۶ء

(۳۳) دہلی کالج میگزین ۱۹۵۳ء

(۳۴) رسالہ یارانِ قدیم دہلی اپریل ۱۹۲۶ء

(۳۵) تذکرہ علماء ہند مؤلفہ رحمان علی

(۳۶) میخانۂ درد مؤلفہ ناصر نذیر فراق

(۳۷) روز روشن مؤلفہ مولوی مظفر حسین

(۳۸) میرے زمانہ کی دلی مؤلفہ ملا واحدی

(۳۹) آثار رحمت مؤلفہ امداد صابری
(۴۰) الاکسیر فی اثبات التقدیر
مترجم شاہ اشرف علی
(۴۱) الامان کا شہید نمبر ۱۹۳۹ء
(۴۲) تاریخ صحافت اردو مؤلفہ امداد صابری
(۴۳) مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی
مؤلفہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف
(۴۴) اختر شہنشاہی مؤلفہ سید محمد اشرف
(۴۵) رسالہ عصمت دہلی جولائی ۱۹۲۷ء
(۴۶) دیوان بشیر از مولوی بشیر الدین
(۴۷) فہرست دواخانہ بقائی دہلی
(۴۸) تاج التواریخ مؤلفہ مولوی نصرت علی
(۴۹) دیوان فقیر از مولانا محمد حسین فقیر
(۵۰) کمال راسخ
(۵۱) اخبار الجمعیۃ دہلی ۱۳ مارچ ۱۹۳۰ء
(۵۲) یادگار دہلی مؤلفہ مولوی سید احمد ولی اللہی
(۵۳) مکتوبات حالی دوم
(۵۴) دکن میں اردو مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی
(۵۵) داستان ادب اردو
مؤلفہ سید محی الدین قادری زور

۱۸ مارچ ۱۹۷۱ء

امداد صابری
محلہ چوڑی والان۔ دہلی

ڈیڑھ سو سال قبل کی دہلی کی ایک جھلک

سلطنتِ مغلیہ پارہ پارہ ہو چکی تھی مگر اہلِ قلعہ اور اہلِ دہلی کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ ہندوستان کے کل صوبوں پر حریف حکومت کرنے لگے تھے۔ لیکن شاہانِ مغلیہ کا دھندلا سایہ اب بھی انھیں اپنا مطیع سمجھ رہا تھا۔ اہل دہلی اپنی چار دیواری میں تمام دنیا کو سمجھتے تھے اور گذشتہ عظمت و شوکت کی داستانیں اب بھی نوکِ زبان تھیں۔ ان کے عجیب و غریب خیالات، ان کے دل کش مشغلے اور ان کی بھولی بھالی باتیں ایسی دل چسپی اپنے ساتھ رکھتی ہیں کہ سننے والا ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔

یہاں مختلف مقامات میں جنوں، جنیوں، پریوں اور بھوتوں کے مسکن تھے اور شب کے وقت کسی ایسے مقام پر جانے کے لئے شرطیں لگائی جاتی تھیں اور نوجوان مغل بچے جن کی مسیں بھیگتی تھیں اپنی شجاعت کی بانگی دکھانے کے لئے تنہا جاتے تھے اور اپنے دوستوں کی نگاہ میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ ہر محلے میں باقاعدہ باشندوں کی تقسیم تھی ـــــ شریفوں کے محلے علیحدہ تھے اور ادنیٰ لوگ علیحدہ محلوں میں رہتے تھے۔ قریب قریب ہر گھر میں ایک اکھاڑہ ہوتا تھا۔ جہاں کُشتی، بنوٹ، پٹے بازی وغیرہ کی کسرتیں کی جاتی تھیں۔ سینوں کو ابھارا جاتا تھا۔ ڈنڑوں کو موٹا کیا جاتا تھا، اور جب علی الصبح کسرتوں سے فارغ ہو جاتے تھے تو اپنے گھروں کے آگے مونڈھے بچھا کے بیٹھ جاتے تھے۔ سلام علیک کی جگہ عشق اللہ کا جملہ استعمال ہوتا تھا۔ یہ سلام برابر والوں میں رائج تھا۔ کسی ادنیٰ شخص کی مجال نہ تھی کہ عشق اللہ کہہ سکے، سوائے آداب و تسلیم کے اور السلام علیکم خاص مولویوں میں رائج تھا۔ مغل بچے نہیں بولا کرتے تھے۔ مغل بچے بیٹھے ہوئے ہیں، پیچوان لگا ہوا ہے، پنجے اور کلائی کے زور ہو رہے ہیں، ڈنڑوں کو ناپا جا رہا ہے، کھانے پر شرطیں ہو رہی ہیں، گنجفہ، شطرنج، اور چوسر کھیلی جا رہی ہے۔ نہ کسی کا غم ہے اور نہ فکر ہے۔ اناج سستا ہے۔ روپیہ کا دس سیر یا مہنگا ہوا تو چھ سیر گھی بک رہا ہے۔ دو پیسے ایک شخص کو دے دیئے اور بھٹیارے کی دوکان پر چلا گیا،

دھیلے کا آٹا لیا، پیسے کا گھی، دمڑی پکوائی کی دی اور دمڑی کا کلّے کا شوربہ اور خوب سیر ہو کر کھا لیا۔
لباس بھی ویسا ہی کم خرچ اور بالا نشین تھا۔ ایک دوپلڑی ٹوپی سچا ٹھپا یا بیک لگی ہوئی کلیوں دار پاجامہ دیسی کپڑے کا، اونچی چولی، انگرکھا یا جامہ، بس شرفا کا یہی لباس تھا جو کم خرچ بھی تھا، پائیدار بھی تھا اور مقتضائے وقت بھی تھا۔ یہ لوگ وضع دار بھی تھے اور اپنی بات کے پورے بھی ہوتے تھے۔ بھنگ گھٹ رہی ہے، مغل بچے گرد بیٹھے ہوئے ہیں، دنیا سے بے نیاز، نہ کسی کی دشمنی کا خیال نہ کسی کی برائی، نہ حسد، نہ کینہ۔ مست اور سرشار، فکر ہزاروں کوس دور، غم پاس ہو کے نہ پھٹکا تھا۔ غیبت سے کبھی ان کے لب آلودہ نہ ہوتے تھے۔ اگر ایک بار کسی کو بھائی کہہ دیا تو وہ بھائی ہے اور اگر دوست کہہ دیا تو وہ دوست ہے۔ ایک عجیب زندہ دلوں کا گروہ تھا، جس کا دھندلا سایہ بھی اب نہیں دکھائی دیتا۔

حاضرات کے زور تھے، ماموں اللہ بخش کے دور دورے تھے، جنات نیاں اور جنات روزمرہ قلعہ کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ بہت سے مغل بچوں نے جنات نیوں سے شادی کر لی تھی، بہت سی دائیاں جنات نیوں کو جنانے جاتی تھیں۔ غرض یہ لطف تھے، یہ چہچہے تھے، یہ خوش صحبتیں تھیں۔ یہ زندہ دلوں کے گروہ تھے، یہ خوش و خرم جلسے تھے۔ ہر ایک اپنے آپے میں مست، نہ نوکری کا خیال، نہ بیوی سے جھگڑا، نہ مقدمہ بازی، مصنوعی تکلفات کا نام و نشان نہ تھا۔ زندگی کے فرضی سامانوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ایک دری گاڑھے کی سفید چاندنی اور اگر ممکن ہوا تو ایک غالیچہ اور صدر میں گاؤ تکیہ، ایک طرف اگال دان، دوسری طرف آفتابہ اور چلمچی رکھی ہوئی۔ بس ایک شربت اور کھاتے پیتے گھر کی یہی آرائش اور یہی زینت تھی۔

ان مغل بچوں، سیدزادوں اور پٹھانوں کا بھولپن ایسا پسندیدہ اور دل لبھانے والا ہے کہ دل عش عش کرتا ہے۔ ایک شخص بغیر تصنع کے مجلس میں اپنا واقعہ بیان کر رہا ہے اور سب بے انتہا توجہ اور شوق سے، سچے دل اور ایمان کے ساتھ سن رہے ہیں۔ اسی زمانے کی سوسائٹی کی بہت سی حکایتیں اب بھی کبھی کبھی دہلی کے گلی کوچوں میں گونج جاتی ہیں اور خود بخود کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مرزا حیرت ایڈیٹر اخبار کرزن گزٹ دہلی نے حسب ذیل شنیدہ واقعہ ۵ر جولائی ۱۹۰۶ء کے شمارے میں تحریر کیا ہے۔

"ایک بوڑھا شخص جو دو چار سال ہوئے زندہ تھا اور جس نے بلی ماران میں ایک چھوٹی سی دکان لے رکھی تھی اور وہ وہاں ایک زمانے میں ٹوپیاں بیچا کرتا تھا اور پھر کچھ دوائیں فروخت کرنے لگا تھا۔ مگر وہ نہ کسی سے ملتا تھا، اور نہ کسی سے طمع رکھتا تھا۔ دو چار آنے روزانہ پیدا کر لئے، اور پیسے کا دودھ، دو پیسے کی خمیری روٹی اور ایک پیسے کے کباب لے لئے اور دونوں وقت کے لئے بے فکر ہو گیا۔ اس پر کبھی کبھی ایک حالت سی طاری ہو جاتی تھی۔ ہماری اس کی کئی سال سے ملاقات تھی اور کبھی کبھی گورستان میں جب ہمارا اس کا ساتھ ہو جاتا تھا تو وہ اپنے زمانے کے عجیب و غریب حالات بیان کرتا تھا۔ ایک دن جب ہم ایک ٹوٹے ہوئے مقبرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ابر خوب آ رہا تھا اور بارش ہو رہی تھی تو اس نے آسمان کی طرف دیکھ کے سرد آہ بھری اور ہم سے کہنے لگا کہ میں اپنا ایک قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو مجھ پر گذرا ہوا ہے اور جس نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ ہم نے بہت شوق ظاہر کیا۔ وہ بوڑھا جس کی عمر ۸۴ یا ۸۵ سال سے کم نہ تھی، جس کے دانت جوں کے توں موجود تھے اور جس کی آنکھوں میں جوانوں کی سی چمک پیدا تھی، جس کی کمر جھک گئی تھی مگر چلنے میں وہ جوانوں سے ہیٹا نہ تھا، آواز میں بوڑھوں کی سی جھرجھراہٹ بالکل نہ تھی، بلکہ لوچ اور کڑاکا تھا اور وہ جب اپنی حالت میں آ جاتا تھا تو بیخودانہ طور پر یہ گانے لگتا تھا ؎

گئی ایک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا سینہ غم سے فگار ہے

ہم واقعی اس کی باتوں کو شوق سے سننے لگے۔ وہ کہنے لگا: "لال قلعہ کے چھتے میں میری ایک دکان تھی، وہاں میں بساطی کا سامان فروخت کیا کرتا تھا۔ روزمرہ ایک نوجوان مالن سیاہ ریشمی ساڑھی باندھے ہوئے قلعے میں آیا کرتی تھی اور بیگمات کے ہاتھ پھول اور کنٹھے بیچ کے سیدھی چلی جاتی تھی، نہ

کسی سے بات کرتی اور نہ کسی طرف آنکھ پھیر کے دیکھتی۔ میری عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی، میں عشق و محبت یا تعلقات زن و مرد سے بالکل آشنا نہ تھا سوائے کسرت کے میں کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ دس گیارہ بجے کھا پی کے اور کسرت وغیرہ سے فارغ ہو کے دکان پر آتا تھا اور مغرب سے پہلے یا کبھی مغرب کے بعد دکان سے چلا جاتا تھا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ والدین مر چکے تھے۔ دکان کے آگے سے نکلتا ہوا میں مالن کو روز دیکھا کرتا تھا۔ مگر میں نے کبھی اس سے بات نہ کی۔ ایک دن وہ خود میری دکان پر آ کے کھڑی ہو گئی اور مجھ سے ہار سنگار کا چاقو مول لیا اور منہ مانگے دام دے کے چلی گئی۔ اسی طرح دوسرے تیسرے روز ایک نہ ایک چیز لے جاتی اور کبھی کسی چیز کو نہ چکاتی۔ جب اس کا آنا دکان پر زیادہ ہوا تو میں بھی کبھی کبھی پیسہ دو پیسے کے پھول لے لیا کرتا۔ وہ ایک پیسے کے پھول اتنے دے دیتی کہ میں خود بھی استعمال کرتا اور اپنے دوستوں کو بھی دے دیتا۔ ایک دن جب کہ کچھ کچھ جھٹپٹا ہوتا چلا تھا اور اس وقت میری دکان پر کوئی گاہک بھی نہ تھا میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں تمہاری نسبت لائی ہوں، تمہاری تنہائی مجھے بری معلوم ہوتی ہے۔ گھر والے کا ایک گھر اچھا اور نگھرے کے سو گھر برے۔ نہ تمہیں کھانے کا آرام ہے نہ سونے کا۔ بھوک لگتی ہے تو بھٹیارے کی دکان پر بھاگے ہوئے جاتے ہو، اگر اسی حالت میں مر جاؤ گے تو منہ میں کوئی پانی ٹپکانے والا بھی نہ ہوگا۔ یہ سن کے میں کچھ گھبرایا، کچھ خوش ہوا، اور کچھ اپنی آزادی کو جاتا دیکھ کے مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ مگر اس مالن کی تقریر کچھ ایسی مؤثر تھی کہ باوجود پس و پیش کرنے کے بھی انکار نہیں کر سکا، اور میری زبان سے پہلا جملہ جو اس کے جواب میں نکلا یہ تھا کہ مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے اور جہاں تم مناسب سمجھو میری شادی کرا دو۔ یہ جواب سن کر مالن بہت خوش ہوئی اور مجھ سے کہا تو کار خیر میں دیر لگانی نہیں چاہئے۔ اٹھو، میرے ساتھ چلو! میں کچھ ایسا محو ہو گیا کہ ہوں کی نہ ہاں، دکان بڑھا کے اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ خاص بازار

اور لال ڈگی کا چکر دیتی ہوئی ایک ایسے محلے میں لے گئی جو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔
جہاں پختہ پختہ مکانات بنے ہوئے تھے اور گلیاں صاف تھیں مگر کوئی آدمی نہ
گلی میں چلتا ہوا، نہ کسی گھر سے نکلتا ہوا مجھے معلوم ہوا۔ مالن مجھے گلی در گلی لئے پھری
اور آخر بڑی مسافت کے بعد ایک مکان کے دروازے پر لے کے پہنچی، دروازے
پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑھیا نکلی، اس نے مجھے سلام کیا اور
مسکرائی اور یہ کہہ کے چلی گئی ٹھہرو! میں پردہ کراتی ہوں۔ گھڑی بھر کے بعد اندر
سے آواز آئی چنبیلی دولہا کو اندر لے آؤ، پردہ ہو گیا ہے۔ میں اندر گیا تو مکان
میں کسی کو نہ پایا۔ ایک دالان میں فرش ہو رہا تھا، بیچ میں سوزنی بچھی تھی اور سفید
غلاف کا چھوٹا سا گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ مالن نے مجھے وہاں بٹھایا اور آپ صحنچی
میں جا کے ایک کوٹھری میں گھس گئی۔ آدھ گھنٹے تک میں تنہا بیٹھا رہا کہ یکایک
مالن گرم پانی کی تتیڑی، آنولے، کھلی اور چنبیلی کا تیل لے کے آئی اور مجھ سے کہا
حمام میں چل کے نہا لیجئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا، اور صحنچی کے پہلو والی کوٹھری میں
چلا گیا۔ یہ سب چیزیں مالن نے وہاں لے جا کر رکھ دیں۔ مجھے باندھنے کو تہبند دیا
اور میرے سر میں آنولے ڈال کے خود میرا سر ملنے بیٹھ گئی، پھر میرے سارے جسم
پر کھلی مل دی اور اس آرام سے مجھے نہلایا کہ میرا بدن پھول معلوم ہونے لگا پھر
ایک نیا جوڑا مجھے پہنایا، بنارسی دوپٹہ میری کمر سے باندھا اور سر پر زریں سرخ عمامہ
اور پھر مجھے وہیں دالان میں ایک سوزنی پر بٹھا دیا۔ میرے آگے چھوٹی الائچیاں،
چاندی کے ورق لگے ہوئے پان اور چکنی رکھ دی اور کہا تم خاموش بیٹھے رہنا میں
قاضی کو بلانے جاتی ہوں۔ آدھ گھنٹے تک میں خاموش بیٹھا رہا کہ اتنے میں مالن
چار آدمیوں کو لے کے آئی، ایک قاضی، ایک وکیل اور دو گواہ تھے۔ قاضی کی
صورت میں نے کبھی دیکھی نہ تھی، سر پر ایک پگڑ باندھے ہوئے، بڑی لمبی ڈاڑھی
صرف آنکھیں اور ناک دکھائی دیتی تھی اور باقی چہرہ بالوں سے چھپا ہوا تھا۔
ہاتھ میں تسبیح اور لمبا جبہ پہنے ہوئے، بڑا بھاری بھرکم معلوم ہوتا تھا۔ قاضی کو

دیکھ کر میں دوزانو ہو بیٹھا۔ چند منٹ کے بعد میرا نکاح ہو گیا اور سلطان جہاں بیگم
کے ساتھ پانسو روپے کا مہر بندھا، نکاح ہونے کے بعد شربت لایا گیا جو پہلے مجھے
کٹورے میں دیا گیا اور پھر قاضی، وکیل اور دو گواہوں نے پیا اور گیارہ بجے کے
قریب یہ سب رخصت ہو گئے۔ مالن تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھی رہی، اور
مبارکباد دینے کے بعد اس نے مجھے چند ہدایتیں کیں، منجملہ ان کے ایک ہدایت
یہ تھی کہ اگر ایسی کوئی بات دیکھے جو پہلے نہ دیکھی ہو تو اس سے خوف زدہ نہ ہونا
اور نہ تعجب کرنا، نہ اس کی بابت سوال کرنا۔ رفتہ رفتہ کل باتیں اور ان کی غایت
تجھے معلوم ہوتی رہے گی تو خوش رہے گا۔ تیری بیوی خوب صورت خلیق اور
منکسر المزاج ہے، وہ تجھ سے کبھی بے وفائی نہیں کرے گی۔ جو رشتہ تم دونوں
میں ہو گیا ہے یہ قطع ہونے والا نہیں ہے۔ غرض یہ کوئی ناگوار باتیں نہ تھیں کہ مجھے
کچھ پس و پیش ہوتا۔ میں نے بے چوں و چرا ہر بات کو منظور کر لیا۔ غرض میں آرام
سے زندگی بسر کرنے لگا اور اب دکان پر آنا جانا بھی بہت کم ہو گیا۔ کئی مہینے
عیش و عشرت میں گذر گئے کہ میری بیوی کی زچگی کا وقت آیا۔ میں باہر کے دالان میں بیٹھ گیا۔
اندر وہی مالن اور چند عورتیں زچہ کے پاس بیٹھ گئیں کہ اتنے میں شدت کے درد ہوئے اور
لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا پیدا ہوتے ہی اور آنول نال کٹتے ہی طاق میں آ بیٹھا اور مجھے جھک کر
سلام کیا۔ یہ دیکھ کر میری جان نکل گئی اور میں ایسا سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا کہ پھر مجھے کچھ خبر
نہ رہی کہ میں کون ہوں کہاں جاتا ہوں اور یہ گھر کس کا ہے۔ مالن میرے پیچھے دوڑی، ظالم
ایسی بدعہدی نہ کر، اپنی زندگی میں اتنی کم عمر بے گناہ دلہن کو بیوہ نہ کر۔ جوں جوں مالن میرے
پیچھے بھاگتی تھی اور سمجھاتی تھی میرے حواس باختہ ہوتے تھے یہاں تک کہ میں ایک جگہ
بے ہوش ہو کے گر پڑا، اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے لال قلعے کے پھٹے
میں اپنے کو پڑا ہوا دیکھا اور چند دکان داروں کو پاس بیٹھا ہوا پایا۔ ہوش آنے
پر مجھے معلوم ہوا کہ میں لال ڈگی پر پڑا ہوا تھا کہ یہ لوگ مجھے اٹھا کے لائے۔ چند
روز کے بعد میں خاصہ تندرست ہو گیا۔ مگر دوسرے تیسرے دن دھندلکے اجالے

تنہائی میں مالن ابھی تک دکھائی دے جاتی ہے، جو دردناک لہجے میں کہتی ہے، ارے ظالم! تو نے سخت بے وفائی کی، تیری بیوی تیری جان کو روتی ہے، تیرا بچہ جوان ہو گیا ہے جو تجھے یاد کرتا ہے۔ بس جہاں میں نے یہ آواز سنی اور میری جان نکل گئی۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہوں اور میری روح پر ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔

ڈیڑھ سو سال قبل دہلی کی ایک تاریخی کشتی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں دہلی میں ہر قسم کے سینکڑوں کارخانے موجود تھے جس کا کچھ سایہ اب بھی دکھائی دیتا ہے۔ ہر کارخانے کے ساتھ ایک اکھاڑا ہوا کرتا تھا۔ شام تک کاریگروں نے کام کیا اور فارغ ہو کر ورزش شروع کی۔ اکھاڑا گوڑا جا رہا ہے، مغل بچے مونڈھے بچھائے بیٹھے ہیں۔ پہلوان اکھاڑے میں زور کر رہے ہیں دودھ کا کڑھاؤ چولھے پر چڑھا ہوا ہے۔ ایک طرف جسموں پر تیل کی مالش ہو رہی ہے، دوسری طرف ڈنڑ پیلے جا رہے ہیں اور بیٹھکیاں لگ رہی ہیں، استاد اپنے شاگردوں کو داؤ پیچ بتا رہا ہے۔ باری باری سے سب اکھاڑے میں اترتے ہیں اور ایک دو پکڑ کر کے باہر نکل آتے ہیں۔ قہقہے چہچہے اڑ رہے ہیں، ڈنڑ دن اور رانوں کو ناپا جا رہا ہے، اس بات کی شرطیں بدی جا رہی ہیں کہ دیکھیں آمنے سامنے کون ڈنٹر زیادہ پیلتا ہے۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھری ہوئی ہیں، سینے ابھرے ہوئے ہیں، رنگت انار کا دانہ بن رہی ہے۔ شریف، امیر، غریب سب سگے بھائیوں کی طرح آپس میں زور کر رہے ہیں۔ ہر ایک کے چہرے سے پرہیزگاری اور اتفاق برس رہا ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں۔ لزنت کرنے کے بعد دودھ کے قدح کے قدح چڑھائے جا رہے ہیں۔ کوئی جلیبیاں ڈبو کے دودھ پیتا ہے، کوئی بادام پیس کر حریرہ بنا کر نوش جان کر رہا ہے۔ غرض شام کے وقت ہر کارخانے کے اکھاڑے میں آپ یہی تماشہ دیکھیں گے۔ تمام شہر کارخانوں سے بھرا ہوا تھا، اور ہر جگہ یہی چہل پہل نظر آتی تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ کاریگر کی مزدوری ایک روپیہ روز تھی۔ روپے کا چار سیر گھی بکتا تھا۔ روپے کا من بھر آٹا آتا تھا۔ لزنت کے بعد یہ سب کاریگر بھٹیاروں کی دکانوں پر چلے جاتے تھے۔ سب کے پیسے اس کے حوالے کر دیئے اور اس نے گھی میں چک بچک چار پانچ بڑے بڑے موٹے موٹے پراٹھے پکا کے ان کے سامنے رکھ دیئے، وہیں سے دو پیسے کی نہاری لی اور وہ سیر بھر آٹے

اور آدھ سیر گھی کے پراٹھے بگھری ہوئی نہاری کے ساتھ جو کم سے کم پاؤ سیر گھی سے بگھاری جاتی تھی صفا چٹ کر گئے اور پھر شہر یا شہر کی فصیل کے کنگروں پر کئی کئی میل کی دوڑیں لگانی شروع کیں، اس کے بعد حلوائی کی دکان پر آکے تین چار سیر دودھ چڑھا گئے۔

لیکن آج دہلی پہلوانوں سے خالی کے برابر ہے۔ جس طرح دہلی علوم و فنون، صنعت و حرفت میں ہندوستان کی سرتاج تھی، اسی طرح پہلوانوں میں بھی اسے ہندوستان کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ ہر جمعہ کو موتیا کھان میں دنگل بندھا کرتا تھا۔ سہ پہر کو کشتیاں ہوتی تھیں اور جمعہ کی نماز کے بعد ہی سے لوگوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ ہجوم کی کچھ نہ پوچھو، سوائے بادشاہ کے سارا قلعہ چلا آتا تھا۔ امرا، وزرا، پالکیوں، نالکیوں اور ہواداروں میں بیٹھ کر علیحدہ علیحدہ آتے تھے۔ شہزادے ہاتھیوں پر سوار ہو کے آتے تھے اور یہ ہاتھی حلقہ باندھ کے چاروں طرف آہنی دیوار کی طرح کھڑے ہو جاتے تھے۔ شہزادے ان پر بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت کی کیفیت نہ پوچھو۔ سینہ تلنے ہوئے، بازوؤں کی مچھلیاں پھری ہوئی، چہرے انار کے دانے بنے ہوئے، جوق در جوق لوگ چلے آرہے ہیں۔ مغل بچے، سید، شیخ زادے اور خان خوانین اپنے لباس اور خال و خط میں نمایاں نظر آتے تھے۔ گھیتلا جوتی پیر میں، غرارے دار پائجامے زیب تن کئے، زریں ٹوپیاں سر پر، پانوں کی گلوریاں منہ میں، ہاتھ میں بانس کی پتلی سی چھڑی، چاندی کے تاروں سے گندھی ہوئی، جاڑا ہے تو شالی رومال اوڑھے ہوئے اور گرمی ہے تو شبنم کے جامے اور انگرکھے زیب تن کئے خراماں خراماں دنگل میں ادھر ادھر ٹہلتے پھرتے ہیں، ادھر سقہ کٹورا بجا رہا ہے۔ ادھر خوانچے والے، کبابی، برف والے غرض ہر قسم کے سودے والوں کے گرد ہجوم لگا ہوا ہے۔ پہلوان علیحدہ علیحدہ ڈنڈے مارتے ہوئے پھر رہے ہیں۔ بیسیوں اکھاڑے موجود ہیں اور ہر اکھاڑے کی الگ الگ ٹکڑیاں ہیں۔

اسی گھما گھمی، اسی دھوم دھام اور اژدہام میں یکایک غل مچا کہ دوارکا پہلوان آرہا ہے۔ سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ دیکھا ایک کڑیل گرانڈیل زبردست ہاتھ پیر کا بلند قامت شخص آرہا ہے۔ چلنے میں اس کی ایک ران کا گوشت دوسری ران کے گوشت سے رگڑ کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کلہ جبڑا، یہ ہاتھ پیر، یہ بازو، سینہ ابھرا ہوا، کمر پتلی، کلے سرخ پھوں پھاں

کرتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اس کے گرد اس کے گرانڈیل پٹھوں کا ہجوم ہے، سب حلقہ باندھے ہوئے ہیں۔ لوگ اسے دیکھ کے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کوئی کہنے لگا کہ بیس سیر دودھ تو پٹھوں کو زور دلا کے کھڑے کھڑے چڑھا جاتا ہے۔ کوئی کہنے لگا دودھ اور جلیبیوں کا بھرا ہوا کھڑاؤ اس نے میرے سامنے صاف کردیا ہے۔ کوئی کہنے لگا اپنے دو پٹھوں کو دونوں کندھوں پر بٹھا کے کئی کئی دوڑیں فصیل کے کنگروں کی لگاتا ہے۔ واقعی ایسے زبردست ہاتھ پیر کا پہلوان بہت کم دیکھا گیا ہے۔ سب کو سلام کرتا ہوا چلا آتا ہے۔ اس کے اکھاڑے کے آدمی یا وہ لوگ جو اس کے اکھاڑے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لئے دعا کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ان شہزادوں کا تو کچھ کہنا ہی نہیں جو دوارکا کو کھلاتے ہیں اور اس کے کل اخراجات کے کفیل ہیں، ان کی توجانیں لڑی ہوئی ہیں۔ یہاں نہ مذہبی تعصب ہے، نہ ہندو مسلمان کا سوال ہے۔ سب سگے بھائیوں کی طرح مل جل رہے ہیں۔ بڑے بڑے جوہری اور مہاجن بھی ہیں، ان میں بعض تو دوارکا کی طرف ہیں اور بعض اس کے حریف کے جانب دار ہیں۔

خلقت اس کا نظارہ کر رہی تھی کہ اسی اثنار میں غل مچا کہ احمد خاں پٹھان بھی آگیا، لوگ جوق در جوق ادھر سمٹنے لگے۔ احمد خاں کی کیا پوچھتے ہو، یہ معلوم ہوتا تھا کہ مست ہاتھی انسانی صورت میں جھومتا چلا آتا ہے، سات آٹھ فٹ کے درمیان قد، دیو صورت، دیو طاقت، جوان جس کی قوت اس کے جسم سے ٹپکتی ہوئی، بازو ایسے گویا شہتیر کے شہتیر، ڈنڈوں کی مچھلیاں بھری ہوئی، سینہ طباق سا چوڑا، اور اوپر کو ابھرا ہوا، رانیں ہاتھی کی سی، غرض اس سج دھج سے یہ پہلوان غول کو چیرتا ہوا اکھاڑے میں آکے بیٹھا۔ اس کا حریف دوارکا پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہزاروں تماشائی موجود ہیں۔ بڑے بڑے استاد بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک فوج کی فوج پہلوانوں کی بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ شہزادے ہاتھیوں پر سوار تماشہ دیکھ رہے ہیں کہ اتنے میں لنگر بندھنے شروع ہوئے۔ حسب دستور پہلوانوں کے آگے چادریں رک گئیں اور پہلوان لنگر لنگوٹا کسنے لگے۔ اس کشتی میں سب کی جانیں لڑی ہوئی ہیں، اور کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی کہ کون مارے گا اور کون پچھڑے گا۔ دونوں شہ زور، دونوں رستم، دونوں پہاڑ کے پہاڑ۔ جب لنگر لنگوٹا کس لیا گیا تو آوازیں آنی شروع ہوئیں، جوڑ چھوڑ دو، زیادہ انتظار نہیں ہو سکتا۔

آخر دونوں پہلوان اکھاڑے کے آگے آکے کھڑے ہوئے، صورتیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ جس وقت یہ بھڑیں گے اور ہاتھ ملائیں گے تو زمین بھی لرز جائے گی۔ اکھاڑے کے قریب پہنچ کے دونوں پہلوانوں کے ہوا خواہ ہٹ کے لوگوں کی صفوں کے آگے جا بیٹھے۔ شہزادوں نے اشارہ کیا۔ دونوں نے چادریں اتار ڈالیں اور خم ٹھونک کے اکھاڑے میں اتر آئے۔ اس وقت ان کے جسم کی بہار دیکھنے کے قابل تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ آبلے پڑتے ہیں۔ احمد خاں کے جسم میں بٹے بٹے ہو رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ جسم کو اس قدر کٹوا تا ہے کہ تمام جسم میں بٹے پڑ گئے ہیں، جسم گوشت سے کے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے، ہاتھ لگاؤ تو یہ معلوم ہو گویا سنگِ خارا پر پڑ گیا۔ بڑے کمائے ہوئے جسم تھے، چکنے ایسے کہ مکھی پھسلے، شیشے کی طرح چمکتے ہوئے۔

غرض دونوں نے اپنے دستور کے مطابق اکھاڑے کو سلام کیا اور پھر خم ٹھونک کر سامنے آ گئے، پہلے ہاتھ ملے اور پھر ریلا پیلی شروع ہونے لگی۔ اپنے اپنے داؤوں کی فکر میں ہوئے، پہلے معمولی گاؤزوری ہوئی، اس کے بعد احمد خاں بغلی ڈوب کے دوارکا کو پکڑ لایا اور پیچھے لنگر میں ہاتھ ڈال کے کھڑا ہو گیا۔ دوارکا نے کچھ جھنجوڑی سی لی۔ جھنجوڑی کا لینا تھا کہ احمد خاں نے ایک دو جھٹکے مار کے اسے ایک دو منٹ کے لئے خاموش کیا۔ دوارکا نکلنے کی فکر میں ہوا کہ احمد خاں نے ذرا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ کر اپنے آگے کی طرف گھسیٹا، اس کے گھسیٹنے سے دوارکا کے قدم کسی قدر زمین سے اٹھے کہ احمد خاں نے اسے اُدھر اٹھا لیا اور جوشِ مسرت میں ہاتھیوں کی قطاروں سے نکل کے تماشائیوں کی صفیں چیرتا ہوا، ایک بلند چٹان پر جا بیٹھا۔

رستم و سہراب، اسفندیار کی تو کہانیاں آپ نے سنی ہیں، اگر یہ مناظر دیکھتے تو وہ کہانیاں بھول جاتے۔ ایک قوی ہیکل دیو نے دوسرے دیو کو پتے کی طرح اٹھا لیا ہے اور بھاگا پھرتا ہے، جس وقت پشتے پر پہنچا، اس کو چت کر کے اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا، جس سے احمد خاں کی دھاک سارے شہر میں بیٹھ گئی اور اس کی قوت شہ زوری کے قائل ہو گئے۔

کرزن گزٹ دہلی یکم اپریل ۱۹۱۲ء

دہلی کی قدیم پٹے بازی، بنوٹ، پنجہ اور کلائی

پٹے بازی اور بنوٹ یہ دونوں فن حقیقت میں عجیب وغریب ہیں۔ پٹے بازی ایک ادنیٰ درجے کا فن ہے۔ مگر بنوٹ اس کے مقابلے میں بہت اعلیٰ درجے کا ہے۔ ایک شخص جو عمدہ بنوٹ جانتا ہے دو چار نہیں بلکہ دس بیس آدمیوں کے قابو میں نہیں آسکتا۔ ان دونوں فنون کے استاد دہلی میں بکثرت موجود تھے۔ مگر اب ان کا بالکل کال ہے۔ سارے شہر میں اس فن کے شاید دو ایک استاد ہوں تو ہوں۔

۱۸۸۱ء کا واقعہ ہے کہ ایک شخص جس پر خون کا الزام تھا اور بڑا قوی ہیکل اور زبردست جوان تھا، وہ یکایک دہلی پولیس کے ہاتھ سے ہتھکڑیاں توڑ کے نکل گیا۔ اور ایک سپاہی کی تلوار چھین کر عدالت سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ عدالت میں ایک کہرام مچ گیا۔ ہر چند اس سے تلوار چھیننے کی کوشش کی گئی مگر کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ دلیری سے اس کے پاس جاتا اور اس سے تلوار چھین لیتا۔ وہ برابر آواز پر آواز دے رہا تھا کہ کسی کو جرأت ہو تو میرے سامنے آئے۔ آخر یہ بات طے ہوئی کہ اگر یہ آسانی کے ساتھ تلوار نہ دے تو اسے گولی ماردی جائے کہ اتنے میں ایک میر صاحب جو بہت ہی کمزور ہاتھ پیر کے، پستہ قامت تھے اور غالباً دہلی کے رجسٹری کے محکمے میں کام کرتے تھے۔ اپنے دفتر سے باہر نکل آئے۔ اور حکام سے یہ کہا کہ اگر حکم ہو تو میں اسے زندہ گرفتار کرلوں۔ یہ سن کے ان کو بڑا تعجب ہوا۔ ان سے کہا گیا کہ کیا واقعی آپ اس سے تلوار چھین لیں گے۔ انھوں نے کہا یہ بات معمولی سی ہے۔ میں اس ایک سے نہیں بلکہ کئی ایک آدمیوں سے تلوار چھین سکتا ہوں۔ چنانچہ انھیں حکم ملا۔ انھوں نے ایک پیسہ اپنے رومال میں باندھا اور اس کے آگے گئے۔ اس نے ہنس کے کہا کہ آپ اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جائیے ورنہ میں تلوار سے آپ کی گردن اڑا دوں گا۔ میر صاحب

نے ہنس کے کہا کہ بھائی تیری خیر اسی میں ہے کہ تلوار دے دے ورنہ تجھے سخت نقصان پہنچے گا۔ وہ یہ سنتے ہی لال پیلا ہو گیا۔ اور میر صاحب پر تلوار لے کے شیر کی طرح جھپٹا۔ میر صاحب نے بنیتر اکاٹ کے اس کی کلائی پر اس زور سے رومال میں بندھا ہوا پیسہ مارا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے کئی گز آگے جا پڑی۔ چونکہ وہ پیسہ کلائی کی رگ پر لگا تھا، خود ایسا چکرا کے گرا کہ کئی منٹ تک اسے ہوش نہ آیا۔ آخر وہ زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور میر صاحب کی بڑی واہ واہ ہوئی۔

اسی طرح ایک ڈاکو جس کا قد آٹھ فٹ سے کم نہ تھا، جو ایک دیو معلوم ہوتا تھا، جس کی قوت یہاں تک تھی کہ موٹی موٹی زنجیریں بہت آسانی سے توڑ دیا کرتا تھا۔ جس کے آگے آٹھ دس من کا بوجھ اٹھا لینا ایک معمولی بات تھی۔ جو نہا ڈاکے مارا کرتا تھا۔ اپنی حسب عادت وہ نجف گڑھ دہلی کے ایک سپاہی جو انگریزی پلٹن میں ملازم تھا کے گھر میں آیا۔ اس ڈاکو کی یہ عادت تھی کہ وہ گھر میں گھس کے سارا سامان نہایت اطمینان کے ساتھ باندھ لیتا تھا اور جب چلنے لگتا تھا تو گھر والوں کو جگا کے آگاہ کر دیتا تھا کہ اگر تم سے روکا جائے تو مجھ کو روکو میں تمہارا سامان لے کے جاتا ہوں۔ اتفاق سے سپاہی کی بیوی اور اس کی بڑھیا ساس کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا۔ اس نے حسب عادت ان عورتوں کو جگایا اور کہا میں سامان لے جاتا ہوں۔ سپاہی کی بیوی پہلے ہی سے جاگ رہی تھی اور یہ سارا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ڈاکو کی آواز سن کے صرف اتنا کہا کہ اچھا تو میرے گھر کا سامان لے جا رہا ہے۔ لے جا۔ میں عورت ذات ہوں اور ایک میری بڑھیا ماں ہے۔ اس وقت اگر میرا شوہر ہوتا اور تو اس کے آگے سے سامان لے جاتا تو میں جانتی کہ تو بڑا ڈاکو ہے۔ یہ سن کر ڈاکو نے ایک بڑا قہقہہ لگایا۔ اور اس سے دریافت کیا کہ تیرا شوہر کب آئے گا۔ اس نے کہا کہ وہ عنقریب آنے والا ہے، اس کی رخصت منظور ہو چکی ہے، وہ غالباً ہفتہ عشرے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ اس پر ڈاکو بولا کہ ہم یہ سامان یہیں چھوڑ جاتے ہیں، جب تیرا شوہر آئے گا، اسی وقت آ کے لے جائیں گے۔ یہ کہہ کے ڈاکو چلا گیا۔

کوئی پندرہ دن کے بعد وہ دیو نژاد ڈاکو جس کے ہاتھ میں ایک من کے وزن کا لوہے کا ڈنڈا رہتا تھا پھر اس سپاہی کے مکان میں آیا۔ اسی طرح بے تکلفی سے اس نے سارا سامان باندھا اور جب اپنا کام کر چکا تو اس نے سپاہی کو جگایا اور کہا میں یہ سامان لے جاتا ہوں۔

سپاہی اٹھ کھڑا ہوا، بانس کی ایک معمولی لکڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ڈاکو سے کہا کہ تیری اسی میں خیر ہے کہ تو یہ کل سامان جہاں سے سمیٹا ہے وہیں رکھ دے اور اپنی جان بچا کے چلا جا۔ دیو نژاد ڈاکو بہت حقارت سے خندہ زن ہوا، اور کہا کہ ڈنڈا جو میرے ہاتھ میں ہے اتنے وزن کا ہے کہ تو اسے نہیں اٹھا سکتا۔ تین ڈنڈے سے ایک زبردست بھینسے اور سانڈ کو بٹھا دیتا ہوں۔ تیری عورت حقیقت میں بڑی دلیر ہے کہ اس نے مجھ سے دو بدو باتیں کی تھیں۔ ایسی عورت پر مجھے رحم کھانا چاہئے۔ تیری اس جرأت سے یقیناً وہ بیوہ ہو جائے گی اور تو مفت میں جان دیدے گا۔ میرے ایک ہاتھ کا بھی تو نہیں ہے۔ بس تو جا اور اپنی بیوی کی جوانی پر رحم کھا کے اپنے پلنگ پر سو جا۔ سپاہی نے ایک قہقہہ مارا، اور پھر جھلّا کے کہا کہ اس بے ہودگی سے کوئی نتیجہ نہیں، اگر تو اپنی جان کی خیر چاہتا ہے تو اس سامان کو کھول اور جہاں سے لیا ہے وہیں رکھ دے۔ ڈاکو کو سپاہی کی یہ بدزبانی اچھی نہ معلوم ہوئی، اس نے فوراً اپنے لوہے کا ڈنڈا رسید کیا۔ سپاہی چونکہ ہوشیار کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ خالی دے کے اور بڑی دلیری سے للکار کے کہا کہ او نامراد اگر تجھ میں جرأت ہے تو اور دل کا حوصلہ نکال لے۔ چنانچہ ڈاکو نے غصے میں آ کے ڈنڈا ابھرا کے مارا مگر وہ بھی خالی گیا۔ سپاہی نے اس پر کہا کہ لے اب سنبھل۔ تیرے دو وار ہو چکے ہیں۔ تیسرا وار میرا ہے۔ یہ کہہ کے کچھ ایسی لکڑی اس کی شہ رگ پر ماری کہ وہ دیو چکرا کے گر پڑا۔ سپاہی اس کے پاس کھڑا ہو گیا اور زور سے ٹھوکر مار کر کہا کہ بس اس برتے پر اتنا پھول رہا تھا۔ ایک معمولی بانس کی لکڑی بھی نہ کھا سکا۔ چنانچہ بڑی دیر میں اسے ہوش آیا۔ مگر اس میں کسی قسم کی ہمت نہ رہی وہ سپاہی کے پیروں پر گر پڑا اور کہا مجھے امان دو میں تمہارا مدت العمر خادم رہوں گا۔

یہ کوئی کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کہ جو لوگ بنوٹ کے فن سے ناواقف ہیں وہ ممکن ہے کہ اسے کہانی سمجھیں یا مبالغہ خیال کریں مگر فی الواقع جنھوں نے بنوٹ کے استادوں کو دیکھا ہے یا کم و بیش اس فن کی خود ورزش کر چکے ہیں وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک صاحب فن کس آسانی سے دس بیس آدمیوں پر غالب آسکتا ہے۔

دہلی میں ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد تک لکڑی اور بنوٹ کے علیحدہ علیحدہ اکھاڑے تھے۔ شرفاء اور امراء کے بچے اس کی باقاعدہ تعلیم پاتے تھے۔ اسی طرح پنجہ اور کلائی کے استاد

دہلی میں ایسے موجود تھے، جن کی نظیر اب نہیں ملتی۔ میر پنجہ کش خوش نویسی میں تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ مگر پنجہ کش کے الفاظ جو ان کے نام کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ باوجود خوش نویس ہونے کے وہ اعلیٰ درجے کے پنجہ کش بھی تھے۔ ہم نے سنا ہے کہ لوہے کے پنجے سے زور کیا کرتے تھے۔ اور آخر میں لوہے کا پنجہ مڑ جاتا تھا۔ مرزا علی بیگ کا واقعہ مشہور ہے، ان کی عمر اسی سے تجاوز کر چکی تھی۔ دستوں کا انھیں عارضہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا محال تھا۔

ایک زبردست پہلوان میرٹھ سے ان کے پاس ملنے آیا۔ مرزا صاحب کی اس سے پہلے کی ملاقات تھی۔ چند روز سے اس پہلوان کو پنجے کا شوق ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی موٹی موٹی زبردست انگلیاں مرزا صاحب کے آگے کر کے کہا کہ آپ مجھے پنجہ سکھا دیجیے، جس کے معنی یہ تھے کہ وہ انھیں چھیڑتا تھا۔ انھوں نے کہا میں قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں۔ دستوں سے میری قوت سلب ہو چکی ہے۔ میں تم سے کیا پنجہ کر سکتا ہوں۔ مرزا صاحب کے ہاتھ کی کلمہ کی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی، اس سے اور بھی قوت نصف رہ گئی تھی مگر جب وہ پہلوان نہ مانا اور زبردستی پنجے میں پنجہ ڈال دیا۔ آخر مرزا صاحب اٹھ بیٹھے اور اپنا لرزتا ہوا ہاتھ آگے کر کے کہا تمھاری یہی خوشی ہے تو پنجہ ڈال دو۔ مگر دیکھنا یہ نہ ہو کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔ تم میری کوئی انگلی توڑ کے چل دو۔ چنانچہ اس نے پنجے میں پنجہ ڈالا، اور اب زور ہونے لگے۔ دس بارہ منٹ تک زور ہوتا رہا۔ مرزا صاحب نے زور کرتے کرتے ایک ایسی قمچی ماری کہ اس کی ساری انگلیاں بول اٹھیں اور ہائے ہائے کر کے لوٹ گیا۔ قمچی مارنا پنجہ کشی کے فن کا ایک خاص محاورہ ہے۔ یہ ایک قسم کا جھٹکا ہوتا ہے جس سے مقابل کی انگلیاں بے کار ہو جاتی ہیں۔

لکڑی اور بنوٹ کی پنجہ کشی پہلی سیڑھی ہے۔ میر پنجہ کش جیسے پنجہ میں نام آور تھے، ویسے ہی لکڑی کے استاد کامل تھے۔ اسی طرح مرزا محمد علی بیگ لکڑی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ پنجہ کشی کے فن اور بنوٹ وغیرہ کے فنون سے بظاہر کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن فن کے استاد اس بات کو جانتے ہیں کہ دونوں کا آپس میں بہت تعلق ہے۔ مغل بچوں میں اس فن کا بہت رواج تھا۔ شام کے وقت موتیا کھان پر قدم شریف کے قریب مغل بچوں کا ہجوم رہتا

تھا اور وہاں سب فن کے آدمی جمع ہوتے تھے۔

موتیا کھان اب تک موجود ہے۔ اس کی چار دیواری منہدم ہو گئی ہے۔ کنوئیں کا غالباً وجود نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک زمانے تک اس کی بڑی رونق رہی۔ یہاں ہندو مسلمان شام کے وقت جمع ہوتے تھے۔ ایک عجیب کیفیت آتی تھی۔ پانی ایسا ٹھنڈا اور میٹھا کہ گرمیوں میں برف کے پانی سے زیادہ لطف آتا تھا۔ ہندو اپنی ٹھنڈائی تیار کر رہے ہیں اور مسلمان بادام پیس رہے ہیں اور اس کا شربت پیا جا رہا ہے۔ تمام دنیا کے فنون کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ پہلوانوں پر بحثیں ہو رہی ہیں۔ بنوٹ اور پنجہ کشی پر تبصرے ہو رہے ہیں۔

جو اکھاڑے اس فن کے تھے گویا وہی مدرسے سمجھنے چاہئیں، بغیر کسی معاوضے کے شوقینوں کو بنوٹ اور لکڑی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اب بھی یہی دستور ہے، استاد کوئی معاوضہ اپنے شاگردوں سے نہیں لیتا۔ (کرزن گزٹ دہلی ۲۳ مارچ ۱۹۱۲ء۔)

دہلی کے قدیمی دستکاری کے کارخانے

دہلی میں ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد میں دستکاری کے صدہا کارخانے تھے، تمام شہر کارخانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر جگہ چہل پہل نظر آتی تھی۔ اب وہ بات نہیں، وہ زور شور نہیں رہا۔ دہلی وہ دہلی نہیں رہی۔ وہ دستکار بھی نہیں رہے۔ اس زمانے کے چند کارخانوں کے حالات پڑھئے۔

امیر کا کارخانہ یہ کارخانہ دبکئی کا تھا، پچاس ساٹھ آدمی کام کرتے تھے۔ املی کی پہاڑی پر تھا۔ اس میں سونے اور چاندی کا تار دبکا جاتا تھا۔ تار دبکنے کی اب مشین نکل آئی ہے مگر ہاتھ سے جو تار دبکا جاتا ہے وہ ان مشینوں کے تار سے بدرجہا مضبوط اور اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ اس کے دبکنے کی یہ صورت ہے کہ کاریگر ایک ہتھوڑا ہاتھ میں رکھتا ہے جس کا وزن تین سیر سے کم نہیں ہوتا۔ اس ہتوڑے کا مربع صورت کا کئی انچ چوڑا منہ بنا ہوا ہوتا ہے اور اس قدر صاف اور چمک دار ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی چیز لوہے کی چمکتی ہوئی نہیں دیکھی، اچھی طرح آدمی اس میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے، آئینے سے بھی اس کی صفائی زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا اوزار نہائی ہوتا ہے جو زمین میں گاڑا جاتا ہے اور ہتھوڑے کے برابر اس میں بھی منہ پر ایک شیقل شدہ حصہ ہوتا ہے، اس کی چمک دمک بھی مثل ہتھوڑے کے منہ کے ہوتی ہے۔ نہائی کے پیچھے سونے کے تار کی لپٹی ہوئی ایک پھرکی رکھی رہتی ہے، اس کے برابر مچھلی کا چھلکا لگایا جاتا ہے، جس میں سے تار نکلتا رہتا ہے۔ کاریگر ایک ہاتھ سے ہتھوڑا مارتا ہے اور ایک سے تار گھسیٹتا جاتا ہے، ہاتھ کچھ ایسا جچا تلا پڑتا ہے کہ تار یکساں نکلتا چلا آتا ہے کہیں سے چوڑا اور پتلا نہیں ہوتا مگر یہ بات اور سمجھنے کی ہے کہ ایک ہی تار نہیں دبکا جاتا بلکہ ایک وقت میں آٹھ دس تار دبکے جاتے ہیں۔ سو تولے کی مزدوری کاریگر کو سوا دو روپے ملتی تھی۔ ایک کاریگر آسانی کے ساتھ ۲۵، ۳۰ تولے دبک سکتا تھا۔ بعض ایسے بھی ہیں

جو ۸۰۰۰۰ تولے تک تار دبک لیتے تھے۔ ان کے آگے دبکے ہوئے تار کا ایک ڈھیر لگا رہتا ہے۔ وہ ایسا خوشنما منظر ہوتا ہے کہ روشنی میں سونے کا دریا بہتا دکھائی دیتا ہے۔ ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی جاتی ہے اور باہم چہل اور مذاق ہوتا جاتا ہے۔

مرزا ولی بیگ بٹیا درگاہ شاہ ترکمان میں ان کا کارخانہ تھا، بیس پچیس آدمی کام کرتے تھے۔ مرزا ولی بیگ بہت ہی زندہ دل اور بامذاق آدمی تھے۔

بٹی کو شاید آپ نہ سمجھیں۔ ریشم اور سونے یا چاندی کا تار بٹ کے کلابتون بنایا جاتا ہے۔ چھت کے قلابے میں ریشم اور تار لٹکا دیا جاتا ہے۔ پتلے سرکنڈے پر ریشم اور تار علیحدہ علیحدہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ کاریگر کی پنڈلی سے چمڑے کا ایک ٹکڑا بندھا رہتا ہے، وہ اس سے رگڑ کے دونوں پولیوں کو چکر دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے دونوں کو سیدھا کرتا جاتا ہے، اس چکر میں ریشم اور تار لپیٹ دیا جاتا ہے، پھر وہ اسے علیحدہ ایک لکڑی پر لپیٹ لیتا ہے اس کو بٹی کہتے ہیں۔ اور جو یہ کام کرتا ہے وہ بٹیا کہلاتا ہے۔ مرزا ولی بیگ کا کارخانہ ان کی زندگی میں ہی برباد ہو گیا تھا۔

خلیفہ ظفر یہ کارخانہ محلہ سوئی والان میں تھا۔ اس میں بھی دبکیئ کا کام ہوتا تھا۔ کاریگروں کی تعداد پچاس ساٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی۔ اس کا تنزل اس بری طرح ہوا اور اپنی عظمت کھو بیٹھا۔ بجائے پچاس ساٹھ کاریگروں کے ایک دو کاریگر کام کرنے لگے۔

اردو ل پیمک والا ترکمان دروازہ میں اس شخص کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے میں فقط پیمک تیار کی جاتی تھی، جس میں بیس پچیس آدمی کام کرتے تھے۔ اس کارخانے کی پیمک بہت مشہور تھی۔

محمدؐ رضا گوٹے والے یہ کارخانہ فراشخانہ میں تھا۔ ڈھائی تین سو کاریگرنیاں کام کرتی تھیں۔ گوٹا گوکھرو اور بادلہ وغیرہ تیار ہوتا تھا۔ عجیب رونق تھی اور فراشخانہ میں چہل پہل نظر آتی تھی۔

محمدؐ جان لیس والے یہ کارخانہ گندہ نالہ کشمیری گیٹ پر تھا۔ خود محمد جان یا ان کے دو ایک بیٹے لیس بنایا کرتے تھے اور گھر میں چھپ کے بناتے تھے۔ چونکہ شہر بھر میں لیس کا کام کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کی مزدوری خوب چل رہی تھی۔

بعض نے ان کا شاگرد بننا چاہا مگر انھوں نے کسی کو نہیں سکھایا۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بخل کی وجہ سے لیس کے کام کو کافی نقصان پہنچا۔

امیر بیگ گوٹے والے ۱۸۵۷ء کے بعد امیر بیگ کے بہت دور دورے تھے۔ ڈھائی تین سو کاریگرنیوں کا ان کے کارخانے سے تعلق تھا گویا اتنی عورتوں کی تعداد ان کے ہاں کام کرتی تھی۔ فقط سنہری یا روپیلی گوٹا یا ٹھپا بُنا جاتا تھا۔ ایک عظیم فیکٹری کی شان پائی جاتی تھی۔

میر صفدر علی گوٹے والے ان کا کارخانہ بھی بہت بڑا تھا۔ پانچ سو عورتیں کام کرتی تھیں۔ جس کارخانے میں اتنے آدمی کام کریں اس کو بڑا کارخانہ سمجھا جاتا تھا۔ میر صفدر علی ٹمیا محل میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں روپے کی خوب ریل پیل تھی۔

استاد امیر یہ کارخانہ خان چند کے کوچہ چاندنی چوک میں کناری کا بہت بڑا تھا۔ یہاں کناری بنائی جاتی تھی ...... تنزل کے زمانے میں اس کارخانے میں بیس پچیس آدمی کام کرتے تھے۔

بدر الدین خاں ان کا کارخانہ املی کی پہاڑی پر تھا، ان کے ہاں بھی کناری کا کام ہوتا تھا۔ کاریگروں کی اوسط تیس چالیس تھی۔ خوب چہل پہل اور رونق تھی۔ استاد بدر الدین زندہ دل آدمی تھے۔ کاریگروں کو اولاد سے زیادہ سمجھتے تھے۔

محمد حسین عرف نان پاؤ یہ کارخانہ حویلی مصطفیٰ خان میں تھا۔ یہاں بھی کناری تیار ہوتی تھی۔ اس کارخانے میں بیس پچیس کاریگر کام کرتے تھے۔ کاریگر کارخندار پر جان چھڑکتے تھے۔

امیر بخش زردوز یہ کارخانہ پھاٹک حبش خاں میں تھا۔ اس کی بڑی شہرت تھی۔ پچاس ساٹھ آدمی روزمرہ کام کرتے تھے۔ صدہا قسم کا زریں سامان یہاں تیار رہتا تھا۔ ہاتھیوں کی جھولیں، گھوڑوں کا ساز و براق دلہنوں کے جوڑے، نوجوان امیرزادوں کے لباس، دولہا کا مسند گاؤ تکیہ، امیرزادوں کی دولائیاں،

رئیس زادوں کی زریں ٹوپیاں سب اس کارخانے میں تیار کی جاتی تھیں۔

عبدالرحمٰن تارکش یہ کارخانہ ریوڑی کے کٹڑے میں تھا۔ یہاں پورے سو آدمی کام کرتے تھے۔ یہاں فقط تار کھینچا جاتا تھا۔ تار کھینچنے کی مشین نکل آئی ہے جس سے تارکشوں کو نقصان پہنچا۔ مگر جو قوت اس تارکشی میں تھی، جو جنتری میں کھینچا جاتا تھا وہ قوت مشین کے تار میں بالکل نہیں ہے۔

نور محمد تاش والے ان کا کارخانہ میر ہاشم کے پھاٹک بازار چتلی قبر میں تھا، جس میں تمام تاش بادلہ اور ریشم تیار ہوتا تھا۔ پہلے یہ کپڑے ہندوؤں کے دولہا پہنتے تھے، اب ہندوؤں کی ارتھی پر ڈالے جاتے ہیں۔ وہ ارتھی جو بوڑھے یا بڑھیا کی ہو۔ یہ کارخانہ بھی ایک زمانے میں مشہور تھا اور اپنی نوعیت کا نرالا تھا۔ کاریگروں کی معقول تعداد اس میں کام کرتی تھی[۱]

ان کارخانوں کے علاوہ راجہ کے بازار میں ابراہیم کناری والے، امیر بیگ دیکئے نیاز علی سنجاف والے اور حافظ محمد حسن کا کارخانہ محلہ سوئیوالان میں تھا۔ ان کے ہاں بیس پچیس آدمی کام کرتے تھے۔ یہ سب فنا ہو گئے اور ہمیشہ کے لئے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

عبدالکریم زردوز ان کا کارخانہ پہلے محلہ گڑھیا میں تھا۔ یہ دہلی کے مشہور زردوزوں میں تھے۔ ان کے کارخانے میں پچاس سے زائد کاریگر کام کرتے تھے۔ کاریگروں کی تعداد جب سو کے قریب ہوگئی، تو یہ کارخانہ چاندنی محل کے ایک بڑے مکان میں چلا گیا۔

استاد عبدالکریم کے والد مولانا عبدالرحمٰن جوہری تھے جو بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ عرب سے آئے۔ اور ہمایوں کے مقبرے کے پاس عرب سرائے میں مقیم ہوئے۔ یہ نگینوں اور ہیروں کا کام کرتے تھے۔ آپ کے اکلوتے صاحبزادے عبدالکریم تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے عرب سرائے پر قبضہ کر لیا۔ تو آپ نے حویلی اعظم خاں میں سکونت اختیار کی اور اپنے صاحبزادے عبدالکریم کو

[۱] کرزن گزٹ دہلی ۲۳ مارچ ۱۹۱۲ء

زر دوزی کا کام سکھایا۔ استاد عبدالکریم کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی۔ اب بھی ان کے شاگرد دہلی اور کراچی میں زر دوزی کا کام کرتے ہیں۔ آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، انتہائی خوش اخلاق، وضعدار اور مخیر تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ۹۰ سال کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں ہوا۔

استاد عبدالکریم کے اکلوتے صاحبزادے محمد دین صاحب ہیں جو مٹیا محل میں رہتے ہیں اور سونے کے زیورات کا کام کرتے ہیں۔ ان کے تین فرزند احمد دین، احمد میاں اور محمد میاں ہوئے۔

حافظ احمد دین صاحب ۱۹۴۲ء میں مٹیا محل میں پیدا ہوئے۔ قاری محمود علی خاں سے قرآن مجید حفظ کیا۔ یہ ریڈیو سازی کا کام کرتے ہیں۔

قاری احمد میاں صاحب نے بھی قاری محمود علی خاں صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ دینی تعلیم کی تکمیل مدرسہ مسجد فتحپوری میں کی۔ دارالعلوم احمدیہ کراچی سے سند لی اور اسی مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے۔

قاری محمد میاں صاحب ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید مدرسہ تعلیم القرآن محلہ گڑھیا میں قاری محمود علی خاں صاحب سے حفظ کیا۔ فارسی، عربی اور اردو کی تعلیم سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی سے پائی۔ تجوید حضرت العلامہ مفتی محمد مظہر اللہ صاحب امام مسجد فتحپوری سے سیکھی۔ اور انھوں نے سند عطا کی۔ "غریب نواز" ہفتہ وار اخبار ۱۹۶۷ء سے جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔ آپ سنی جمعیۃ العلماء صوبہ دہلی کے جنرل سکریٹری ہیں۔ اچھے قاری ہیں، آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اردو پروگراموں میں اکثر آپ کو نعت خوانی، غزل خوانی اور تلاوت قرآن مجید کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔

لال قلعہ دہلی کے اطراف کے منہدم شدہ محلّے اور بازار

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی کے لال قلعہ کے اطراف میں اور دور پرے فیض بازار، خانم کا بازار، حویلی خان دوراں خاں، چوک سعد اللہ خاں، انگوری بازار، بگوا باڑی، اردو بازار، کوچہ بلاقی بیگم پنجابی کٹرہ تھے جو دہلی کے مشہور محلے تھے۔

راج گھاٹ کی سڑک اور زینت مساجد دریا گنج کے قریب نواب شمس الدین، نواب جھجر اور راجہ کشن گڈھ وغیرہ کی کوٹھیاں تھیں۔ راجہ کشن گڈھ کی کوٹھی میں ۱۸۳۵ء کو دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر فریزر کا قتل ہوا، اس قتل کا الزام نواب شمس الدین اور کریم خاں پر عاید ہوا۔ ان پر مقدمے چلے اور سزا میں پھانسی ملی۔

دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ لال قلعہ کے اطراف اور جامع مسجد کے علاقے کے لوگوں نے بھی حصہ لیا۔ لال قلعہ اور جامع مسجد مجاہدین کا مرکز تھے۔ مجاہدین نے دہلی کی زمین کے ایک ایک چپے کے لئے جنگ لڑی اور جانیں دینے سے دریغ نہیں کیا۔

دہلی اور خاص طور پر جامع مسجد و لال قلعہ کے اطراف کے لوگ انگریزوں کی آنکھوں میں بہت کھٹکتے تھے۔ انگریز ان سے انتقام لینے کے لئے اندھے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے جامع مسجد پر قبضہ کیا۔ اس کو منہدم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایسا نہ کر سکے۔ اللہ نے اپنے گھر کی خود حفاظت کی۔ مگر لال قلعہ کے مذکورہ محلوں اور بازاروں کو منہدم کیا اور ان کے وجود کو مٹایا۔ لال قلعہ کے اطراف میں مذکورہ محلوں کے علاوہ اور کون سے محلے تھے اور ان میں کون حضرات آباد تھے اور ان کی حیثیت کیا تھی، اس پر اس مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

فیض بازار شہر کے شمال کی جانب دہلی دروازے سے لال قلعہ کے نیچے تک تھا۔ یہ بازار ایک ہزار پچاس گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا۔ اس کو شاہ جہاں بادشاہ کی محل اعزاز النساء نے بنوایا تھا جن کا خطاب اکبر آبادی تھا۔ یہ بازار انتہائی دل کش، دلربا، فرحت بخش تھا۔ اس کے ہر دو جانب اونچے اونچے مکانات تھے، درمیان میں نہر بھی تھی، ایک خوبصورت حوض بھی تھا۔ شاندار اور گھنے درخت چھائے ہوئے تھے، جس سے تازگی اور بہار تھی۔ سبزی فروشوں کی دوکانوں سے دائمی شادابی ٹپکتی تھی۔ یہ خوبی شہر میں اور جگہ نہیں تھی۔ اس بازار میں حکیم بو علی خاں کا کمرہ تھا، جس کو نواب دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ نے خرید لیا تھا۔ اس بازار میں پھول کی منڈی بھی تھی۔ گلفروشوں کی دوکانوں سے دماغ معطر رہتا تھا۔ اس کے پاس تھانہ فیض بازار تھا، سنہری مسجد کے عقب میں پگوا باڑی تھی، اس میں پگوا بیگم کی قبر تھی، جو محمد شاہ کی لڑکی تھی۔ یہاں ایک خانہ باغ تھا، اس میں شاہی خاندان کے لوگ رہتے تھے۔ اس بازار کے مشرق کی جانب ایک ڈاک بنگلہ تھا، جس کے پاس اکبر آبادی مسجد تھی۔ یہ مسجد بھی اعزاز النساء نے ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء میں تعمیر کرائی تھی، جس کے متعلق سر سید مرحوم نے "آثار الصنادید" میں لکھا ہے:

"یہ مسجد دل کش، دلربا، فرحت بخش اور روح افزا، سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی تھی اور گرد اس کے مکانات اور حجرے طالب علموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے تھے، ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر مسجد بنائی، اس مسجد کے تین برج، اور سات در ہیں۔ مسجد کی عمارت ۴۳ گز طویل اور سترہ گز عرض میں تھی، ایک چبوترہ تھا، اس پر سرخ رنگ کا کٹہرا لگا ہوا تھا۔ اس کے آگے ایک حوض تھا، جس میں نہر کا پانی آتا تھا۔"[1]

اس مسجد میں جہاں عبادت الٰہی ہوتی تھی وہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس کے ایک کمرے میں شاہ عبد العزیزؒ کے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادر نے پوری عمر گزار دی، اس میں وعظ کے ساتھ درس بھی دیتے تھے۔ حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ جب دہلی آئے تو اسی مسجد میں مقیم ہوئے[1] اور شاہ عبد القادر سے تحصیل علم کیا۔ دور دراز سے جو طلباء تحصیل

[1] آثار الصنادید، باب چوتھا ص ۲۶

علوم دینی کے لئے اس مسجد میں آتے ان کی خدمت بھی آپ کرتے تھے۔ اسی مسجد میں شاہ اسمٰعیل شہید نے بھی شاہ عبدالقادر سے کتب دینی پڑھیں اور اخوند شیر محمد اور مولوی امان علی وغیرہ نے اسی مسجد میں شاہ صاحب سے تعلیم پائی۔

مولوی شیر محمد افغانستان میں پیدا ہوئے ــــ علم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان آئے۔ دہلی میں آکر اسی مسجد اکبر آبادی میں حدیث پڑھی۔ آپ مولانا اسمٰعیل شہید کے ہم سبق تھے، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ حکیم غلام حسن خاں کے مکان میں مقیم ہوئے۔ شیخ غلام علی صاحب مجددی سے بیعت تھے، خلافت کا مرتبہ پایا تھا۔ حج بیت اللہ کے لئے بے چین رہتے۔ ان کی امید بر آئی، روانہ ہوئے تو راستے میں صفر ۱۲۵۷ھ میں فوت ہوئے۔

مولوی امان علی سادات صحیح النسب تھے۔ مولانا عبدالقادر صاحب سے کتب حدیث پڑھیں۔ طبیعت میں استغنا تھا، روزگار کی طرف سے بے پرواہ تھے، رزاق انس وجان کے خزانہ تقدیر سے شب و روز میں جو وظیفہ مل جاتا تھا۔ اس پر قناعت کرتے تھے، طبابت میں مہارت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ سرسید مرحوم ان سے عقیدت رکھتے تھے۔

ان علماء کے علاوہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے معتقد و گردیدہ مجذوب حضرات بھی تھے، چنانچہ دہلی کے مجذوب شاہ عبدالنبی اکبر آبادی مسجد میں اس وقت تک مقیم رہے جب تک شاہ عبدالقادر صاحب زندہ رہے۔ شاہ صاحب جس وقت بیمار ہوئے اور نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی تو شاہ عبدالنبی اپنا بستر کندھے پر ڈال کر روانہ ہوئے لوگوں کو ان کے جانے پر حیرت ہوئی، تو ان کے پاس پہنچے۔ ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"اب قدر دان ہمارا دنیا سے چلا گیا، ہم یہاں رہ کر کیا کریں گے۔"

اس کے بعد آپ نے جامع مسجد دہلی کے ایک حجرے میں زندگی بتائی۔ صاحب کرامت بزرگ تھے۔

مسجد اکبر آبادی کے نزدیک کشمیری کٹرہ تھا، جس میں زیادہ تر کشمیری لوگ رہتے تھے۔ کشمیری کٹرہ اور اکبر آبادی مسجد کا مرزا غالبؔ نے کئی خطوط میں ذکر کیا ہے کہ:

"کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی، سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی، اللہ اللہ
گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں۔ کشمیری کٹرہ گر گیا ہے اور وہ اونچے اونچے در
اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں"[1]

جامع مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے جہاں سرمد شہید اور ہرے بھرے شاہ کے مزار ہیں، وہاں سے لال قلعہ کے راستے کے درمیان تک خاص بازار تھا۔ اس بازار میں تمام قسم کے سودے بیچنے والے بیٹھتے تھے اور خاص طور سے سبزی فروشوں کی بڑی تعداد تھی جن سے ہمہ قسم کی ترکاریاں ملتی تھیں۔ اس بازار سے بادشاہ کی سواری لال قلعہ سے جامع مسجد میں آتی تھی۔ اس میں صبح سے رات گئے تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور دکانیں مال و اسباب سے بھری رہتی تھیں جس میں ہر قسم کا سامان ہوتا تھا۔ اس خاص بازار میں ہرے بھرے شاہ اور سرمد شہید کے مزارات کے قریب ایک گلی "حافظوں کی گلی" کے نام سے مشہور تھی[2] جس میں حافظ حمید الدین صاحب کا خاندان شاہ جہاں کے زمانے سے رہتا تھا اور چند گھر اور لوگوں کے تھے۔

حافظ حمید الدین صاحب کے خاندان کا تعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تھا۔ ان کے بزرگ حجاز مقدس کے رہنے والے تھے اور قبیلہ قریش سے ان کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ تلاش معاش کے لئے جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے، چونکہ فن سپہ گری کے ماہر تھے، فوج شاہی میں بھرتی ہو گئے اور رفتہ رفتہ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہونے لگے۔ چند پشتوں کے بعد سپہ گری کا پیشہ چھوڑ کر اہل قلم کے زمرے سے منسلک ہو گئے اور علوم مروجہ میں لیاقت پیدا کر کے شاہانِ وقت کے ہاں رسائی پیدا کی۔ ان کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ عالمگیر کے عہد میں مخالفوں نے ان کے نسب پر اعتراض کیا، جس کی وجہ سے اس قضیے نے طول پکڑا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شریف مکہ سے معلوم کرایا گیا، تو اس نے ان کے قریشی ہونے کی تصدیق کی۔

[1] اردوئے معلیٰ ص ۲۹۳ [2] رجسٹرڈ قلمی مرتبہ حافظ عبد القادر۔

بہادر شاہ ثانی جو سلطنت مغلیہ کے چراغ سحری تھے، ان کے دور تک اس خاندان کے لوگوں کا قلعے سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا۔ گرچہ باقاعدہ نوکر نہیں تھے، مگر تھوڑی بہت تنخواہ گھر بیٹھے بطور وظیفہ کے پاتے تھے۔ حافظ حمید الدین صاحب کے دادا حافظ شریف عرف کامل تھے، جن کے صاحبزادے حافظ نصیر الدین تھے جن کا شمار دہلی کے مشہور حافظوں اور قاریوں میں تھا۔ حافظ نصیر الدین کے شہزادوں اور بادشاہ سے مراسم تھے۔ حافظ صاحب گرچہ متمول نہیں تھے مگر خوش حال تھے، کبھی روزگار کی تلاش کے لئے دہلی سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ان کے خاندان کے بزرگ حافظ علی خاں، حافظ شیخ بندہ علی، حافظ قادر بخش، حافظ قمر الدین اور پیر الٰہی بخش بھی اسی حافظوں کی گلی میں رہتے تھے۔

شیخ بندہ علی صاحب دہلی سے جوانی میں اندور جاکر فوج میں بھرتی ہوئے اور چند روز میں میجری کے عہدے پر مامور ہوئے، خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی گزارنے لگے، پھر ان کے لڑکے شیخ بدر الدین بھی وہاں جاکر سالار ہوگئے۔ اور ان کے اکثر عزیز و اقارب شیخ احمد حسین، حیدر علی، امداد علی وہیں جاکر فوج میں بھرتی ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کسی وجہ سے استعفیٰ دے کر معہ کل عزیز و اقارب وہاں سے چلے آئے اور کیرانہ میں سکونت اختیار کرلی۔

خاص بازار کے پاس سوداگروں کا محلہ تھا جو خانم کا بازار کہلاتا تھا۔ حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی تکمیل علوم کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور حضرت شیخ یحییٰ مدنی سے بیعت کرنے کے بعد دہلی واپس ہوئے اور بازار خانم میں اپنا مسکن بنایا۔ فوت ہونے کے بعد اسی بازار میں آپ کا مزار بنا۔ خانم کے بازار کے ایک سرے پر آپ کا مزار تھا، دوسرے سرے پر کھاری کنواں تھا۔ جہاں اب وکٹوریہ ہسپتال ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شیخ صاحب کا مزار اجڑ گیا خانم کے بازار میں ایک موضع جیسی آبادی تھی۔ بقول مرزا غالب:

> "ان کی اولاد کے تمام لوگ اسی موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں، ان کے پاس شیخ کا

کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب یہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں، کیا کروں، کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہوسکے گا" [1]

اسی بازار میں کریم اللہ شاہ صاحب کی مسجد تھی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران ۱۴ر جون ۱۸۵۷ء کو نواب محبوب علی خاں فوت ہوئے، ان کے جنازے کے ساتھ ہاتھی اور فوج بھی تھی۔ ان کو اسی مسجد کریم اللہ شاہ میں تزک و احتشام کے ساتھ دفن کیا گیا، جنازے کے ساتھ تمام عمائدین شریک تھے۔

اسی خانم بازار میں حافظ اشرف خلف امام الدین رہتے تھے۔ علوم دینیہ سے واقف، حافظ قرآن نوجوان تھے، کافی ذہین تھے، خط نسخ بھی ان کا اچھا تھا۔ ایک تفسیر قرآن مجید انھوں نے منظوم لکھی تھی لیکن مکمل نہ ہوسکی، ناتمام چھوڑی۔ فارسی میں صوفیانہ شعر کہنے کے ساتھ خیال، پٹہ، ترانہ اور ٹھمری بھی کہتے تھے۔ علم موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ایک ساز ایجاد کیا تھا جس کا نام "سندر بین" رکھا تھا۔ اردو کلام کی اصلاح حکیم قدرت اللہ قاسم سے لیتے تھے۔ خانم بازار والوں کو ان کے اشعار بہت یاد تھے۔ صاحب طبقات الشعراء ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بازاریوں سے محبت بہت رکھتا تھا، ہولی میں بھی میں نے اس کے شعر بازاریوں کو پڑھتے ہوئے پایا ہے۔ خیال اور پٹہ اور ترانہ، ٹھمری بہت بناتا تھا۔ اس کو بیس برس کا عرصہ ہوا کہ وفات پائی۔"

اسی خانم کے بازار میں بڑے تجربے کار کاریگر بھی رہتے تھے، جن کو اسلحہ بنانے کا بھی تجربہ تھا۔ جب بہادر شاہ ظفر سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران ۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو میر حیدر حسین داروغہ توپ خانہ نے عرض کیا کہ اسلحہ خانہ میں آلات حرب بہت کم ہیں۔ خانم کے بازار والوں نے اس کمی کو پورا کرنے کی ذمہ داری خود لی اور دستکاری میں اپنے کمال کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ توپ کا گولہ اور بندوق کی ٹوپی اور تفنگ کو بالکل انگریزوں جیسا بنا دیا، اور ٹوپیوں پر

[1] اردوئے معلیٰ ص ۱۸۳

دہلی کا نام کھدوایا۔[۱] بادشاہ نے ان میں سے ہر ایک کے لئے وظیفہ مقرر کیا۔[۲]

اسی بازار میں حافظ عبدالحکیم صاحب دہلوی تاجر پاپوش مالک جنرل بوٹ ہاؤس کے جدامجد قاری احمد صاحب بھی رہتے تھے، جن کے متعلق سرسید نے تحریر کیا:

"ایسے عالم علم قرأت ہیں کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا اور زبان اس کی اوصاف سے قاصر ہے، دین داری اور اتباع شریعت اور اکل حلال اور اکتساب خیرات اور اجتناب از نواہی سب ایک ذات ستودہ صفات میں جمع ہیں۔ اس جامعیت کے ساتھ افراد بشر سے کم نظر میں گذرا ہے۔"

مسٹر اینڈریوز نے منشی ذکاء اللہ پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی زبانی نقل کیا ہے

"میرا خاندانی مکان قلعہ اور جامع مسجد کے درمیانی حصے میں تھا۔ فتح دہلی کے بعد ایک دن فوج کے افسر اور سپاہی پہنچے۔ بچے کھچے لوگوں کو حکم دیا کہ فوراً گھر خالی کردو۔ یہ تمام محلہ منہدم کر دیا جائے گا۔ ایک گھنٹے کے اندر صدیوں کے بسے ہوئے گھر باہر نکلنے پر مجبور ہوئے اور تمام محلے بارود سے اُڑا دئے گئے۔ میدان کا یہ حصہ سڑک سے کئی فٹ بلند ہو گیا تھا۔ یہ بلندی اس لئے ہوئی تھی کہ مکانوں کا ملبہ پھیلا کر، بچھا دیا گیا۔"

اس بازار کے متصل محلہ خان دوراں خاں تھا، بلکہ یہ ایک قصبہ تھا جس میں ہزاروں آدمی رہتے تھے۔ اس حویلی یا محلے میں حافظ حمید الدین صاحب کے سسرال کے لوگ آباد تھے۔ حافظ حمید الدین صاحب کے صاحبزادے حافظ عبدالقادر صاحب تھے، جن کے حقیقی نانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب عرف حافظ جھمو بھی رہتے تھے۔ یہ حافظ صاحب آغاز جوانی میں ریاست ٹونک چلے گئے تھے، اس وقت نواب امیر خاں وہاں کے رئیس تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب کی قابلیت و لیاقت کی قدردانی کر کے اپنے صاحبزادے نواب وزیر الدین کا اتالیق مقرر کیا۔ جب نواب امیر خاں فوت ہو گئے اور نواب وزیر الدولہ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے تو

[۱] قیصر التواریخ ص ۴۴۶ [۲] روزنامچہ جیون لال

انھوں نے حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو بڑے عہدے پر مامور کیا۔ ان کی جائداد دہلی کے مختلف مقامات پر اتنی تھی کہ ان کا پورا خاندان اور پیڑیاں بھی خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی تھیں۔ ان کے سکونتی مکان یعنی محل سرائے، دیوان خانہ، فیل خانہ اور اصطبل قابل دید تھے[۱]

اسی محلے میں حافظ محمد بخش عرف ممو اور حافظ احمد بخش حافظ عبدالرحمٰن کے حقیقی بھائی بھی رہتے تھے، جو قلعہ کی بدولت آسودہ حال اور متمول تھے اور خاص طور پر حافظ ممو کا دہلی کے نامی گرامی لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ بے حد سخی اور با مروت تھے۔ مولانا محمد حیات جو دہلی کے عابد، زاہد، صاحب نسبت عالم تھے، سے بیعت تھے۔ جب مولانا محمد حیات فوت ہوئے تو ان کا مزار حضرت نظام الدین اولیاء میں کافی روپیہ خرچ کر کے بنوایا اور تاحیات ان کا عرس ہر سال بڑی دھوم دھام سے کرتے رہے۔ صاحبِ جائداد تھے۔ زنانہ و مردانہ مکانوں کا سلسلہ اس طرح بندھا ہوا تھا کہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں اور دوسرے مکان سے تیسرے مکان میں جا سکتے تھے۔ زنانہ مکانوں کا سلسلہ ایک طرف مشرق کی جانب علیحدہ تھا اور مردانہ مکانوں کا سلسلہ اپنے زنانہ مکانوں کے مقابل جانب مغرب دوسری طرف علیحدہ تھا۔ اس مکان کے عقب میں مشرق کی جانب بادشاہی فیل خانہ اور قصاب واڑہ تھا۔

یہی حافظ ممو ہیں جن کے ایک دل چسپ مقدمے کا ذکر مرزا غالبؔ نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ یہ حافظ صاحب بھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی شرکت کے الزام میں گرفتار ہوئے، ان کی جائداد بھی ضبط ہوئی، جب یہ بے گناہ ثابت ہو کر رہا ہوئے، تو انھوں نے اپنی جائداد کو واگذار کرنے کی درخواست کی، تو اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ مرزا غالب لکھتے ہیں[۲]:

> "ایک لطیفہ پرسوں خوب ہوا، حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں، قبض و تصرف تو ان کا ثابت ہو چکا ہے، صرف حکم کی دیر، پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا کہ حافظ محمد بخش کون ہے۔ عرض کیا میں! پھر پوچھا حافظ ممو

۱؎ رجسٹرڈ قلمی مرتبہ حافظ عبدالقادر۔ ۲؎ اردوئے معلیٰ ص ۲۵۲

کون۔ عرض کیا میں۔ اصل میرا نام محمد بخش ہے، ممو مشہور ہوں۔ فرمایا کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم اور حافظ ممو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخل دفتر ہوئی، ممو اپنے گھر چلے آئے۔"

حافظ محمد بخش کے صاحبزادے حافظ محمد حسین بسمل تھے جو اسی حویلی خان دوراں خاں میں رہتے تھے، ان کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی مؤلف گلستان سخن کے شاگرد تھے۔ بہادر شاہ ثانی کے عہد میں نشو و نما پائی تھی۔ صاحب گلستان سخن ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صاحب طبع سلیم و ذہن قویم، وجاہت صوری اور حسن معنوی سے بہرہ ور، جمال ظاہری اور کمال باطنی سے کامیاب، علوم رسمی سے بقدر ضرورت متمتع۔ اشعار میں رسائی فکر اور خوش کلامی پائی جاتی ہے ؎

بار گران عشق فلک سے نہ اٹھ سکا — کیا جانے مرے دل نے یہ کیوں کر اٹھا لیا

پیر مغاں نے بسمل میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

تم سے دل کی ناز برداری نہ ہوگی دل نہ لو

جان من یہ دل بڑے نازوں کا ہے پالا ہوا

حافظ عبدالرحمٰن عرف حافظ جمو کے صاحبزادے اور حافظ محمد بخش عرف حافظ ممو کے بھتیجے حافظ احمد حسین راغب بھی شاعر تھے۔ ان کے بارے میں بھی صاحب گلستان سخن نے یہ رائے دی ہے:

"تیزی فکر اور جودت طبع کے ساتھ پسندیدگی اطوار اور رگزیدگی کردار کو فراہم رکھتا ہے ؎

یارب اسے تو چین دے مجھ کو نہ دے نہ دے

جلتا ہے مرے حال پہ دل غم گسار کا

ترغیب خلد اور مجھے راغب خدا سے ڈر

کیا کم ہے لطف خلد کچھ کوچۂ یار کا

جامع مسجد کے گوشہ جنوب و مغرب میں بھس والوں کا محلہ تھا، جس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس محلے کے باہر سڑک کے کنارے پر بھس والوں کی دوکانیں تھیں۔ اس محلے میں چند غیر بھس والے

بھی رہتے تھے۔ چنانچہ حافظ عبدالرحیم اور حافظ عبدالرحمن دونوں حقیقی بھائی اسی محلے میں رہتے تھے۔ عبدالرحیم صاحب حافظ عبدالقادر کے حقیقی خالو تھے۔ یہ دونوں بھائی بڑے ذہین و فہیم تھے۔ قلعہ کی بدولت انھوں نے بھی بہت کمایا اور جائیداد پیدا کی۔ رحیم گنج جو مختار خاں کی حویلی میں ہے حافظ عبدالرحیم کا بنایا ہوا تھا۔ اس محلے کے برابر جامع مسجد کے گوشہ جنوب و مشرق میں ایک محلہ "شیر کے پنجرے" کے نام سے مشہور تھا۔[۵۱] پہلے یہ بادشاہی شیر خانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اس اصطبل میں دو شیر بند رہتے تھے۔ اس محلے کے برابر خاص بازار کی سڑک کے کنارے "خان دوراں خاں" کی حویلی کے پاس ایک محلہ فولاد پورہ تھا، جس میں شیخ ہدایت اللہ حافظ حمیدالدین صاحبان کے خاندان کے افراد رہتے تھے۔ جو ۱۸۵۷ء سے قبل انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔ انگریزوں سے نفرت ہوئی تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر چلے آئے۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے تھے اور محلہ ٹوکری والان میں سکونت رکھتے تھے۔ حافظ حمیدالدین کے خاندان کے لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔ رئیسہ بیگم اہلیہ سعید خاں صاحب مالک اکاڈمی پریس پہاڑی املی اور ان کے بھائی عبدالستار ملازم میٹرو پولیٹن کونسل کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔

چوک سعداللہ خاں شاہ جہاں بادشاہ کے وزیر سعداللہ خاں کے نام پر تھا۔ یہ چوک نہایت نفیس اور پر رونق تھا۔ یہاں بڑی چہل پہل تھی۔ اس کے حدود میں ایک طرف تو قلعے کا دہلی دروازہ اور فوجی باغ تھا، دوسری طرف سنہری مسجد تھی۔

اردو بازار لال قلعہ کے صدر دروازے چاندنی چوک سے دریبہ کے خونی دروازے تک تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں اس حصے میں لشکری لوگ رہتے تھے۔ اس بازار کے کسی حصے میں ایک شاعرہ نجیباً رہتی تھی، جس سے رند مشرب لوگ دل بہلاتے تھے۔ یہ اردو بازار کی رونق تھی، جس کی گفتگو ضلع جگت بلکہ پھکڑ آمیز تھی۔ اس نے ایک غزل پان کے تلازمہ پر لکھی تھی جس کا ایک شعر لوگوں کی زبان پر رہ گیا[۵۲]

[۵۱] رہنمائے قلمی مرتبہ حافظ عبدالقادر دہلوی [۵۲] تذکرہ مستورات نادری ص ۱۴۹

ٹک دیکھو بعد مرگ مرے انتظار کو
نرگس نے چھا لیا ہے ہمارے مزار کو

بقول مرزا غالب:

"کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک ایک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ اور حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں۔"

جن عمارتوں کا ذکر مرزا غالب نے کیا ہے، ان میں کے اکثر محلے اور عمارتیں ایسی ہیں جن سے اب دہلی والے واقف نہیں۔ بقول خواجہ حسن نظامی صاحب: "میں بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں تھیں۔"

پنجابی کٹرہ سوداگروں کا مسکن تھا، جس میں زیادہ تر پنجابی اترا کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ پنجابی کٹرہ مشہور ہو گیا۔ اس کٹرے میں ایک خوب صورت مسجد سنگ سرخ کی تھی، اس میں ایک حوض بھی تھا۔ اس مسجد کو نواب اورنگ آبادی بیگم اہلیہ اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کیا تھا۔ جس میں مولوی عبدالخالق صاحب اور علامہ محمد نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے، اور دن رات قال اللہ وقال الرسول کا ذکر رہتا تھا۔ اس مسجد کے صحن میں لوگوں نے مکانات بنا لئے تھے ـــ اس مسجد کا نقشہ سرسید مرحوم نے آثار الصنادید میں دیا ہے۔ یہ کٹرہ اور مسجد اس جگہ تھی جہاں دہلی کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہ دونوں ریلوے میں آ گئے۔

منشی کریم الدین شریرؔ دہلی کے رہنے والے تھے، پنجابی کٹرہ میں مقیم تھے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ صاحب خم خانۂ جاوید کو منشی شریرؔ کا نام اور جائے رہائش معلوم نہ ہو سکی۔ معلوم ہوتا ہے "گلدستۂ نازنیناں" سے ان کے متعلق معلومات حاصل ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"شریرؔ آشفتہ خاطر اور عاشق مزاج تھا اور شاعری کے سوا بھاشا زبان پر بھی عبور رکھتا تھا۔ طبیعت میں سوز و گداز، زبان میں تاثیر تھی۔ جوجوگی نامہ خمسہ کی شکل میں عوام الناس اور کتب فروش نظیر اکبر آبادی کا خمسہ سمجھ کر چھاپتے ہیں، وہ ان کا نہیں بلکہ گلدستہ نازنینان جو ۱۲۶۱ھ میں چھپا تھا۔ اس کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خمسہ شریک کا ہے، جس کا پہلا بند یہ ہے[1]

یاد اس شوخ کی کیا کیا ستم لاتی ہے
جان تن میں مرے گھبراتی ہے
آہ کرتا ہوں تو بجلی سی نکل آتی ہے
جب میں روتا ہوں تو آنکھوں سے برس جاتی ہے
کبھی ساون کی جھڑی کبھی بھادوں کی بھرن

تذکرہ شمیم سخن میں ان کا یہ شعر درج ہے

ہم کو خالق نے کیا ہے بے سروساماں پیدا
نہ تو دامن ہے میسر نہ گریباں پیدا

دہلی دروازہ کے باہر تھوڑے فاصلے پر کابلی دروازہ تھا۔ یہ دروازہ غالباً ہمایونی عہد میں پرانے قلعہ کے ساتھ بنا تھا۔ جو عظمت و شان میں معقول تھا۔ سنگ خارہ کا بنا ہوا تھا، لیکن روکار سنگ سرخ کی تھی۔ اس دروازے پر دالان اور حجرے اور نشیمن بنے ہوئے تھے، جس میں جیل خانہ کے سپاہی رہنے لگے تھے۔ اس کابلی دروازے کے سامنے دہلی کا جیل خانہ تھا۔ اور کابلی دروازے کے اردگرد آبادی تھی، جس میں محمد رفیع سوداؔ، استاد ذوقؔ، حافظ غلام رسول شوقؔ اور مرزا کاظم حسین بیقرارؔ وغیرہ رہتے تھے۔ حافظ غلام رسول شوقؔ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ اکبر ثانی کے زمانے میں کابلی دروازہ کی مسجد کے امام تھے۔ محلے کے اکثر لڑکے ان کے پاس پڑھنے آتے تھے، مشاق اور باکمال شاعر تھے۔ جب شاہ نصیرؔ کے رنگ سے علیحدہ ہو کر کہتے تھے تو زبان میں سادگی اور سلاست آجاتی تھی۔ نکتہ سنجی اور معنی طرازی میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ آپ کو روزمرہ کے محاورات کو انتخاب کرنے کا خداداد ملکہ حاصل تھا اور ان کے استعمال کرنے کا عمدہ سلیقہ رکھتے تھے۔ استاد ذوقؔ کو یہ بات انہی کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئی۔ ان کے

[1] خم خانہ جاوید جلد چہارم ص ۵۲۶

کلام میں وہ تمام خصوصیتیں تھیں جو اس زمانے کے شاعر کے لئے مایۂ ناز ہو سکتی تھیں۔ ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ درد اور سوز پایا جاتا ہے۔ خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے ابتدا میں انہی سے اصلاح لی۔ محلے کے شوقین نوجوان ان سے غزلیں لکھوایا کرتے تھے۔ ان کی محفل میں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ چنانچہ استاد ذوقؔ کہا کرتے تھے۔ مجھے وہاں سنتے سنتے بہت سے شعر یاد ہو گئے۔ چنانچہ صاحب گلستانِ سخن ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عہدِ طفولیت سے اب تک باوجودیکہ ان کی عمر ستر برس کے قریب پہنچی، مشقِ سخن میں مصروف، ہر مشکل زمینوں میں پیشتر گامزن اور قوافی تنگ میں اکثر گرم سخن تھے۔ اشعار عاشقانہ و دل چسپ تشبیہہ و تمثیل ایسی کہ مذاقِ شاعری میں گوارا ہو۔ ۱۲۷۲ھ میں ۷۰ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔"

رونگٹے پاؤں میں چبھتے ہیں نزاکت کے سبب
فرشِ مخمل پہ وہ گلرو جو قدم رکھتے ہیں

لکھا ہوا تھا یہ اس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں رہا کوئی ... ایسا زمیں کے پردے پر

میر کاظم حسین بیقرارؔ ہمشیرزادہ سید رضا خاں مختار شاہ عالم ثانی تھے۔ استاد ذوقؔ کے ہم سن اور ہم سبق تھے۔ پہلے انھوں نے حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لی۔ بقول مولانا آزادؔ:

"ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی بادِ باراں، انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لئے اچھے موقعے ملتے تھے۔ استاد ذوقؔ اور یہ اتحادِ طبعی کی وجہ سے اکثر ساتھ رہتے تھے، اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔"

بیقرارؔ کی وجہ سے استاد ذوقؔ شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ ایک روز مرزا کاظم حسین نے استاد ذوقؔ کو اپنی غزل سنائی۔ استاد ذوقؔ نے دریافت کیا یہ غزل تم نے کب کہی، بہت عمدہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے شاہ نصیرؔ سے تلمذ حاصل کیا ہے، ان کو یہ غزل بغرض اصلاح پیش کی تھی۔ استاد ذوقؔ کو بھی خواہش پیدا ہوئی اور ان کے ساتھ جا کر شاہ نصیرؔ کے شاگرد بنے۔

انہی کاظم حسین کے توسّل سے استاد ذوقؔ کی لال قلعہ میں آمد و رفت ہوئی۔ لال قلعہ میں جانے کے لئے کسی امیر کی ضمانت دینا ضروری تھا، اس ضمانت کے بغیر لال قلعہ میں کوئی شخص جا نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے استاد ذوقؔ کی ضمانت دی۔ جس کے بعد استاد ذوقؔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں جانے لگے۔ بہادر شاہ ظفرؔ ولی عہدی کے زمانے میں شاہ نصیرؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ جب شاہ نصیرؔ دکن چلے گئے تو بہادر شاہ ظفرؔ میر کاظم بیقرارؔ سے اصلاح لینے لگے۔ اسی زمانے میں جان الفنسٹن شکارپور سندھ کی سرحدوں سے لے کر کابل تک عہد نامے لکھنے پر مامور ہوئے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت تھی۔ میر کاظم حسین قابل و لائق ہونے کے ساتھ خاندانی آدمی بھی تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفرؔ سے جان الفنسٹن کے نام سفارشی چٹھی لکھوائی جو منظور ہوئی، اور یہ میر منشی بن کر اُن کے ساتھ چلے گئے۔ میر کاظم حسین بیقرارؔ ذہین اور موزوں طبع تھے ؎

جس طرف پھرتا رہا وہ ماہ رو رشکِ قمر
جوں دلِ خورشید دل اپنا مقابل ہو گیا
رخ سے گر زلفیں انھیں تو چھوڑ دی اُس نے نقاب
اک نیا پردہ ہمارے اُس کے حائل ہو گیا

محمد عارف آگرہ کے رہنے والے تھے، عارفؔ تخلص تھا۔ دہلی میں دہلی دروازہ کے متصل رفوگری کی دکان تھی۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ، اور میر تقی میرؔ ہم عصر تھے۔ تذکرہ میر حسن کی ترتیب کے وقت ان کی ستّر سال کی عمر تھی۔ ان کے ہم مشرب شاعر ان کو استاد کہتے تھے۔ شعر کم کہتے تھے، لیکن خوب کہتے تھے ؎

جنوں کی قطع اب پوشاک کیجئے — بہار آئی گریباں چاک کیجئے
یا الٰہی بلبل و گل میں رہے دائم ملاپ — ہے قیامت آشنا ہو آشنا کا چھوٹنا

دار البقا اور دار الشفا یہ دونوں عمارتیں جامع مسجد کے ساتھ بنیں تھیں۔ دار الشفا جامع مسجد کے شمال میں تھا اور دار البقا جامع مسجد کے جنوبی دروازے کی طرف تھا، جہاں اب سنگھاڑہ ہے۔ اس میں ایک مزار اور ایک کنواں قدیمی ہے، اس کے پاس ڈاک خانہ جامع مسجد اور

رسالہ "آستانہ" کا دفتر ہے۔ یہ دونوں عمارتیں جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے منہدم کر دیں اور میدان بنا دیا۔

دارالبقا میں قدیم زمانے سے طلباء رہتے تھے اور کتب معقول و منقول پڑھا کرتے تھے۔ دُور دراز سے طلباء آتے تھے اور اہلِ علم کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ مدرسہ خراب و خستہ ہو گیا تھا۔ مولوی مفتی صدرالدین صاحب کو اللہ نے ہمت و توفیق دی، انھوں نے زرِ کثیر خرچ کر کے اس کو از سرِ نو تعمیر کرایا، جو حجرے ٹوٹ گئے تھے، ان کو شاہ جہانی طرز پر بنوایا، طلباء کے کپڑوں اور کھانے کا بھی انتظام کیا۔ تعلیم دلانے کے لئے حاجی مولوی محمد صاحب اور مولوی سرفراز مقرر کئے۔ حاجی محمد صاحب جون پور کے رہنے والے تھے، حج کرنے کے بعد دہلی آئے اور مولانا اسحاق صاحب سے کتبِ حدیث پڑھیں۔ اگرچہ وہ دوسرے فنون سے بھی واقف تھے، لیکن فنِ حدیث میں ان کو پوری قوت حاصل تھی، انتہائی نیک سیرت اور متقی عالم تھے۔

جناب مولانا مُلا سرفراز صاحب کتب معقول و منقول، حکمت و ہندسہ اور ہیئت پڑھاتے تھے۔ ان علوم میں ان کو کمال حاصل تھا —— انھوں نے کتبِ حدیث مولوی صدرالدین صاحب سے پڑھی تھیں۔

مرزا غالب نے جاں نثار خاں کے چھتے کا ڈھانا، خان چند کے کوچے کا سڑک بننا، بلاقی بیگم کے کوچے کا مسمار ہونا، جامع مسجد کے گرد ستر بہتر گز کا میدان نکلنے کا ماتم کیا ہے، بلاقی بیگم کا کوچہ کیوں مسمار ہوا، اس لئے کہ یہ کوچہ مجاہدین کا مرکز تھا۔ مرزا غیاث الدین شرر کوچہ بلاقی بیگم کے قریب ایک باغیچے میں رہتے تھے، جن کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی شرکت کی پاداش میں انگریزوں نے پھانسی پر چڑھایا تھا۔

مرزا غیاث الدین دہلی کے رہنے والے تھے، ان کے والد مرزا قمرالدین شید آتھے اور دادا شاہ عالم بادشاہ تھے، ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ گانے، بجانے، راگ، ناچ دیکھنے کا ان کو بہت شوق تھا، بٹیروں اور کبوتروں کے پالنے کا بھی شوق تھا۔ قلعہ معلّیٰ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ اپنے معاصرین میں خوش گلو مانے جاتے تھے، نہایت باوضع تھے، صاحب گلستانِ سخن ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"نوجوان، خوش طبع، ظریف مزاج، جامۂ اہلیت اس صاحب مروت کی قامت پر قطع ہوا ہے، گاہ گاہ فکر شعر کرتا ہے۔"

جب ان کو پھانسی ملی، اس وقت ان کی عمر ۴۵ برس کی تھی ؎

ہماری آہِ رسا، لامکاں پہ جا ٹھہری　　نہ دم لیا، نہ کہیں راہ میں ذرا ٹھہری

پھرا نہ جیتا ہوا، کوئے یار سے کوئی

گلی صنم کی عزیزو! یہ کربلا ٹھہری

دہلی کالج کے چند قدیم ترین اساتذہ

دہلی کالج کے ابتدائی زمانے کے اساتذہ کے نام و حالات بہت کم ملتے ہیں، اگر ملتے بھی ہیں تو بہت مختصر سے۔ جن اساتذہ کے حالاتِ زندگی دستیاب ہوئے ہیں وہ اس مضمون میں تحریر کئے گئے ہیں:

(۱) مرزا احمد کے والد ماجد مرزا محمد اسحاق تھے، جو برلاس میں سنہ ۱۰۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں ہرات کے سپہ سالار مقرر ہوئے اور نادر شاہ کی جنگ ہرات میں فوت ہوئے۔

مرزا احمد محدث علوم و فنون عربیہ و احادیث و تفسیر کی تحصیل کے بعد سنہ ۱۱۴۰ھ اور سنہ ۱۱۵۰ھ کے درمیان دہلی آئے۔ محمد شاہ بادشاہ نے آپ کی قابلیت و لیاقت کی وجہ سے دہلی کالج کا مدرس اعلیٰ مقرر کیا۔ ان کا انتقال دہلی میں سنہ ۱۱۶۷ھ میں ہوا۔ آپ نے برلاس خاندان کے امراء شاہی میں شادی کی، ان سے مرزا معظم، مرزا عظیم اور مرزا اسلم پیدا ہوئے۔ مرزا معظم عین جوانی میں فوت ہوئے۔ مرزا عظیم والد کی زندگی میں دکن گئے اور لاپتہ ہو گئے۔ مرزا محمد اسلم دہلی میں والد کے پاس رہے۔ دہلی سے بنگال چلے گئے اور نواب عالی جاہ قاسم علی خاں والئ بنگال کے دربار میں سپہ سالار مقرر ہوئے، کچھ دنوں کے لئے دہلی آگئے تھے تو یہاں سے معہ اہل و عیال مراد آباد چلے گئے، مراد آباد سے بنگال گئے تو نواب قاسم علی خاں کی سرکار ختم ہو گئی تھی۔ بنگال سے بریلی پہنچے اور بیماری کی حالت میں مراد آباد آگئے اور وہیں سنہ ۱۱۷۰ھ میں انتقال ہوا۔ انھوں نے دہلی کے قیام کے زمانے میں مرزا محمد امین کی صاحبزادی سے شادی کی جو درباری امراء میں سے تھے۔ ان سے مرزا محمد اکرم آشنا ہوئے۔ متین و حلیم و ظریف تھے۔ سات سال کی عمر میں ان کے والد فوت ہوئے —— والدہ کے ہمراہ سنہ ۱۱۷۰ھ میں اہلیہ محمد مقیم جو آپ کی خالہ تھیں، ان کے

ساتھ رامپور گئے۔ مولوی مقیم صاحب نواب سید محمد فیض اللہ خاں صاحب کے لڑکوں کے استاد تھے، اور آپ ریاست کی طرف سے سفیر کی حیثیت سے گورنر ہند کے پاس بھیجے جاتے تھے۔

مرزا مولوی محمد اکرم نے تحصیل علم کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۱۸۹ھ کو دختر مرزا غلام مصطفیٰ بیگ سکندر محلہ مغل پورہ مراد آباد سے شادی کی۔ عمر کا زیادہ حصہ صاحبزادہ محمد نظام علی خاں خلف نواب سید محمد فیض اللہ کی مصاحبی میں گذارا[1]۔ علما کی صحبت میں رہتے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ ۱۲۳۹ھ کو رامپور میں پچھتر برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ کلام میں لطافت ہے[2]؎

آئینہ اس کے ہاتھ سے اک بار گر پڑا — آنکھوں کی اپنی جب اسے ستی نظر پڑی

آشنا کو نہ اٹھا بزم سے اپنی ظالم — ایسے ملنے کے نہیں ناز اٹھانے والے

(۲) مولوی سبحان بخش دہلی کالج کے عربی کے تیسرے مدرس تھے، انھوں نے عرصے تک مدرسی کی۔ بہت ذکی فہیم و عقیل عالم تھے۔ علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ تذکرہ مفسرین، تذکرہ حکما، اور محاورات ہندان کی تالیف ہے۔ مؤخر الذکر کتاب ان کی بہت مشہور ہوئی۔ انھوں نے حسب ذیل ترجمے بھی کئے ہیں:

تاریخ ابن خلکان کا ترجمہ وفیات اعیان ـــ تزک تیموریہ۔

(۳) مولوی حسن علی خاں فارسی کے مدرس دوم تھے۔ خلیق و فہیم، ذکی، ظریف اور ہوشیار آدمی تھے۔ قانون مال، گلستان، الف لیلہ (منتخب) کا ترجمہ کیا۔ دہلی کالج کے پرنسپل کی فرمایش پر کرہ ارضی کا بھی ترجمہ کیا۔ ان کی تقریباً تمام کتابیں دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی نے طبع کرائیں۔ ۱۸۴۷ء میں ان کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ تذکرہ نادری میں مولوی حسن علی خاں صاحب کا ذکر منشی درگا پرشاد صاحب نے ان الفاظ سے کیا ہے[3]:

"دہلی والوں میں سے نواب حسن علی خاں صاحب مدرس دوم فارسی اولہٰ دہلی کالج مترجم گلستان مرحوم و مغفور اس لہجہ سے مترنم ہیں۔

[1] تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۶۹ [2] انتخاب یادگار ص ۶ [3] تذکرہ نادری ص ۵۲

شعر سعدی ؎

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت   رفت و منزل بدیگرے پرداخت

ترجمہ ؎

جو کوئی آیا محل بنایا   آپ گیا اور اُور بسایا "

(۴) رام کشن داس کشمیری دہلی کے قدیم باشندے تھے، انگریزی میں پوری قدرت حاصل ہونے کے باوجود فارسی سے بھی لگاؤ تھا اور عمدہ فارسی جانتے تھے۔ اردو بھی ان کی بہت صاف وشستہ تھی۔ مولوی کریم الدین طبقات الشعراء میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

" بہت تیز فہم، اور دانا اور ہوشیار اور ذکی آدمی ہے، بہت ظریف اور متین ہے، اس کے ترجموں کی خوبی اور اچھے ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ "

ان کی عمر ۱۸۴۷ء میں تقریباً ۳۵ برس کی تھی۔ دہلی کالج کے مدرس تھے جب ذیل کتابوں کا ترجمہ انھوں نے کیا:

(۱) اصول قوانین دیوانی وفوجداری (۲) اصول قانون کلکٹری (۳) اصول قوانین گورنمنٹ (۴) چوتھا باب سیر الاسلام (۵) اصول دوم شاستر مؤلفہ میکناٹن (۶) قواعد صرف ونحو انگریزی کا ڈاکٹر اسپرنگر کی مدد سے اردو میں ترجمہ کیا (۷) رسالہ طب (۸) فن زراعت پر "مزید الاموال باصلاح الاموال" کے نام سے ان کی تصنیف ہے۔

(۵) ماسٹر نور محمد تحتانی جماعتوں کے مدرس تھے۔ اچھی استعداد کے مالک تھے، چھوٹے بچوں کو پڑھاتے تھے، تذکرہ طبقات الشعراء مؤلفہ مولوی کریم الدین کے ترتیب وتالیف کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ تاریخ بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ انھوں نے کیا، تاریخ مغلیہ کے ترجمے میں ماسٹر حسینی شریک تھے، سیر الاسلام میں بھی ان کا کچھ ترجمہ کیا ہوا ہے۔

(۶) ماسٹر حسینی بھی بچوں کو تعلیم دیتے تھے، بہت ہوشیار و سمجھدار و متین آدمی تھے، ان کو کبوتروں اور گدھوں کے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ترجمہ کرنے میں کمال رکھتے تھے، تاریخ ایران مؤلفہ کوندر صاحب، شرع شریف مؤلفہ میگناٹن صاحب کا ترجمہ مولوی سید محمد صاحب کی اعانت سے، قانون محمدی فوجداری مؤلفہ میگناٹن، قوانین محمدی وراثت مؤلفہ میگناٹن،

خلاصہ قانونِ دیوانی مؤلفہ پرنسپ اور خلاصہ قانونِ فوجداری مؤلفہ سکیپ وڈ کا ترجمہ انھوں نے کیا۔ ۱۸۴۱ء میں ان کی عمر تیس سال کی تھی۔

(۷) میر اشرف علی صاحب دہلی کالج میں منشی تھے، اور بہت قابل شخص تھے، تاریخ کشمیر سے اردو میں ترجمہ کیا، رسالہ اصول حساب کی تالیف میں بابو ہر دیو سنگھ کو مدد دی اور بریف سروے آف ہسٹری کے اردو ترجمے کی اصلاح کی۔ چنانچہ مولوی کریم الدین صاحب ان کے بارے میں رطب اللسان ہیں:

"منشی میر اشرف علی، منشی مدرسہ دہلی، بہت ذہین اور ذکی آدمی ہیں، اردو زبان بہت پاک وصاف، اور اچھی مہارت فارسی کی ان کو حاصل ہے، ایک تاریخ کشمیر کی جو فارسی میں تصنیف کی ہوئی محمد اعظم کی تھی، بموجب حکم صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ دہلی کے، اردو میں انھوں نے ترجمہ اس کا کیا ہے، بہت اچھا ترجمہ ہے ... یہ شخص بہت خلیق اور متواضع، کشادہ پیشانی، ہنسی صورت، ظریف و ادیب اور عقلمند ہے، دوستی میں بھی صاف اور بے لگاؤ ہے، یار وفادار اور بامروّت، قوم سے سید زیدی واسطی بڑے خاندان کا ہے۔"

مطبع العلوم متعلقہ دہلی کالج کے آخری مہتمم سید اشرف علی صاحب تھے۔ اس مطبع میں دہلی کے مدرسوں کی کتابیں چھپتی تھیں۔ فوائد الناظرین اور قران السعدین وغیرہ رسالے اس مطبع میں چھپتے تھے۔ اس مطبع کے شیئر ہولڈر تھے اور ان کے شیئر کی رقم سے مطبع چلایا جاتا تھا۔ دہلی کے بیشتر اساتذہ اس اسکیم میں شامل تھے، مثلاً مولوی مملوک علی صاحب، ماسٹر رام چندر صاحب، ماسٹر سبحان بخش صاحب اور میر سید محمد خوش نویس بھی اس کے حصے دار تھے۔ بہت دنوں تک اس مطبع نے تنہا اپنا سکہ جمائے رکھا، لیکن جب اور مطابع جاری ہو گئے اور چھپائی سستی ہو گئی تو اس کا اثر مطبع پر پڑا، چنانچہ دسمبر ۱۸۵۲ء میں سید اشرف علی صاحب کو اس پریشانی کا ذکر کرنا پڑا:

"یہ نیاز مند اشرف علی مہتمم مطبع العلوم (متعلقہ مدرسہ دہلی)

کاسب شرکا کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ اب شہر میں کثرت چھاپہ خانوں
کی ایسی ہوئی ہے کہ جو کتاب ایک روپیے میں تیار ہوتی تھی اس کو دوسرے
چھاپے خانے والے چار آنہ میں بدون مآل اندیشی کے کرنے کو تیار ہوتے
ہیں، اگرچہ انجام ان کا بخیر نہیں ہوتا اور آخرکار پشیمانی اٹھاتے ہیں لیکن
اس صورت میں بہت نقصان مطابع قدیم کا ہوتا ہے کیوں کہ جو نرخ ان
مطابع میں مقرر تھا، اب تاجروں کے نزدیک بہت گراں معلوم ہوتا ہے
تو اس سبب سے کوئی تاجر بیرونی اس مطبع میں نہیں چھپواتا اور صورت
ناچاری قرض دوام کر کے کتب ملکیت مطبع سے چھپوائی جاتی ہیں۔ اور
ان کتب کو بضرورت اجرائے کار تاجروں کو بوعدہ برس روز کے دی جاتی
ہیں اور ان سے بڑی دقت سے کچھ وصول ہوتا ہے اور کچھ ڈوبتا ہے اور
یہاں بیاج بھرتے بھرتے دم ناک میں آتا ہے اور جو صاحب کہ کچھ
چھپواتے ہیں اس کی چھپائی برسوں تک نہیں دیتے اور لیت لعل میں
گذارتے ہیں تو اس صورت میں بجز نقصان کے کوئی صورت نفع کی
نہیں معلوم ہوتی اور شرکا ر کہتے ہیں کہ ہر ششماہی، ہر سال پر نفع بانٹا
کرو اور تقسیم نفع کے واسطے مجھ کو تنگ کرتے ہیں اگرچہ اس مطبع مدارس
دہلی میں دو دفعہ نفع نقصان تقسیم ہو چکا ہے یعنی فی حصہ گیارہ گیارہ
روپیہ پہنچ چکا ہے اور اب فی حصہ انیس انیس روپیہ لگتا رہا ہے اور
مطبع مدرسہ آگرہ میں جو کہ اس سے پہلے کا ہے آج تک ایک دفعہ بھی
نفع تقسیم نہیں ہوا ہے۔ اور بلکہ شرکا ہی سے مدد چاہی جاتی ہے اور یہی
حال چھاپہ خانہ مدرسہ بریلی کا ہے کہ وہاں جس روز سے مقرر ہوا ہے
ایک خرمہرہ بھی شرکا نفع کے نام سے نہیں جانتے لیکن یہاں جو دو دفعہ
ہو چکا ہے اس واسطے مجھ کو زیادہ تنگ کرتے ہیں اور اس سے پہلے اکثر
شرکا نے اپنے اپنے حصے یعنی مولوی مملوک علی صاحب مرحوم نے، ماسٹر

رام چندر، مولوی سبحان بخش، میر سید محمد خوش نویس اور اکثر طلبار اکاون
باون حصے کے بعض نے برابر پر اور بعض نے کچھ کم پر بھی بیچ دئے اور روپیہ
اپنے اپنے حصوں کا لے لیا۔ تو اب سب صاحبوں کی خدمت میں جو کہ
حصہ دار باقی ہیں عرض کرتا ہوں کہ بعد ملاحظہ حساب مطبع کے جس صاحب
یعنی شریک کو منظور ہو وہ صاحب بعد ادا کرنے قرض واجب الادا اور
زر حصص کے اس مطبع کو مع اشیا موجودہ کے اپنے قبضے میں کرلے۔"

(٨) لالہ ہردیو سنگھ خلف بسئ رام ولد بنسی دھر ساہو منشی گری کی خدمت پر مامور تھے، بہت محنتی ہوشیار اور خلیق شخص تھے۔ رسالہ پیمائش دو حصوں میں انہی کی تالیف ہے جو مولوی قادر علی صاحب کی اصلاح کے بعد طبع ہوا۔ پروفیسر ڈیمورگن کی کتاب اصول حساب کا ترجمہ اردو میں جس کی اصلاح منشی اشرف علی صاحب نے کی اور سوسائٹی نے طبع کرایا ۱۸۴۷ء میں ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ صاحب طبقات الشعرار ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ شخص بے کینہ اور بہت صاف دل اور یار باش اور اہل مروت ہے،
کارگذار اپنے کار مفوضہ کا بہت ہے، نوکری کو اپنا کار تصور کرکے بہ جان و
دل محنت کرتا ہے۔ اور بہت ہوشیار تیز اور چالاک ہے۔ میں نے
اس کو کبھی فرصت سے بیٹھے ہوئے نہیں پایا جب دیکھا کار سرکاری
میں دیکھا۔"

(٩) مولانا حاجی شیخ محمد ضیار الدین حنفی قادری کے والد ماجد داروغہ محمد بخش تھے، دہلی کے موضع بسئ پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا مملوک علی نانوتوی اور مفتی صدر الدین صاحب سے تعلیم پائی، دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۸۴۲ء میں عربی کے مددگار پروفیسر اس کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے۔ دہلی کالج کے ٹوٹنے کے بعد ۱۸۵۷ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری پر مامور ہوئے[۵] پھر شمس العلمار کا خطاب اور ایل۔ ایل۔ ڈی کا اعزاز پایا۔ امتحانات منشی فاضل،

[۵] واقعات دارالحکومت دہلی، دوم ص ۱۲۹

مولوی فاضل کے ممتحن ہوتے رہے، پنشن لے کر محلہ چاہ رہٹ نزد جامع مسجد میں سکونت اختیار کی۔ عبادت میں سختی سے پابند اوقات رہے، پنجگانہ نماز اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھتے تھے۔ انگریزی فوجیوں کے ادنیٰ اور اعلیٰ طالب علموں کے لئے انشاء اردو ہر دو حصہ، کچہری کے اہل کاروں کے لئے مقرۃ العمل، اور مدارس انگریزی کے لئے منتخبات اردو مفتاح الارض، رسالہ علم طبیعات آپ کی یادگار ہیں۔[۱] ترجمہ مسلم الادب پنجاب یونی ورسٹی کا عربی کورس تھا۔ طالب علموں کے لئے مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا۔ بابائے اردو علامہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی ضیاء الدین ایک بڑے عالم تھے اور کالج میں عربی پروفیسر ہوئے تھے، افسوس ان کی یادگار سوائے رسوم ہند کے پہلے حصے کے کہیں اور نہیں پائی جاتی۔"[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ضیاء الدین صاحب کی بقایا مذکورہ کتابوں کا علم مولوی عبدالحق صاحب کو نہیں تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ان کتابوں سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے ضیاء شمسی دیوان حافظ کی شرح بھی لکھنی شروع کی تھی لیکن اسی زمانے میں افسران فوج کے امتحان کے واسطے کتابیں لکھنے میں مصروف ہو گئے تھے، کچھ پتہ نہیں چلا کہ شرح دیوان حافظ مکمل کر سکے یا نہیں۔ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں آپ ہجرت کر کے زیارت حرمین شریفین کے لئے گئے، مدینہ منورہ روانہ ہونے والے تھے کہ مکہ معظمہ میں فوت ہوئے۔[۳]

مرزا غالب کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی ضیاء الدین صاحب شعر کہتے تھے اور ان کا تخلص ضیاؔ تھا لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ بہت کم گو تھے یا ضرورت کے وقت کہہ لیا کرتے تھے۔ کرنل ہملٹن کمشنر دہلی کو جو سپاس نامہ انھوں نے پیش کیا تھا اس کے یہ دو شعر ملے ہیں[۴]

[۱] وصالِ جمیل ص ۱۵ [۲] مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۹ [۳] وصالِ جمیل ص ۱۵

[۴] دہلی کالج میگزین ۱۹۵۳ء مضمون ڈاکٹر مختار الدین ص ۱۷۲

آفتاب اس کے آگے ہے تاریک　　　کہتے ہیں لوگ جس کو ہیملٹن
علم اس کا ضیاؔء پہ روشن ہے　　　نور چینیوں میں اس کے ہے ملٹن

ان کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

ضیاؔء اب مختصر کر اپنی تقریر　　　دعا پر ختم کر یہ ساری تقریر

(۱۰) منشی بھیروں پرشاد دہلی کے کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چیلپوری میں ان کا مکان تھا جس کا عالی شان دروازہ ان کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ منشی جی نے دہلی کالج میں ہی تعلیم پائی۔ بڑے ہونہار اور قابل ولائق و ذہین طالب علم تھے۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے لالہ وزیر سنگھ کا وظیفہ ایک سو بیس روپیہ مقابلے میں حاصل کیا تھا۔ بی اے کے امتحان میں پنجاب کے تمام طلباء میں فرسٹ آئے۔ آرنلڈ گولڈ میڈل حاصل کیا۔ دہلی کالج ہی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ چنانچہ بابائے اردو مولانا عبدالحق صاحب اپنی تصنیف "مرحوم دہلی کالج" میں لکھتے ہیں:

"بھیروں پرشاد یہیں کے طالب علم تھے جو بی اے میں تمام یونی ورسٹی میں اول آئے۔ اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ اپنے وقت میں بہت مشہور تھے۔"

منشی جی کا رنگ سانولا، عینک ہر وقت لگی رہتی تھی، جاڑے میں سیاہ مخمل کی اچکن، اور گرمی میں رفل کا آڑا چوڑی دار پائجامہ، سیاہ وارنش کا چمکتا ہوا انگریزی جوتا، سر پہ پٹیالہ نما عمامہ، ریشمی ازار بند اکثر لٹکتا رہتا تھا۔ پینے پلانے کے بہت شوقین تھے اور ہر وقت ایک گونہ بے خودی کے عالم میں سرشار رہتے تھے۔ علمی طبقہ ان کا احترام کرتا تھا اور طالب علم تو ان کو پوجتے تھے۔

۱۹۶۵ء میں منشی بھیروں پرشاد گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ان کو ساڑھے تین سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ آپ دہلی سوسائٹی کے ممبر تھے، ۱۶ر جنوری ۱۸۷۱ء کی میٹنگ میں آپ نے ایک مضمون جس کا عنوان تھا "اثرِ صحبتِ بد" پڑھا سب نے ہی تعریف کی اور خاص طور پر مولانا الطاف حسین حالی نے مضمون بے حد پسند کیا جس کا ابتدائی حصہ یہ تھا:

"جس زہر کے کھانے سے آدمی اکثر ہلاک ہو جاتا ہے مگر کبھی بچ بھی جاتا ہے اس کو تو سب ہی لوگ جانتے ہیں، اس کے سوا ایک اور زہر ہے جس کا مارا کبھی پانی نہیں مانگتا۔ مگر اس کا مزا ایسا خوشگوار ہے کہ انسان کو نفرت کی جگہ اور اس کی رغبت ہوتی ہے۔ اس زہر کا نام صحبت بد ہے، اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دولت مند مفلس کیوں ہو جاتے ہیں اور عالم جاہل جیسے کام کیوں کرنے لگتے ہیں اور عفت و پارسائی میں کیوں دھبہ لگ جاتا ہے اور باخدا لوگ لالچی بوالہوس کیوں ہو جاتے ہیں اور غیبت کرنے کی عادت لوگوں کو کیوں پڑ جاتی ہے، جھوٹ بولنے کو برا کیوں نہیں جانتے۔ اچھے آدمیوں کی صحبت سے کیوں بھاگنے لگتے ہیں۔ وقت عزیز کو رائیگاں کیوں کرتے ہیں، خدا سے کیوں نہیں ڈرتے، بہادر نامرد اور سخی بخیل کیوں کر ہو جاتے ہیں، فریب اور عیاری پر فخر کیوں کرنے لگتے ہیں، ماں باپ کے حقوق کیوں فراموش کر دیتے ہیں، تو میں ان سب باتوں کا یہی جواب دوں گا کہ صحبت بد سے، بلکہ اگر کوئی بات پوچھے کہ سلطنت پر زوال کیوں آجاتا ہے اور ریاستوں میں ہلچل کا ہے سے پڑ جاتی ہے تو میں یہی کہوں گا کہ صحبت بد سے۔ محمد شاہ کے زمانے میں بہت عرصہ گذرا، اسے جانے دو یہ تو کل کی بات ہے کہ مصاحبوں کی بدولت لکھنؤ کی صاحبی بگڑتے بگڑتے آخر خاک میں مل گئی اور ان کا حال تو آپ سب صاحبوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

منشی بھیروں پرشاد کو زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ ان کی تحریر میں روانی ہے، کہیں تکلف اور تصنع کا نام نہیں ہے۔ فصیح و سلیس زبان کے مالک ہیں، کیوں نہ ہو۔ دہلی والے ہونے کے ناطے سے اردو ان کی لونڈی ہے اور کالیستھ ہونے کے اعتبار سے فارسی ان کی باندی ہے۔

۱۸۷۷ء کو جب دہلی والوں کو معلوم ہوا کہ دہلی کالج توڑا جا رہا ہے تو ۲۱ فروری ۱۸۷۷ء کو ایک عظیم الشان جلسہ عجائب خانہ کے بڑے کمرے میں چار بجے شام کو ہوا، جس کی صدارت نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو نے کی۔ جس میں طے پایا کہ وائسرائے کی خدمت میں

ایک وفد بھیجا جائے۔ وفد کے ارکان میں رائے بہادر صاحب سنگھ، رائے جیون لال، پروفیسر رام چندر اور لالہ مدن گوپال کے ساتھ ماسٹر بھیروں پرشاد بھی تھے۔ اس جلسے میں آخر میں جو تقریر ہوئی وہ ماسٹر صاحب کی تھی، جس کے الفاظ یہ تھے:

"فاضل چیئرمین نے آپ کے سامنے اس مقصد کو جس کے لئے یہ جلسہ ہوا ہے ابھی بیان کیا ہے۔ پنجاب گزٹ کا آخری پرچہ ہمارے لئے یہ حادثہ لایا ہے کہ پہلی اپریل ۱۸۷۷ء سے دہلی کالج زندہ نہ رہے گا۔ تمام خیرخواہانِ شہر اس کی وفات کا افسوس کریں گے۔ اس بات میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ دہلی کالج کا توڑنا ایسے وقت قرار پایا کہ اس شہر میں انہی ملکہ معظمہ نے شہنشاہی کا خطاب اختیار فرمایا۔ مناسب ہے کہ ہم سب مل کر ویسرائے کی خدمت میں لفٹننٹ گورنر صاحب کی حکم کی منسوخی کے واسطے درخواست کریں۔"

مولانا ذکاء اللہ، لالہ پیارے لال، ڈپٹی نذیر احمد اور ماسٹر بھیروں پرشاد جب پنشن یافتہ ہو گئے تو انھوں نے دہلی میں ایک لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جس نے اردو کی کافی خدمت کی۔ ان کے پادریوں سے بھی اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ ان ہی پادریوں میں سے ایک پادری انڈریوز نے ایک کتاب "ذکاء اللہ آف دہلی" لکھی جس میں ان بزرگوں کے بھی جستہ جستہ حالات ملتے ہیں۔ اس زمانے میں دہلی میونسپل کمیٹی کے باغ میں شام کے وقت یہ سب بزرگ جمع ہوتے تھے اور تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ لالہ ہنومنت سہائے جو دہلی کے انقلابی رہنما ماسٹر امیر چند شہید کے ساتھیوں میں سے ہیں، ان کا ماسٹر بھیروں پرشاد سے قریبی رشتہ ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ ماسٹر بھیروں پرشاد کا انتقال ۱۹۱۲ء کو دہلی میں ہوا۔

(۱۱) ماسٹر نند کشور کا تعلق خاندانِ چودھریاں ایرن گوتی سے تھا۔ یہ خاندان کافی قدیم زمانے سے موضع منڈورہ میں جو گوڑگانوہ چھاؤنی کے قریب اور دہلی سے بیس میل کے فاصلے پر ہے، سکونت رکھتا تھا۔ جب جہانگیر بادشاہ ۱۶۰۶ء میں تخت نشین ہوا، تو اس نے سلیم گڈھ دہلی میں آباد کیا۔ تو اس وقت سے یہ خاندان منڈورہ سے منتقل ہو کر سلیم گڈھ میں سکونت پذیر ہوا۔ جس وقت شاہ جہاں بادشاہ نے شاہ جہاں آباد یعنی دہلی کی بنیاد ڈالی اور قلعہ دہلی

میں سلیم گڈھ کو شامل کرنے کی تجویز کی تو اس خاندان کو سلیم گڈھ چھوڑنا پڑا۔ جس کے عیوض میں بادشاہ کی طرف سے چومنزل مکانات دہلی کے محلہ دسان میں عطا ہوئے۔

جب سے یہ خاندان سلیم گڈھ میں آباد ہوا تھا کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی خدمت مغل بادشاہوں کی طرف سے اس خاندان کے افراد کو سپرد ہوئی۔ اور چودھری کا لقب عطا ہوا۔ اس خاندان کے افراد کے پاس بہت سے فرمان شاہی معہ مہر دستخط کے تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پُر آشوب زمانے میں مال و اسباب کے ساتھ تلف ہو گئے۔ ان دستاویزات کے تلف ہونے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان کے اجداد چودھری اللہ ورام، چودھری جے رام، چودھری نین سنگھ، چودھری تلسی رام، چودھری مادھو رام، چودھری مانک چند اور چودھری سیتل داس مغلیہ عہد میں کن کن عہدوں پر ممتاز تھے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صاحبان تمام عمر سلطنت مغلیہ کی خدمت کرتے رہے اور تقریباً پورا خاندان فارسی داں تھا۔

چودھری مانک چند کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے بھائی سیتل داس کے ہاں منشی گھانسی رام، منشی چنچل رائے اور صاحب سنگھ پیدا ہوئے۔ چنانچہ ان میں سے چودھری مانک چند صاحب نے منشی گھانسی رام کو گود لیا۔ یہ منشی گھانسی رام فارسی و ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے ریاضی میں ایک کتاب تصنیف کی۔ ان کے چار فرزند جے گوپال، گوردھن داس، سورج بھان اور رایشر داس ہوئے۔

ماسٹر نند کشور کے دادا چودھری سورج بھان تھے، جو فارسی زبان کے ماہر تھے اور کئی سال تک نواب غیرت علی خاں والیِ کرنال کے عہد میں دیوان کے عہدے پر مامور ہوئے۔ علالت کی وجہ سے ملازمت سے سبک دوش ہو کر دہلی چلے آئے اور ۱۹ جنوری ۱۸۴۸ء کو فوت ہوئے۔

چودھری سورج بھان کے چار لڑکے منشی بنسی دھر، منشی رام سہائے مل مشیر الدولہ رائے بہادر منشی امید سنگھ اور راؤ بہادر منشی گنیشی لال تھے۔

ماسٹر نند کشور کے تایا منشی بنسی دھر تھے جو فارسی میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ چند سال تک محکمہ کلکٹری میں نائب سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ بعد میں کچھ روز کے لئے

پنجاب میں سر جارج کلارک کی پیشی میں کام کیا۔ پھر انبالہ میں تحصیلدار مقرر ہوئے، اور ۴۴ سال کی عمر میں ۴ر دسمبر ۱۸۴۷ء میں کوہ نبا سر میں فوت ہوئے۔ ان کے صاحبزادے منشی چینی لال صاحب ہوئے جو اپنے چچا چودھری امید سنگھ کی کوششوں سے والیِ اندور۔ ہلکر کے مصاحب مقرر ہوئے۔ یہ بھی جوانی میں ۳۵ برس کی عمر میں ۱۸۵۵ء کو رحلت کر گئے۔ ان کے فرزند رائے پریشری داس تھے جو ۱۸۴۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور دہلی کالج میں انگریزی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اور درجہ بدرجہ چار ریاستوں جگنی، نوکاسی، بادنی اور سٹرلیہ کے سپرنٹنڈنٹ چار سو روپے ماہوار پر مامور ہوئے۔ ان کو انگریزی سرکار نے رائے صاحب کا خطاب عطا کیا۔ اور ۳۱ر دسمبر ۱۸۸۹ء کو ۳۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

ماسٹر نند کشور صاحب کے والد ماجد منشی رام سہائے مل تھے جو دہلی میں ۱۸۰۶ء کو پیدا ہوئے۔ یہ بھی فارسی اچھی جانتے تھے۔ ابتداء میں دہلی کوتوالی میں محرر ہوئے، اس کے بعد ریاست اندور میں ناظم فوجداری مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ملازمت سے علیحدہ ہو گئے اور ۱۸۵۸ء کو گوالیار میں نائب صوبہ سبل گڈھ دو سو روپے ماہوار پر مامور ہوئے، پھر اسی ریاست میں عہدہ اسسٹنٹی فوجداری ان کے سپرد ہوا۔ چودہ برس نوکری کرنے کے بعد مستعفی ہوئے اور اسی روز دہلی آئے۔ اور اپریل ۱۸۷۸ء میں ۷۲ سال کی عمر میں ہردوار میں فوت ہوئے۔

ان کے صاحبزادے ماسٹر نند کشور صاحب ۸ر اگست ۱۸۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور کئی وظیفے لئے۔ پرنسپل دہلی کالج کی سفارش پر ۱۵ر نومبر ۱۸۵۴ء کو راجہ منڈی کے ایک سو روپے ماہوار پر اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو کر دہلی چلے آئے، اور دہلی کالج میں درس و تدریس کے کام پر لگائے گئے۔ دو سال کے بعد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں کالج سے علیحدہ ہو کر مئی ۱۸۵۸ء کو مہاراجہ بھوانی سنگھ والیِ ریاست دیتا کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں دیوانی و فوجداری صدر عدالت دیتا ان کے سپرد ہوئی۔ جون ۱۸۶۳ء میں دیوان بنکاجی کی وفات کے بعد اور دیوان لچھمن سنگھ کی علالت کی وجہ سے ریاست کے

دربار کے مصاحب مقرر ہوئے۔ اور آخر عمر تک مصاحب رہے، ان کی تنخواہ ۱۷۵ روپے ماہوار تھی اور دو ہزار روپے کی سالانہ جاگیر حین حیات رہی۔

ماسٹر صاحب نے ریاست دیتا میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس پر حکمراں طبقے نے ان کو سراہا۔ آپ نے "تاریخ ریاست دیتا" انگریزی میں تالیف کی۔ ۱۸۷۱ء میں جونسن صاحب کی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا، اور اس کا نام "مقالات طبعی" رکھا۔ یہ کتاب علم سائنس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں آپ نے اپنے چچا راؤ بہادر منشی گنیشی لال کے، ۱۸۷۱ء میں اپنے بڑے چچا مشیر الدولہ رائے بہادر منشی امید سنگھ کے حالاتِ زندگی پر کتابیں تصنیف کیں۔

جنوری ۱۸۸۰ء میں علالت کی وجہ سے ریاست سے رخصت لے کر دہلی تشریف لائے اور ۱۸ر جون ۱۸۸۰ء کو ۴۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ماسٹر صاحب وقت کی قدر کرتے تھے، ایک لمحہ بھی بے کار نہیں گذارتے تھے۔ دھرم کے پابند تھے، پوجا پاٹ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے رائے بہادر منشی مکند لال تھے۔ ماسٹر صاحب کی زندگی میں ایک سو روپے ماہانہ پر اسسٹنٹ دربار دیتا رہے۔ ماسٹر صاحب کی وفات کے بعد ان کا ریاست دیتا سے ایک سو پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا تھا، اور "راؤ بہادر" کا خطاب بھی ملا تھا۔ ان کے چار صاحبزادے گوبند لال، پیارے لال، رام لال اور چھوٹے لال تھے۔

ماسٹر نند کشور صاحب کا پورا خاندان علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔ ان کے بھائی مشیر الدولہ رائے بہادر منشی امید سنگھ ستمبر ۱۸۱۵ء میں کرنال میں پیدا ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں ان کو انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں آتا تھا۔ مگر فارسی و عربی میں بہت اچھی استعداد و قابلیت تھی۔ ۱۸۳۲ء کی ابتداء میں روزگار کی تلاش کے لئے انبالہ گئے، وہاں مسٹر کولنز ہیڈ کلرک دفتر پولیٹیکل ایجنٹ کو فارسی پڑھانی شروع کی اور ان سے انگریزی سیکھی۔ مسٹر کولنز نے ان کو سر جارج کلرک صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ ان کی کوششوں سے رائے صاحب نے دو برس دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۳۶ء میں

سر جارج کلرک کے دفتر انبالہ میں منشی مقرر ہوئے ۱۸۴۳ء میں سفیر دربار لاہور کے سررشتہ دار ہوئے۔ چند دنوں کے بعد سکریٹری مغربی و شمالی کے دفتر میں فارسی گو "پرشین انٹرپریٹر" اور مترجم مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۸۴۴ء میں سر رنبرٹ ہملٹن رزیڈنٹ اندور نے مہاراجہ تکوجی راؤ ہلکر والیٔ ریاست اندور کا اتالیق مقرر کیا اور سرکاری مدرسہ اندور کا سپرنٹنڈنٹ بنایا۔ اس عرصے میں ان کو دفتر رزیڈنسی میں میر منشی گری بھی کرنی پڑی ——
۴ ر مارچ ۱۸۵۲ء کو جب مہاراجہ تکوجی کو ریاست کا نظم و نسق سپرد ہوا۔ تو انھوں نے ان کو بلاکر دو مواضع گروتہ اور پھولان جو پرگنہ دیپال پور میں تھے، جن کی آمدنی چھ ہزار روپے سالانہ تھی، بطور جاگیر عطا فرمائے پانچ سو روپے تا زندگی اور ایک سو روپے پشت در پشت وظیفہ مقرر کیا۔ اور خطاب "مشیر الدولہ رائے بہادر عطا کیا۔ دہلی تشریف لائے تو میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ۴ ر نومبر ۱۸۶۶ء کو ۵۱ سال کی عمر میں آگرہ میں فوت ہوئے۔ آپ کے دو صاحبزادے نانک چند اور کیشو داس تھے۔ نانک چند نے اندور میں اعزاز پایا۔ انھوں نے اپنے خاندان کے مختصر حالات ایک کتابچے کی شکل میں ۳۱ ر اگست ۱۸۸۵ء کو ۳۲ صفحوں پر تحریر کیے، جس سے میں نے ان کے خاندان کے یہ حالات اخذ کیے۔

خواجہ شہاب الدین حسن ہیڈ ماسٹر عربک اسکول دہلی

خواجہ صاحب کے والد ماجد کا نام خواجہ شمس الدین احراری تھا، اور یہ خواجہ قائم احراری کے فرزند تھے۔ خواجہ قائم احراری کا مدرسہ رودگران میں مشہور تھا۔ خواجہ شمس الدین گجرات میں ڈپٹی تھے، ان کی شادی امیر بیگم صاحبہ بنت امیر اولاد علی سے ہوئی۔ خواجہ شہاب الدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں چار برس کے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کی والدہ نے بیحد کوشش کی۔ یہ بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ والدہ کی تربیت نے اور چار چاند لگا دیے۔ جب تعلیم سے فراغت حاصل کی تو ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے مرزا واجد علی بیگ وکیل کوٹہ کی صاحبزادی سے ہوئی اور خواجہ شہاب الدین باہر کی نوکری چھوڑ کر شہر میں آ رہے اور سرکاری مدرسے میں ساٹھ روپے مہینے کے ملازم ہوئے۔ کنچنیوں کی گلی میں رہا کرتے تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دہلی میں ان کا گھر ویران ہوا۔ کچھ دنوں اونیہ بیگ خاں کے کٹڑے میں رہے، پھر پنڈت کے کوچے میں آن رہے اور مرتے دم تک اسی محلے میں رہے۔ شروع میں پورب میں معمولی تنخواہ پر ملازمت کی، پھر غازی الدین خاں کے مدرسے میں صدر مدرس مقرر ہوئے اور لارڈ کرزن کے دربار کے پانچ برس بعد تک پڑھاتے رہے۔ جب عربک اسکول میں نیا انتظام شروع ہوا، اور نواب سلطان مرزا کے بعد نئے معتمد خان بہادر غلام محمد حسن خاں مامور ہوئے، ان کے زمانے میں پرانی وضع کے استاد برطرف کر دئے گئے تو خواجہ شہاب الدین صدر مدرسی سے سبک دوش ہوئے اور ان کی جگہ ماسٹر فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

فروری ۱۹۱۰ء میں بیمار ہوئے، ڈاکٹر کیدارناتھ معالج تھے، ایسی بڑی پتھری نکلی تھی کہ وہ عجائب گھر میں رکھی گئی، خواجہ شہاب الدین صاحب کنگ جارج کے دربار سے دو برس پہلے تیرہ تیزی کی تیرھویں کو اللہ کے پیارے ہو گئے۔

ماسٹر شہاب الدین صاحب کے پڑھانے کا ڈھنگ بڑا پیارا تھا، اس طرح پڑھاتے تھے جیسے قصے کہانیاں سناتے ہوں۔ انتہائی ہنس مکھ تھے، تبسم کے ساتھ آہستہ بولتے تھے۔ مدرسے میں وہ رعب و دبدبہ تھا کہ شریر سے شریر لڑکے کی بھی روح فنا ہوتی تھی۔

طالب علم بھی بلا کے تھے، ڈرتے تھے، خوفزدہ ہوتے تھے، لیکن شرارت سے نہیں چوکتے تھے۔ ایک دفعہ نماز کے گھنٹے میں طلباء مدرسے کی مسجد چھوڑ کر موچیوں کی مسجد میں آپہنچے اور شرارت کرنے لگے، ملاجی کو جی بھر کے ستایا، حوض کا پانی خوب اچھالا، بدھنیاں توڑ دیں۔ ملاجی نے جب دیکھا کہ اس شیطانی لشکر سے چھٹکارا مشکل ہے تو جاکر موچیوں کو چڑھا لائے، وہ آئے، انھوں نے لڑکوں کو گھیر لیا۔ اور لڑکوں سے نام معلوم کر کے لکھے۔ لڑکے حرفوں کے بنے ہوئے تھے۔ سب نے اپنے ناموں کے بجائے خواجہ شہاب الدین، امتیاز حسین، احمد بیگ، منظور الدین اور عطاء الحق وغیرہ استادوں کے نام لکھوائے۔ موچیوں نے دوسرے دن جاکر اسکول میں ماسٹر شہاب الدین صاحب سے شکایت کی۔ خواجہ صاحب نے جب نام پڑھے تو سمجھ گئے کہ طلباء کی شرارت ہے۔ خواجہ صاحب نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ کل صبح آئیے، حاضری کے بعد سب لڑکے تمھارے سامنے کھڑے کر دئے جائیں گے، ان کو پہچان لینا۔ جن طلباء نے شرارت کی تھی وہ سمجھتے تھے کہ موچی ہماری شکایت کرنے آئیں گے، اس خیال سے وہ اگلے روز مدرسے نہیں آئے، چنانچہ وقت مقررہ پر موچی آئے اور شناخت نہ کر سکے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ وہ کسی دوسرے اسکول کے لڑکے ہوں گے، شرارتاً اس اسکول کو بدنام کرنے کے لئے انھوں نے ایسا کیا۔

خواجہ صاحب اپنے گھنٹے میں ہمیشہ طالب علموں کو اخلاقی باتیں بتایا کرتے تھے، اور اخلاق وسیرت کی درستی پر زور دیا کرتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے طالب علم کے پاس آکھڑے ہوتے اور اچکن کی جیبیں ٹٹولا کرتے تھے، اگر کسی شامت زدہ کی جیب میں سے سگریٹ نکل آئے تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی لڑکا جیب میں چرٹ رکھ کر لایا، خواجہ صاحب اس کے پاس سے گذرے اور جیب پر ہاتھ رکھا، تو انھوں نے محسوس کیا۔ فوراً مولوی احمد بیگ کو آواز دیکر کہا لیجئے بتیاں تو ہوتی تھیں اب تو یہ موٹے موٹے بتے ہونے لگے۔ ان کا رخ چونکہ احمد بیگ صاحب کی طرف تھا، اس لئے طالب علم نے پھرتی سے چرٹ جیب سے نکال کر اچکن کے گلے میں پیچھے کے

رخ ڈال دیا۔ اب خواجہ صاحب نے چاہا کہ نکال کر احمد بیگ صاحب کو چرٹ دکھائیں تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بہت متعجب ہوئے اور کہا، لیجیے صاحب! اور مسکراتے ہوئے چل دئے۔

خواجہ صاحب چشم پوشی اکثر کر جاتے تھے، لیکن جب چشم نمائی کرتے تو سزا بڑی سخت دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کچھ لڑکے ایکا کر کے مولوی احمد بیگ صاحب کی جماعت سے بھاگے اور سب کے سب اسکول کی کھائی پار کر کے تہہ خانے میں قبروں پر جا چھپے۔ مولوی احمد بیگ سے کسی نے جا کر بھانڈا پھوڑ دیا۔ خواجہ صاحب کو لے کر تہہ خانے کے دروازے پر آئے، لڑکوں نے جو پیروں کی آواز سنی، سب دم روک کے چپکے سے ستونوں کی اوٹ میں چھپ گئے، خواجہ صاحب نے نیچے کی آخری سیڑھی پر آ کر ایسے سیدھے پن سے کہا کہ بھئی احمد بیگ یہاں تو کوئی لڑکا نہیں، آپ کو غلط اطلاع ملی، اتنے میں ایک لڑکے کی بے اختیار ہنسی نکل پڑی۔ خواجہ صاحب نے بے ساختہ کہا، بھاگو! قبر کا کوئی مردہ ہے۔ یہ سن کر سب لڑکے کھل کھلا کر ہنس پڑے اور وہ ٹھہر گئے اور کہا اب تو سب مردے ہنسنے لگے، چلو دیکھیں۔ قبروں کے پاس آ کر ستونوں کے پیچھے چھپتے ہوئے ایک ایک لڑکے کو ہٹاتے جاتے تھے کہ اوہ آپ ہیں۔ غرض سب کو جمع کر کے آگے آگے گھیرتے ہوئے مدرسے میں لائے، سب سے الٹے کان پکڑوائے اور دو دو چار چار بیتیں ماریں۔

پھبتی کسنے میں خواجہ صاحب کو کمال حاصل تھا۔ ایک موقع پر کمپنی باغ میں باجا بج رہا تھا، میموں کی صف سامنے تھی۔ ماسٹر احمد بیگ صاحب سے فرمانے لگے: "ذرا ان میموں کی کمریں تو ملاحظہ فرمائیے، بالکل اگالدان معلوم ہوتی ہیں۔"

استاذی مصور غم علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور نے رسالہ یارانِ قدیم دہلی کے اپریل ۱۹۲۶ء کے شمارے میں اپنے استاد خواجہ شہاب الدین کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کا عنوان تھا "فسانہ شب":

"ماسٹر شہاب الدین مرحوم کے مزاج میں ظرافت بہت زیادہ تھی، وہ سزا کے وقت بھی ہنستے رہتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے بھی پٹنے کا اتفاق ہوا، قصور سنگین تھا، آٹھ دس بیدیں ماریں مگر ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر۔

بتیس برس سے کم نہیں زیادہ ہوئے ہوں گے میرے پھوپھی زاد مولوی انوار حسین

مرحوم کا نکاح تھا، برات خان میرزا صر علی کے مکان پر گئی، خواجہ شہاب الدین مرحوم بھی شریک تھے، گیارہ بجے دلہن وداع ہو گئی، ولیمہ دوسرے روز تھا مگر خاص آدمیوں کے واسطے کھانا اس روز بھی پکا تھا۔ ماسٹر صاحب چلنے لگے، سب کا جی چاہا کہ وہ بھی کھانے میں شریک ہوں، خدا بخشے درخواست منظور کر لی اور ساتھ تشریف لے آئے مگر یہ حکم دے دیا کہ بارہ بجتے ہی چلا جاؤں گا۔ اتنا سنتے ہی سب شاگرد کھانے کو پٹ گئے۔ میں لال کنوئیں پر محمودہ نانبائی کے ہاں گیا اور مار امار تین شیرمال پکوائیں اور جس طرح ہوا، ان کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ جب اس وقت کا خیال آتا ہے تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ماسٹر صاحب اکیلے کھانا کھا رہے ہیں اور ہم پانچ آدمی سامنے حاضر ہیں، اور باغ باغ ہو رہے ہیں۔ کھانے کے بعد پانی طلب فرمایا۔ میں لے کر گیا تو اس میں تر مرے تھے، ہنسے اور کہنے لگے "پانی بھی گنگا جمنی ہی پلاؤ گے" اس روز ان کو کھانا کھلا کر جس قدر خوشی ہم شاگردوں کو ہوئی مشکل سے بیان ہو سکتی ہے۔ میری سب سے پہلی کتاب 'ظلمت' شائع ہو چکی تھی ہم سب سڑک تک ہمراہ گئے، چلنے کا وقت آیا تو میں نے مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ ہنسے اور فرمایا "ارے میاں تم تو مصنف ہو گئے ہو!" میں نے بصد ادب عرض کیا آپ ہی کا طفیل ہے۔" کمر پر ہاتھ رکھا اور فرمانے لگے "بھئی جیتے رہو!"

مشتاق احمد زاہدی صاحب جنھوں نے عربک اسکول میں تعلیم پائی تھی، اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولوی شہاب الدین نہ صرف دیگر تمام ماسٹروں سے من حیثیت عہدہ بالاتر تھے بلکہ قد و قامت میں بھی سب سے اونچے تھے اور خود گرہ بحوٹ نہیں تھے، لیکن ہزاروں گرہ بحوٹوں کے استاد تھے۔ ماسٹر شہاب الدین ہر بات میں یکتا تھے، ان کی وضع قطع، ان کا لباس، ان کی چال ڈھال، ان کا طرز تعلیم سب دوسروں سے مختلف تھا۔ مثلاً ان کا لباس سر سے پاؤں تک پرانی قسم کا تھا۔

سر پر عمامہ انگرکھے پر چوغہ، گلے میں ہمیشہ ایک بڑا رومال بندھا ہوتا تھا۔ اور پاؤں میں ہمیشہ پنجابی کامدار جوتی۔ مدرسے میں ہوں یا بازار میں کہیں کسی شاگرد کو دیکھ لیتے تو دور سے ہی تاڑ لیتے اور اگر اس سے کوئی تہذیبی لغزش ہو جاتی تو کلاس میں بڑے مزے مزے کے فقرے کستے اور اس طرح شرمندہ کر کے اسے راہ راست پر لاتے، پڑھانے میں زیادہ زور مشکل الفاظ کے معنی اور گریمر پر دیتے تھے، گریمر کے تو ماہر تھے، ترجمہ بھی عمدہ اور بامحاورہ کرتے تھے۔ کورس پورا ختم ہو یا نہ ہو جتنا پڑھا دیا ایسا پڑھایا کہ کوئی دن ہی فیل ہو تو ہو۔ ہماری جماعت میں ۱۳ لڑکے تھے، جب انٹرنس کا امتحان ہوا تو ۲ لڑکے فیل ہوئے، ان میں سے بھی ایک ہی فقط انگریزی میں فیل تھا۔ ماسٹر صاحب موصوف کا برتاؤ اپنے شاگردوں کے ساتھ صحیح معنوں میں پدرانہ تھا۔"

ماسٹر فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر عربک اسکول دہلی

ماسٹر صاحب کے آباد اجداد موضع شوکتلہ ضلع لاہور کے باشندے تھے۔ آپ وہاں کے مسلمان راجپوت کھوکھر خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ اسی گاؤں میں آپ کی اب تک جدی جائداد ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد آپ کے والد محمد اسماعیل صاحب جو زراعت پیشہ تھے، دہلی تشریف لے آئے۔

ماسٹر فضل الدین صاحب ۱۸۷۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ماسٹر شہاب الدین حسن سے تعلیم پائی۔ ایف۔ اے سینٹ سٹیفن کالج سے کیا، اس کے بعد آپ پنجاب کے محکمے میں ملازم ہوئے اور کلاچی ڈیرہ اسماعیل خاں میں تعینات کئے گئے۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پرائیویٹ طور پر دیا، فارسی میں فرسٹ آئے۔ اسی زمانے میں عربک اسکول میں تبادلہ کردیا گیا، چھ سات سال کے بعد کچھ دنوں ڈیرہ غازی خاں اور لدھیانہ میں معلمی کی، پھر اسی اسکول میں چلے آئے۔ ۱۹۰۸ء میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

اس زمانے میں عربک اسکول صرف بلڈنگ میں تھا۔ چاروں طرف کھائی تھی۔ ماسٹر فضل الدین صاحب کی کوششوں سے کھائی کی زمین اور دوسری زمین نزول سے لی گئی۔ کھائی بھروا کر شمال کی طرف کھیل کا گراؤنڈ بنوایا، اور جنوب کی طرف ایک ہال تعمیر کیا۔

۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں ایف۔ اے کی کلاس کھلی۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں ماسٹر صاحب ریٹائرڈ ہوئے۔ دسمبر میں خان صاحب کا خطاب ملا۔ دہلی کی تقریباً ہر سوسائٹی اور ادارے کے آپ ممبر رہے۔ جامع مسجد کی منتظمہ کمیٹی اور فتح پوری مسجد کی منتظمہ کمیٹی کے بھی آپ ممبر تھے۔ مسجدوں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے اور بہت سی مسجدوں کی مرمت کرانے اور بنوانے میں آپ نے حصہ لیا۔

۱۹۳۰ء میں حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ ماسٹر صاحب قد آور تھے، سانولا رنگ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں، ادھوڑی استر کی جوتی، لمبا کوٹ، شرعی پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے، بڑے محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ مدرسے کے کاموں میں ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ بری صحبتوں اور برائیوں سے بچانے کے لئے طلباء کے پیچھے پیچھے سایے کی طرح رہتے تھے۔ لڑکوں کے کھیلنے اور کودنے اور شرارت کرنے اور بری صحبتوں میں بیٹھنے اور جانے کے کون کون سے ٹھکانے ہیں ان کو خوب جانتے تھے۔ بعض مرتبہ ایسا ہی ہوا ہے کہ لڑکے کہیں بری جگہ یا بائیسکوپ یا دنگل و باغ میں بیٹھے ہیں تو کسی طالب علم نے کہہ دیا کہ اب کہیں ماسٹر فضل الدین صاحب نہ آجائیں تو مڑ کر دیکھا تو ماسٹر صاحب دھرے ہوئے ہیں۔ لڑکوں کی روح نکل جاتی تھی۔

ماسٹر فضل الدین صاحب نے مدت العمر انگریزی جوتا نہیں پہنا۔ بقول خواجہ حسن نظامی مرحوم: ماسٹر فضل الدین صاحب یا تو کوئی غیبی طاقت رکھتے تھے یا ہمزاد ان کے تابع تھا کہ جہاں ان کا ذکر ہوا وہ فوراً مسکراتے ہوئے سامنے آجاتے تھے۔ خواجہ صاحب اپنی رائے لکھنے کے بعد اپنا تجربہ تحریر فرماتے ہیں۔ اگرچہ میں عربک اسکول کا طالب علم نہیں ہوں مگر یہ تجربہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ بارہا مجھ کو بھی ہوا ہے کہ جہاں میں نے عربک اسکول کے لڑکوں سے ہنس کر کہا ماسٹر فضل الدین صاحب کو بلوایا جائے، تو پانچ منٹ نہیں گذرتے تھے کہ کہیں سے ماسٹر صاحب سامنے آجاتے تھے اور بعض اوقات تو مجھے ازحد حیرت ہوتی تھی کہ جہاں ماسٹر صاحب کے آنے کا امکان نہ ہوتا وہ وہاں پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ چند واقعات ایک طالب علم کی زبانی سنیئے:

(۱) پریڈ کے میدان سے فٹ بال کھیل کر تمام فٹ بال پارٹی جس میں مولانا عبدالحمید نعمانی، غلام محی الدین کپتان فٹ بال ٹیم، بدرالاسلام بیرسٹر ان کے بھائی مظہر الدین اور منور الدین شامل ہیں۔ پتھر والے کنوئیں کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ مظہر بہت دیر تک گاتا رہا، اس کے بعد اوروں کا نمبر تھا، اتنے میں گیارہ بج گئے، گلنے کا رنگ جما ہوا تھا۔ میرے منہ سے نکلا اس وقت تو ماسٹر فضل الدین نہیں آسکتے۔ میرے اس کہنے پر مجمع نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب نے نہایت خفا ہو کر کہا ہو تو بڑے ہی مہمل۔ ابھی مجھ پر طعن و تشنیع کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دیکھا ماسٹر فضل الدین اور ماسٹر امیر چند چلے آرہے ہیں۔

(۲) میں ابھی تیسرے سے ترقی کر کے چوتھی میں آیا تھا کہ ایک دن جب میں مدرسے پہنچا تو میرے ایک ہم جماعت خلیل الرحمٰن صاحب، کٹارے چمن رہے تھے، اسکول کی املی کے کٹارے تھے۔ میں بھی ان کا اسی طرح حقدار تھا۔ جس طرح خلیل الرحمٰن صاحب۔ کٹاروں پر کشمکش شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن صاحب نے فرمایا میں ماسٹر صاحب سے کہہ کر بیدیں لگوا دوں گا۔ اس کا جواب میں نے جو کچھ دیا وہ شاید ماسٹر صاحب کو یاد ہو۔ لیکن ماسٹر صاحب کا نام میری زبان پر آنا تھا کہ فوراً معلوم ہوا کہ میرے کان ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھے۔

(۳) عربک اسکول کو اپنی شرارتوں سے نجات دلانے اور خود تعلیم سے نجات حاصل کرنے کے تقریباً بارہ برس بعد کا واقعہ ہے کہ واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی اور چند اور احباب اپنے دوست مولانا عارف ہسوی معاون ہمدرد سے ملنے کے لئے آگرہ گئے۔ مولانا آگرہ جیل میں قید تھے، صبح جس وقت ہم لوگ ریل سے دہلی اترے تو ماسٹر فضل الدین صاحب وہاں بھی موجود تھے، جب ہماری نظر ان پر پڑی تو ہم نے ان کو نہایت ادب سے سلام کیا اور ہم نے دریافت کیا کہ آپ کا کیسے تشریف لانا ہوا۔ مولانا صاحب نے تبسم ہو کر فرمایا کہ تم لوگوں نے میرا خیال کیا ہو گا۔

۱۹۳۵ء میں آپ کے چھوٹے صاحبزادے ظہیر الدین کا انتقال ہوا، اس کا آپ کو بہت صدمہ ہوا اور روز بروز صحت گرنے لگی۔ آخر میں یادداشت بہت کمزور ہو گئی تھی، گھر کا راستہ تک بھول جاتے تھے۔ اگست ۱۹۴۴ء میں آپ فوت ہو گئے۔

ماسٹر فضل الدین صاحب کے چار صاحبزادے تھے، سب سے بڑے ملک امین الدین صاحب تھے جو ۱۸۹۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربک اسکول سے ۱۹۱۱ء میں میٹرک کیا، ۱۹۱۶ء میں مشن کالج سے بی۔ اے کیا اور ۱۹۱۹ء کو لاہور میں ایل ایل۔ بی کا امتحان دیا۔ بارہ سال دہلی میں پریکٹس کی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک دہلی میونسپل کمیٹی کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے اگست ۱۹۴۸ء تک دہلی میونسپل کمیٹی کے سکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ دو مرتبہ میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔

دہلی اینگلو عربک اسکول کے چند اساتذہ

دہلی اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی کا مشہور و معروف اسکول ہے، جس میں دہلی کی مشہور و معروف اور نامور ادبی و سیاسی ہستیوں نے تعلیم پانے کے بعد تاریخی اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اسکول کے اساتذہ کس درجے کے تھے، اور کون کون حضرات تھے۔ ان میں سے چند کے حالات تحریر کئے گئے ہیں:

(۱) ماسٹر ذاکر حسین رمزی ۱۸۶۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد بھی دہلی کے باشندے تھے۔ آپ کے دادا شیخ مولانا محمد واسع قلعہ معلی میں شہزادیوں اور شہزادوں کی اتالیقی پر مقرر تھے۔ آپ کے حکیم احسن اللہ خاں، مرزا الٰہی بخش اور لالہ شام لال کے علاوہ دہلی کے امراء و رؤسا سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ یہ علمی خاندان تھا۔ آپ کے والد مرزا باقر بھی عالم و فاضل اور نہایت قابل آدمی تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مکتب نامہ کر یا اور قرآن مجید اپنے والد سے پڑھا۔ ۱۸۷۳ء میں موڈل اسکول دہلی میں داخل ہوئے۔ ذہین، تیز طبیعت اور محنتی تھے اور تعلیمی ذوق نے علمی منازل اس قدر جلد طے کرا دیئے کہ تھوڑے عرصے کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ مڈل کلاس کے اول درجے کا امتحان پاس کیا۔ پانچ روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ جب دہلی کالج ٹوٹ گیا تو آپ کشمیری دروازہ گورنمنٹ اسکول میں داخل ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان وہیں سے دیا، جس میں چودہ روپے ماہوار وظیفہ پایا۔ بیکر صاحب ہیڈ ماسٹر گرک پیٹرک، سکنڈ ماسٹر آپ کی تعلیمی ترقی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ آپ کا میلان زباندانی، تاریخ اور جغرافیہ کی طرف تھا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے کافی عرصے تک انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں کی تاریخوں کا مطالعہ کیا۔ کافی وقت گراموں کے دیکھنے میں صرف کیا۔ ۱۸۸۹ء میں اتالیق انگریزی

کا پہلا حصہ یعنی مخزن الفوائد شائع کیا یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے اتالیق انگریزی کے پندرہ حصے لکھے۔ یہ پندرہ حصے ہندوستانی طلباء کے لئے ایسا آسان اور اس قدر مفید معلومات کا خزانہ ہے کہ طالب علم بہت معمولی قیمت میں برسوں کی محنت وکاوش کے ذخیرے بیسیوں گرامروں کے نچوڑ سے انگریزی کے تمام قواعد وضوابط سے واقف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں ہزاروں ہندوستانیوں نے ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا اور انگریزی سیکھی۔

۱۸۹۳ء میں ماسٹر صاحب اینگلو عربک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ پانچویں جماعت کو انگریزی، جغرافیہ، تاریخ اور سائنس پڑھاتے تھے۔ آپ نے عرصۂ دراز تک طالب علموں کو ایسی تعلیم دی کہ کمزور سے کمزور بچہ بھی چل نکلتا تھا اور مشکل سے مشکل قواعد نوک زبان ہو جاتے تھے۔ جب امتحان ہوتا تو فرسٹ ڈویژن میں کثیر طلباء پاس ہوتے تھے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کے شاگرد اچھے اچھے درجوں اور عہدوں پر پہنچے۔ یوں تو ماسٹر صاحب کے ہزاروں شاگرد تھے، لیکن قابل ذکر نام یہ ہیں:

(۱) مسٹر آصف علی سفیر متعینہ سوئزرلینڈ۔ (۲) مسٹر حیدر رضا بیرسٹرایٹ لا حیدرآباد دکن۔ (۳) مسٹر احمد حسن خاں تحصیل دار کرنال۔ (۴) مسٹر مہدی حسین ایم اے پروفیسر آگرہ کالج۔ (۵) نواب سید محسن مرزا صاحب ایم اے پروفیسر لاہور کالج۔ (۶) شیخ نور احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا دہلوی۔ (۷) سید رؤف علی صاحب بیرسٹر (۸) ڈاکٹر ناصر عباس پروفیسر طبیہ کالج (۹) مسٹر تاراچند دہلی کے مشہور و معروف ایڈوکیٹ۔ (۱۰) نواب ابوالحسن صاحب مجسٹریٹ (۱۱) ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب دہلوی (۱۲) مسٹر سید رضا مرزا دہلی کے نامی ایڈوکیٹ جو آج کل کراچی میں ہیں۔

ماسٹر ذاکر حسین کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ وہی پرانی وضع کا لباس، چغہ، عمامہ، دیسی جوتی پہنتے تھے، خوب صورت شکیل آدمی تھے۔ لمبا قد، آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ آپ نے اتالیق انگریزی کے علاوہ پاکٹ ہسٹری اور تاریخ اسلام بھی لکھی۔ ماسٹر صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ رمزی تخلص کرتے تھے۔ چند اشعار مجھ کو یاد تھے اور کچھ دوستوں سے سنے وہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

غم ہجراں مجھے نہ دیجئے آپ ـــ جان حاضر ہے جان لیجئے آپ

کرو کچھ اور بھی تم صبر رمزیؔ ـــ خدا شاید کوئی سامان کر دے

اک راز ہے سینہ میں نہاں وعظ نہیں ـــ ممبر نہ بچھاؤ، میں سر دار کہوں گا

وہ فکرِ معیشت ہو یا تیری محبت ہو ـــ لیتے ہوئے گھبرائے دنیا جسے ہم لیں گے

تیرا ان کے لئے اور لقب ہو موزوں ـــ مولوی ہیں نہیں، مسٹر سے خفا ہوتے ہیں

مری فریاد پتھر بن کے برسے سر پہ دشمن کے ـــ گریں آہیں عدو کے آشیاں پر بجلیاں ہو کر

لاکھوں غم ہوں مگر اے خالق ہر دو عالم ـــ تابندہ تری درگاہ سے مایوس نہیں

وہ وقت بھی آنکہ ہے، ہم گوشہ نشینوں کا

شاہانِ جہاں رمزیؔ آ آکے قدم لیں گے

(۲) مولوی نجم الدین صاحب چھٹی اور ساتویں جماعت کو ریاضی، فارسی، جغرافیہ اور سائنس پڑھاتے تھے۔ چھتہ چھپا میم چتلی قبر پر رہتے تھے، جسم دیکھنے دکھانے کے قابل تھا۔ اس کو دیکھنے کے بعد کوئی ہنسے بغیر یا ٹھٹھا لگائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جتنے پست قد تھے اتنے ہی پھیلے ہوئے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ:

"میں پہلوانی کر چکا ہوں۔ چار سو بار مگدر روزانہ ہلایا کرتا تھا"

رنگ کے معاملے میں یوں سمجھئے نہ بہت گورے تھے اور نہ بہت کالے تھے۔ سردی میں صافہ باندھتے تھے اور گرمی میں قالب دار میرٹھی ٹوپی پہنتے تھے۔ دستور کے مطابق دیسی جوتی اور چُغے میں ملبوس ہوتے تھے۔ انتہائی بھولے اور سیدھے تھے۔ ریاضی کے ماہر تھے۔ نجم الحساب وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔

چودھری اشفاق صاحب نے جو اس زمانے میں اینگلو عربک اسکول میں تعلیم پاتے تھے، ماسٹر جی کا ایک دل چسپ قصہ لڑکوں کی شرارت کا سنایا، جس میں چودھری صاحب بھی برابر کے شریک تھے۔

ہم کو ایک دن ایک مولوی صاحب چاندنی چوک میں مل گئے جو مولوی نجم الدین کی ہم شکل، ہم قد، موٹاپے میں بھی ان ہی کے مانند تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ کی تعلیم کہاں

تک ہے اور کون سی زبان آپ اچھی جانتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں فارسی اچھی جانتا ہوں۔ ہم نے کہا چلئے عربک اسکول میں ایک ماسٹر کی ضرورت ہے جو فارسی جانتا ہو۔ ان کو چغہ پہنایا گیا اور رفاالبدار ٹوپی اُڑھائی اور ان کو کلاس میں جاکر بٹھا دیا۔ وہ بڑے انہماک سے پڑھانے لگے۔ وہ پڑھا ہی رہے تھے کہ مولوی نجم الدین صاحب بھی کلاس میں آ گئے۔ دور سے دیکھا تو سمجھے نہیں، جب پاس پہنچے تو بڑے غور سے ان کو دیکھا اور اس شرارتی لڑکے کی طرف متوجہ ہوئے، جے سائمر ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب آپ کے کلاس فیلو یا شاگرد تھے۔ ان کا نام لے کر کہا " جانے کہاں ہو جے سائمر ہے تم کو مدرسہ سے نکلوا کر ہی دم لوں گا، بدمعاش شریر!" لڑکوں نے دیکھا معاملہ بگڑتا ہوا نظر آرہا ہے تو چپکے سے بازاری مولوی کو بلا کر باہر لے گئے اور کہا کہ ابھی آپ کی تقرری کا آرڈر نہیں آیا ہے۔ لیجئے یہ آپ کے دو روپے۔ چھ سات دن میں آپ کی تقرری کا آڈر مل جائے گا تو تشریف لے آئیے گا۔ ان کو بھیج کر اندر پہنچے، مولوی صاحب بہت گرم تھے۔ بار بار یہی کہے جاتے تھے کہ تم کو مدرسے سے نکلوا دوں گا۔ ہم نے ان سے کہا استانی جی نے برفی منگائی ہے، وہ دھنی حلوائی سے ہم لادیں گے، آپ لے جائیے گا۔ مولوی صاحب نے جھنجھلا کے کہا کیسی برفی ورفی، تم کو مدرسہ سے ہی نکلوا کر دم لوں گا۔ غرضیکہ ہم سب لڑکوں نے خوشامد کی، ہاتھ پاؤں دبائے اور کہا، ماسٹر جی ہم مارے جائیں گے۔ اسکول سے اگر نکال دئے گئے تو ہماری زندگی خراب ہو جائے گی۔ ہمارے والدین ہم کو گھر میں بھی نہیں رکھیں گے۔ خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ خدا خدا کر کے مولوی صاحب نے معاف کیا۔ ہم نے ان کو مغل کے ہاں سے جو عربک اسکول کے دروازے پر حلوا بیچتا تھا، کھرچن والا گرم گرم حلوا مولوی صاحب کو کھلایا۔ بچارے سیدھے سادے آدمی تھے، ترس آگیا اور کہا اچھا مدرسہ سے نہیں نکلواؤں گا، اب تم ایسی شرارت نہ کرنا۔

(۳) مولوی سید آفتاب حسین کا خاندان پتین ہیٹری ضلع بجنور کے زمین داروں میں سے ہے۔ سادات پتین ہیٹری سادات باہرہ کی شاخ ہے جو موضع سنبھل ہیڑہ سے نکلی ہے۔

مولوی صاحب کے والد سید غازی الدین حسن تھے۔ مولوی صاحب پتین ہیٹری میں پیدا ہوئے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے میر پور پہنچے اور مدرسہ جعفریہ میں داخلہ لیا۔ وہاں کچھ

کتابیں پڑھنے کے بعد میرٹھ گئے اور مدرسہ منصبیہ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ میرٹھ سے لاہور تشریف لے گئے اور وہاں پنجاب یونیورسٹی میں مولوی فاضل کا امتحان دیا، اور تمام پنجاب میں اول نمبر آئے۔ نواب سید سلطان صاحب کی کوشش سے عربک ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہوئے، کشمیری دروازے میں قیام کیا۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ عربک اسکول میں ع۔ بی پڑھاتے تھے۔

مولوی صاحب نہایت سیدھی سادھی وضع سے رہتے تھے۔ انتہائی ذہین، ذکی، متین، خلیق، منکسر مزاج، عابد و متقی انسان تھے۔ آپ نے ایک مسجد اور دینی مدرسہ قائم کیا اور انجمن شیعۃ الصفا دہلی کے بانیوں میں تھے۔ شرعی ڈاڑھی، گورا بھبو کا رنگ، درمیانی قد تھا، چغہ اور بہت ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ سر پہ عمامہ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ آپ جناب مرتضیٰ حسین صاحب بیاںؔ میرٹھی سے ملنے گئے۔ جب آپ مکان پر پہنچے تو آواز دی۔

بیان صاحب نے پوچھا کون ہے، جواب میں مولوی صاحب نے کہا "آفتاب"۔ بیاںؔ صاحب نے کہا مغرب کے بعد آفتاب کیسا۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ مرتضیٰ کے واسطے رجعت کی ہے۔ آپ بہترین واعظ تھے۔ کتب بینی کا بے حد شوق تھا، اکثر راتیں جاگنے میں گذار دیتے تھے۔ مولوی صاحب ۱۳۲۱ھ کو دہلی میں فوت ہوئے۔ درگاہ پنجہ شریف میں دفن ہوئے، خزینۃ التواریخ میں آپ کا یہ قطعہ وفات درج ہے ؎

چو رحلت نمود آفتاب حسینم — محدث خوش اعمال و پاکیزہ طینت

شنیدم تاریخ ہجری ز ہاتف — کہ پنہاں شد آفتاب ہدایت
۱۳۲۱ھ

جناب سید محمد ہارون صاحب نے یہ مصرع تاریخ کہا۔ ع

شد ایں مرقد آفتاب حسین ؏

مولوی صاحب نے اپنی یادگار دو صاحبزادے جناب مولانا سید محمد اور سید حسن چھوڑے۔ مولانا سید محمد صاحب عربک اسکول میں پڑھانے کے بعد دہلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، جادو بیان مقرر ہیں۔ اور آج کل کراچی میں تشریف فرما ہیں۔

(۴) ماسٹر احمد بیگ تھرڈ ماسٹر تھے۔ گلی چنیانی کشمیری دروازہ میں رہتے تھے۔ ساتویں آٹھویں جماعت کو جغرافیہ اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان کی انگریزی دانی مشہور تھی۔ دیسی جوتی، شرعی پائجامہ اس پر کرتا، کرتے پر چغہ، سر پر عمامہ باندھتے تھے، کھلا ہوا گندمی رنگ، آنکھیں درمیانی اور قد بھی درمیانہ تھا۔ بہت غصیل ماسٹر تھے۔ اور تعلیمی معاملات میں بہت ہوشیار اور طبیعت کے اعتبار سے نیک آدمی تھے۔ انسپکٹر مدارس سے تعلیمی سلسلے میں ٹکر لینے سے نہیں چوکتے تھے اور اکثر باتیں ان کی مانی جاتی تھیں۔

ایک دفعہ کوئی انسپکٹر امتحان لے رہا تھا۔ طالب علم سے اس نے کہا تمہارا تلفظ غلط ہے۔ طالب علم نے ماسٹر احمد بیگ صاحب کی طرف دیکھا۔ ماسٹر احمد بیگ انسپکٹر سے اڑ گئے اور منوالیا کہ میرا بتایا ہوا تلفظ صحیح ہے اور جو تم نے بتایا ہے وہ غلط ہے۔

(۵) ماسٹر امتیاز حسین کٹرہ دینا بیگ گلی قاسم جان میں رہتے تھے۔ چھٹی ساتویں کلاسوں کو انگریزی اور حساب سکھاتے تھے۔ بہت خوش مزاج تھے۔ گرگابی کی جوتی، شرعی پائجامہ، کالی اچکن اور کالی ٹوپی اوڑھتے تھے، شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ اساتذہ کا کلام اور ان کے شاعرانہ لطیفے سناتے تھے۔ غالباً خود بھی شعر کہتے تھے۔

(۶) ماسٹر نعمت اللہ صاحب چمڑے والی پہاڑی جتلی قبر پر سکونت رکھتے تھے۔ چوتھی اور پانچویں کلاس کو حساب، جغرافیہ اور اردو کی تعلیم دیتے تھے۔ بڑے چلن کے آدمی تھے، گھر کی سلی ہوئی شیروانی، پیروں میں کالا شو اور سر پر کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ دہلی کے مشہور رنگریز بتی کے صاحبزادے تھے۔ شاید میٹرک تک تعلیم تھی۔

(۷) ماسٹر مکرم شاہ فراش خانہ میں رہائش رکھتے تھے۔ چوتھی اور پانچویں جماعت کو خوش نویسی سکھاتے تھے۔ انگریزی اور اردو کے بہترین خوش نویس تھے۔ عنفوانِ شباب میں ۲۸ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۸) مولوی عمر صاحب کوچہ قابل عطار کے رہنے والے تھے۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ انتہائی غصیل تھے، لیکن ایسے ہی مہربان بھی تھے۔ جب لڑکے شرارت کرتے تو اپنے ہاتھوں سے ان کی ٹوپیاں اتار کر سر پر قمچیاں ہی قمچیاں برساتے تھے اور جب لڑکے سبق

یاد نہیں کرتے تھے اور چھٹی کا وقت آجاتا تھا، یا کلاسوں کی چھٹی ہو جاتی تو آپ اپنی کلاس کی چھٹی نہیں کرتے تھے، اور لڑکوں سے کہا کرتے تھے:

"مت یاد کرو! تمھارے سامنے گھر سے کھانا منگا کر کھاؤں گا۔ تم سب بھوکے مرو۔ تم کو چھٹی نہیں دوں گا۔"

دہلی کالج کے چند شاعر

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کا آخری مرکز مدرسہ غازی الدین خاں یعنی دہلی کالج رہا ہے۔

جہاں اس میں علمی و ادبی مجلسیں جمتی تھیں، تالیف و تصنیف اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، بہترین اور نادر کتابوں کے ترجمے ہوتے تھے اور نامور ادیب اہلِ علم اور اہلِ قلم سر جوڑ کر مشرقی زبانوں کو زندۂ جاوید بنانے کے منصوبے باندھتے تھے۔ وہاں دہلی کے چوٹی کے شاعر، نامی گرامی قادر الکلام استاد اپنی معجز بیانی سے مشرقی زبانوں کو عروج بام پر پہنچانے کے لئے جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے دہلی کالج میں مشاعرہ کرنے کی ٹھانی۔ کامیاب ہوئے اور ایسے تاریخی مشاعرے ہوئے جس کی نظیر دہلی کیا ہندوستان بھر میں اب تک نہیں ملتی۔

ان شعراء کو اُکسانے اور جمع کرنے والے اسی دہلی کالج کے مدرس تھے، جو حساب سکھاتے تھے جن کو لوگ 'منشی فیض پارسا' کہتے تھے[1]۔ پارسا شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں سے تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ افسوس کہ ان کے اِن دو شعروں کے سوا اور کوئی شعر نہیں ملتا ؎

بنت ہے فریاد و فغاں گریہ و زاری ہے مدام   کاش انساں نہ ہمیں حق نے بنایا ہوتا

کوئے الفت کے خاکسار اے دل   مثلِ آئینہ، صاف طینت ہیں

غدر سے ۲۰، ۲۵ برس پہلے کی بات ہے کہ ان ہی منشی پارسا کی کوششوں سے مشاعرہ شروع ہوا، اور مدت تک نہایت کامیابی سے جاری رہا۔ اس سلسلے میں منشی جی نے دہلی کالج کے پرنسپل سے بھی مدد لی۔ اِن دنوں شہر کے دروازے نو بجے بند ہو جاتے تھے۔ مدرسہ

[1] آب حیات ص ۴۸۷

شہر کے باہر تھا۔ گڈھ کپتان سے اجازت لینی پڑتی کہ مشاعرے کے دن دو بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہے۔ چنانچہ اس مشاعرے میں شاہ نصیر، استاد ذوق، مومن، مرزا غالب، آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور ان کے شاگرد جمع ہو کر داد سخنوری دیتے تھے۔ شاہ نصیر نے لکھنؤ میں بعض شعراء کی خواہش و فرمائش پر دو غزلیں کہی تھیں۔ دہلی جب آئے اور مشاعرے میں شریک ہوئے تو یہ دونوں غزلیں پڑھیں۔ ایک مطلع اور دوسری غزل کا یہ شعر تھا ؂

هم بھڑک کر توڑتے تارِ قفس کی تیلیاں — پر نہ تھیں اے ہم صفیرو اپنے بس کی تیلیاں
برہمن اپنے بتوں کو بخدا سجدہ نہ کر — آدم مردہ ہیں بے گور و کفن پتھر کے

ان دونوں غزلوں پر شاہ نصیر کو بہت داد ملی اور مشاعرے میں بہت پسند کی گئیں۔ شعراء نے اپنے شاگردوں کو ان دونوں زمینوں میں غزلیں کہہ کر دیں۔ خیرالدین یاس دہلوی جو استاد ذوق کے شاگرد اور دہلی کے اچھے مانے ہوئے طبیب تھے۔ دوسری زمین میں یہ شعر کہا جو بہت مقبول ہوا[۱] ؂

مرہم سنگِ جراحت نے بھرے اپنے گھاؤ
کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

یہ بات شاہ نصیر کو ناگوار گزری۔ پہلی زمین میں تقریباً پچاس غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں کو دیں۔ انھوں نے وہ غزلیں مشاعرے میں پڑھیں۔ چنانچہ اس مشاعرے میں یہ طے پایا کہ ہر مشاعرے میں طرحی غزل کے ساتھ تیلیوں والی طرح جاری رہے۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور عاشقانِ سخن ایسے سودائی بنے کہ مدت تک زمینِ سخن میں تنکے چنتے رہے۔ یقیناً کسی شاعر کے گھر میں کبھی جھاڑو کی ایک تیلی باقی نہیں رہی ہو گی۔

دوسرے شاعر آٹھ آٹھ نو نو شعر کی غزلیں اسی طرح میں پڑھتے تھے۔ لیکن شاہ نصیر ہر مرتبہ دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتے تھے اور ان کا ہر شاگرد انیس بیس سے کم کے شعر کی کوئی غزل نہیں پڑھتا تھا۔

[۱] گلستانِ سخن مؤلفہ مرزا قادر بخش ص ۱۶۲

اس مشاعرے میں پبلک بھی کافی شریک ہوتی تھی اور جب کہ تیلیوں کی معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا تو پبلک جوق در جوق مشاعرے میں پہنچنے لگی۔ سب کی نگاہیں شاہ نصیر اور شیخ ذوق کی طرف لگی رہتی تھیں۔

آخری مشاعرے کی روئیداد بڑی دل چسپ ہے۔ مشاعرہ شاندار اور کامیاب ہوا۔ شاعر باکمال اپنے شاگردوں کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ خاقانِ ہند استاد ذوق نے ایک قصیدہ اسی زمین میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے زمانے میں لکھا تھا۔ مشاعرے میں پڑھا — جس کا ایک شعر یہ بھی تھا ے

چھت ترے دالان کی نازک بہت ہیں نازنیں   کیا لگائی اس میں ہے پائے مگس کی تیلیاں

شاہ نصیر کے شاگردوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ انھوں نے سمجھا ہمارے استاد پر پھبتی کسی گئی ہے۔ شاہ نصیر کے شاگردوں میں بڑے سیف زبان، پرگو، تیز طبع اور حاضر جواب منشی گھنشام داس عاصی تھے۔ جو شاہ عالم ثانی کے زمانے سے بہادر شاہ تک شاہی دفتر میں ملازم رہے تھے، انھوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا ے

آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہر خدا   یار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں
شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ   باندھیے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں

عاصی کے بعد شاہ وجیہہ الدین صاجزادے شاہ نصیر الدین نے بھی یہ شعر پڑھا ے

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا   ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بزم مشاعرہ درہم برہم ہو گئی۔ مشاعرے کا خواہ نتیجہ کچھ ہی نکلا، لیکن منشی فیض پارسا قابل مبارکباد ہیں کہ ایسے لاثانی مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔

منشی پارسا کی طرح دہلی کالج نے بہت سے شاعر پیدا کیے جن کا ذکر خیر بھی ضروری ہے۔ جن بزرگوں کے تذکروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں، مثلاً مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد صاحبان کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔ دہلی کالج کے ان چند شعرا کے حالات

[1] خم خانہ جاوید جلد پنجم ص ۵۴۲

پڑھئے جو عوام و خواص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔

تعشق علامہ یگانہ فاضلِ زمانہ جناب مولوی سید محمد صاحب شاگرد مولوی رشید الدین خاں مرحوم مدرسہ سرکاری میں سو روپے ماہوار پر مامور تھے۔ عربی پڑھاتے تھے اور صدر مدرس تھے[1]

۱۸۴۳ء میں ان کی جماعت میں آٹھ طالب علم تھے۔ اور یہ کتابیں پڑھاتے تھے۔

میر قطبی الف لیلیٰ پہلی جلد اکیسویں شب سے بیسویں شب تک۔ نفحۃ الیمن دوسرے باب سے آخر تک۔ اصول شاشی، تمام۔ ہدایۃ الحکمۃ، تمام۔ شرح وقایہ، کتاب الزکوٰۃ سے آخر تک (جلد اول)۔ مقامات حریری ۱۸ مقالات اقلیدس۔ پہلے دو مقالے (اردو)۔ براؤن کی کتاب حساب کسور عام تک۔ یلبذی شروع سے تعلیقات تک۔ جغرافیہ ہندوستان۔ مراۃ الاقالیم[2]

حکیم قدرت اللہ صاحب قاسم سے جو آپ کے قریبی رشتہ دار تھے، آپ نے حکمت سیکھی، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے اور حکیم صاحب کو دکھلایا کرتے تھے، ان کو ہمہ دانی کا دعویٰ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جامع الکمالات انسان تھے۔ حکیم عزت اللہ عشقؔ کے آپ داماد تھے، ۷۵ برس کی عمر میں ۱۸۵۷ء میں فوت ہوئے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ زبان میں روانی اور سلاست ہے۔

سنتا ہی نہیں بلبل بیدل کی جو گل آہ
کیا تو نے شگوفہ یہ صبا کان میں چھوڑا

وعدۂ شام تو کیا ہے ولے!
کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر
رحم اے فتنہ گر نہیں آتا

نوائے پیماں شکن وعدہ پہ کس دن میرے گھر آیا
سدا سنتے رہے یوں ہی کہ شام آیا سحر آیا

کہوں کیا حال اے گلرو تری فرقت میں آنکھوں سے
کبھی خونابِ دل ٹپکا، کبھی لختِ جگر آیا

خوب راحت سے جگا کر اس کو لے آئی یہاں
کام آئی ہمدمو! اس آہ کی تاثیر رات

کہتے نہ تھے تعشقؔ مت جاؤ اس گلی میں
آئے نہ وہاں سے دیکھا خوار و تباہ ہو کر

رو یا کیا سحر تک میں رشک سے عزیزو!
ہنستے سنا جو اس کو غیروں سے انجمن میں

---

[1] گلستان سخن ص ۱۰۹ [2] مرحوم دہلی کالج ص ۶۱

کچھ چپکے چپکے کہنا اس کالب و دہن میں ہوتے ہیں دل کے ٹکڑے آتا ہے یاد جس دم

کس پری سے ہے تعشق گرم جوشی ان دنوں

پھر فزوں ہم کو نظر آتی ہے وحشت آپ کی

احمد مولوی احمد علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ تمام علوم سے واقف تھے۔ لیکن دہلی کالج میں بتدیوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ فن حکمت کے بھی ماہر تھے، اور امراض کی تشخیص میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بہت مخلص متین، اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔[1] "چشمۂ فیض" اردو کی قواعد پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو کے شعر دستیاب نہیں ہو سکے۔ فارسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔[1]

ساقی بیا با جامِ مے ایں لطف در جنت کجا آں جا بہارِ دیگر و ایں جا بہارِ دیگر است

اختر امید از برج جلال آمد پدید نیر اقبال بر اوج کمال آمد پدید

شکر ایزد را کہ نخلِ آرزو شد پر ثمر

کوکبِ تابندہ با جاہ و جلال آمد پدید

غافل میر سید محمد خوش نویس دہلی کے سادات کے باعزت اور اہل علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مدرسہ شاہ جہاں آباد دہلی کالج میں طلبار کو خوش نویسی سکھاتے تھے، اور اردو اور ناگری بھی طلبار کو پڑھاتے تھے۔ آپ دہلی سوسائٹی کے سرگرم ممبر تھے۔ ہر مٹنگ میں شامل ہوتے تھے۔ اور سوسائٹی کے مسئلوں میں مضامین بھی پڑھا کرتے تھے۔ آپ نے ۲۸ جون ۱۸۶۲ء کی سوسائٹی کے جلسے میں "حاکم و محکوم کی موانست" پر ایک مضمون پڑھا، جو بہت پسند کیا گیا۔ اور ایک نظم ۱۴ اگست ۱۸۶۲ء کی مٹنگ میں "صفتِ سرما" پر پڑھی۔ حل لغات ناگری میں ایک مبسوط کتاب مفتاح اللغات لکھی اور علم حساب میں لیلاوتی کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔ آپ کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا اور تاریخ گوئی میں زیادہ ملکہ حاصل تھا۔[2] صفتِ سرما پر آپ نے ۴۸ اشعار کی نظم کہی جس کے چند شعر یہ ہیں:

[1] گلستانِ سخن ص ۳۸۱ [2] ایضاً ص ۳۸۲

خدا کے فضل سے سرما کا موسم جب کہ آتا ہے
سب ہی مخلوق کو کیا کیا بہار اپنی دکھاتا ہے
غذا مرغوب اور پوشاک کی کیا قدر ہوتی ہے
خلائق کیسی راحت سے گھروں میں اپنے سوتی ہے
نہ مچھر کی اذیت ہے نہ پسّو ڈنک مارے ہے
شب و روز استراحت سے ہر اک اپنے گذارے ہے
طپش گرمی کی اور برسات کی تکلیف جاتی ہے
نہایت استراحت سے سبھوں کو نیند آتی ہے
سب ہی پیتے ہیں پانی برف کا دن رات بے قیمت
ذرا دیکھو کہ حق کی کس قدر ارزاں ہے یہ نعمت
شبوں کو کام سرما میں خلائق سے جو ہوتے ہیں
باس آسائش سے گرمی میں بھلا سوچو تو ہوتے ہیں
سب ہی موسم میں بیماری کا غلبہ ہے عیاں سب پر
مگر سرما میں صحت سے گذرتی ہے یہ ہی اظہر
دگر نہ قول ہے سب کا سفر پارہ سقر کا ہے
مگر سرما کی سردی میں نہ کچھ باعث خطر کا ہے

ہوا ہے طول نا قابل ختم کر اس جا پہ یہ مطلب
کہ ہو سکتا ہے حق کی نعمتوں کا حصر تجھ سے کب

شیدائی شیدآئی صاحب کا نام ابوالحسن ہے۔ فرید آباد میں مقیم تھے۔ دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے۔ مولانا امام بخش صہبائی مرحوم سے عروض اور فارسی پڑھی اور کچھ دنوں مدرسہ شاہ جہاں آباد (دہلی کالج) میں علم و ہندسہ اور ریاضی میں مہارت پیدا کی، اور خداداد ذہانت کی وجہ سے مدرسے میں وظیفہ بھی پایا۔ آپ کی قابلیت و لیاقت دیکھ کر کالج کے پرنسپل نے آپ کو مدرسہ اکبر آباد کی مدرسی کے لئے منتخب کیا۔ ساٹھ ستر روپے کی تنخواہ پر مامور ہوئے اور عرصے تک وہیں تعلیم دیتے رہے۔

اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلام میں متانت تازگی اور روانی ہے۔

فارسی کے چند شعر دستیاب ہو سکے، وہ ملاحظہ ہوں ؎

صحبتِ یاراں نگیں طبع مارا زندہ کرد
ورنہ شیدآئی دل پژمردہ در بر داشتم

رفتم بزیر خاک و زدم در کفن صبوح
زانرو کہ خوشتر ماست بصبح وطن صبوح

مخوی محمد بیگ مخوی ریواڑی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ یہ نوجوان سلیم الطبع اور فکر بلند تھا۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتا تھا، اور مولانا امام بخش صہبائی

سے تعلیم پاتا تھا۔ شعر اور شاعری میں بھی ان ہی سے اصلاح لیتا تھا۔ نمونہ کلام:

چیر کر دیکھا جو پہلو اس ترے نخچیر کا — دل کی جا سینہ میں پیوستہ تھا پیکاں تیر کا

اثر سے ضعف کی دامانِ یار تک ہمدم — ہزار جائے ٹھہر کر میرا غبار آیا

عالم تھا خدائی تیرے کوچہ میں کل رات — زاہد بھی وہیں سجہ بکف گوشہ نشیں تھا

محوی کو قتل کر کے اب افسوس کیا ضرور — ہونا تھا جو کچھ وہ تو مرے یار ہو گیا

پیکانِ یار دل نے یوں کر رکھا مخفی — رکھتا ہے پاس گویا اک رازِ دلنشیں کو

اب تو لانا م خدا لب پہ کہ محوی اس وقت — تیرے کچھ اور نظر آتے ہیں آثار مجھے

محوی کو اس گلی سے لے آئیں گے اٹھا کر — دو چار یار مل کر تکلیف اگر کریں گے

اس کی گلی سے کل تو لائے قضا کے منہ سے
جاتا ہے آہ محوی پھر آج تو وہیں کو

اثر عبد الرزاق خلف منشی عبد الرحمن تمنا ذہین اور خوش اخلاق نوجوان تھا۔ دہلی میں بہت مدت تک شہید فرنگ مولانا امام بخش دہلی کی خدمت میں حاضر رہ کر فارسی پڑھی اور (دہلی کالج میں) ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ تذکرہ گلستانِ سخن کی ترتیب کے وقت ان کا عالم جوانی تھا۔ کلام پر لطف اور پاکیزہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

مجھے تو جلنے پہ بھی زندگی غنیمت تھی — فلک نے مثلِ چراغ اب بجھا دیا مجھ کو

سوزش سے حشر تک وہ زمیں ہو کبھی نہ سبز — جس جا ہمارے آبلۂ پا کا آب ہے

پہلو میں درد، سینہ میں چاک، اشک آنکھ میں — مجھ سے تو کہہ اثر کہ ترا دل لگا کہیں

تیرا ہر اک سے ملنا بتِ وفا دشمن — کرے گا دیکھئے کس کس سے آشنا مجھ کو

ہوئی بدولتِ ضعف آہ سے بھی خاطر جمع — اثر پہ جس کے کچھ اک اعتبار تھا مجھ کو

خواہش ہے میرے دستِ جنوں کو بہار کی — اور آرزو ہے آبلۂ پا کو خار کی

ہوں کامیاب لعلِ لبِ یار سے عدو — حسرت نہ نکلی آہ دلِ سوگوار کی

کیا جانتا تھا وہ کہ ستم کیا ہے جور کا — باتیں ہیں سب یہ اس دلِ الفت شعار کی

وحشت تو دیکھئے کہ پسِ مرگ بھی مری — جنگل میں اڑتی پھرتی ہے مٹی مزار کی

تم اور عیش بادہ و اغیار ہم نشیں | ہم اور مصیبت آہ پہ شبہائے تار کی
اے حضرت آخر کہیں عاشق ہیں آپ جو | یوں خاک اُڑاتے پھرتے ہو تم کوہسار کی
میں اور یار شب ماہتاب ہے | یارب مجھے خیال ہے یا یہ کہ خواب ہے
اے چشم اس کے سامنے رو کر نہ ہو سبک | انسان کی آبرو جو ہے موتی کی آب ہے
پامالِ غیر ہے مری نعش اس گلی میں آج | مر کر بھی میری خاک پہ کیا کیا عذاب ہے
عشقِ بُتاں میں خاک بسر ہے تو اے آخر | دُنیا خراب اور تیرا دیں بھی خراب ہے
یک دن فاتحہ پڑھتا تھا کسی قبر پہ وہ | حیلہ اک اور بھی باقی ہے سو مر دیکھیں گے

گر چال کا نام آتا ہے آتی ہے قیامت
مضموں تری رفتار کا باندھا نہ کریں گے

بسمل پنڈت موتی لال دہلوی نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ کالج کے ہونہار طالب علم مانے جاتے تھے۔ انگریزی کی اچھی استعداد تھی۔ سرٹی مٹکاف اور گنیر کے میڈل انگریزی زبان میں آپ نے لئے۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں کالج میں اسکالرشپ پاتے تھے۔ ان کے وظیفے کی مدت کو بڑھانے کے لئے سفارش کی گئی تو منظوری دیتے وقت خصوصیت کے ساتھ آپ کے متعلق یہ الفاظ لکھے گئے تھے کہ:

"وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ہے کیوں کہ انگریزی سیکھنے میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنے فرصت کا وقت ترجمہ کرنے اور اُردو رسالوں کے مرتب کرنے میں صرف کرتا ہے۔"

۱۸۵۰ء میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد لاہور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے فارسی ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے تھے۔ کئی سال حکومت پنجاب کے میر منشی رہے۔ پھر اکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ جج ہو گئے تھے۔ پلوٹارک کے تذکرہ سرو کا ترجمہ اردو میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی ایما پر کیا۔ جس کو سوسائٹی نے شائع کرایا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک شاعروں کا تذکرہ بھی لکھا تھا۔ تعلیم نسواں اور صغر سنی کے مضامین کے صلے میں سرکار سے طلائی تمغہ انعام میں ملا تھا۔ مسمریزم کی دو کتابوں کا انگریزی سے آپ نے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

ججی سے پنشن پانے کے بعد گجرات میں رہنے لگے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں ۶۲ سال کی عمر میں لاہور میں فوت ہوئے۔ کشمیری پنڈت تھے، اردو اور فارسی پر پورا عبور تھا[1]

رند مشرب تھے، اردو شاعری کی طرف بھی توجہ دی۔ زبان سلیس اور شیریں ہے، انداز بیان بھی والہانہ ہے[2]:

یہ سمجھے دیکھ کر ہم خالِ لب اس آفت جاں کا — بجائے خضر زنگی پاسباں ہے آبِ حیواں کا

بہت سا فرق تجھ میں اور ان میں ہے نکر دعویٰ — مہ نو ہمسری ناخن و ابروئے جاناں کا

بہا دیں اشک کے طوفاں سے کشتی نوح کی بھی ہم — اٹھا دیں ایک پل کو ہم جو پردہ چشم گریاں کا

چمن میں سرو کہتے ہیں تمہارے سایۂ قد کو — فلک پر چاند رکھا نام عکسِ روئے تاباں کا

عاقبت تک رہے پابستۂ زنجیر بلا — دیکھ پائے جو تری زلفِ گرہ گیر کے بل

گھر پہ آتے ہی تیرے پاس سے مڑ جاتا ہوں

بس ادھر آتا ہوں اور ادھر جاتا ہوں

آرام

منشی شیو نرائن آرام کے بزرگ آگرہ کے قدیم رہنے والے تھے۔ کایستھ خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے والد منشی نند لال تھے اور دادا بنسی دھر مرزا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے جائیداد کے منصرم تھے۔ چنانچہ مرزا غالب اس خاندانی دوستی کا ذکر اپنے ایک خط میں کرتے ہیں:

"برخوردار نورِ چشم شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دل بند ہو اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال معلوم ہے۔ مجھ سے سنو۔

"تمہارے دادا کے والد نجف خاں دھمدانی ہیں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو۔

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۵ [2] خم خانہ جاوید جلد اول ص ۵۸۹

تمھارے دادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہیں کی، یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر خانصاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے جو "کیٹھم گانو" اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو منشی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں، اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس کی میری ہی عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی، چونکہ ان کا گھر بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازہ کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی۔

"... واصل خاں نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور وہ کٹڑہ کا کرایہ اُن کے پاس جمع کرتا تھا"

منشی شیونرائن ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو، فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ انگریزی مشہور لغت نویس ڈاکٹر فیلن سے پڑھی۔ دہلی کالج میں بھی آپ نے تعلیم پائی۔ اور دہلی کالج میں غدر سے قبل پروفیسر بھی رہے۔ ۱۸۵۶ء میں مفید خلائق پریس جاری کیا تھا، اور نومبر ۱۸۵۶ء میں مفید خلائق نکالا تھا۔[۵] چنانچہ گارسان دتاسی اپنے ۶ فروری ۱۸۶۱ء کے خطبے میں لکھتا ہے:

"مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ آیا آگرہ کا ہندوستانی گزٹ دوبارہ چھپنا شروع ہوا یا نہیں ہاں ایک رسالہ مفید خلائق کے نام سے شائع ہوتا ہے، اس کے ایڈیٹر شیونرائن ہیں جو دہلی کالج کے پرانے طالب علم ہیں۔ شورش عظیم (یعنی غدر سے پہلے یہ اس کالج میں

۵۔ خطبات دتاسی ص ۱۱۳

پروفیسری کی خدمات انجام دے چکے ہیں، انھوں نے انگریزی سے کئی اردو ترجمے بھی کئے ہیں۔"

دتاسی نے ۲ دسمبر ۱۸۶۸ء کے خطبے میں بھی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت مفید خلائق پر تبصرہ کیا ہے:

"مفید خلائق بھی چل رہا ہے، اس کے اڈیٹر شیونرائن کا شمار اردو کے اچھے لکھنے والوں میں ہے۔ آپ یہ کرتے ہیں کہ اردو کے پہلو بہ پہلو ہندی زبان کے مضمون بھی شائع کرتے ہیں۔ ہندی کے مضامین سُروپ کارک کے عنوان کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ان سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہندوؤں کو خوش کریں جو مسلمانوں کی زبان سے اپنی زبان کو تحریر کے ذریعے الگ کرنا چاہتے ہیں۔"

مفید خلائق پریس کافی عرصے تک چلا۔ اس میں بہت سی کتابیں اور اخبارات چھپتے تھے۔ چنانچہ معیار الشعراء جو ۱۸۵۲ء میں آگرہ سے نکل رہا تھا، جو ایک ادبی رسالہ تھا اور جس کو منشی قمرالدین قمرؔ اور گلاب خاں ہفتے میں دوبار نکالتے تھے۔ جس میں قدیم و جدید شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ یہ پرچہ ۱۸۵۶ء میں منشی شیونرائن کے مفید خلائق پریس میں چھپنے لگا تھا۔ اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ اخبار جس پریس میں چھپتا تھا اسی پریس کے مہتمم کے ذمے اخبار کا تمام انتظام ہوتا تھا۔ اور خط و کتابت بھی پریس کے پتے سے ہی ہوتی تھی۔ معیار الشعراء ایک کامیاب ادبی پرچہ تھا۔ ہر شاعر کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ میرا کلام اس پرچے میں شائع ہو جائے۔ چنانچہ مرزا غالبؔ مرحوم نے منشی شیونرائن کو اپنے ایک دوست کے کلام شائع کرنے کے لئے ایک خط میں لکھا ہے:

"اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رام پور کے ہاں تمھارا اخبار معیار الشعراء جاتا ہے یا نہیں، اب کے تمھارے معیار الشعراء میں یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہیں چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے۔ امیرؔ تخلص کرتے ہیں، لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں، ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں

غالب نے ہمارے پاس بھیجی ہیں اور ان کے لکھنے سے ان کا نام اور سن کا حال جو میں اوپر لکھ رہا ہوں اس کو معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک یا دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور اس کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھو کہ :

"در رام پور بدولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد"

اور مجھ کو اس امر کی اطلاع دو کہ رام پور کو تمھارا اخبار جاتا ہے کہ نہیں۔ مرسلہ یک شنبہ ۱۲ /جون ۱۸۵۹ء"

۱۸۶۱ء میں ایک ماہانہ رسالہ 'بغاوتِ ہند' بھی آگرہ سے نکلنا شروع ہوا، جس کے اڈیٹر مکند لال تھے[۱]۔ یہ رسالہ بھی مفید خلائق پریس میں چھپتا تھا۔

مرزا غالب کو جب یہ اخبار اور رسالے وصول ہو جاتے تھے تو ان کی وصولیابی کی اطلاع ضرور دیتے تھے اور اگر نہیں ملتے تھے تو نہ ملنے اور نہ بھیجنے کا گلہ و شکوہ فرماتے تھے۔ اور ان اخباروں کے خریدار بھی بنانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ منشی جی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"نہ میرے خط کا جواب نہ ہنڈی کی رسید، برخوردار نواب شہاب الدین خاں نے اگست سے دسمبر تک کے پنج ماہہ معیار الشعرا اور بغاوتِ ہند کا بھیجا ہے یعنی ۱۲/ مجھ کو دئے اور میں نے ہنڈی لکھوا کر وہ اپنے خط میں لپیٹ کر تم کو بھیجی ہے[۲]"

منشی جی کے اخبار اور ان رسالوں میں اور شعرا کے علاوہ مرزا غالب مرحوم کی بھی نظمیں اور غزلیں اور قطعے چھپتے تھے۔ چنانچہ غدر کے بعد ڈپٹی کمشنر کے اعزاز میں چراغاں ہوا۔ ایک قطعہ پندرہ بیت کا آپ نے کمشنر کو بھیجا، اس کی نقل منشی جی کو بھیجی کہ تمھارا جی چاہے اس کو چھاپ دو۔ اس کے مطلع کا بند یہ تھا :

[۱] خطباتِ دتاسی ص ۳۰۶ [۲] اردوئے معلی ص ۲۷۹

سخن سنج غالب ز روئے عقیدت　　دعا می کند در بہارِ چراغاں

کہ بادا فزوں سالِ عمرِ شہنشہ　　بروئے زمیں از شمارِ چراغاں

یہ ہی وہ منشی شیونرائن ہیں جنھوں نے حضرت غالب سے ان کے دیوان چھاپنے کی خواہش کی اس کے باوجود کہ مرزا غالب نے ضیاء الدین کے اصرار پر ان کو دیوان رام پور سے منگوا کر چھاپنے کے لئے دے دیا تھا۔ اور انھوں نے اس کے چھاپنے کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ اس واقعے کے ظاہر کرنے کے بعد مرزا غالب مرحوم لکھتے ہیں :

"اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع (مفید خلائق) چھوڑ کر پرائے چھاپہ خانہ میں کتاب کیوں بھجواتا۔ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا ہے اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے اگر چھاپہ شروع نہوا ہو نہ چھاپا جائے۔ اور دیوان جلد میرے سامنے بھیجا جائے اگر دیوان آگیا تو فوراً تمھارے پاس بھیجوں گا، اگر وہاں کاپی شروع ہوگئی تو میں ناچار ہوں، میرا قصور نہیں ہے۔"

چنانچہ جب وہ دیوان آگیا تو فوراً مرزا صاحب نے روانہ کر دیا اور لکھ دیا :

"چاہے اپنے پاس رکھو، کسی کو دے ڈالو۔ چاہے پھاڑ کر پھینک دو۔"

یہ تھے منشی شیونرائن اور مرزا غالب مرحوم کے تعلقات۔ اگر دتا سی کو اس مخلصانہ دوستی کا علم ہوتا تو مفید خلائق کے اردو ہندی چھاپنے کے بارے میں غلط رائے نہیں دیتے، اور منشی جی کے اس فعل کو فریب سے تعبیر نہیں کرتے۔

منشی شیونرائن کے مفید خلائق پریس ہی میں مرزا غالب کی تصنیف دستنبو چھپی اور ان ہی کے ہاتھوں فروخت ہوئی۔

منشی جی میونسپل بورڈ آگرہ کے سکریٹری تھے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے ان کو رائے بہادری کا خطاب ملا تھا۔ آپ اردو اور ہندی کے بہترین ادیب تھے۔ حسب ذیل کتابیں ترجمہ کیں اور تالیف فرمائیں :

(۱) تذکرہ دیماس تھنیز (ڈیلو مارک) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ (۲) ہندوستان کا

ایک جغرافیہ اردو میں لکھا (۳) ارفورٹ کے رسالے میں علم طبیعات کا ترجمہ بشرکت سروپ نرائن کیا (۴) بقول مالک رام صاحب "ایک کتاب قصہ قاصدان شاہی بھی لکھی۔ خدا معلوم کہیں سے شائع ہوئی یا نہیں" (۵) مفید الانشا منشی امین الدین کا ہندی میں ترجمہ کیا۔

مرزا غالب کے یار غار اور رسا تھی اور شاعر نہ ہوں اور اگر شاعر ہوں تو ان کے چند شعر ہوں۔ افسوس ان کا کلام بھی کسی کو دستیاب نہیں ہو سکا۔ صاحب خم خانہ جاوید جیسے محنتی اور جفاکش اور کھوجی ان کے کلام کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ منشی شیو نرائن شاعر تھے اور اچھے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی یادگار یہ ایک مختصر سی غزل رہ گئی ہے:

وہ چاہیں جس قدر جور و جفا ہم پر کریں لیکن ہمیں تسلیم لازم ہے کہ پابند رضا ٹھہرے

یہ دنیا ایک سرا ہے اس کو آخر چھوڑ جانا ہے اگر دو چار دن آ کر یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

ادھر آنے کو وہ ہیں اور ادھر وقت سفر آیا عجب مشکل نہ وہ آئیں نہ دم بھر کو قضا ٹھہرے

اسی کو زندگی کا لطف ہے اس دہر فانی میں کہ جو نزدیک اچھوں کے بھلا اور با خدا ٹھہرے

قیام اپنا ہو اس محنت سرائے دہر میں کیونکر جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھہرے

منشی شیو نرائن کا ۶۴ برس کی عمر میں اگست ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا۔

صہبائی

مولانا امام بخش صہبائی جو دہلی کالج کے مخصوص استادوں میں سے تھے، ان کے حالات تو کافی کتابوں میں ملتے ہیں اور ان کے فارسی کے اشعار بھی دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن اردو کا کلام نہیں ملتا تھا۔ میں نے جستجو کی ــــ ایک روز اتفاقاً بحر الفصاحت مولوی حکیم محمد نجم المغنی کی تالیف کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس میں مولانا صہبائی کے تین شعر نظر پڑ گئے۔ صنائع معنوی میں ایہام کی مثال میں مولانا صہبائی کا یہ شعر درج ہے اور اس کی تشریح بھی کی گئی ہے:

دیکھنا منھ لال ہو جائیں گے کس کس کے ابھی
سامنے میرے جو برگِ سبز یاں تو نے دیا

یہاں مقصود بطریق ایہام کے حاصل ہوتا ہے، اس لیے کہ منھ لال ہونے کے دو معنی ہیں، ایک قریب یعنی منھ کا سرخ ہونا بسبب پان کے۔ اور دوسرے بعید یعنی منھ کا لال ہونا طمانچوں سے اور ایہام اسی کو کہتے ہیں کہ سامع کا خیال معنی قریب کی طرف جاوے اور قائل کی مراد معنی بعید

ہوں ۔ لے

دوسری جگہ صنعت تجریہ کی مثال دیتے ہوئے حکیم صاحب لکھتے ہیں: " جس چیز سے کوئی چیز اسی صفت کی حاصل کریں اس کے ساتھ حرف سے کہ اردو میں او کا ترجمہ ہے ذکر کریں جیسے :

آتشِ غم ایسی کچھ بھڑکی کہ پل میں ہو گیا
داغِ دل سے آفتاب روزِ محشر آشکار

اس جگہ دل کے داغ کی سوزش میں مبالغہ منظور ہے یعنی داغ دل کا سوزش میں اس مرتبے کو پہنچا ہے کہ اس سے آفتاب حاصل ہو گیا ہے۔ لے تیسرا شعر ملاحظہ ہو: لے

مجھے دیکھ کر تیغ کو دیکھتے ہیں
غرض یہ کہ ہو خون ناحق کسی کا

گمنام

بانیان دار العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے دہلی کالج میں شعبۂ مشرقیہ کے صدر مدرس مولانا مملوک علی سے تعلیم پائی ۔ لے

مولانا یعقوب تخلص گمنام ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ مولانا مملوک علی کے صاحبزادے تھے۔ دہلی کالج سے تعلیم پانے کے بعد آپ اجمیر کے اسکول میں ملازم ہوئے۔ پرنسپل نے آپ کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر آپ سے بغیر پوچھے گورنمنٹ کو سفارش کر کے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ منظور کرا لیا۔ جب آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے تعلیم و تدریس کو مقدم سمجھ کر اس کو منظور نہیں کیا۔ اجمیر سے بنارس اور بنارس سے رڑکی میں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں سے ڈپٹی انسپکٹری پر سہارنپور تشریف لے آئے۔ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد غدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے فرو ہونے کے بعد آپ کو سہارن پور کے اسکول سے چھ مہینے کی تنخواہ نو سو روپے بھیجی گئی اور ملازمت پر بلائے گئے۔ آپ نے وہ نو سو روپے واپس کر دئے اور کہا کہ میں نے ان چھ مہینے میں کچھ کام نہیں کیا۔ اس لئے اس تنخواہ کا میں

لے بحر الفصاحت ص ۹۲۷ لے ایضاً ص ۹۴۹ لے ایضاً ص ۹۵۳
لے خطبات مولانا عبید اللہ سندھی ص ۲۱۴

مستحق نہیں ہوں ؎۱

۱۲۸۴ھ میں دیوبند کے مدرسے کا خاکہ بنایا جا رہا تھا، اس وقت مولانا قاسم کی چٹھی پہنچی کہ آپ دیوبند تشریف لے آئیے۔ چنانچہ جب دیوبند کے چھتے کی مسجد میں مختصر سا مکتبہ قائم ہو گیا تھا اور ۲۱ طالب علم تھے آپ اس کے سب سے پہلے مدرس مقرر ہوئے اور ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت کو لات مار دی اور ۳۰ روپے تنخواہ لینی منظور فرمائی۔

جب مدرسہ کچھ چلنے لگا تو مولانا جمال الدین شوہر والیہ ریاست سکندر جہاں بیگم (بھوپال) جو مولانا مملوک علی صاحب مرحوم و مغفور کے شاگرد تھے، ان کی خواہش ہوئی کہ استاد زادہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو تین سو روپے پر ریاست میں بلا کر حق شاگردی ادا کریں۔ آپ کو جب اس مضمون کا خط پہنچا تو آپ نے بھوپال جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور مولانا جمال الدین کو لکھا: "لا حاجتہ فی یعقوب الا قضاھا" یعنی یعقوب کی جو دلی حاجت تھی وہ پوری ہو چکی کہ بقدر ضرورت معاش کے ساتھ اہل اللہ کا قرب اور علم دینی کی خدمت نصیب ہو گئی لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں ہے ؎۲

جب مولوی یعقوب صاحب مراد آباد تشریف لے جاتے تو امیر شاہ خاں صاحب اور حافظ عطاء اللہ چھتاری سے آپ کی خدمت میں جاتے تھے۔ نواب محمود علی خاں آف چھتاری جب مولانا کا نام اور ان کی ملاقات کا تذکرہ سنتے تو ان حضرات سے کہا کرتے تھے کہ کسی طرح مولانا یعقوب صاحب کو یہاں لاؤ۔ ایک مرتبہ مولانا صاحب سے امیر شاہ نے عرض کیا کہ حضرت نواب صاحب کی بے حد خواہش ہے کہ آپ ایک مرتبہ چھتاری تشریف لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے پاس جاتا ہے تو نواب صاحب اس کو سو روپے دیتے ہیں۔ ہمیں نواب صاحب خود بلاتے ہیں اس لئے شاید دو سو روپے دیدیں۔ دو سو روپے کتنے دن کے ہوں گے۔ اس طرح ہم وہاں جا کر مولویت کے نام کو دھبہ نہیں لگائیں گے ؎۳

مولانا یعقوب شاعری بھی فرماتے تھے۔ اس علمیت کے بعد اور ایسے باپ کے بیٹے

؎۱ مکتوبات مولانا یعقوب ص ۹ ؎۲ تذکرۃ الخلیل ص ۶۵ ؎۳ امیر الروایات ص ۱۷۰

ہوتے ہوئے کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ آپ نے بڑا طویل خمسہ چشتیہ خاندان کا لکھا ہے[1]:

شیخ کو مسجد ہوئے اور شمع کو بت خانہ نصیب — کر طلب کا اپنی مجھ کو جوشِ مستانہ نصیب
خلق کو ہوتا ہے حج زیارت خانہ نصیب — کر مجھے اپنی مدد سے حج مردانہ نصیب
حاجی امداد اللہ ذوالعطا کے واسطے

بس چھڑا دے نفسِ شیطاں سے الٰہی دل مرا — کر مشرف عشقِ رحماں سے الٰہی دل مرا
پاک کر ظلمتِ عصیاں سے الٰہی دل مرا — کر منور انورِ عرفاں سے الٰہی دل مرا
حضرت نورِ محمد پر ضیا کے واسطے

صدّیق

منشی محمد صدیق دہلوی ۶ فروری ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ گلی میر جملہ لال کنواں دہلی میں رہتے تھے۔ آپ کا نسب حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا، جن کا شمار عشرہ مبشرات میں ہے۔ آپ کے پردادا شیخ رحیم اللہ اور دادا کریم اللہ عہد مغلیہ میں شہزادوں کو فنِ تیر اندازی کی مشق کرایا کرتے تھے۔

آپ کے والد منشی محمد ابراہیم طبابت کرتے تھے اور نقاشی میں بھی خوب دسترس تھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں نواب سلطان دولھا مرحوم کے عہد میں ممتاز تھے۔

منشی صدیق نے عربک ہائی اسکول میں تعلیم پائی، اس کے بعد مولانا عبدالغنی صاحب مرحوم سابق صدر مدرس مسجد فتحپوری سے فارسی پڑھی۔

منشی صدیق صاحب کو شروع سے شاعری کا شوق تھا۔ اس ذوق نے تعلیم کی بھی تکمیل کرنے نہیں دی اور مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی مرحوم کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا۔ آپ نے قومی نظمیں بھی کہیں جو کثرت کے ساتھ اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ طبیعت کو شعر گوئی سے مناسبت ہے۔ زبان صاف ہے اور بیان پر قدرت ہے، بول چال اور زبان کا چسکا بھی موجود ہے:

[1] ارشادِ مرشد ص ۵۶

زاہد شراب پی کہ ہے موسم بہار
سایہ ہے سر پہ رحمتِ پروردگار کا

ظلم اتنا تو ذرا بانیٔ بیداد نہ کر — بند فریاد سے پہلے لبِ فریاد نہ کر
نہیں منظور رہائی نہ رہا کر لیکن — بے پر و بال قفس میں مجھے صیاد نہ کر
کوئی اٹھا بھی بیمار تمہارا ہو کر — جاؤ بھی نام ڈبویا ہے مسیحا ہو کر

دہلی میں لوٹ زاہد، حسن بہارِ جنت
حوروں سے بھی حسین تر پریاں ہیں چاوڑی میں

سناؤں تمہیں دل کا میں مدعا کیا — کہوں کیا میں تم سے کہ کیا چاہتا ہوں
ستم کی ادا میں ہو شانِ کرم بھی — جفا کرنے والے، وفا چاہتا ہوں

مجھے کیا انقلاب آسماں کا اعتبار آئے
نہ میں بدلا، نہ وہ بدلے، نہ کچھ طرزِ جفا بدلی

کچھ اس طرح شباب کی دنیا گذر گئی — معلوم ہی نہیں کدھر آئی کدھر گئی

دخترِ رز نے تجھے زاہد کبھی چھونے نہ دیا
اس سے بڑھ کر بھی کوئی صاحبِ عصمت دیکھی

گوہرِ مضموں سے اے صدیق پائی آبرو — فیضِ راسخ نے مجھے اتنا سخنداں کر دیا

اہلِ تقویٰ بھی ہیں محشر میں گنہ گار بھی ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کس پر ترا احساں ہو گا

محمود ۱۸۹۰ء میں جب درس گاہ غازی الدین خاں میں عربک ہائی اسکول کھولنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس وقت اس اسکول کی شہر میں دو شاخیں تھیں ایک شاخ گلی شعبان رودگران میں تھی جس میں تیسری کلاس تک تعلیم دی جاتی تھی۔ پہلی کلاس کو نواب مرزا مظفر مرزا جو کہ چھتہ فراش خانہ میں رہتے تھے۔ دوسری کلاس کو محمود مرزا اور تیسری جماعت کو نواب اکبر مرزا پڑھاتے تھے۔ دوسری شاخ اکرام اللہ صاحب مرحوم سب رجسٹرار کے مکان مرکیوالان میں تھی۔

جس میں ماسٹر باقر حسین جو شہزادوں میں سے تھے اور کوچۂ چیلان میں رہتے تھے۔ ماسٹر محفوظ علی، مولوی عمر علی اور ماسٹر نعمت اللہ چوتھی اور پانچویں جماعت کو پڑھاتے تھے۔ یہ شاخ ۱۸۹۴ء میں ٹوٹ گئی تھی اور دونوں کلاسیں چوتھی اور پانچویں ہائی اسکول میں پڑھائی جانے لگیں، رودگران کی شاخ قائم رہی۔

ان شاخوں اور ہائی اسکول کے ماسٹروں میں ایک ماسٹر نواب محمود مرزا شاعر تھے۔ جن کو شعر کہنے اور سمجھنے کا شوق اور ذوق تھا۔ یہ نواب واجد علی شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان کو وثیقہ ملتا تھا۔ مرزا جی میر مہدی مجروحؔ کے شاگرد ہیں، ان کو یہ دو شعر یاد ہیں:

برا مانئے مت مرے دیکھنے سے　　تمھیں حق نے ایسا بنایا تو دیکھا

ساتھ پینا شراب لے لے کے
ساقیا مجھ کو یاد آتا ہے

شعلہ

منشی محمد خلیل الرحمٰن خلف جناب محمد عوض خاں صاحب مغفور یکم جنوری ۱۸۹۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مغلیہ بادشاہوں کے کسی امیر کے ہاں اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔ آپ کا خاندان مدت دراز سے دہلی میں محلہ بلی ماران کٹرہ بجواڑیاں میں سکونت پذیر تھا۔ آپ نے اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۴۷ء تک آپ دہلی کے پوسٹ آفس میں ملازم رہے ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد کراچی تشریف لے گئے۔ آپ پہلے میر شرافت علی صاحب کشتہؔ کے شاگرد ہوئے، جناب کشتہؔ کے فوت ہونے کے بعد آپ نے جناب نوح ناروی صاحب سے اصلاح لینی شروع کی، آپ جناب نوح ناروی کے مخصوص شاگردوں میں ہیں۔

جناب شعلہ نہایت خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ دہلی کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ آپ کے کلام میں امیر مینائی کا رنگ نمایاں ہے۔ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا شوق ہے، خوب کہتے ہیں:

میری قضا سے چونک کے پوچھا عدو نے کون　　اس نے کہا۔ کوئی نہیں، اک دل فروش تھا
بعد فنا کوئی بھی نہ رویا سرِ مزار　　اک شمع چراغ گورِ سودہ بھی خموش تھا

بچپن سے روتے آئے نہ ہم زار زار کب ۔۔۔ ہاں موتیوں کا پہنا نہ شعلہ نے ہار کب

آتے ہی میرے گھر میں انھیں نیند آگئی ۔۔۔ میرے نصیب جاگیں گے پروردگار کب

دردِ فراق، رشکِ عدو، یاس، بے کسی ۔۔۔ چاروں ہوئے نہ ہجر میں مجھ سے دوچار کب

ہمارے قلب و وحشت دوست کو تسکیں کیا ہوگی

لباسِ زندگی کی ہم نہ جب تک دھجیاں کرلیں

حیا کی، نازکی، رفتار کی، گفتار کی صورت ۔۔۔ مصوّر کس طرح کھینچے ادائے یار کی صورت

تعجب ہے کہ اس صورت پہ ہو انکار کی صورت ۔۔۔ تمھاری شکل کہتی ہے کہ میں ہوں پیار کی صورت

ہمیشہ کوہ و صحرا کے بہت تنکے چُنے ہم نے

چمن کے چار پتوں کو بھی زیبِ آشیاں کرلوں

فنا پہ بھی غمِ بے مائیگی نہ مجھ کو رہا ۔۔۔ بگولے آئے کفن دینے دشتِ غربت میں

عمرِ شباب چشم زدن میں گذر گئی ۔۔۔ بادِ نسیم تھی، ادھر آئی ادھر گئی

وہ جو ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے کہ ہے قبرِ شعلہ کی کس طرف

انھیں بے کسی نے بتا دیا یہ مزار ہے یہ مزار ہے

شورؔ — جناب رشید احمد قریشی شاگرد حکیم حنیف علی رعبؔ شاگرد جلالؔ لکھنوی نے عربک ہائی اسکول دہلی میں تعلیم پائی۔ شعر گوئی کی طرف قدرتی میلان تھا۔ کلام ملاحظہ ہو:

تم قابلِ خطاب تو سمجھے بھلا مجھے ۔۔۔ اچھا برا ہوں میں، کہے جاؤ برا مجھے

میں اور تشنہ کام رہوں تیرے دور میں ۔۔۔ آنکھوں کا صدقہ جام دے اے ساقیا مجھے

چلنے کو ناز برق اُٹھائے، مری بلا! ۔۔۔ کیا کم ہے تیرا خندۂ دنداں نما مجھے

نہ کھلتا کہ یہ دل بستگی کیوں ہے اذیت سے ۔۔۔ جو دل چیرا تو نکلے اس میں تیرے تیر کے ٹکڑے

آوارگی نہ جائے گی جب تک ہے دم میں دم

وحشت میں ہر نفس ہے سمند ہوا مجھے

راشدؔ — علامہ راشد الخیری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ مصورِ غم ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔ آپ نے دہلی عربک اسکول

میں تعلیم پائی تھی، آپ کی انگریزی قابلیت پر کلاس ماسٹر مرزا احمد بیگ اور ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین فخر کرتے تھے۔ انٹرنس آپ نے اسی اسکول سے کیا۔ جہاں مولانا کی نثر رونے رُلانے والی ہے۔ وہاں مولانا کے شعروں میں بھی یہ تاثیر ہے کہ پڑھنے والے کو بے چین کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ مولانا پیدائشی شاعر تھے۔ مگر اس کی طرف انھوں نے توجہ نہیں کی۔ جب کہنے پر آتے تھے تو ایک ہی نشست میں پوری کی پوری نظم روانی کے ساتھ لکھواتے چلے جاتے تھے۔ انھیں جذبات نگاری اور منظر کشی کا خداداد ملکہ تھا[۵]

"آمنہ کالال" کتاب میں مولانا عرب کی جاہلیت کے زمانے کا نقشہ کھینچتے ہیں:

انصاف لُٹ چکا تھا، ایمان لٹ چکا تھا
الطاف و مہر کیسی رحم و کرم کہاں کا

مفلس کی تھی مصیبت، کمزور پٹ رہا تھا
ظالم کے بیس بسوے اندھیر مچ رہا تھا

انسانیت کے جوہر کونوں میں رو رہے تھے
رحم و کرم کے پُتلے قبروں میں سو رہے تھے

اُلٹی چھری سے ذبح انسانیت ہو رہی
نفسانیت شرارت گھٹی میں پڑ گئی تھی

عیاشی، بدمعاشی معمولی دل لگی تھی
دن رات کا جُوا تھا ہر وقت مے کشی تھی

ظلم و ستم کے جھنڈے ہر سمت گڑ رہے تھے
حیوانیت کے پردے عقلوں پہ پڑ رہے تھے

مظلوم کی غلامی دوزخ کا تھا فسانہ
گردن پہ گرم لوہے کپڑا تھا اور نہ کھانا

بیدوں کی تھی گواہی بازو دست شانہ
اس ظلم پر تشدّد تھا اس کا لب ہلانا

یہ زندگی کے دکھڑے یہ درد یہ مصیبت
اور آنکھ کا اشارہ تھی زندگی کی قیمت

عورت کنیز بن کر دُنیا میں جی رہی تھی
خونِ جگر کے ٹکڑے خاموش پی رہی تھی

فطرت یہ بھی سمجھ کر ہونٹوں کو سی رہی تھی
مردے سے تھی وہ بدتر کہنے کو جی رہی تھی

سکھ اس طرح ہوا تھا آخر حرام اس کو
اور مرد جانتا تھا لونڈی غلام اس کو

اندھے کنوئیں عرب کے دامانِ کوہ و صحرا
شاہد ہیں اس ستم کے جو لڑکیوں پہ ٹوٹا

صورت کی بھولی بھالی باتوں کی جیسی مینا
زندہ رہیں گڑھوں میں، دم تک مگر نہ مارا

[۵] ساقی دہلی کا راشد الخیری نمبر ستمبر ۱۹۳۶ء

عورت کی ہر حقارت تھی مرد کو گوارا ۔۔۔ گلے کا جانور تھی دانہ تھا اور نہ چارا

جب حضور آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں دائی حلیمہ سے جنگل میں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور دائی حلیمہ اس پریشانی میں آپ کی والدہ آمنہ کے پاس پہنچتی ہیں تو بی بی آمنہ حلیمہ سے مخاطب ہوتی ہیں :

مرا بچہ تو ہے اچھا؟ تو کیوں روتی ہوئی آئی ۔۔۔ یہ کیا حالت ہوئی تیری بتا تو خیر سے دائی
مرا دولہا کہاں چھوڑا! ہوئی ہے گود کیوں خالی ۔۔۔ بتا جلدی، سنا جلدی، خبر ہے ساتھ کیا لائی
ہزاروں وہم ہوتے ہیں، کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔۔۔ قیامت ہے ترا رونا، غضب ہے تیری تنہائی
پریشاں یہ تری صورت کسی صدمہ کی شاہد ہے ۔۔۔ خبر کچھ اور دیتی ہے یہ تیری شکل مرجھائی
ترے کمہلائے ہونٹوں میں کوئی آفت ہے پوشیدہ ۔۔۔ حلیمہ ہے نشانِ رنج رنگت تیری سنولائی
تو ہنستی بولتی رخصت ہوئی بچہ مرا لے کر ۔۔۔ ہوئی واپس تو اب ہے اس طرح کی شکل دکھلائی

حلیمہ تیرے قرباں شکل بچہ کی دکھا مجھ کو
پڑی ہے تجھ پہ کیا بپتا اری کچھ تو بتا مجھ کو

جاذب

محمد میاں قریشی ۱۹۰۷ء میں گلی دیوی داس محلہ چوڑی والان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد میرے چچا شیخ حاجی حشمت اللہ صاحب مرحوم تھے۔ بڑے مخیّر انسان تھے۔ غریبوں اور خاص طور پر طلبا پر اپنی کمائی کا بڑا حصّہ خرچ کر دیا کرتے تھے۔ گھر میں اس بات پر کہاسنی بھی ہو جاتی تھی۔ جاذب صاحب نے ابتدائی تعلیم حوض والی مسجد میں پائی۔ اس کے بعد اینگلو عربک کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں سے میٹرک کرنے کے بعد سینٹ اسٹی فنس کالج دہلی سے بی اے آنرز کا امتحان دیا۔ اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ تعلیم کے بعد فوجی ٹریننگ لی اور فوج میں اعلیٰ عہدے پر مامور ہوئے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کراچی چلے گئے اور آج کل راولپنڈی میں فوج کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

شاعری کا شوق آپ کو طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا۔ عربک سکول کے مشاعروں میں غزلیں اور نظمیں پڑھتے تھے۔ عام مشاعروں میں شرکت کو بُرا سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آج کل مشاعرے میں شرکت کرنا شاعری کی بے عزتی کرنا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ کے کلام کا مجموعہ "باغی"

کے نام سے شائع ہوا۔

آپ عاشقانہ شاعری کو پسند نہیں کرتے۔ محبوب کی کمر کی ناپ تول، اداؤں، ناز اور نخروں کے بیان کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ آپ نے زیادہ تر سماج کی خرابیوں، کرداروں اور شخصیت پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ آپ کے کلام میں آمد ہی آمد ہے۔ جوش کے ساتھ متانت ہے، زبان شستہ اور صاف ہے۔ جاذب صاحب کا مسلک کیا ہے:

زباں پر آج میری شعلہ افشاں اک فسانہ ہے
میں خود جلتا ہوں مدت سے اب اوروں کو جلانا ہے
سنی جاتی نہیں اب مجھ سے مظلوموں کی فریادیں
مجھے نعروں سے اپنے فتنۂ محشر اٹھانا ہے
سر مزدور پہ رکھی گئی ہیں جس کی بنیادیں
اٹھو اب ہم کو اس قصرِ امارت کو گرانا ہے

غریبوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

سناؤ مجھ کو ذرا اپنی داستانِ الم
تمہارے درد کو نسبت ہے میرے نالوں سے
اگر خلش ہے دلوں میں تو میرے پاس آؤ
تمہارے کانٹے نکالوں گا اپنی پلکوں سے
تمہارے واسطے آرام بن کے آیا ہوں
دوا بناؤں گا اپنے لہو کی بوندوں سے

مزدوروں میں جب زندگی پیدا ہونے لگتی ہے تو ان کے ارادے اور منصوبے کیا بنتے ہیں:

میں اپنے ہاتھوں کو چومتا ہوں پڑے ہیں محنت سے جن میں چھالے
میں اپنے پیروں کو دیکھتا ہوں جو خاک و خوں میں بھرے ہوئے ہیں
ملال ہو آج بھی تو کیا ہے، مرے تو جونکیں لگی ہوئی ہیں
ترس رہا ہوں میں روٹیوں کو پھٹے ہوئے ہیں بدن پہ کپڑے
نقیب ہوں اس شباب کا میں جو آج نکلا ہے جھونپڑوں سے
دئے گئے ہیں مجھے وہ نعرے پھٹیں گے کانوں کے جن سے پردے

غریب و مفلس اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے:

آج ایک بندہ ترا زمزمہ خواں ہے یارب
جن کے نغموں میں بھی اک رنگ فغاں ہے یارب
میرے مالک ترے فردوس کی کیا حالت ہے
آج کل اپنے چمن میں تو خزاں ہے یارب

سماج کے ٹھیکے داروں کو جنھوں نے اپنے غریبوں کے پھندوں میں خدا کے غریب بندوں کو جکڑ رکھا ہے۔ شاعرانہ کا پردہ چاک کرتا ہے ؎

صداقت لفظ بے معنی ہے ہمدم اس زمانے میں
زمین اللہ کی، آباد ہیں شیطان کے بندے

بیانِ دوزخ و جنت میں پنہاں ہے ریاکاری
بنا رکھے ہیں واعظ نے کمانے کے عجب دھندے

یہاں ممبر پہ اپنے واسطے بھوکے غریبوں سے
لئے جاتے ہیں ناموس حرم کے نام پر چندے

بگر اکر از سرِ نو مسجد و مندر بناتے ہیں
مگر مرتے ہیں بھوکے سینکڑوں اللہ کے بندے

جہالت ہے کہیں۔ مکر و دغا ہے اور کہیں غفلت
پڑے ہیں ہر طرف سے گردن انساں میں پھندے

دہلی کالج اور اینگلو عربک کالج دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات کہاں تک لکھے جائیں۔ دہلی کا کون سا خاندان ہے جس نے اس درس گاہ سے فیض نہ اٹھایا ہو، ان کے حالات قلم بند کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب چاہیئے۔ (قدیم دہلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء)

دہلی کے تین مُفسّر و مترجم قرآن

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبزادوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنے اور ترجمہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے تفسیر فتح الرحمٰن، شاہ عبدالعزیز نے تفسیر فتح العزیز، شاہ رفیع الدین نے ترجمہ قرآن مجید اور شاہ عبدالقادر نے تفسیر موضح القرآن تحریر فرمائی۔ ان کے بعد اور حضرات نے بھی یہ سلسلہ شروع کیا، اور قرآن مجید کی تفسیر و ترجمے لکھے، چنانچہ ان حضرات میں سے تین دہلی کے مفسّر و مترجم قرآن مجید کے مختصر حالات تحریر کئے جاتے ہیں:

(۱) مولوی عبدالحق حقانی ابن خواجہ محمد امیر شیخ علوی کابلی الاصل تھے۔ عالمگیر کے عہد میں ان کے بزرگ ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے مورثِ اعلیٰ خواجہ شمس الدین تبریزی تھے۔ آپ کے دادا کو رئیس کیتھل، کیتھل لے گئے تھے، ان کے والد نے بعد میں گمتھلہ میں سکونت اختیار کی۔[۱]

مولوی عبدالرب صاحب حقانی، ۲ رجب ۱۲۶۵ھ میں گمتھلہ میں پیدا ہوئے۔ استاد الکل حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی، مفتی محمد یوسف لکھنوی اور مولانا عبدالحق صاحب مہاجر مکی سے ۱۲۸۸ھ میں علوم دینی کی تحصیل کی۔ آپ کو صوفیائے کرام سے عقیدت تھی۔ اس لئے آپ قادریہ سلسلے میں مولوی سید عالم صاحب سے اور نقشبندیہ میں مولانا حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت ہوگئے۔[۲]

مولوی صاحب بڑے ذی علم تھے اور ادیب بھی تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف کا مشغلہ مدت العمر رہا۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے آپ سے بھی تعلیم پائی۔ ریاست حیدرآباد دکن سے آپ کو معقول وظیفہ ملتا تھا اور آخر عمر میں کلکتے کے مدرسہ عالیہ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے،

[۱] مصنفین اردو ص ۴۸ [۲] وصال الجمیل ص ۱۸

آپ کی خداداد ذہانت وقابلیت ولیاقت کو دیکھ کر حکومت برطانیہ نے شمس العلمار کا خطاب دیا۔

مولوی عبدالحق صاحب بہت سادہ مزاج، دوست نواز، بڑے خلیق، ملنسار مدبر، مرجع عوام وخواص اور مرنجان مرنج بزرگ تھے۔ جس طرح بھی ممکن ہو سکا اسلام کی دل کھول کر خدمت کی۔ آپ اسلام میں فرقہ بندی کو نا پسند کرتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں دہلی کے معززین اور سربر آوردہ لوگوں نے ایک انجمن موئید الاسلام، یتیم خانہ اور لڑکے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا تھا، جس میں حکیم اجمل خاں، مولوی عبدالاحد صاحب، حکیم ظہیر الدین صاحب، حکیم رضی الدین، نواب غلام محمد حسن خاں صاحب، مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی، منشی محمد دین صاحب، خان بہادر محمد اکرام اللہ خاں صاحب، مولوی عبدالحق صاحب حقانی، خان بہادر محمد الہٰی بخش صاحب وغیرہ حضرات اس کے سرگرم کارکن، معاون اور سرپرست تھے۔ ان اسکول وغیرہ کی غرض یہ تھی کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں عیسائی اسکولوں میں داخل ہو کر عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یتیم خانہ نہ ہونے کی وجہ سے لاوارث بچے مشنریوں کے ہاتھوں میں چلے جاتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے اسکول قائم ہونے چاہئیں۔

۱۹۱۱ء میں انجمن ہدایت الاسلام مولوی عبدالحق صاحب نے قائم کی، جس کا مقصد اسلام کی حقانیت اور خوبیوں کا اظہار کرنا اور اس کی تعلیم واشاعت کی طرف توجہ دینا اور مخالفین اسلام کا جواب دینا، عیسائیوں کی شرارتوں کو روکنا تھا۔ ان مقاصد کو پھیلانے کے لئے انجمن نے ایک رسالہ الھدایت جاری کیا۔، جس کے سرپرست مولوی عبدالحق صاحب تھے۔

مولوی عبدالحق صاحب ویسے جامع العلوم تھے۔ لیکن تفسیر قرآنی میں ان کو خاص ملکہ اور ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ آپ نے تفسیر حقانی تصنیف کی جو آٹھ جلدوں میں ہے۔ یہ تفسیر اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ آپ نے ایک کتاب البیان لکھی ہے جو مذہبی لٹریچر میں ایک عمدہ اضافہ تھا، جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی ہوا۔ تاکہ یوروپین اقوام بھی اسلام کی حقانیت سے واقف و آگاہ ہو جائیں۔ اس میں وجود ملائکہ اور حشر ونشر پہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ عقائد اسلام بھی آپ کی

تصنیف ہے۔ آپ کا دہلی میں ۱۹۱۶ء کو انتقال ہوا۔ آپ کے صاحبزادے ابوالحسن حقانی تھے۔

(۲) مولوی سید احمد حسن صاحب دہلی کے خاندان سادات میں تھے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد آپ نے حدیث فقہ کی کتابیں شمس العلماء میاں صاحب مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے پڑھیں۔ آپ کا شمار میاں صاحب کے ارشد تلامذہ میں تھا۔ علم طب کی کتابیں بھی آپ نے پڑھی تھیں۔

آپ کو انگریزی ملازمت ملنے کے کئی مواقع آئے۔ مگر آپ نے نہیں کی۔ اور حیدرآباد دکن میں ملازم ہوئے اور ضلع کے تعلق دار یعنی کلکٹر عرصے تک رہے۔ آٹھ سو روپے تنخواہ تھی۔ حدیث و فقہ کے علاوہ انگریزی قانون سے بھی آپ بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ آپ نے بڑی دیانت داری، خداترسی اور نیک نامی کے ساتھ ملازمت کا زمانہ چھوڑا۔ ضلع کے حکمران ہونے کے باوجود کسی قسم کا گھمنڈ نہیں ہوا۔ نہایت انکساری کے ساتھ خدا کے بندوں کی دلجوئی اور خدمت کی۔

آپ نام و نمود سے کوسوں دور تھے۔ گوشہ نشینی اور کم سخنی کے عادی تھے۔ جامع مسجد اور فتح پوری مسجد کے منتظمہ کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ چند دنوں کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ پند و نصائح فرماتے یا تبلیغ اسلام میں معروف رہتے تھے۔ انتہائی متقی اور پرہیزگار عالم تھے۔ سنت نبوی کے سخت پابند تھے۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کے بڑے داماد تھے۔

پنشن پانے کے بعد آپ کتب دینی اور تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ آپ نے پہلے قرآن شریف پر ایک بسیط حاشیہ احسن الفوائد کے نام سے لکھا، جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد ایک جامع تفسیر قرآن اردو زبان میں "احسن التفاسیر" کے نام سے تالیف فرمائی۔ جو سات جلدوں میں مع ایک مقدمے کے ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ آپ کی تصانیف حدیث کے فن پر عربی زبان میں یہ ہیں:

(۱) تنقیح اللغات فی تخریج احادیث المشکوٰۃ۔

(۲) ابن حجر کی بلوغ المرام، حاشیہ موسوم بلوغ المرام من ادلتہ الاحکام۔

۱۹۱۹ء میں آپ ایک کتاب احکام القرآن تحریر فرما رہے تھے۔ مؤلف واقعات دارالحکومت دہلی آپ کی قابلیت کے معترف تھے، چنانچہ آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

"دلی میں آپ کا دم غنیمت ہے۔ آپ بڑے مولوی ہی نہیں ہیں، بلکہ زمانۂ حال کے تازہ ترین طرز کا بھی لازوال خزانہ ہیں۔ آپ کی تصانیف دیکھنے سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور جو لوگ آپ کی صحبت سے مستفید ہوتے ہیں وہی کچھ آپ کی سچائی اور بے لوث طرز زندگی کا اندازہ کر سکتے ہیں اور جس کسی کو ایک سچے اور راست باز دین دار مسلمان کا نمونہ دیکھنا ہو وہ آپ کو دیکھ لے[1]"

(۳) مولوی مقبول احمد صاحب دہلوی اپنے زمانے میں ایک بڑے پایے کے عالم تھے۔ آپ ۱۸۶۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام پیرجی غضنفر علی تھا۔ ابتدائی تعلیم عربک اسکول دہلی میں حاصل کی۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ جس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھ لیتے تو وہ حفظ ہو جاتی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۸۹ء کو ایف، اے پاس کیا۔ اس کے بعد ریاست پنڈراول میں پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وعظ کہنا شروع کیا۔ اور اس میدان میں ایسی شہرت حاصل کی جو واعظین کو کم میسر ہوتی ہے۔ وعظ اس قدر موثر ہوتا تھا کہ سامعین کے دل ہل جاتے تھے اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگتے تھے۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد دہلی ہی میں قیام کیا اور قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دہلی میں ایک دواخانہ یونانی کھولا، مرکبات تیار رکھے۔ اس دواخانے کا نام ایس، ایم، احمد اینڈ کمپنی رکھا۔ اور فی حصہ کی قیمت پچاس روپے مقرر کی۔ سرمایہ کم تھا۔ کام چل نہ سکا۔ تو آپ کے دونوں فرزند شجاع الدولہ اور آصف الدولہ نے تمام حصے داروں کا روپیہ ادا کر دیا۔ اور کمپنی کے پورے مالک بن گئے۔

آپ نے طلبا کی درسی کتابیں تالیف کیں۔ حضرت دانیال کی کتاب النجوم کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اور "زائچہ تقدیر" نام رکھا۔ در اثبات ایمان حضرت ابی طالب مصنفہ سید احمد دحلان مفتی مکہ معظمہ کی عربی کتاب کا ترجمہ کیا اس کا نام اسنی المطالب رکھا[2]۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۲۱ء کو دہلی میں وفات پائی اور پنجہ شریف میں دفن ہوئے[3]۔

---

[1] واقعات دارالحکومت جلد دوم ص ۱۳۱ [2] تذکرہ بے بہا [3] مصنفین اردو ص ۹۲

دہلی کے دو مشہور واعظ

مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب کے والد گاماں خاں تھے جو مولوی عبدالقادر صاحب دہلوی کے مرید تھے۔ دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب پھاٹک حبش خاں گلی مرس والی میں رہتے تھے۔ آپ نے ۹ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد کچھ کتابیں مولوی عبدالخالق صاحب خسر مولوی نذیر حسین صاحب اور کچھ فارسی و عربی کی کتابیں حضرت مولانا شاہ اسحاق دہلوی سے پڑھیں۔ فقہ، تفسیر اور حدیث کی تکمیل حضرت میاں صاحب مولوی نذیر حسین محدث دہلوی سے کی اور سند حاصل کی۔

مولوی صاحب کی دربار شاہی میں بڑی عزت و وقعت تھی۔ آپ کو قلعے میں لے جانے کے لئے لال قلعے سے پالکی آیا کرتی تھی۔ اس میں بیٹھ کر آپ لال قلعے جاتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر آپ کی توقیر و عظمت کرتے تھے، تحفے تحائف بھیجا کرتے تھے اور ملنا جلنا تھا۔

کسی موقعے پر حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی آپ کے گھر تشریف لائے اور قرآن مجید کے ایک رکوع کے پڑھنے کی فرمائش کی۔ آپ کے والد نے کہا حضور آپ جہاں سے فرمائیں یہ وہیں سے سنا دے۔ مولانا شہید نے ایک مشکل رکوع جس میں متشابے بہت تھے۔ سنانے کے لئے فرمایا۔ چنانچہ وہی رکوع مولوی صاحب نے پڑھا، کوئی غلطی نہیں نکلی تو مولانا شہید بہت خوش ہوئے، گلے سے لگایا، اور دعائیں دیں۔

نہر سعادت خاں دہلی پر آپ کے والد ماجد گاماں خاں صاحب نے ایک مسجد تعمیر کی تھی جس کے نیچے نہر جاری تھی، جس کے اوپر مسجد تھی۔ مسجد میں ایک میٹھا اور ٹھنڈا کنواں تھا، اس پر درختوں کا گھنا سایہ تھا۔ دلی کی گرمیوں میں یہ جگہ بلا مبالغہ جنت کا ایک ٹکڑا معلوم دیتا تھا۔ ہر دو شنبہ کی فجر کی نماز کے بعد مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب وعظ فرماتے تھے۔ مسجد لوگوں سے

کھچا کھچ بھر جاتی تھی۔ مولوی صاحب اپنے وعظ و ارشاد میں سامعین کو یہ ذہن نشین کرا دیتے تھے کہ اگر مسجد کے نیچے آب شیریں کی نہر جاری ہے تو اوپر قرآن مجید کا بحر مواج لہریں مار رہا ہے جس میں سے دُرِ بے بہا نکال نکال کر سامعین کے آگے بکھیرے جا رہے ہیں۔

مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب پرانے لوگوں کی طرح اپنی وضع کے بڑے پکے تھے، سادہ طبیعت پائی تھی۔ آپ کا انتقال ۱۳۲۴ھ کو دہلی میں ہوا۔ آپ میاں صاحب نذیر حسین محدث دہلوی کے قریب شیدی پورے کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ شاگرد نے استاد کا یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔

(۲) مولوی عبدالرب صاحب ابن مولوی سید عبدالخالق صاحب ابن سید خیر اللہ صاحب محدث دہلوی، دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ یہ خاندان محدثوں کا تھا۔ مولوی عبدالخالق صاحب کے علم و فضل کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ آپ کے رشد و ہدایت سے بہت سے لوگ ٹھیک ہوئے، لوگ سیدھی راہ پر آئے۔ آپ کا اخلاق انتہائی وسیع تھا۔ اخلاق محمدی کا نمونہ تھا۔ متانت اور سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے مولوی عبدالقادر اور چھوٹے مولوی عبدالرب صاحب تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے استاد اور خسر بھی تھے جو محلات شاہی کے امام اور بیگم ولی عہد کے استاد تھے۔ قلعے میں بڑی عزت تھی۔

مولوی عبدالرب صاحب نے دہلی کے علماء سے علوم دینی کی تحصیل کی۔ بے نظیر واعظ تھے اور طرز بیاں ایسا موثر تھا کہ سامعین خود رفتہ اور مسحور ہو جاتے تھے۔ کٹرہ نظام الملک کی مسجد نزد جامع مسجد میں ۲۹ برس تک وعظ کہا اور خلق اللہ کو اپنے وعظ سے محظوظ و مستفید کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد اس مسجد میں ان کے صاحبزادے مولوی ادریس صاحب نے عرصہ تک وعظ فرمایا۔ مولوی عبدالرب صاحب نے سہارنپور کی جامع مسجد تعمیر کرائی اور مدرسہ آسیہ بیگم اور مدرسہ عبدالرب دہلی میں گندا نالہ موری گیٹ پر تعمیر کرائے۔ مدرسہ عبدالرب اب تک جاری ہے، اس میں علوم دینی پڑھائے جاتے ہیں۔

دہلی کے ان دونوں واعظ اور عالم دین کے بارے میں مولوی بشیرالدین صاحب مؤلف

واقعات دار الحکومت دہلی تحریر فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں دہلی میں بڑے نامور واعظ دو ہی تھے، احناف میں مولوی عبدالرب صاحب اور اہل حدیث میں مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب، ان کا وعظ عالمانہ اور بڑا پُر تاثیر تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قرآن و حدیث کا دریا بہہ رہا ہو یا یوں کہیے کہ سمندر میں سے دُرِ بے بہا نکال کر سامعین کے سامنے بکھیر رہے ہیں۔ خاکسار اپنی خوش نصیبی سے دونوں صاحبوں کی مجالس وعظ میں بارہا حاضر رہا ہے۔ واقعی بات اور حقیقت الامری یہ ہے کہ دونوں صاحب اپنی اپنی جگہ لاجواب تھے۔ ان صاحبوں کی زبان میں ایک ایسا اثر تھا کہ لوگوں کے دل اپنے قابو میں کر لیتے تھے اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لگا دیتے تھے۔ حافظہ اور سلسلہ سخن کا یہ حال بحر مواج لہریں مار رہا ہے۔ آمد تھی آورد نہ تھی، تقریر اور طرز بیان ایسا شستہ اور مسلسل کہ مضامین امڈے چلے آتے تھے، تامل اور غور کی ضرورت نہ تھی۔"

آسیہ بیگم کی مسجد مولوی صاحب نے اپنی بیٹی آسیہ بیگم کے نام پر بنائی تھی، ان کا عین جوانی میں انتقال ہوا تھا، جس کا صدمہ مولوی صاحب کو مرتے دم تک رہا۔ اس مسجد کی تعمیر ۱۳۰۴ھ میں شروع ہوئی۔ مولوی عبدالرب صاحب کے انتقال کے بعد اس کی تکمیل ان کے صاحبزادے مولوی ادریس نے کرائی۔ مسجد دالان در دالان لداؤ کی ہے، پانچ در ہیں جس کے آخری حصہ میں ایک حوض اور کنواں ہے۔ مولوی عبدالرب صاحب کے بڑے بھائی مولوی عبدالقادر صاحب، تھے جو مولوی کبیر الدین صاحب کے نانا اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خسر تھے، کنواں، اور حوض مولوی کبیر الدین صاحب کی بڑی بہن نے بنوایا تھا۔ اس مسجد میں چاروں طرف طلباء کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ چھت پر بھی دو کمرے ہیں۔ پیش طاق پر یہ کتبہ ہے "ہو الباقی، مسجد آسیہ بیگم حنفیہ۔ تعمیر شدہ باہتمام مولوی محمد ادریس صاحب مرحوم ابن مولانا مولوی عبدالرب صاحب، سال تعمیر ۱۳۰۴ھ"

مولوی صاحب نے ایک کتاب اپنی صاحبزادی آسیہ کے نام پر فردوس آسیہ المعروف خواص خمسہ تصنیف فرمائی۔ اس میں خلفاء راشدین کے علاوہ پانچویں حصے میں حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ کے حالات شہادت درج ہیں۔ یہ کتاب ۲۳۴ صفحات پر مشتمل ہے جو مطبع خادم الاسلام دہلی میں طبع ہوئی۔ مولوی صاحب کا انتقال ۱۳۰۸ھ میں ہوا۔

———— ————

دہلی کے تین مصوّر

استاد محمد حسین مصوری میں ماہر تھے۔ مغلیہ دور حکومت میں ان کا خاندان مصوری میں نامور تھا۔ آپ کو مصور اعظم کا خطاب ملا ہوا تھا۔ انگریزوں نے بھی ان کے فن کو سراہا، اور یہ اعزاز برقرار رکھا۔

استاد کی قدیمی رہائش کوچہ نٹوان میں تھی۔ یہ مکان کافی بڑا تھا۔ ان کو مختلف قسم کے جانور پالنے کا شوق تھا۔ تقریباً ہر فالتو جانوران کے چڑیا گھر میں موجود تھا۔ شکاری کتوں کا بے حد شوق تھا۔ تازی شکاری کتے کئی کئی پال رکھے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ دوپہر کا کھانا دن کے دو بجے کھاتے تھے، اور رات کا کھانا گیارہ بجے شب کو تناول کرتے تھے۔ دوپہر کو جب وہ اپنی نشست پر ہوتے تو دوزانو بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ تمام شاگرد بھی ان کے سامنے دوزانو بیٹھتے تھے۔ باری باری دیا ہوا کام دیکھتے، اور ساتھ ہی ضروری ہدایات دیتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد ذرا سی غلط نشست اختیار کرتا تو فوراً ایک لمبی سی چھڑی جو ان کے پاس رہتی تھی۔ اس کے ذریعے اشارہ کرکے صحیح طریقے سے بیٹھنے کی ہدایت کرتے۔ اسی دوران ان کے پاس بڑے بڑے آدمی اپنے کام کے لئے آتے تھے۔ دہلی کے اکثر جوہری جس میں زیادہ تر ہنود و صاحبان ہوتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں ایکسپورٹ کرتے تھے، اور غیر ملکی سیاحوں کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کا کام ان کے یہاں ہوتا تھا۔

ایک دفعہ ان کے پاس ایک پٹھان آیا۔ اس نے اپنے والد کی شکار کھیلتے ہوئے تصویر بنوانا چاہی۔ مگر اس کے پاس اپنے والد کی کوئی تصویر نہ تھی۔ اس نے اپنے والد کا حلیہ استاد کو بتایا، اور چہرے کی پوری ہیئت بیان کی۔ انھوں نے تصویر بنانے کا ایک ہزار روپیہ
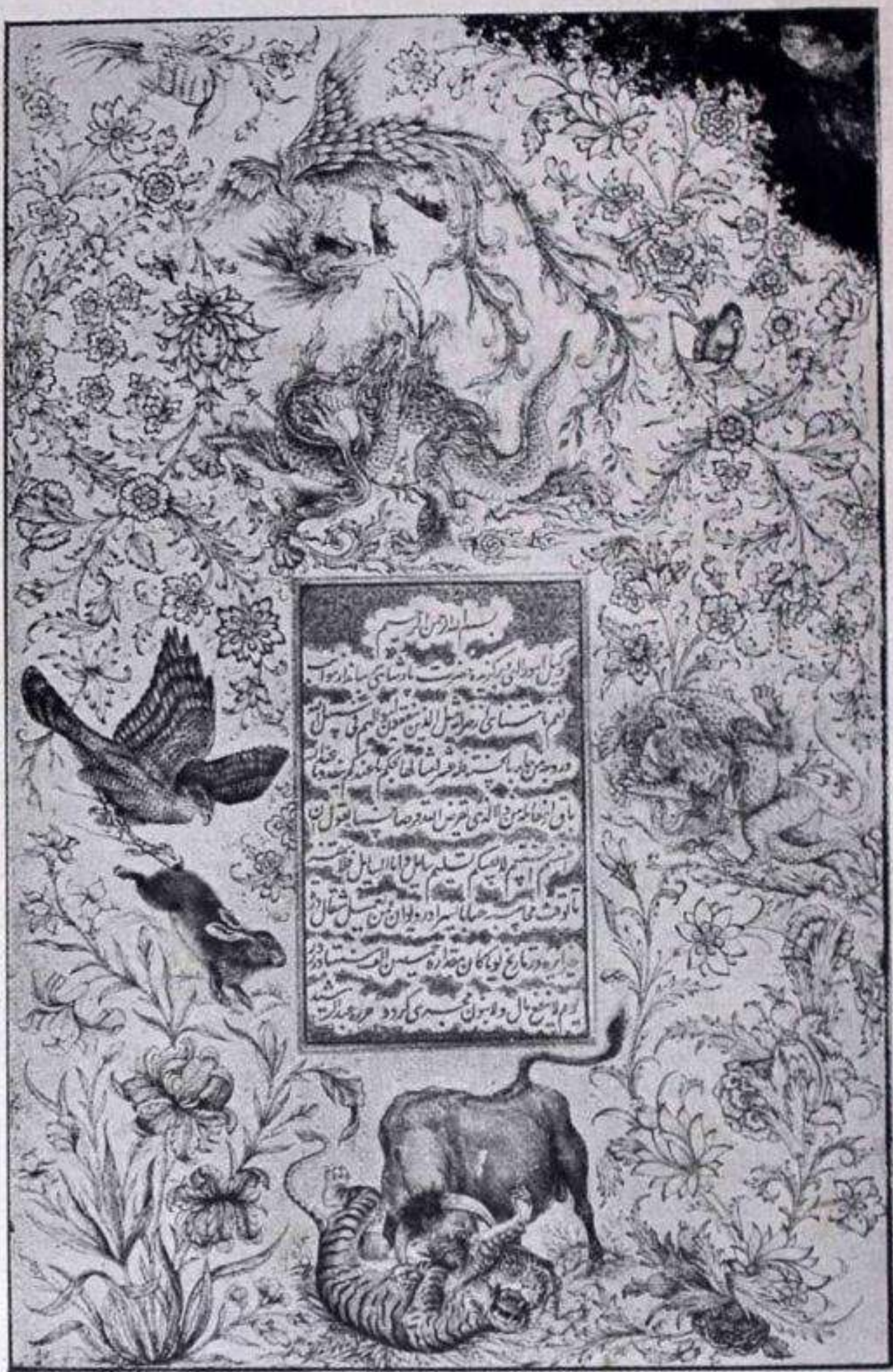
اُستاد محمد حسین کے فنِ مصوری کا ایک نادر نمونہ
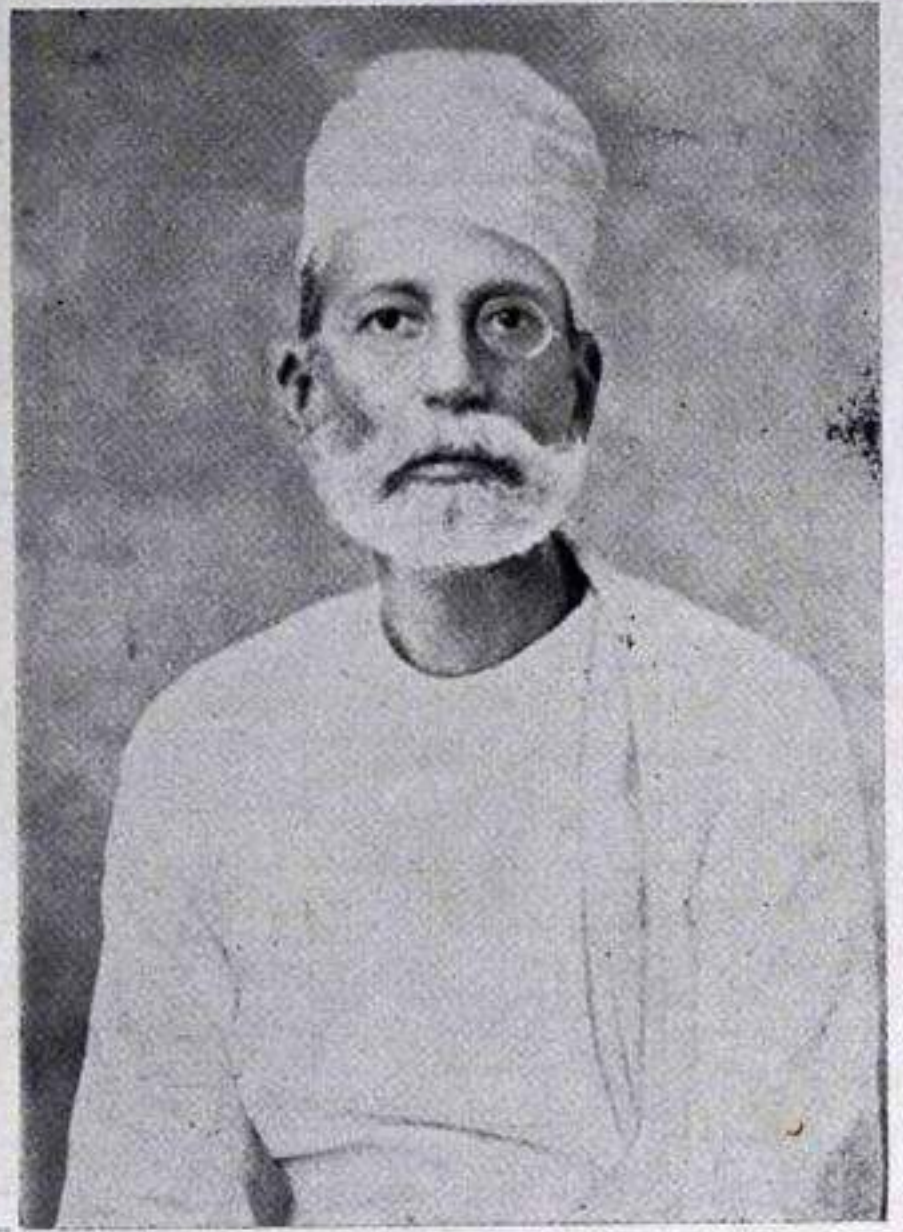
اُستاد محمد حسین (مصوّرِ اعظم)

پنڈت رام ناتھ (گورنمنٹ فوٹوگرافر)

بتایا، جو اس نے منظور کیا۔ استاد نے ۲۰ × ۱۶ سائز کی تصویر تیار کی جو اس قسم کی تھی:

ایک شخص یعنی پٹھان کا باپ گھوڑے پر سوار ہے۔ ہاتھ میں نیزہ ہے، اور شیر کا شکار کر رہا ہے۔ اس تصویر میں جس خوبی سے شیر کو، بپھرا ہوا حملہ کرتے ہوئے سوار کی طرف جھپٹتا ہوا دکھایا گیا تھا، اور شکاری اپنے نیزے سے اس کی گردن پر وار کر رہا تھا۔ اتنا عمدہ بنا کہ پٹھان دیکھتے ہی پھڑک اٹھا۔ اس نے بڑی عقیدت سے استاد کے ہاتھ چومے اور ایک ہزار روپے کی رقم جو چاندی کے روپوں کی صورت میں تھی نذر کی۔ انھوں نے اس میں سے دس دس روپے شاگردوں کو دئے۔ باقی رقم اٹھانے کے لئے استانی جی کو بلا کر کہا "اٹھاؤ یہ سب لے جاؤ۔"

استاد کو رنگوں کی اس قدر شناخت تھی کہ دور سے ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کہ اس میں فلاں رنگ اس قدر اور فلاں اس قدر آمیزش کر لو تو تمھارا مطلوبہ رنگ بن جائیگا۔ اور وہ درست ہوتا تھا۔

افسوس کہ ان کی زندگی کا آخری دور بڑی کس مپرسی میں گذرا۔ انھوں نے روپیہ بہت پیدا کیا۔ مگر رکھا نہیں، جو آیا خرچ کیا۔ ان کی شہرت بہت تھی۔ کچھ عقیدت مندوں اور شاگردوں نے اعانت کی بھی مگر ان سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوا۔ ان کے دماغ کی طاقت، آنکھوں کی روشنی اور جوش و امنگ سب ختم ہو چکے تھے۔ ان کی اولاد نہ تھی، اس لئے انھوں نے اپنے بھائی محمد شفیع کے لڑکے ناصر کو متبنیٰ بنا لیا تھا، جس کو انھوں نے پالا پوسا تھا —— لیکن اس نے ان کے نام کو روشن نہیں کیا۔ اور ان کے نقش قدم پر نہیں چلا۔

استاد نے آخری عمر میں بارہ ہندو راؤ ٹراموے شاپ کے پاس ایک بالا خانہ رہائش کے لئے لیا۔ اسی میں ۱۹۴۰ء میں فوت ہوئے۔ انتقال کے بعد ناصر نے ان کا کل سرمایہ جو کاغذوں پر پنسل، اسکیچ کی صورت میں تھا۔ ہر فن کی کتابیں تھیں، جس میں نادر و نایاب بھی تھیں۔ ایک حضرت شمس تبریز کے دست مبارک کی تحریر کردہ بھی تھی۔ کباڑیوں اور پنساریوں کو ردی میں فروخت کیں۔

(۲) پنڈت رام ناتھ دہلی کے پرانے مانے ہوئے فوٹو گرافر اور فوٹو آرٹسٹ تھے۔

ان کے والد رائے بہادر بشمبر ناتھ ایگزیکٹیو انجینیر دہلی کے رؤسا میں تھے۔ ان کے چار صاحبزادے تھے۔ ایک پولیس میں آفیسر تھے۔ امر ناتھ ان کا نام تھا۔ دوسرے شام ناتھ انبالہ میں کسی مل میں انجینیر تھے۔ پنڈت رام ناتھ کے سب سے چھوٹے بھائی پریم ناتھ تھے۔

رام ناتھ جی بچپن سے ہی فوٹو گرافی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے والد نے ان کو رڑکی کی کالج میں فوٹو گرافی سیکھنے کے لئے بھیجدیا تھا۔ وہاں سے انھوں نے فوٹو گرافی کا ڈپلوما کیا۔ ۱۹۰۶ء میں کشمیری گیٹ پر اپنی دکان لی۔ اس وقت دہلی میں ان کے مدمقابل کوئی دوسرا فنکار نہ تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جب دہلی میں شاہ جارج پنجم کا دربار ہوا، تو انھوں نے اس تقریب کی کل فوٹو گرافی کی تھی۔ ملکہ میری کو ان کا کام بہت پسند آیا۔ تو انھوں نے رام ناتھ جی کو تعریفی سرٹیفکٹ عطا کیا۔ یہ بڑے حلیم، شمیم اور خوش مزاج آدمی تھے۔ تصب و تکبّر سے بالکل مبرا، علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اردو کے مدّاح تھے۔ ہندی انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ شعراء اور موسیقاروں سے ان کے تعلقات تھے۔ کبھی شعراء کی محفل رہتی، کبھی موسیقی کی محفل گرم رہتی۔

رام ناتھ جی کے پاس دہلی کے علاوہ اور دوسرے شہروں سے بھی آرڈر آتے رہتے تھے۔ حکومت کا کام بھی کافی رہتا تھا۔ وہ سارا کام خود کرنا جانتے تھے۔ کاریگروں کے محتاج نہ تھے۔ کاریگروں سے وہی کام لے سکتا ہے، جو اس کا ماہر ہو۔ اس وجہ سے ناکارہ کاریگر ان کے یہاں زیادہ نہ ٹھہرتا تھا۔ فیروز صاحب رام ناتھ جی کے محبوب شاگرد تھے۔ وہ ان کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ رام ناتھ جی صوفی منش بزرگوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دہلی بائیس خواجگان کی چوکھٹ ہے۔ یہاں کوئی آدمی بھوکا نہیں سوتا۔ ان کو خود بھی حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ سے دلی عقیدت تھی۔ اکثر درگاہ میں جاکر حاضری دیا کرتے اور غریبوں کو کھانا وغیرہ تقسیم کراتے تھے۔ یہ کام جمعرات کے روز انجام دیتے تھے۔ شاگردی کے زمانے میں فیروز صاحب کی تحویل میں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔

دہلی میں ان کا آبائی وطن نائی واڑہ چاوڑی بازار میں تھا۔ وہاں کے مندر کے پجاری کے ذریعے منگل کے روز بھنڈارا (لنگر خانہ) کراتے تھے۔ غریبوں کی امداد کرتے تھے۔ دہلی میں

حافظ جی مجذوب تھے جو اکثر ننگے رہا کرتے تھے اور ہر وقت خاک اُڑاتے رہتے تھے۔ عرف عام میں ننگے حافظ جی کے نام سے مشہور تھے۔ کسی سے کچھ نہ مانگتے تھے، جامع مسجد کے گرد ان کا دورہ رہتا تھا۔ دہلی کے ڈولی والے ان کو ڈولی میں بٹھا کر مخیّر حضرات کے ہاں لے جاتے تھے۔ وہ لوگ ان کہاروں کو محض اس کے صلے میں کہ انھوں نے حافظ جی کی زیارت کرائی ہے کچھ دے دیا کرتے تھے۔ رام ناتھ جی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ ہر جمعے کی نماز کے بعد وہ کہار ان کی دکان پر حافظ جی کو ڈولی میں سوار کرا کے پہنچ جاتے تھے اور رام ناتھ جی باوجود دکان بند ہونے کے ان کا انتظار کرتے تھے۔ چونکہ دکان کے ساتھ رہائش بھی تھی، خدمت کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ حافظ جی سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے۔ عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ خاک جو حافظ جی کے بدن پر ملی ہوتی تھی اپنے ہاتھ میں لگا کر چہرے پر پھیر لیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں ان کے ہاں تین اولادیں ہوئیں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ وہ کہا کرتے تھے یہ حافظ جی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

جب دہلی میں کوئی معقول فوٹو اسٹوڈیو نہ تھا۔ رام ناتھ جی کا اسٹوڈیو سائنٹفک طور پر مکمل تھا۔ انگریزی دورِ حکومت میں بڑے بڑے انگریز حکام ان سے کام لیتے تھے —— لارڈ لن لتھگو، اور لارڈ ویول کی یہاں کی فوٹو گرافی کرتے تھے۔ علاوہ ازیں پنڈت موتی لال، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر ٹیگور اور بہت سی ریاستوں کے راجے، مہاراجوں اور نوابوں کے فوٹو انھوں نے بنائے جو دکان کی زینت بنے رہتے۔

شہید بھگت سنگھ اور بی۔ کے دت کے فوٹو بھی ۳۰-۱۹۲۹ء میں اسی اسٹوڈیو میں رام ناتھ جی کی تحویل میں ان کے شاگرد رشید فیروز آرٹسٹ نے بنائے تھے۔ دونوں فوٹو شہید بھگت سنگھ کے ہیٹ اوڑھے ہوئے اور بی۔ کے دت کے قمیص کے ساتھ رام ناتھ جی کے اسٹوڈیو کے تیار کردہ تھے۔ چونکہ یہ دونوں صاحب اپنے اپنے نیگیٹو کے ساتھ تصاویر سے متعلق ایک ایک پرزہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس لئے جب بھگت سنگھ نے اسمبلی پر بم اور گرفتار ہوئے تو پولیس نے اسٹوڈیو پر چھاپہ مارا۔ زمین ادھیڑ ڈالی، مگر چونکہ ریکارڈ میں نیگیٹو سمیت مال دینے کی رسید درج تھی اور ان کی وصول یابی بھی تھی، اس لئے ان کا

بڑی مشکل سے پیچھا چھوٹا۔ آج کسی کو معلوم بھی نہیں کہ شہید اعظم کی وہ تصویر جو بے حد مقبول ہوئی اس کا بنانے والا کون تھا۔

آخر دور میں رام ناتھ جی کا کام پھیکا پڑ گیا تھا۔ بچے چھوٹی عمر کے تھے۔ کشمیری گیٹ کی دکان بند ہو گئی تھی اور وہ دہلی چھوڑ کر غازی آباد چلے گئے تھے۔ وہیں پر ان کا ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کے پاس اردو کی نایاب و نادر کتابیں تھیں۔ اولادیں میں کوئی بھی اردو سے واقف نہیں تھا، اس لئے ان کی قیمتی کتابیں ضائع ہوئیں۔

(۳) فیروز آرٹسٹ ہند و پاک کے مشہور و پرانے آرٹسٹ ہیں۔ لیکن ان کے آباو اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت عمرؓ کی اڑتالیسویں پشت سے ملتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی بیسویں پشت سلطان عمر شاہ تک ایک اولاد نرینہ کا سلسلہ رہا۔ ان کی دو اولادیں سلطان محمد شہاب الدین اور سلطان محمد شاہ فاتح تھانیسر ہوئیں۔ اس کے بعد پھر ایک اولاد کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ستائیسویں پشت میں مولانا محمد عمر نجیب خاں کے ہاں دو اولادیں ہوئیں۔ شیخ محمود اور محمد قاضی خاں کے ہاں ایک ہی اولاد ہوئی۔ سینتیسویں پشت میں حکیم بدرالدین علی خاں شہسوانی کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں اور ان کے بڑے فرزند حکیم خورشید حسن خاں صاحب کے ہاں چار اولادیں ہوئیں اور منجھلے لڑکے حکیم خورشید خاں کے پوتے محمد مجتبیٰ خاں کے دو فرزند ہوئے۔ عید خاں اور محمد خاں کے ہاں دو صاحبزادے لال محمد اور عیسیٰ خاں ہوئے۔ لال محمد خاں کے پڑپوتے پیر داد خاں (مغلیہ حکومت کے آخری دور میں وزیر تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے خاص مصاحبوں میں سے تھے۔ بادشاہ کو بچانے میں ان کا نمایاں ہاتھ تھا۔) جو فیروز صاحب کے پر دادا تھے۔ یہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے تھے۔ اور ان کو اس جرم کی پاداش میں بلند شہر کے کالے آم کے میدان میں پھانسی دے دی گئی۔ ان کے دادا پیر محمد خاں بھی فوج میں تھے اور آزادی جنگ ۱۸۵۷ء میں شرکت کے الزام سے کسی طرح بچ گئے تھے۔ جب انگریزوں نے عام معافی کا اعلان کیا اور نوکریاں بحال ہوئیں تو یہ بھی بحال رہے۔ اس وقت بھی ایک خاص عہدے پر مامور تھے۔ بعد میں ترقی کر کے میجر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۸۶۰ء یا ۱۸۶۱ء میں جب وہ فیروز پور پنجاب چھاؤنی
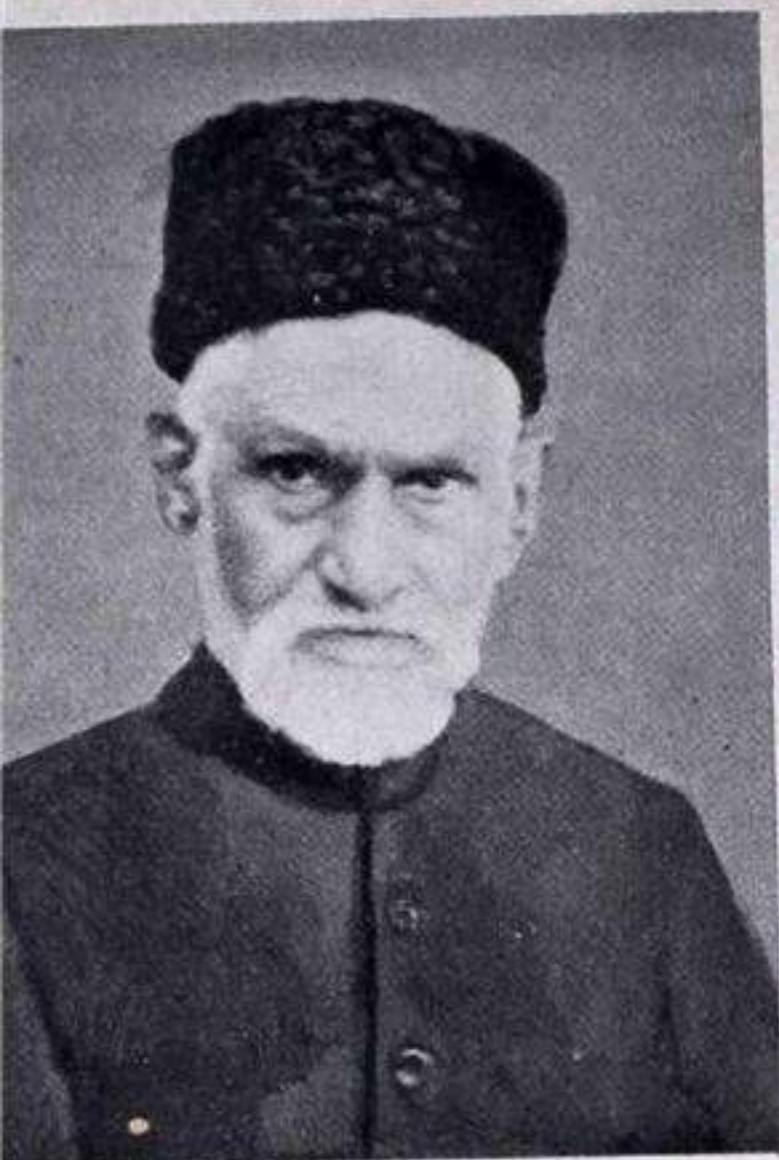
فتح محمدؐ خاں (آرچیٹیکٹ)
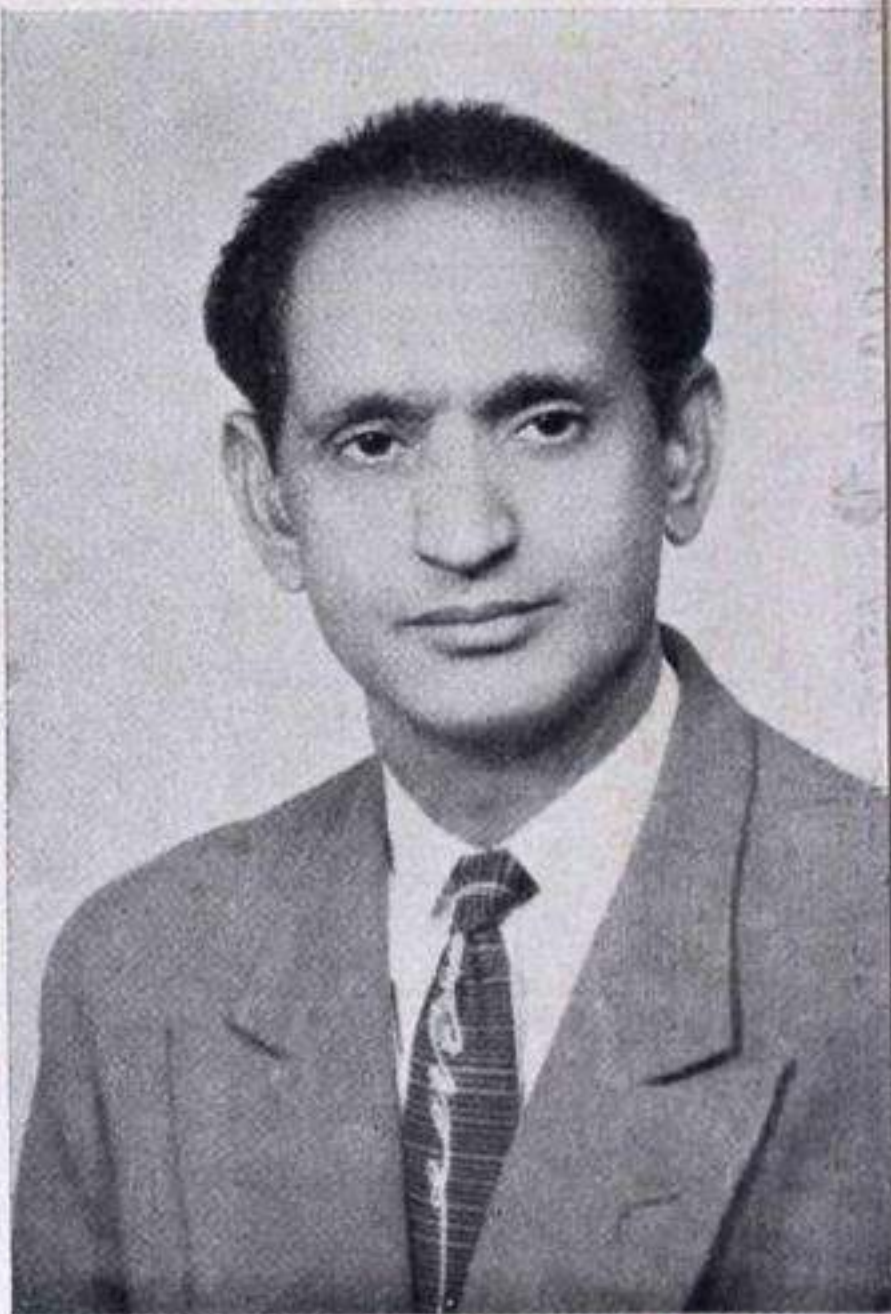
فیروز محمدؐ خاں (فیروز آرٹسٹ)

فیروز صاحب کا ایک تاریخی شاہکار — سقوطِ قسطنطنیہ

کیمپ میں تھے تو رات کے وقت کیمپ سے اپنے گھر آرہے تھے۔ اندھیرے میں گھوڑے سے ٹھوکر کھائی اور گر کر جاں بحق ہوئے۔

فیروز صاحب کے والد فتح محمد خاں صاحب اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے جو ان کے انتقال کے وقت کمسن تھے۔ ان کی پرورش ان کی والدہ عائشہ خانم نے کی۔ لکھایا پڑھایا۔ زمین داری کی نگرانی ان کے ماموں کے سپرد ہوئی۔ فتح محمد خاں صاحب نے تعلیم ختم ہی کی تھی کہ والدہ صاحبہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے ماموں ان کو چونکہ جائیداد کا حق نہیں دینا چاہتے تھے اور خود قابض رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے ان سے اَن بَن ہو گئی اور وہ پنجاب چھوڑ کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں ملٹری کا کورس پورا کر کے سیکنڈ لیفٹننٹ کی حیثیت سے آرکیٹکٹ کے منصب پر مامور ہوئے اور میجر کے عہدے تک ترقی کی۔ غصہ اور تنک مزاجی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کسی کی غلط بات برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی خود کبھی کوئی غلط بات کہتے تھے۔ یہ ہی وجہ ان کی ملازمت سے سبک دوشی کی بنی۔ ہوا یہ کہ ایک بنگلہ جو مقفل تھا اس کے نقشے کی ضرورت تھی۔ کسی وجہ سے اس کے جلد کھلنے کی توقع نہیں تھی۔ انھوں نے بنگلے کو اندر سے دیکھے بغیر اندازے سے اس کا نقشہ تیار کر دیا۔ ایک انگریز نے جو کہ ان کا ماتحت تھا، صرف اس بنا پر کہ بغیر دیکھے نقشہ درست تیار نہیں ہو سکتا، اعتراض کیا جو انھیں ناگوار گزرا۔ بنگلہ کھلوانے کا حکم حاصل کیا گیا۔ اندر سے دیکھا تو نقشہ بالکل صحیح نکلا۔ اس پر انھوں نے اپنے ماتحت انگریز سے کہا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ اسے اپنے انگریز ہونے کا گھمنڈ تھا۔ اعتراف کرنا کسرِ شان سمجھا۔ انھوں نے اس کو گستاخی گردانا اور طیش میں آ کر ایک تھپڑ رسید کر دیا اور کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ حرکت وہاں کے حکام کو ناپسند ہوئی، ان سے استعفیٰ طلب کر لیا گیا اور وہ میرٹھ چلے آئے۔ اس واقعے کے بعد انھوں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ "میجر" کا لفظ استعمال نہیں کیا اور اسے اپنے نام کے ساتھ لکھنا بھی اپنی تحقیر سمجھا۔ ان کی یہ خود داری برابر قائم رہی۔

۱۹۱۱ء کا دور تھا۔ جارج پنجم کی تاج پوشی کی تیاری ہو رہی تھی۔ ان کو میرٹھ میں

بحیثیت آرچیٹکٹ کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ میرٹھ کا گھنٹہ گھر اور اجمیر کا گھنٹہ گھر ان ہی کے نقشے سے ۱۹۱۴ء میں تعمیر ہوئے۔ فیروز صاحب کے والد اپنے ماتحتوں سے کام لینے میں سخت تھے۔ ذرہ برابر بھی کسی کی رعایت نہ کرتے تھے، اور نہ ہی رشوت کا جادو ان پر چلتا تھا۔ دیانتدار ہونے کے باعث افسران کی نگاہوں میں کھٹکتے تھے۔ آخر بحالت مجبوری انھوں نے ۱۹۱۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور دہلی چلے آئے اور یہیں بود و باش اختیار کی۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کے بڑے مداح تھے اور یہ خلافت کا دور تھا۔ تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کے مصاحبوں میں سے تھے۔

یکم اپریل ۱۹۴۶ء میں وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ دلی کے نئے قبرستان نزد فیروز شاہ کوٹلہ میں سپرد خاک کئے گئے۔ یہ بڑے طمطراق کے آدمی تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ، انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو کتابیں ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں برباد ہوگئیں، جو کہ فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ فتح محمد خاں صاحب کی تین اولادیں ہوئیں۔ بڑی لڑکی حسن بانو، فیروز محمد خاں، اور فریدہ خانم۔

حسن بانو کی شادی میرٹھ میں عبدالعزیز صاحب سے ہوئی جو وہاں گھڑیوں کا کاروبار کرتے تھے۔ فریدہ خانم کی شادی پٹنہ کے نامور ڈاکٹر میجر مسحف علی ہاشمی کے چھوٹے صاحبزادے احسان علی ہاشمی سے ہوئی۔ ان کے ہاں سات اولادیں ہوئیں۔ فریدہ ہاشمی آج کل کراچی (مغربی پاکستان) میں مشہور لیڈی ڈاکٹر ہیں۔

فیروز آرٹسٹ کا پورا نام فیروز محمد خاں ہے۔ وہ حویلی کلو خواص، بازار چتلی قبر دہلی میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ان کا رجحان مصوری کی طرف رہا۔ ان کے والد محترم دیندار تھے اور مصوری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے ایک دوست ساوتری پرشاد نے ایک روز صاحبزادے کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ کیا پڑھتے ہیں؟ والد صاحب نے فرمایا: "اسکول جاتا ہے، قرآن شریف پڑھتا ہوں مگر اس کو تصویر کشی کا شوق ہے۔ کاپیوں پر تصویریں بناتا رہتا ہے۔" ساوتری پرشاد نے کہا کہ یہ کوئی بری بات ہے؟ تم تو پرانے زمانے کے ہو اور پرانے خیالات رکھتے ہو۔

لڑکے کو کیوں نئے زمانے سے روشناس نہیں ہونے دیتے۔ اسے اسکول کے کے علاوہ باقی وقت میں کسی مصور کے پاس بھیج دیا کرو۔ والد صاحب بولے "میں کسی بھی مصور کو نہیں جانتا جہاں یہ کام سیکھ سکے۔ اگر انٹرنس پاس کرے تو کسی آرٹ کالج میں داخل کرا دوں گا" ساوتری پرشاد نے کہا کہ یہ کام میں پورا کر دوں گا۔ اور وہ فیروز صاحب کو دہلی کے نامور و معروف فوٹوگرافر پنڈت رام ناتھ کے پاس لے گئے۔ ان کی دوکان کشمیری گیٹ پر تھی۔ یہ ۳ مارچ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ پنڈت رام ناتھ اپنے وقت کے مشہور و معروف ماہر فوٹوگرافر تھے اور روڑکی کالج کے سند یافتہ تھے۔ انھوں نے فیروز صاحب کو بڑی شفقت سے کام سکھایا۔ ان کی صلاحیت بر روئے کار آئی اور وہ بھی ایک ماہر فوٹوگرافر بن گئے۔

فیروز صاحب کے مغل مصوری کے استاد "مصور اعظم منشی محمد حسین" تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے شاگرد ہوئے — تقریباً چھ سات سال تک ان سے کام سیکھتے رہے اور پھر بعد میں اپنا ذاتی اسٹوڈیو ریگل بلڈنگ نئی دہلی میں قائم کیا ہی تھا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ سرمایہ اتنا بھی نہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ کاروبار کرتے۔ اس لئے گھر پر ہی کمرشل آرٹ کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ کیونکہ فوٹوگرافی میں کافی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے اور ۱۹۴۷ء کی ہنگامہ آرائی نے سب کو تباہ و برباد کیا تھا۔ اس مشکل دور میں انھوں نے بڑی مستقل مزاجی سے اپنے کام کو سنبھالا۔ اس وقت صرف ان کی بڑی لڑکی بیدار اختر پیدا ہوئی تھی۔ جو کمسن تھی۔ ان کے خاندان کے کافی افراد پاکستان جا چکے تھے، لیکن یہ ہمت و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر یہیں رہے۔ جب ذرا لاقانونیت کے بادل چھٹے اور قتل و غارت گری ختم ہوئی تو خدا کا شکر ادا کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ ۱۹۴۷ء میں لاجپت رائے مارکیٹ زیر تعمیر تھی اور اس کے صدر دروازے پر ایک قد آدم تصویر (LIFE SIZE PORTRAIT) لالہ لاجپت رائے کی لگنی تھی جس میں لالہ جی کو گاندھی ٹوپی اوڑھے ہوئے دکھایا گیا ہے لالہ جی کا کوئی بھی فوٹو گاندھی ٹوپی کے ساتھ نہ تھا بلکہ تمام پگڑیوں کے ساتھ تھے۔ فیروز صاحب نے ان کی تصویر گاندھی ٹوپی کے ساتھ تیار کر دی۔ فسادات کے بعد یہ ان کا پہلا کام تھا۔ تصویر بہت پسند کی گئی۔ حوصلہ بڑھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو

وزیر اعظم ہند نے اس تصویر کی نقاب کشائی بروز ہفتہ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کی شام کو کی، اور تصویر کی تعریف کی۔ موجودہ مارکیٹ دوبارہ پتھر کی تعمیر کی گئی ہے۔ پہلے ٹین کے شیڈ اور کچی دیواروں سے عارضی طور پر بنائی گئی تھی، جو کہ توڑ دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی صدر دروازہ بھی توڑ دیا گیا۔

فیروز صاحب اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ اور خود دار بھی۔ زمانہ بدل گیا، لیکن ان کی خو نہ بدلی۔ انھوں نے اپنے خاندان کی روش کو باقی رکھا ہے۔ ان کی قلمی مہارت کا یہ حال ہے جو میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کوئی تصویر ایسی بنوانا چاہتے ہوں جو صرف آپ کے ذہن میں ہے۔ اس کی شباہت، نقش، خد و خال بتانے پر وہ ہو بہو تصویر تیار کر دیتے ہیں اور آپ کے اطمینان کے حد تک اس کی تکمیل کرتے ہیں۔ میری ان سے پرانی واقفیت ہے۔ میری تمام کتابوں کے سرورق اور کتابوں کی اکثر تصاویر ان کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہند و پاک کے مشہور اور اپنے فن میں کامل مصور ہیں۔ دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات کے بیشتر ادارے ایسے ہیں جنھوں نے ان کے فن سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ دہلی کے نامور ہر دل عزیز شخصیت جناب حکیم عبدالحمید صاحب ان کے فن کی قدر کرتے ہیں۔ ادارہ ہمدرد کا اکثر و بیشتر کام ان ہی سے کرایا جاتا ہے گذشتہ سال ۱۹۶۹ء میں جب انھوں نے غالب اکیڈمی قائم کی تو اس کے میوزیم کا تمام کام ان کے سپرد ہوا۔ چنانچہ میوزیم کی تمام تصاویر ان ہی کے قلم کی مرہون منت ہیں۔ ان میں غالب، اقبال اور میر تقی میر کی تصویریں قابل ذکر ہیں جو بڑے سائز میں ہیں۔ سال رواں یعنی ۱۹۷۰ء میں حکیم صاحب موصوف نے "انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ" تغلق آباد میں قائم کیا، اس کے میوزیم کی بھی تمام تصاویر، پرانے زمانے کے اطبا، فلسفی اور دانش وروں کی پینٹنگس اور فوٹو گرافس میں انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بو علی سینا، رازی، ابن رشد، زہراوی، البیرونی، ولیم ہاروے، شسرتہ، اکبر ارزانی اور علی گیلانی وغیرہ کے علاوہ دور جدید کے نامور حکما، کی تصاویر جن میں حکیم اجمل خاں صاحب اور حکیم عبدالمجید صاحب کی تصاویر قابل ذکر ہیں، شاہکار کا

درجہ رکھتی ہیں۔ قدیم طریقۂ علاج، سازوسامان، جڑی بوٹیاں اور آلات جراحی وغیرہ کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ انسٹی ٹیوٹ انٹرنیشنل فیم کا حامل ہے، لہذا اس کے لئے ایسے کہنہ مشق فنکار کی ضرورت تھی جو اس کے کام کو کمال خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہو اور غالباً فیروز صاحب کے ہاتھوں اس کام کی تکمیل ان کے ماہر فن ہونے کا روشن ثبوت ہے۔

صرف ایک مسہری ہے جس پر ان کا سارا کارخانہ ہے۔ اس پر دن بھر کام کرتے ہیں اور اسی پر رات کو سوتے بھی ہیں۔ کوئی بناوٹ انکو چھو نہیں گئی ہے۔ ان کے کئی شاگرد ہیں،، جو کامیابی کے ساتھ اپنا الگ کام کرتے ہیں۔

فیروز صاحب قناعت پسند آدمی ہیں، وہ صرف حسب ضرورت کام کرتے ہیں جس سے ان کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ اطمینان بخش زندگی، پُر سکون ماحول آرٹسٹ ہونے کے باعث ان کو بہت پسند ہے۔ بس انھیں پرانے وقت کی یادگار سمجھئے۔ اس وقت ان کی سات اولادیں ہیں۔ سب سے بڑی لڑکی بیدار اختر فیروز نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی تک تعلیم حاصل کی ہے۔ بڑے لڑکے تاج محمد (تاج فیروز) دہلی کالج سے بی۔ اے کیا ہے۔ اس کم عمر میں بھی ان کا ہاتھ نہایت صاف ہے۔ اپنے فالتو اوقات میں والد صاحب کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ کئی انعام بھی حاصل کر چکے ہیں اور فوٹو گرافی سے بھی مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔ امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے ــــــ دوسرے صاحبزادے خالد فیروز نے جامعہ کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا ہے۔ ان سے چھوٹی لڑکی شمیم اختر، اس کا چھوٹا بھائی طارق فیروز، چھوٹی بہن نسیم اختر اور سب سے چھوٹا بھائی اطہر فیروز بھی زیر تعلیم ہیں۔ یہ بڑے ہی اطمینان کی بات ہے کہ سب بچے دینی تعلیم سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ حسب توفیق سب نماز پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اللہ توفیق دے تو یہ بچے قوم و ملت کے لئے باعث فخر ہوں گے۔

فیروز صاحب کے کہنے کے مطابق ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب بزرگوں

کی خدمت، استاد کی عزت، ماں باپ کی دعائیں اور ان کی رفیقۂ حیات کی دانش مندی اور سلیقہ شعاری ہے۔ ان کی اہلیہ انور جہاں نہایت ہی نیک بی بی ہیں۔ بچوں کی نگہداشت، پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت کے سبب بچے نہایت ذہین، باادب اور ہونہار ہیں۔ کاروباری طور پر بھی وہ ان کی معاون ثابت ہوئی ہیں۔ یہ نیک خاتون دہلی کے اعلیٰ گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ اُن کے والد جناب احمد سعید دہلی کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ آرائی نے ان کو بھی نہیں بخشا ـــــــ آخر میں ان کا بھی کاروبار ختم ہو گیا تھا۔ ان کے تین صاحبزادے، جاوید احمد، اقبال پرویز اور سلیم احمد مع اپنی والدہ اور تین بہنوں کے ساتھ کراچی میں رہتے ہیں۔ ایک بہن دہلی میں ہیں۔ احمد سعید صاحب نے جنوری ۱۹۶۲ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

محلہ چوڑی والان کے لوگوں کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت

دہلی کے بہت کم لوگ ایسے تھے جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ نہ لیا ہو ـــــ اسمیں ہندو مسلمان یا سکھ کی تمیز نہیں تھی . . . . سب نے غلامی کی لعنت کو ختم کرنے کی جدوجہد میں اپنا پورا زور لگایا تھا۔

جن لوگوں نے اس تحریک میں حصہ لیا تھا اور جانوں کی بازیاں لگائی تھیں، ان کے تاریخی کارنامے تاریخ کے صفحات کی زینت بنتے اور اگر یہ تحریک کامیاب ہوجاتی تو اس کا ہر ہیرو زندہ ہوجاتا۔

چونکہ یہ تحریکِ آزادی ناکام ہوئی اور ایسی بری طرح ناکام ہوئی کہ اس کا اثر ہندوستان کے چپے چپے پر ہوا۔ ہر بوڑھا بچہ اور نوجوان خواہ مرد ہو یا عورت، ان کے دلوں پر خوف کا عالم چھا گیا تھا، جس نے جو کیا تھا وہ اس کو مخالفوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ لوگوں کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ تاکہ وہ دشمنوں کے پھندوں میں پھنسنے سے بچ جائے۔

اس حالت میں اس دور کی تاریخ اور مجاہدوں کے کارنامے کس طرح قلم بند ہوسکتے تھے۔ یا عالم آشکارا ہوسکتے تھے۔ دلوں میں رہے وقتاً فوقتاً زبانوں پر آتے رہے اور آتے جارہے ہیں۔

محلہ چوڑی والان لال قلعے سے بہت دور نہیں ہے، تھوڑی ہی دور کے فاصلے پر ہے۔ لال قلعے کے سامنے جامع مسجد ہے اور جامع مسجد کے سامنے پچاس قدم کے فاصلے پر محلہ چوڑی والان شروع ہوجاتا ہے۔ چھتہ شیخ منگلو کیا ہے محلہ چوڑی والان کا ایک ملا ہوا حصہ ہے۔ اسی چوڑی والان سے چاوڑی بازار کو جاتے وقت گلی میگزین آتی ہے، جس کے در و دیوار حافظ بنے کی گلی سے ملتے ہیں۔

یہ میگزین والی گلی کیوں مشہور ہے، اس لئے کہ اس جگہ شاہی میگزین تھا۔ اسلحہ شاہی رکھے جاتے تھے۔

جس محلے میں شاہی میگزین ہو، اس محلے کے رہنے والے آزادی کی تحریک سے بچ جائیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی محلے کے برگزیدہ حضرات میرے دادا حافظ قاری جلال الدین صاحب اور حافظ بنّے کے بہنوئی قدرت اللہ اور حافظ بنّے کے بیٹے کریم بخش کے داماد عبدالقادر، جو محلہ چوڑی والان میں رہتے تھے اور حاجی امان اللہ کے تایازاد بھائی حاجی محمد بخش جو چمڑے والی گلی میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ اور دوسرے حضرات اس میگزین کے اسلحات کی فراہمی وغیرہ پر مامور تھے۔

ان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ یہ اسلحات خریدیں اور میگزین میں پہنچائیں۔ عبدالقادر صاحب انگریزی فوج میں مخبری کے لئے بھی مامور تھے۔ موزے بنیان کی گٹھری لگاتے اور فوج کے ہمراہ رہتے تھے۔ اور بادشاہ کو اطلاع دیتے تھے کہ فوج کہاں جا رہی ہے اور کہاں سے آ رہی ہے یا اس میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

مرزا الٰہی بخش کا خاندان بھی اسی محلے میں رہتا تھا چنانچہ اسی محلہ چوڑی والان میں اب تک اس غدار خاندان کے ایک سپوت مرزا ثریا جاہ کے نام پر گلی مرزا ثریا جاہ چلی آتی ہے۔ اس غدار خاندان کے افراد سے مل کر ایک انگریز نے اس میگزین کو تباہ کرنے کی سازش کی تھی وہ خود بوری میں بند ہو کر بارود وغیرہ کی بوریوں کے ساتھ میگزین میں پہنچ گیا۔ اس نے جا کر میگزین کو آگ لگا دی۔ خود تو اس کو جلنا بھُننا تھا لیکن وہ اپنے ساتھ بہت سے ہندوستانیوں کو آگ کے شعلے بنا گیا۔ اس میگزین کے پھٹنے کا ایسا دھماکہ ہوا کہ چاوڑی بازار تک انسانی جسم کے لوتھڑے کے لوتھڑے اڑ اڑ کر گرے۔

جس گھر کو اسی کے گھر کے چراغ سے آگ لگے تو اسے کون بچا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی لپٹیں تمام دہلی میں پہنچیں، انگریزوں کی ٹولیاں لوٹنے مارنے اور قتل و غارت گری پر پل گئیں۔ جو شریف لوگ تھے انھوں نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جتن کئے، شریف زادیوں نے اپنی آبرو کی حفاظت اسی میں سمجھی کہ کنوئیں میں چھلانگ لگائیں اور ابدی نیند سو جائیں۔

غداروں کی بن آئی اور انگریزوں کا وفادار بننے کے لئے جس کو دیکھا باغی کہا اور گولیوں کا نشانہ بنوایا، جس گھر کو دیکھا معہ خاندان کے آگ لگوائی۔

ایک ٹولی انگریزوں کی جامع مسجد سے چتلا دروازے ہوتا لوٹتی اور قتل و غارت گری کرتی ہوئی میر عاشق کے کوچے میں پہنچی۔ مخبروں کے سردار منشی تراب علی نے پہلے تو اپنے محلے کے کچھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتروادیا۔ پھر اس ٹولی کو ہمراہ لے کر گلی جوتے والی کی طرف رخ کیا۔ اس زمانے میں کوچہ میر عاشق سے گلی جوتے والی میں آنے جانے کا عام راستہ تھا۔ جب مخبر اعظم کی یہ ٹولی سلطان العارفین کے مکان کے نیچے اتری تو مخبروں کے سردار کو شیخ قدرت اللہ دکھائی دیئے۔ شیخ صاحب صلاح الدین قریشی کے نانا حاجی عبدالحفیظ کے مکان کے سامنے کھڑے تھے، مخبروں کے سردار نے ان کی طرف اشارہ کیا کہ یہ باغی ہے، بادشاہ کا حامی ہے۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس ٹولی نے ان پر گولیوں کی بارش کردی۔ جب امن ہوا تو لوگوں نے ان کی نعش کو دیکھا تو حافظ داؤد کے مکان میں دفن کردیا۔ وہاں اب تک ان کی قبر ہے۔

شیخ قدرت اللہ کے بارے میں ایک اور حکایت بھی سنی جاتی ہے جو یہ ہے:

جب انگریزوں نے دہلی پر حملہ کیا ہے تو اس وقت ہمارے بزرگوں نے اپنے گھروں سے مستورات کو نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا اور کچھ حضرات دن میں مکانوں کا پہرہ دیتے تھے اور رات کو چلے جاتے تھے۔ پہرہ دینے والوں میں شیخ قدرت اللہ شہید بھی تھے۔

جب انگریزوں نے دہلی کو فتح کرلیا، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرتے ہوئے کوچہ میر عاشق میں پہنچے۔ منشی تراب علی کا انگریزوں کے وفاداروں میں شمار ہوتا تھا، ان کی وجہ سے کوچہ میر عاشق کے کچھ لوگ محفوظ رہے اور وہاں انگریزوں نے عمل جراحی زیادہ نہیں کیا۔ البتہ ان کا رخ گلی جوتے والی کی طرف ہوا، اور سلطان العارفین کے مکان سے اترے تو سونے کے زیور وہیں پھینک دیئے اور چاندی جیب میں ڈال لی۔ جب گلی کے لوگوں نے انگریزوں کو دیکھا تو آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ ان کو یہاں سے کسی طرح چلتا کرو۔ روپے اکٹھے کرکے جو تقریباً دس پندرہ روپے ہوں گے، ان کو دیئے، روپیہ دینے والے شیخ قدرت اللہ صاحب ہی تھے۔ یہ روپے دے ہی رہے تھے کہ ایک انگریز نے ان کو گولی ماردی۔ ساتھی یہ ماجرا دیکھ کر رفو چکر ہوگئے۔ یہ

گولی کھاکر حافظ داؤد والے مکان میں چلے گئے۔ دو تین روز کے بعد لوگوں نے دیکھا تو چارپائی پر مرے پڑے ہیں۔ وہیں دست پنوں وغیرہ سے گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

یہ واقعہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ ایسے سمجھ دار لوگ ایسی بچوں جیسی حرکت کریں گے۔ البتہ شہادت کی پہلی وجہ درست معلوم ہوتی ہے کہ ان کو انگریزوں کا باغی کہہ کر گولی کا نشانہ بنوایا گیا۔

میرے دادا حافظ قاری جلال الدین کی بھی کوچہ میر عاشق کے مخبروں کے سردار نے مخبری کی تھی کہ یہ بادشاہ کا بہی خواہ ہے اور شاہی میگزین میں اسلحہ پہنچاتا تھا۔ چنانچہ دادا مرحوم کافی عرصے تک روپوش رہے اور ان کے ساتھی پرانے قلعے میں جاکر رہنے لگے تھے۔ وہاں ان کی آمدنی گنّے سے ہوتی تھی۔ کھیتوں سے گنّے خریدتے اور بیچ ڈالتے تھے۔

ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزوں کے فوجی کیمپوں میں نان بائی بن کر روٹی پکانے پر لگ گئے تھے جو وہاں سے فوج کی خبریں لینے کے ساتھ راشن کا آٹا وغیرہ لاکر اپنے ساتھیوں کا پیٹ بھرتے تھے۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے پھیری والے کا بھیس بدلا، سوئیاں اور پینچکیں بیچتے پھرے اور ضروری خبریں حاصل کر کے بادشاہ تک پہنچا دیتے تھے۔

یہ طبقہ زیادہ تر میر محبوب علی صاحب کا معتقد تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انھی کی قیادت میں کام کرتا تھا۔ میر محبوب علی ان مجاہدین میں سے تھے جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں انگریزوں سے لڑنے کا فتویٰ دیا تھا، اس فتوے پر ان کے بھی دستخط ہیں۔ یہ چھتہ شیخ منگلو میں رہتے تھے۔ انھوں نے ہی چھتہ شیخ منگلو کی مسجد بنوائی تھی جس کے دروازے پر اب بھی لکھا ہوا ہے "مسجد میر محبوب علی" اور یہ مسجد اسی نام سے مشہور ہے۔

حافظ محمد بخش بھی دادا کے ہمراہ تھے، ان کے خاندان کے افراد بھی انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

حاجی امان اللہ کی ساس کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں جب حافظ محمد بخش معہ اپنے اہل و عیال کے محلہ چھوڑ کے جانے لگے تو حاجی امان اللہ

کی ساس سے کہا گیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو، ان کا چونکہ دماغ خراب تھا، جنونی کیفیت طاری تھی۔ اور جسیم بھی کافی تھیں، یہ چلنے کے لئے تیار نہ ہوئیں۔ لے جانے کی کافی کوشش کی گئی پُرآشوب وقت تھا۔ ہر شخص بھاگنا چاہتا تھا۔ جب یہ تیار نہ ہوئیں تو ان کو چھوڑ کے چلے گئے۔ قتل وغارتگری کرتے ہوئے فرنگی آئے۔ انھوں نے مکان میں جو اسباب تھا وہ اٹھایا اور اس غریب مجنوں عورت پر گولی کا فیر کر کے چلے گئے۔ جب خاندان کے لوگ گھر میں داخل ہوئے تو ان کو دفن کیا۔ ان کا ابھی تک گلی چرخے والی میں جس مکان میں حاجی کالے کباڑئے رہتے ہیں مزار ہے۔ اسی طرح بڑے بھائی محمد شفیع کے گھر میں بھی شہید فرنگ کی ایک قبر ہے جو ان کے دادا کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ بھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

شیخ قدرت اللہ جن کا حافظ داؤد کے گھر میں مزار ہے، یہ حافظ بنّے کے بہنوئی تھے ان کی بیوی کا نام عائشہ تھا، ان کے دو صاحبزادے تھے، ایک کا نام رحمت اللہ اور دوسرے کا نام کریم احمد تھا۔ کریم احمد کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ رحمت اللہ کے صاحبزادے حمید اللہ جن کی کلکتے میں سندریا پٹی میں جوتوں کی دکان تھی۔ ان کی شادی خالہ اصغری سے ہوئی جن سے محمد میاں اور احمد میاں دو لڑکے اور دو لڑکیاں چھمی حسین پیدا ہوئیں۔

حاجی امان اللہ کی ساس کے باپ کا اور خاوند کا پتہ نہیں چل سکا کہ کون تھے۔ البتہ حاجی امان اللہ صاحب ہماری برادری کے ایک بہت ہی پرانی شخصیت ہیں جنھوں نے ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں جس کو ایک سو اسی سال ہوئے چرخے والی گلی کے نکڑ پر (متصل خانقاہ شاہ غلام علی) ایک مسجد بنوائی تھی۔[۱] (دہلی صدیقی برادری کی شخصیتیں)

---

[۱] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص ۳۱۲

صدیقی برادری دہلی کا شجرہ

پڑھے لکھے آدمی کو اپنے حسب ونسب کا فکر زیادہ ہوتا ہے، چونکہ اس کا اٹھنا بیٹھنا پڑھے لکھے اور معقول طبقے میں ہوتا ہے اور اہل علم کبھی اپنے نسب کو چھپاتا نہیں، اس لئے وہ اس کی اہمیت کو زیادہ سمجھتا ہے۔ میرے والد ماجد مولانا شرف الحق مرحوم و مغفور ہندوستان کے مشہور شہروں کی ہی نہیں بلکہ غیر ممالک کی بھی سیاحت کر چکے تھے۔ یہ سوال ان کے سامنے ضرور آیا ہوگا، چنانچہ ان کو ان کا احساس ہوا، وہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

"مجھ کو چھ سات سال تک اس بات کی جستجو رہی کہ میں اپنے خاندان کا شجرہ حاصل کروں، یوں تو میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر گیا، لیکن خصوصیت کے ساتھ شجرہ کے حصول کے لئے ملتان، پٹیالہ، سرہند اور کرنال وغیرہ جانا پڑا، وہاں کے لوگوں سے معلوم کیا، لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہ ضرور معلوم ہوا کہ یہاں خاندان کے افراد رہتے ہیں لیکن منتشر حالت میں ہیں۔ انھوں نے میری آؤ بھگت کی اور ان کی خواہش بھی تھی کہ خاندان کا شجرہ حاصل کیا جائے، اور جب مل جائے تو اس کی ایک نقل ان کو بھی روانہ کر دی جائے۔"

قبلہ والد صاحب نے خاص طور پر پٹیالہ کے بارے میں فرمایا:

اب بھی وہاں ہمارے خاندان کے لوگ اور مقامات سے زیادہ ہیں۔ ان کو میرے آنے کا جب علم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میں ان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں تو انھوں نے میرا ایک شان دار جلسہ تلواروں کے سایہ میں کرایا۔ وہاں کے مردوں کے علاوہ عورتیں بھی بلند قامت اور جسیم اور خوب صورت ہوتی ہیں، اس جلسہ میں عورتوں نے بھی شرکت کی تھی۔"

والد مرحوم نے ایک مقام کا ذکر کیا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، ذہن میں پھر رہا ہے، لیکن زبان پر نہیں آتا، وہاں والد صاحب کا ایک پادری سے مناظرہ ہوا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے علاوہ مقامی افسران اور انگریز بھی کافی تعداد میں شامل ہوئے تھے۔ دو تین گھنٹے تک مناظرہ ہوتا رہا، آخر پادری عاجز آگیا جواب نہ دے سکا اور اپنی کم لیاقتی کا اس نے بھرے جلسے میں اقرار کیا۔

اس مناظرے میں ایک مسلمان سشن جج نے بھی شمولیت کی تھی، انھوں نے جلسے کے اختتام پر والدِ مرحوم سے مقامِ سکونت معلوم کیا۔ دوسرے روز جہاں یہ ٹھہرے ہوئے تھے وہاں پہنچے۔ انھوں نے شہر کے تاثرات اور حکام کے خیالات بتلائے کہ آپ کے معقول دلائل کا ہر شخص معترف ہے۔ دوران گفتگو انھوں نے والد صاحب سے دریافت کیا آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد علیہ الرحمۃ نے بتایا کہ میرا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے ملتا ہے۔ اس نے ان کے دادا اور والد کا نام پوچھ کر کہا، افسوس میرے والد ماجد کا انتقال ہوگیا، وہ زندہ ہوتے تو آپ سے مل کر بہت مسرور ہوتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دہلی میں ہمارے خاندان کے لوگ رہتے ہیں اور میں حیدرآباد دکن میں اپنے خاندان کے ایک فرد سے ملا تھا، وہ آپ کے والد کا نام لیا کرتے تھے۔ اس گفتگو کے بعد فرمایا تم انبالہ جاؤ، وہاں کا پتہ بھی دیا۔ والد مرحوم انبالہ پہنچے۔

انبالہ پہنچ کر ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ کامیاب کس طرح ہوئے وہ آپ کو ان کی حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوگا جو انھوں نے شجرۂ نسب کے ساتھ اس ضخیم کتاب میں لکھی ہے، جس میں مشکوٰۃ شریف اور بخاری شریف کے وہ اسباق لکھے تھے جو آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھے تھے۔ ملاحظہ ہو شجرۂ خاندان:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کرسی نامہ شرف الحق ابن حافظ جلال الدین دہلوی منقول از کتاب مولوی عتیق اللہ صدیقی برادر جناب حکیم علی حسین صاحب صدیقی تھانیسری بر مکان مناد سنہ ہانان پنزان، چھاؤنی انبالہ یوم دوشنبہ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۰۵ھ و مولوی صاحب

از یک مؤرخ کامل جو مولوی محمد علی قندھاری حاصل فرمودہ اند واو مورخ حوالہ کتاب می دہد بلا ثبوت وشاہد چیزے نمی نویسد والغیب عنداللہ، واللہ اعلم بالصواب۔

شیخ داؤد ملتانی، ابن شیخ موسیٰ ابوالمکارم ملتانی، ابن شیخ عبدالوہاب کرمانی، ابن شیخ ابی سعید کرمانی، ابن علی، ابن اسماعیل، ابن یوسف، ابن یوسف بغدادی، ابن عبدالواحد، ابن عبدالعزیز، ابن احمد ابن اسماعیل، ابن عبداللہ مکی، ابن قاسم، ابن عبدالجبار، ابن خالد، ابن عبدالرحمٰن، ابن شہاب الدین، ابن موسیٰ، ابن ابراہیم، ابن سفیان ثوری، ابن عینۃ، ابن ابی القاسم احمد، ابن عبدالرحمٰن، ابن محمد صدیق، ابن قاسم، ابن عبدالرحمٰن ابن امیرالمومنین عبداللہ کنیت ابوبکر صدیق، ابن عثمان کنیت ابی قحافہ رضی اللہ عنہم۔

اس میں تو شک ہرگز نہیں ہے لقولہ ہوالصحیح از تاریخ تنویر الاخیار وفی ملوک الاخیار نوشتم برائے یادگار شرف الحق الحق عفی عنہ۔ اسی کتاب کے حاشیے پر داؤد ملتانی کی اولاد کے حسب ذیل نام بھی تحریر کئے ہیں۔ داؤد ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ بیٹے تھے۔

شیخ احمد لاہوری، شیخ عبدالباسط لاہوری، شیخ عبدالغنی لاہوری، شیخ کاظم لاہوری، شیخ عبدالرزاق لاہوری، شیخ ابراہیم لاہوری، شیخ مردان لاہوری، شیخ بڈھن لاہوری، شیخ مطلوب لاہوری، شیخ فیض لاہوری، شیخ محمد منعم لاہوری، شیخ محمد اکرم لاہوری۔ یہ کل باپ بیٹے ملتان سے لاہور میں آئے۔

والد علیہ الرحمۃ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ شیخ بڈھن جو ہمارے جد اعلیٰ ہیں ان کی اولاد کی بھی جستجو کی اور اس میں کامیاب ہوئے چنانچہ اس شجرے کی عبدالحکیم صاحب صدیقی سب ایڈیٹر پٹیالہ اخبار والد صاحب سے نقل کر کے لے گئے تھے۔ انھوں نے والد علیہ الرحمۃ کو اپنے حسب ذیل خط میں جو میرے پاس ہے شیخ بڈھن کی اولاد کے نام لکھے ہیں۔

"محترم المقام مولانا شرف الحق صاحب دام عزہٗ، اسلام علیکم

آپ کا شجرہ نقل کر کے میں لے گیا تھا، آپ کے حکم کے مطابق خاندان کے

بزرگوں سے ملا شیخ ابراہیم، شیخ محمد صدیق، شیخ کریم الدین سے شیخ بڈھن کے صاحبزادوں کے نام معلوم کئے، انھوں نے یہ نام بتلائے۔ ساتھ میں صاحبزادیوں کے نام بھی معلوم ہوئے چھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔

صاحبزادے: شیخ عبدالرحیم، شیخ محبوب بخش، شیخ احمد، شیخ عبدالکریم، شیخ عبداللہ اور شیخ عبدالرحمٰن۔

صاحبزادیاں: عائشہ، صفیہ، رحمت، آمنہ۔

شیخ ابراہیم، شیخ محمد، شیخ کریم الدین، شیخ بڈھن کے بھائی شیخ عبدالباسط کے نبیرہ ہیں۔ ان کے دادا کا نام رحمٰن بخش، والد کا نام محمد اسماعیل تھا۔ شیخ اسمٰعیل میرے نانا تھے۔ میری والدہ کا نام زلیخا ہے اور والد مرحوم کا نام عبدالرحیم تھا۔

اخبار کا کام مجھ کو زیادہ کرنا پڑتا ہے اس لئے عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ انشاءاللہ آئندہ مزید معلومات فراہم کر کے روانہ کر دوں گا۔ فقط والسلام

عبدالکریم صدیقی سب ایڈیٹر پٹیالہ اخبار پٹیالہ

۱۱ ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ

اس مستند ثبوت کی وجہ سے والد مرحوم اپنے آپ کو صدیقی لکھا کرتے تھے اور اپنی تصانیف پر بھی نام کے ساتھ صدیقی تحریر کرتے تھے۔ چنانچہ استیصال عیسوی بمقابلہ دین محمدی ۱۳۰۶ھ میں چھپی تھی اس پر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھا ہے۔

والد صاحب کے پاس صدیقی برادری کے شجرے کے حصول کے لئے اکثر لوگ آتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء۔ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ الہ آباد سے ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی صاحب آئے اور وہ مذکورہ شجرہ نقل کر کے لے گئے۔

عرصہ ہوا جناب عبدالکریم صاحب صدیقی نے بھی مجھ سے ذکر کیا تھا کہ ایک صاحب غالباً انبالہ سے دہلی آئے تھے جو اپنے آپ کو صدیقی بتاتے تھے اور ان کا دہلی میں آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ شجرہ خاندانی کا پتہ لگائیں۔ جب یہ صاحب دہلی میں آئے تو برادری والوں نے ان کی بہت عزت کی اور دعوتیں بھی دیں۔ یہ مولوی شرف الحق صاحب سے ملے، ان کا خاندانی

شجرہ دیکھا ہی نہیں بلکہ نقل کیا اور کہا ہمارے بزرگوں کا سلسلہ بھی شیخ بڈھن سے ملتا ہے میری تحقیق کے مطابق یہ شجرہ درست ہے۔

میں نے رسالہ فٹ ویر میں عبدالکریم صاحب کی زندگی میں ایک مضمون "صدیقی ہونے کا قدیمی سرکاری اور دستاویزی ثبوت" کے عنوان کے تحت لکھا تھا۔ جس میں اس واقعے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہوئے حافظ محمد رحیم صاحب ایڈیٹر فٹ ویر نے حسب ذیل حاشیہ لکھا تھا:

"غالباً ۱۹۳۰ء کی بات ہے کہ یہ صاحب تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں برادری کے ہم سب نوجوان محمد علی ریڈنگ روم قائم کر رہے تھے۔ میں نے اکثر انھیں لائبریری کے دفتر میں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ محض شجرۂ نسب کی تصدیق کے لئے انبالہ سے دہلی آئے تھے اور قوم کے ان بزرگوں سے مل کر معلومات حاصل کر رہے تھے جنھیں شجرہ کے متعلق معلومات تھی۔"

یہ تو والد ماجد کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اس کے علاوہ ہماری برادری کا ایک معزز خاندان بنے والوں کا ہے جن کے پاس اپنی جائیداد کے قدیمی دستاویزات ہیں چنانچہ حافظ عبدالمنّان صاحب نے مجھ کو بتایا کہ ہمارے خاندان کے بزرگوں کے نام جو موضع جہاں نما اور موضع بسی پور تھے۔ ان کے پرانے سرکاری کاغذات میں گوت صدیقی لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالمنان صاحب نے مذکورہ دستاویزات مجھ کو دکھلائیں جن کی عبارت یہ ہے:

(۱) نقل از نقشہ کھیوٹ کھتونی موضع بسی پور پرگنہ وتحصیل وضلع دہلی خاص مشمولہ مثل بند وبست بابتہ ۱۸۸۰ء معافی دوام بنام کریم بخش ولد خدا بخش عرف حافظ بنے قوم شیخ گوت صدیقی۔

(۲) نقل از نقشہ کھیوٹ کھتونی موضع جہاں نما پرگنہ وتحصیل وضلع دہلی خاص مشمولہ مثل بند وبست بابت ۱۸۸۰ء معافی دوام کریم بخش ولد خدا بخش ورحیم بخش ولد کریم بخش قوم شیخ گوت صدیقی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل موضع جہاں نما اس آراضی کا نام تھا جس کے تھوڑے حصے پر

اب حافظ بنے کی سرائے ہے۔ اس نام کے بعد یہ آراضی "ٹرے ولین درہ" یا "ٹرے ولین باغ" کہلائے جانے لگی۔ "ٹرے ولین" ایک انگریز تھا جو بندوبست کے محکمے کا افسر تھا۔

حافظ عبدالمنان صاحب بنے والوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اسی نسبی و نسلی صدیقی نام کی نسبت سے حافظ بنے نے صدیقی پریس جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل جاری کیا تھا جس میں مذہبی وغیرہ کتابیں چھپتی تھیں اور حافظ بنے کے صاجزادے کریم بخش نے بھی اسی زمانے میں حنفی پریس بھی قائم کیا تھا۔

حکومت برطانیہ کے ابتدائی زمانے میں جو جائدادیں واگذار ہوئی تھیں یا جو مقدمات دائر ہوئے تھے، ان مقدمات کی مثلیں انگریزی زبان میں چھپوائی جاتی تھیں۔ چنانچہ حافظ عبدالمنان صاحب نے مثل مقدمہ محمد مرزا بنام حافظ کریم بخش ومسماۃ بیگم جان ومسماۃ مہرجان اور مسماۃ انور جہاں مطبوعہ مجھ کو دکھائی۔ یہ مقدمہ ۱۸۸۶ء میں کیلیفڈ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں دائر ہوا تھا۔ اس مقدمے کا نمبر ۳۱۰ ہے۔ مضمون سے متعلقہ بیان واقتباسات ملاحظہ ہوں:

صفحہ نمبر ۵۴ پر بیان کریم بخش: "میرے پاس صدیقی پریس اور حنفی پریس کا حساب کتاب نہیں ہے۔"

صفحہ نمبر ۹۰ پر بیان خدا بخش سکنہ بھوجلہ پہاڑی: "کریم بخش جوتے اور کتب فروشی کا کام اپنے والد کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کا علیحدہ پریس تھا اور ان کے والد کا ایک دوسرا علیحدہ پریس تھا۔"

میں نے اپنے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے میں اس صدیقی پریس کی مطبوعہ کتابیں تلاش کیں تو دو کتابیں صدیقی پریس کی چھپی ہوئی ملیں۔

(۱) ہدیہ اثنا عشریہ: یہ ۱۲۶۱ھ میں چھپی، پریس نگمبود (اسپلنڈ روڈ) کے راستے میں تھا۔ اس کے مالک خدا بخش اور مہتمم عنایت اللہ صاحب تھے۔

(۲) تحفۃ الہند مؤلفہ مولانا عبید اللہ نو مسلم، مطبوعہ ۱۲۸۱ھ۔

اس سے زیادہ معقول ومدلل اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ جو ناقابلِ تردید ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں، اور خاص طور پر اپنے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب سے

بار ہا سنا کہ ہماری برادری کے لوگ ۱۷۱۱ء میں بندا بیراگی کے ظلم وستم سے تنگ آ کر سرہند سے نکلے اور مختلف مقامات پر انھوں نے سکونت اختیار کی اور دہلی میں بھی آ کر بسے اور ان میں کا اچھا طبقہ چمڑے والوں کی پہاڑی بازار چتلی قبر میں سکونت پذیر ہوا۔

چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ چمڑے والی پہاڑی کے نکڑ پر مسجد حافظ امان اللہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۸۵-۱۷۸۴ء میں تعمیر ہوئی، واقعات دار الحکومت اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس میں لکھا ہے۔ پیش طاق کے کتبے کا پہلا شعر مٹ گیا، دوسرا یہ ہے: [۱]

..... خرد گفت از سال او   زہے مسجدے پر ز نورِ خدا

حافظ امان اللہ ہماری برادری کے بزرگ تھے، ان کے تایازاد بھائی حاجی محمد بخش کے تین لڑکے تھے حاجی اللہ بخش، حاجی احمد اور عبدالحق۔

حاجی اللہ بخش کے صاحبزادے حکیم عبدالستار صاحب بانی صادق دواخانہ بازار ٹمیا محل تھے، ایک بیٹی نبی النساء ہیں۔

حاجی احمد کے تین لڑکے محمد احمد، عزیز احمد اور اشتیاق احمد تھے اور دو لڑکیاں انجمن آرا اور میمونہ تھیں۔

عبدالحق صاحب کے صاحبزادے محمد اصغر، انوار الحق، محمد یعقوب تھے، اور ایک لڑکی اختر النساء تھیں۔

حافظ امان اللہ صاحب کے اس خاندانی رشتے کی تصدیق میں نے چچا انوار صاحب اور حافظ زین العابدین صاحب سے ان کی زندگی میں کی تھی اور ان کی زندگی میں "محلہ چوڑیوالان کے لوگوں کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت" میرا ایک مضمون رسالہ فٹ ویر کراچی میں شائع ہوا تھا جو اس کتاب میں بھی درج ہے۔ جس میں ان ہی الفاظوں کے ساتھ حافظ امان اللہ صاحب کا ذکر ہے۔

آج سے ڈھائی سو سال پہلے ہماری برادری کے خاندان بہت ہی مختصر تھے۔ میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میری دادی دانا کی سات بہنیں تھیں۔ برادری کا بہت سا حصہ ان کی اولاد ہے۔

---

[۱] واقعات دار الحکومت جلد دوئم ص ۳۱۲

اس سے بھی اندازہ لگائیے کہ ہم لوگ دہلی میں اس زمانے میں بڑی تعداد میں گلی چرخے والی اور محلہ چوڑی والان میں آباد تھے۔ گلی چرخے والی میں زیادہ سے زیادہ آٹھ یا نو مکان تھے، اور محلہ چوڑی والان میں زیادہ سے زیادہ اٹھارہ انیس گھر ہوں گے۔ گلی حکیم جی والی، گلی جوتے والی، گلی تخت والی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد یا اس سے کچھ پہلے وجود میں آئی تھیں۔ ورنہ یہاں میدان تھا یا کشمیریوں کا گلستاں یا چمن تھا۔ مسجد جوتے والی کی زمین بھی اسی کا حصہ تھی، مسجد میں جو کنواں ہے وہ اسی باغ کا کنواں تھا[۱]

---

[۱] رسالہ صدیقی گزٹ دہلی - اپریل ۱۹۶۳ء۔

جناب مولانا احمد حسین صاحب

مولانا احمد حسین ابن مولوی سید حسین ابن سید خدا بخش ابن سید احسان علی ابن سید شمشاد علی ابن سید مختار احمد دہلی کے قدیم رہنے والے تھے۔

اس خاندان کو اسی زمانے میں شاہ جہاں بادشاہ نے دہلی بلوایا تھا۔ جس زمانے میں جامع مسجد شاہی دہلی کے امام صاحب کے خاندان کو دہلی بلوایا تھا۔ جو ترکمان دروازے کے اندرونی حصہ احاطہ میر بھکاری میں مقیم ہوا۔

مولوی سید احسان علی صاحب شاہ عالم کی فوج میں ملازم تھے، ان کی دربار شاہی میں رسائی تھی۔ مسجد صالح جو ترکمان دروازہ کے پاس ہے جس کو صالح بہادر بن حسین سلطان نے ۱۰۸۷ھ مطابق ۱۶۷۶ء میں تعمیر کرایا تھا اور جو ۲۶ھ جلوس عالمگیری میں خانزاد خاں کی جگہ جالندھر کے فوجدار مقرر ہوئے تھے، اسی مسجد میں مولوی صاحب امامت فرماتے تھے۔

ان کے فرزند ارجمند مولوی سید خدا بخش قلعہ معلیٰ میں قرآن مجید اور دینیات کے پڑھانے پر مامور تھے۔ انھوں نے دہلی کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ انگریزوں سے معرکہ آرائی کی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ان کو انگریزی حکام نے سزائے موت کا حکم دیا۔ جس کے مطابق انھوں نے پھانسی کے تختے پر جام شہادت نوش کیا۔ ان کے صاحبزادے مولوی سید حسین کا بہادر شاہ ظفر کے حامیوں میں شمار تھا۔ انھوں نے بھی اس جنگ میں شرکت کی تھی۔ یہ بھی انگریزوں کے عتاب میں آئے، لیکن ایک فوجی کی مدد سے بچ بچا کر کئی برس تک عرب سرائے میں روپوش رہے۔ امن وامان ہونے کے بعد یہ دہلی میں آئے۔ کافی دنوں کے بعد جیل میں ملازمت ملی۔ جہاں یہ قیدیوں کو کاغذ بنانا سکھاتے تھے۔ انھوں نے بھی مسجد صالح میں امامت کی۔ دہلی میں فوت ہوئے۔ کلو بخشو کے تکیے

میں آرام فرما ہیں۔

مولوی سید حسین کے صاحبزادے مولوی احمد حسین اور محمد حسین تھے۔ محمد حسین صاحب حافظ قرآن تھے۔ بمبئی میں وعظ کے لئے بلائے جاتے تھے۔ مولوی کرامت اللہ صاحب کے مرید تھے۔ تمام زندگی محنت و مشقت کر کے بسر کی۔ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب زمانے میں ہجرت کر کے پاکستان گئے، لاہور میں سکونت اختیار کی، وہیں انتقال ہوا۔ ان کی اولاد پاکستان میں سکونت پذیر ہے۔

مولوی احمد حسین صاحب نے قرآن مجید حافظ دھنّا بنیا سے مسجد مچھلی والان جامع مسجد میں حفظ کیا۔ مولوی جلال الدین افغانی سے مدرسہ فتحپوری دہلی میں درسی کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ اور اسی مدرسے سے سند لی۔ مولوی کرامت اللہ صاحب سے سلسلۂ صابریہ میں بیعت ہوئے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد باڑہ ہندو راؤ کی مسجد میں امامت کی۔ بارہ دری نواب وزیر خاں پھاٹک حبش خاں کی مسجد میں تعلیم القرآن کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ ان سے پنجابیوں کے لڑکوں نے کافی تعداد میں قرآن مجید حفظ کیا۔ حافظ رحیم الدین نتواں تیلی وغیرہ ان کے شاگردوں میں تھے۔ آخر عمر میں کوچہ پنڈت میں پیرجی عبد الصمد کی مسجد میں امامت کی۔

دہلی کی مساجد کے علاوہ بھوپال کی جامع مسجد میں تراویح سنائی۔ پیری مریدی کرتے تھے۔ ریاست دوجانہ میں ان کے کافی مرید تھے۔ زیادہ تر وہاں کی مسجد میں انھوں نے تراویح سنائی۔

ان کے احباب میں مولوی مظہر اللہ صاحب امام مسجد فتحپوری دہلی، پیرجی عبد الصمد صاحب اور مولوی عبد الغفار صاحب اور اخوندجی صاحب تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں ۱۹۵۰ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ قبرستان فیروز شاہ کوٹلہ میں دفن ہیں۔

مولوی احمد حسین صاحب کے تین صاحبزادے مولوی محمد احمد صابری، مسعود احمد اور محمد حامد ہوئے۔ مولوی محمد احمد صاحب نے مولوی عباس علی صاحب مدرس مدرسہ مسجد فتحپوری اور حکیم محمد نذیر صاحب صابر سے تعلیم پائی۔ مولوی عباس صاحب مسجد پاپوش فروشان محلہ

چوڑی والان میں امامت کرتے تھے۔ اور حکیم محمد نذیر صاحب پھاٹک حبش خاں میں رہتے تھے۔

مولوی محمد احمد صاحب پہلے مولوی کرامت اللہ صاحب سے بیعت ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد حاجی صوفی ظہور احمد صاحب کے مرید ہوئے۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر سے وعظ کہنا شروع کیا۔ امامت اور وعظ کی ابتدا مسجد صالح ترکمان گیٹ سے شروع کی۔ گجرات، کاٹھیاواڑ اور راجستھان میں آپ کو وعظ کہنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ سال کے چھ مہینے بمبئی وغیرہ میں گذارتے ہیں۔ عشرہ محرم میں آپ کا شہادت کا بیان بمبئی میں ہوتا ہے۔ آپ کے وعظ میں اثر ہے۔ رُلانا، ہنسانا اور جوش دلانا آپ کی زبان کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ سحرالبیان مقرر ہیں۔

مولوی محمد احمد صاحب انتہائی ظریف الطبع ہیں، دوست نواز انسان ہیں۔ حاضر جوابی میں کمال رکھتے ہیں۔ مولویت کا رعب و دبدبہ ان میں نہیں ہے۔ سادہ لوح ہیں اور سادہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی رہائش بازار ترکمان گیٹ گلی چاندی والی میں ہے۔ دہلی میں ان کا ٹھکانا جامع مسجد کے شمالی دروازے کے سامنے میر صلاح الدین حسام الدین تاجر کتب کی دکان ہے۔ ان کا زیادہ وقت جب دہلی میں رہتے ہیں یہیں گذرتا ہے۔ اس دکان پر علمی و ادبی مباحث جاری رہتے ہیں۔ جن سے سننے والے لطف حاصل کرتے ہیں۔

ان کے منجھلے بھائی مسعود صاحب تبلیغی دورے کے درمیان دریائے گومتی میں ڈوبے اور راہی ملک بقا ہوئے، ان کے چھوٹے بھائی حامد علی صاحب تجارت کرتے ہیں۔

جناب سیّد محمد اعظم دہلوی

سید محمد اعظم دہلوی کا سلسلۂ نسب حضرت نقی علیہ السلام سے ملتا ہے جو حسب ذیل ہے۔

حاجی محمد اعظم بن حاجی شاہ ماہ قلندر بن محمد ہاشم بن حاجی سید محمد بن حاجی محمد انور بن حاجی محمد اکرم بن حاجی عبدالرحیم بن خواجہ محمد قیام الدین المعروف حاجی محمد عرب بن سید محمد مکرم بن محمد قاسم بن محمد عبدالرشید قادری بن سید میر محمد بن سید محمد مکرم سید حسن محمد بن سید محمد غیاث نور بخش، بن محمد علی ثانی صمدانی بن سید محمد المشہور صفی اللہ بن عبداللہ المقلب مقبول اللہ بن سید عبداللہ بن سید علی المعروف جمیل اللہ بن سید جعفر علی بن حضرت نقی علیہ السلام۔

سید محمد اعظم کے جد اعلیٰ خواجہ قیام الدین المعروف خواجہ محمد عرب حسنی الحسینی تھے، جو شاہ جہاں بادشاہ کے زمانے میں آثار شریف جامع مسجد دہلی کے نگراں مقرر ہوئے۔ یہ تبرکات خلفائے بنو عباس کے قبضہ میں تھے۔ ان کی حکومت کے زوال کے بعد سلطان محمود غزنوی اور سلجوقی ترکوں کا عروج ہوا تو کچھ تبرکات غزنی پہنچ گئے اور باقی سلطان الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے قبضہ میں آئے اور سلطان عثمان صاحب نے جب سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر سلطنت عثمانیہ کا ایوان بلند کیا، جو تبرکات سلجوقی سلاطین کے پاس محفوظ تھے۔ وہ عثمانی سلاطین کے خزائن میں منتقل ہو گئے۔ چودھویں صدی عیسوی میں امیر تیمور نے ترکی پر حملہ کر کے سلطان بایزید یلدرم کو شکست فاش دی اور ان سے بزرگان دین کے تبرکات چھین کر اپنے وطن لے آئے اور اس طرح آل تیمور کے گھرانے میں خلفائے بنو عباس کے وہ گراں مایہ تبرکات پھر مجتمع ہو گئے جو شاہان غزنی اور سلاقیہ میں منقسم ہو گئے تھے۔ جامع مسجد دہلی کے تبرکات عرصے تک افغانستان میں رہنے کے بعد شہنشاہ ہمایوں کے ساتھ کابل سے ہندوستان میں آئے اور عہد شاہ جہانی تک توشہ خانے میں رہے۔[1]

---

[1] آثار شریف ص ۱۴

جامع مسجد دہلی کی تکمیل پر غربی دالان میں رکھوائے گئے۔ گیارھویں صدی ہجری کے آخر ایام میں شہنشاہ عالمگیر نے الماس علی خاں خواجہ سرا کے زیر اہتمام سنگ سرخ کا جالی دار ممبر تعمیر کرایا۔[۵۵] جو بہادر شاہ ظفر کے عہد میں تیز آندھی کی وجہ سے گر پڑا۔ اس کو از سر نو بہادر شاہ ظفر نے تعمیر کرایا۔

خواجہ محمد عرب کی رشد و فلاح کی شہرت سن کر شاہانِ وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرب یاب ہوا کرتے تھے۔ ان کے فرزند حاجی عبدالرحیم تھے جو اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ ان کے صاحبزادے حاجی محمد اکرم کی علمیت کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا۔ انھوں نے درس و تدریس میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ ان کے خلف حاجی محمد انور صاحب حکمت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ درباروں میں رسائی تھی ان کے نور نظر حاجی سید محمد صاحب بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، صاحبِ کرامت مشہور تھے۔ ان کے فرزند ارجمند حاجی محمد اعظم کے دادا حافظ محمد ہاشم تھے جن کا اپنے زمانے کے مشہور قاریوں میں شمار تھا، قرآن شریف کی تلاوت ہر وقت جاری رکھتے تھے۔

ان کے صاحبزادے حاجی شاہ ماہ قلندر تھے جو خاندان چشتیہ قلندریہ اور مداریہ کے اکابر میں تھے۔ آپ کا سالانہ عرس اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کرتے تھے، خاندان مغلیہ کے اکثر لوگ آپ کے سلسلے میں داخل تھے۔ آپ کے فرزند و جانشین سید محمد حافظ قرآن تھے۔ ہفت قرارت کے ماہر تھے، آپ جامع مسجد میں قرآن شریف پڑھتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی نماز فجر کے وقت اکثر اوقات جامع مسجد میں ان کا قرآن سنا کرتے تھے۔ باپ اور بیٹے کا مزار زیر جامع جنوبی حصے میں ہیں خانقاہ حسینی میں حضرت سرمد کے مزار کے متصل ہے۔

سید محمد اعظم کے دو فرزند حافظ عبدالعزیز اور حافظ محمد صالح تھے۔ عبدالعزیز صاحب بڑے پیر جی کے نام سے مشہور تھے، ان کی زبان میں برکت تھی۔ اور مجیب الدعوات تھے۔

---

[۵۵] آثار الصنادید

ان کے صاحبزادے حافظ عبدالحکیم، حافظ عبدالرزاق، حافظ داؤد محمود علی اور عبدالرشید صابری پہلی بیوی سے، کریم بخش اور رحیم بخش دوسری بیوی سے تھے۔

پیرجی عبدالرشید اردو فارسی اچھی جانتے تھے۔ علوم دینی سے بھی واقف تھے۔ شعروشاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ فرقت، ان کا تخلص تھا۔ سید صابر حسین صابری شفقت دہلوی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد۔ کے پرآشوب زمانے میں یہ لوگ اپنے مکانات چھوڑ کر روح اللہ خاں کی سرائے میں جابسے تھے۔ چنانچہ فرقت صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں [۱]

دل چاہتا ہے لکھوں میں بستی کا کچھ احوال — کیا کیا یہاں پہ لوگ تھے وہ صاحب خیال
آپس میں اتفاق سے رہتے تھے باکمال — کرتے تھے تجارت لکڑی ہوتے تھے نونہال
نام اس سرائے کا جو ہے گا روح اللہ خاں — درمیان یہ غدر کے بنے جنت نشاں
بھاگے تھے لوگ دہلی سے آکر رہے تھے یاں — جب ہوگیاں امن نہ لوگ رہے یہاں

سرائے کے لوگوں کا بھی فرقت صاحب نے ذکر کیا ہے ؎

باقی رہتے تھے ایک صنا جو نامدار — پایا تھا اس سرائے میں انھوں نے بڑا وقار
پورے تھے اپنی بات کے اور سب میں تھے کھرے — سب بستی والے ان کو بڑا مانتے رہے
اب یہ زمانہ حاجی رحیم بخش کا ہو رہا — دیتے خدا کی راہ میں خوش ہو کے بے بہا
جو کچھ ہوا وہ جس کی مقدر کا لے گیا — جو آیا اس کے پاس وہ محروم نہیں گیا
بخشی ہے اس کا نام اور اقبال ہے بلند — بیٹے حفیظ الدین ہیں لائق ہیں ارجمند
عبدالصمد ہیں چودھری اس وقت میں یادگار — جیسے سمند گھوڑے پہ ہوتا ہے شہسوار

عزت بڑی ہے ان کی زمانے میں آشکار
مانا ہے حاکموں نے کمسیر کا ڈالا ہار

فرقت صاحب نے عشقیہ شاعری کے ساتھ مرثیے بھی لکھے ہیں جو خاصے طویل ہیں۔

[۱] دیوان قلمی پیرجی عبدالرشید فرقت دہلوی۔

ان کے دو صاجزادے ذوالفقار احمد اور مختار احمد تھے۔ مختار احمد صاحب گریجویٹ تھے۔ ایم، اے پاس تھے۔ انگلینڈ، ملایا اور انڈونیشیا کی سیاحت کی تھی۔ بہت اچھے آرٹسٹ تھے۔ انگلش ویرہاؤس کشمیری گیٹ دہلی میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے۔ احمدیہ فرنیچر اسٹور بندر روڈ کراچی میں ملازمت کی۔ شادی نہیں کی تھی، غالباً ۱۹۶۵ء میں ۶۰ برس کی عمر میں کراچی میں انتقال ہوا۔ شعر و شاعری کا ان کو بھی شوق تھا۔ حضرت استاذی نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے شاگرد تھے۔ خار تخلص تھا ؎

جادو سے بھری رکھتا ہے وہ شوخ نظر بھی
دل کا بھی ہوا فیصلہ زخمی ہے جگر بھی

لگ جائے میری کشتیٔ آلام کنارے
گر لطف کی ہو جائے نظر ایک ادھر بھی

ہم سے بھی زمانہ میں نہیں بادہ گسار اب
ہم مے بھی پیا کرتے ہیں اور خونِ جگر بھی

بے فائدہ دل دے دیا اس غنچہ دہن کو
الفت کا نہ خارؔ اس پہ ہوا خاک اثر بھی

ذوالفقار احمد صاحب کے دو صاجزادے شمشاد احمد صاحب اور نثار احمد صاحب آج کل آثار شریف جامع مسجد دہلی کے نگراں ہیں، اہتمام میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ دونوں بھائی بھوجلہ پہاڑی گلی سیدان دہلی میں سکونت رکھتے ہیں۔

جناب شاہ ابوالخیر مجددی

شاہ ابوالخیر بن شاہ محمد عمر بن شاہ احمد سعید بن شاہ ابوسعید کا سلسلہ نسب حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ آپ کے پر دادا شاہ ابوسعید ۱۱۹۶ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ گیارہویں برس میں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ فن تجوید قاری نسیم اللہ صاحب سے سیکھا۔ علوم دینی مفتی شرف الدین رامپوری اور شاہ مولانا رفیع الدین دہلوی سے پڑھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے میں علم باطنی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے والد ماجد سے طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور والد صاحب کے حکم سے اپنے خاندان کے درویشوں سے تکمیل باطن کی۔ حضرت شاہ درگاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خاندان قادریہ میں بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔ ہزاروں آدمی مرید ہوئے۔ آپ جس پر توجہ ڈالتے وہ آپ کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ ۱۲۲۵ھ کو رامپور سے دہلی میں حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ شاہ صاحب نے ان کو اپنی مسند پر بٹھایا اور خلافت عطا کی۔

۱۲۳۹ھ کو حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد ریاست ٹونک پہنچے اور وہاں بیمار ہوئے اور عیدالفطر کے روز آپ نے اپنے عزیزوں کو نصیحت کی کہ: "اہل دنیا سے پرہیز کرنا، اگر دنیا داروں کے پاس جاؤ گے تو ذلیل ہوگے"۔ آپ کا ٹونک میں ہی ۱۲۴۵ھ کو انتقال ہوا۔ نعش تابوت میں رکھ کر دہلی لائی گئی۔ چالیس روز کے بعد تابوت سے نکالی گئی، اور حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

شاہ ابوسعید کے دوسرے صاحبزادے شاہ احمد سعید صاحب تھے جو ربیع الاول ۱۲۱۷ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد اپنے والد صاحب کے

ہمراہ دہلی گئے۔ نو دس برس کی عمر میں حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کی۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے:

"بہت سے لوگوں سے لڑکے مانگے لیکن کسی نے نہیں دیا البتہ ابوسعید نے اپنا لڑکا مجھے دے دیا ہے میں نے اس کو اپنا بیٹا بنایا ہے۔"

ابتدائی تعلیم آپ نے شاہ غلام علی صاحب سے حاصل کی۔ باقی کتب معقول و منقول مولوی فضل امام، مولوی رشید الدین خاں صاحب، مولانا شاہ عبدالعزیز، مولوی رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ بیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، تو درس دینا شروع کیا۔ پچیس سال خانقاہ شاہ غلام علی میں زندگی بتائی۔ ستاون برس کی عمر میں ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا دہلی میں بگل بجایا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد دہلی سے ہجرت کی۔ پنجاب سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچے، وہاں سے بمبئی روانہ ہوئے۔ بمبئی سے حجاز مقدس پہنچے، حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی مریدوں کی تعداد کافی ہوگئی۔ اہل شہر کی کوششوں سے ترکی حکومت کی طرف سے آپ کا وظیفہ مقرر ہوا۔ ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ میں آپ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ آپ کے تین صاحبزادے مولوی شاہ عبدالرشید، شاہ محمد عمر اور شاہ محمد مظہر تھے[1]

شاہ محمد عمر صاحب شوال ۱۲۴۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ابتدائی تعلیم مولوی حبیب اللہ صاحب سے پائی۔ حدیث اپنے چچا شاہ عبدالغنی سے پڑھی اور علوم دینی اور کتب تصوف اپنے والد ماجد سے تحصیل کی، بیعت بھی اپنے والد سے کی جنھوں نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ حجاز مقدس گئے۔ مدینہ منورہ میں مقیم تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، نواب کلب علی خاں والئ رامپور وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اس خاندان میں سے کوئی صاحب رامپور تشریف لائیں، اتفاق سے شاہ محمد عمر صاحب اپنے صاحبزادے کی شادی کرنے کے لئے رامپور

[1] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۹

تشریف لے گئے۔ نواب صاحب نے قلعے کے اندر سرکاری مکان قیام کرنے کے لئے دیا اور رامپور میں رہنے کے لئے اصرار کیا، لیکن آپ حجاز مقدس جانا چاہتے تھے۔ کہ رامپور میں محرم ۱۲۹۸ھ میں فوت ہوئے اور حضرت جمال اللہ صاحب کے گنبد کے متصل جانب غرب دفن ہوئے۔[۱]

شاہ محمد عمر صاحب کے صاحبزادے شاہ ابوالخیر صاحب تھے جو ۲۷ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ کو خانقاہ شاہ غلام علی مجددی دہلی میں پیدا ہوئے۔

چار سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، تحصیل علم مکہ معظمہ جاکر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، جناب مولانا سید حبیب الرحمٰن صاحب مہاجر اور جناب مولانا مولوی شیخ احمد دھاں سے کی۔ ۱۴ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور مدت تک مدرسہ صولتیہ میں مدرسی کی۔ شیخ القرا، شیخ عبداللہ آپ کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نے شاہ ابوالخیر صاحب کی برسوں خدمت کی، آپ کی وساطت سے حضرت کا فیض قاری عبدالرحمٰن الہ آبادی کو پہنچا۔[۲]

عین عالم جوانی میں مکہ معظمہ سے رامپور پہنچے، وہاں سے دہلی آئے اور خانقاہ شاہ غلام علی میں سکونت اختیار کی۔ ہر سال آپ ۱۲ ربیع الاول کی شب کو گیارہ بارہ بجے کے درمیان محفل میلاد شریف منعقد کرتے تھے، خود مولود شریف پڑھتے تھے، انوار و برکات کی یہ کثرت ہوتی کہ آپ کی آنکھوں سے برابر اشک رواں ہوتے، بیان کی تاثیر دلوں پر چھریاں چلاتی، آہ و فغاں کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ اس محفل میں لوگ کثرت کے ساتھ شامل ہوتے تھے، خانقاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی اور سڑک کی بھی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی۔

شاہ صاحب نماز بڑی خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے، نماز میں جب کسی آیت کے فہم معنی کی وجہ سے حلاوت پیدا ہوتی تو رقت طاری ہوجاتی اور تمام نمازی بھی بے چین ہوجاتے تھے اور زار و قطار رونے لگتے تھے۔

[۱] آثار رحمت ص ۳۰۹ [۲] حیات شاہ ابوالخیر ص ۲۱

آپ کو مطالعے کا بھی شوق تھا۔ آپ کے کتب خانے میں ہزارہا نایاب و بیش بہا قلمی اور مطبوعہ عربی، فارسی اور اردو کی ہر قسم و ہر فن کی کتابیں تھیں۔ قلمی کتابوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ معقول قیمتیں دے کر خریدتے اور اہم کتابوں کی نقل بھی کراتے تھے۔ چنانچہ مجمع الزوائد کی آپ نے نقل کرائی۔ آپ کا ۶۹ سال کی عمر میں جمعہ کی شب ۲۹ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ کو انتقال ہوا۔ خانقاہ شاہ غلام علی میں دفن ہوئے۔ آپ کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ خیرؔ تخلص کرتے تھے ؎

پہنچے نہ باغِ طیبہ تک افسوس خیرؔ ہم | آئی خزاں ربیع کا موسم بسر ہوا

دم بند ہوگا مطربِ چرخ کا ابھی | مدحِ نبی میں خیرؔ اگر نغمہ گر ہوا

نشانِ منزلِ مقصود سے واقف وہی ہیں خیرؔ | طوافِ کعبۂ دل روز و شب جو لوگ کرتے ہیں

مدد اے جذبِ عشقِ احمدؐ پاک | خیرؔ کو شوق جبہ سائی ہے

مل جائے خیرؔ دولتِ دنیا و دیں مجھے | مدفن کو گر بقیع میں تھوڑی سی جا ملے

جبین سائی کردے خیرؔ گنہگار
شفیع المذنبین کے آستان کی

مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی

مولوی امین الدین صاحب اورنگ آباد دکن کے رہنے والے تھے، وہیں پیدا ہوئے پھر ضلع ناسک میں سکونت اختیار کی۔ آپ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند گئے اور دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ ـــــ ۱۸۸۹ء میں مدرسہ اعزازیہ شاہ جہاں پور میں داخلہ لیا اور مولانا نادرالدین جنھوں نے منطق و فلسفہ مولانا عبدالحق خیرآبادی ابن مولانا فضل حق سے تحصیل کی تھی۔ ان سے معقولات کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ دوران تعلیم آپ نے محلہ حسن زئی شاہجہانپور میں قیام کیا۔ پھر دیوبند جاکر درس نظامیہ کو مکمل کیا۔ آپ مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب کے ہم سبق اور ہم جماعت تھے۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر دہلی آئے، اور مسجد چھتہ شاہ جی بڑھ شاہ بولا میں سکونت اختیار کی۔ کچھ دنوں کے بعد مفتی اعظم دیوبند سے دہلی آئے اور مولانا امین الدین صاحب کے پاس ٹھہرے۔ مولانا نے مفتی صاحب سے فرمایا کہ میں ایک مدرسہ دہلی میں قائم کرنا چاہتا ہوں اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔

مفتی صاحب نے فرمایا تمھارا خیال مبارک ہے میں تمھارے ساتھ ہوں، لیکن میرا اس وقت شاہجہاں پور جانا ضروری ہے اس لئے کہ میرے استاد مولانا عبیدالحق جن کی سعی و کوشش سے میں تعلیم حاصل کرنے گیا تھا۔ مجھ کو مدرسہ عین العلم کے لئے بلا رہے ہیں۔ میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ تم مولانا انورشاہ صاحب کو بلالو وہ تمھاری مدد کریں گے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا انورشاہ صاحب۔ مولوی امین الدین صاحب اور مولانا حافظ ضیارالحق صاحب دیوبند کے ہم سبق اور ہم جماعت تھے۔

چنانچہ مولوی امین الدین صاحب بجنور تشریف لے گئے۔ مولانا انورشاہ صاحب، مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری کے مکان میں مقیم تھے۔ مولانا نے شاہ صاحب کو اپنا مقصد بتایا وہ

تیار ہو گئے تو مولوی امین الدین صاحب نے شاہ صاحب سے معلوم کیا کہ آپ کے پاس کتنے روپے ہیں۔ شاہ صاحب نے بتایا سات روپے جو انھوں نے مولانا کو دئے تھے انھیں سات روپوں میں دہلی پہنچے، ان میں سے ٹکٹ بھی لیا گیا اور شاہ صاحب کو سنہری مسجد چاندنی چوک میں تعلیم کے لئے بٹھا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی امین الدین صاحب نے مولانا حافظ ضیاء الحق صاحب دیوبندی کو دیوبند سے بلوایا۔ مولوی امین الدین صاحب نے مہتمی اور مولانا محمد انور شاہ صاحب نے صدر مدرسی کے فرائض انجام دئے[1]

مولوی امین الدین صاحب نے شروع میں لوگوں سے مدد نہیں لی۔ مدرسے کو اپنے طور پر چلاتے رہے، لیکن جب ضروریات بڑھتی چلی گئیں۔ تو آپ نے پہلی میٹنگ ۲۳ صفر ۱۳۱۶ھ ــــ ۱۸۹۸ء میں کی۔ اور اس میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا:

"مدرسہ امینیہ عربیہ اسلامیہ جدیدہ واقع شہر دہلی جاری ہو چکا ہے۔ جب سے کہ جاری ہوا مثل کشتی دریائے بے سروسامانی کی موجوں سے اندیشہ غرق میں تھا اور ہمیشہ کمترین درگاہ باری تعالیٰ میں دست بدعا تھا کہ یا مجیب الدعوات کوئی مالک الغیب ابدال الصفت ایسا بھیج کہ اس کشتی قریب الغرق کو تھامے۔ واہ رے! شانِ ایزدی کہ اتفاقاً حضرت مولانا منفعت علی صاحب دام مجدہ مدرس مدرسہ دیوبند کسی کار ضروری کے واسطے تشریف لائے اور مدرسہ کو دیکھ کر لفظ مرحبا زبان پر لائے۔ المختصر اس کا ذکر چند سوداگروں سے کہ جو باخدا ہیں، مولوی صاحب نے بیان فرمایا، وہ سب صاحب دوسرے روز مدرسہ میں تشریف لائے کیا دیکھتے ہیں کہ کہیں حدیث نبوی کا درس دیا جا رہا ہے۔ کسی جگہ پر فقہ کہیں اصول فقہ پڑھایا جاتا ہے کہیں صرف و نحو کا چرچا ہے۔ غرض جمیع علوم کے درس دیکھ کر حیرت میں ہوئے۔ اور سب صاحبوں نے یہ مشورہ کیا کہ اس کشتی کو دریائے بے سروسامانی سے نکالنا چاہیئے اور ایک سرپرست مقرر

[1] مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی ص ۲

کرنا چاہیئے۔ جو ہمیشہ خبر گراں رہے۔ چنانچہ جناب شیخ حاجی محمد اسحاق صاحب سوداگر اور جناب الف خاں صاحب روشنائی والے جو کہ اس جلسہ میں موجود تھے مقرر کئے گئے اور ان ذات بابرکات نے خوشی سے قبول فرمایا اور سرگرم اصلاح مدرسہ ہوئے۔"

مولانا انور شاہ صاحب مدرسہ کے صدر مدرس ساڑھے چار سال تک رہے۔ جبکہ ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا اور آپ کے والد پر اس سانحہ کا بہت اثر ہوا۔ تو انھوں نے خاندانی امور اور خانقاہ کی جانشینی کے معاملے میں اعانت کرنے کے لئے آپ کو وطن میں مستقل رہنے کے لئے بلایا۔ چنانچہ آپ والد صاحب کے حکم سے مجبور ہوکر ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو دہلی سے تشریف لے گئے۔

مولوی امین الدین صاحب نے صدر مدرس کے لئے حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب کا نام تجویز کیا۔ مفتی صاحب اس وقت مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور میں مدرس تھے۔ ان کے پاس مولوی صاحب خود تشریف لے گئے۔ چنانچہ مفتی صاحب شوال ۱۳۲۱ھ میں دہلی پہنچے اور شیخ الحدیث اور مفتی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ مفتی صاحب کے آنے کے بعد سنہری مسجد کی جنوبی حصے کی زمین پر دو چار کمرے اور حجرے بنوائے۔

اسی سنہری مسجد کے زمانے کا واقعہ ہے، ایک مولوی صاحب صوفیوں کی روحانیت کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مولوی امین الدین صاحب کو یہ مذاق اور صوفیوں کی توہین ناگوار گذرتی تھی ایک روز صوفیوں کا مذاق اڑانے والے مولوی امین الدین صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں مولانا شرف الحق صاحب دہلوی بھی تشریف لے آئے اور مولوی امین الدین صاحب نے ان کا ذکر مولانا شرف الحق صاحب سے کیا۔ مولانا نے ان پر توجہ ڈالی تو وہ مولوی صاحب مچھلی کی طرح فرش پر تڑپنے لگے۔ مولوی امین الدین صاحب گھبرائے اور مولانا شرف الحق صاحب سے کہا یہ مرجائیں گے بس کیجئے۔ مولانا نے توجہ ہٹائی تو انکی بے چینی اور تڑپن ختم ہوئی۔ تب ان حضرت نے توبہ کی۔

سنہری مسجد میں جب طلباء کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور جگہ کی تنگی ہوگئی تو ۱۹۱۵ء میں مسجد پانی پتیاں کشمیری گیٹ کے متولیوں نے مولوی امین الدین صاحب کو مسجد

اور اس کی متعلقہ اراضی دیدی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے مسجد اور مدرسے کی تعمیر شروع کردی اور ۱۳۳۶ھ میں مدرسہ سنہری مسجد سے منتقل ہو کر پانی پتیان میں آگیا۔

یہ مسجد پہلے ایک احاطہ کے اندر تھی جس میں کئی کچے مکان اسی مسجد سے متعلق تھے۔ اصل مسجد تین در کی لداؤ کی تھی، شمال و جنوب کے دالان کرایے پر چلتے تھے۔ مولوی امین الدین کی کوششوں سے اس کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایک نہایت وسیع اور شاندار دومنزلہ و سہ منزلہ عمارات صحن مسجد کے گرد بن گئیں۔ ان سہ طرفہ عمارتوں میں طلبار کا دار الاقامہ، مدرسہ امینیہ، مہتمم و مدرسین کے رہنے کے حجرے، دار الافتار، دار الحدیث اور کتب خانہ وغیرہ تعمیر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں تعمیر کا سلسلہ جاری تھا اور اس وقت تک مولوی امین الدین صاحب کے ہاتھوں سے تعمیر پر تیس ہزار روپے خرچ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مولوی امین الدین صاحب کی مخلصانہ جد و جہد کا ذکر "صاحب واقعات دار الحکومت دہلی" نے کیا ہے

"عمارت کی مد جدا ہے، اس پر اب تک تیس ہزار روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور کام برابر جاری ہے۔ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کے لئے لاکھوں روپے فنڈ جمع کیا تو ان کی وجاہت کو اس میں بڑا دخل تھا۔ مگر یہاں محمد امین بیچارے کو کون جانتا ہے اور اس کا اثر دباؤ کسی پر کیا پڑ سکتا ہے، نہ یہاں دینے سے کوئی دنیا میں نام آوری ہے نہ سر سید کی خوشنودی سے بیش قرار نوکری یا خطاب مل سکتا ہے یہاں کا دینا تو بس خالصاً لوجہ اللہ ہے، ایسی حالت میں ایک معمولی شخص کا اس قدر رقم خطیر جمع کر لینا بجز تائید غیبی کے قوت بشری سے خارج ہے بریں ہم اس سے ہم کو یہی سبق ملتا ہے۔ سچی سعی ہمیشہ مشکور ہوتی ہے۔"

۱۳۳۵ھ میں اس مدرسے میں مختلف شہروں کے طلبار ۱۷۶ تھے، جن میں عربی پڑھنے والے ۱۲۹ فارسی پڑھنے والے ۲۶ اور قرآن مجید پڑھنے والے ۲۱ تھے، اس مدرسے میں تمام دینی علوم و فنون، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب پڑھائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی فاضل، منشی فاضل کی کلاسیں بھی لگتی تھیں، چنانچہ مولوی بشیر الدین نے اس کے متعلق تحریر کیا ہے۔[۵۵]

[۵۵] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص ۳۰۱

"اس مدرسہ میں علوم دینیہ اور جملہ علوم وفنون کی تکمیل نصاب نظامیہ کے موافق کی جاتی ہے۔ عربی علم وادب، حدیث شریف، تفسیر، فقہ وغیرہ سب مضامین داخل کورس ہیں۔ علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ حصول معاش کی غرض سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ کے لئے بھی طلبار تیار کئے جاتے ہیں یہاں کے طلبا، زبان عربی کی نوشت وخواند اور تقریر پر بخوبی قادر ہوتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم بھی یہاں کے بعض طلبار کو علم ادب پڑھانے کے لئے خاص طور پر وقت دیا کرتے تھے اس مدرسہ کے طلبار گورنمنٹ کے مدارس میں بھی لئے جاتے ہیں۔" (۳۰)

مولوی امین الدین صاحب انتہائی خدا ترس بزرگ تھے شہر دہلی میں ہی نہیں بلکہ ان کے زہد وتقویٰ کی دھوم دور دور تک تھی، ان کے دل میں انسانی ہمدردی تھی اور فیض پہنچانے کا جذبہ رکھتے تھے۔ نرم دل، ملنسار اور خلیق تھے۔ مگر دینی معاملات اور مدرسہ کے انتظامی امور میں ذرہ برابر بھی رو رعایت نہیں کرتے تھے، عملیات میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔

اپنے عزیز واقارب کی مدد فرماتے تھے۔ جب سفر سے واپس آتے تو سوغات اپنے عزیزوں کے لئے لاتے تھے۔ سیاسی جھگڑوں اور دنیاوی دھندوں سے دور رہتے تھے۔ ۷ر جولائی ۱۹۰۶ء میں آپ نے گلی احمد شاہ حویلی اعظم خاں میں ایک مکان خرید کر از سر نو بنوایا، اس مکان کی ایک علیحدہ کوٹھری میں عبادت الٰہی میں مستغرق رہتے تھے پرانی وضع کے سیدھے سادھے مولوی تھے، طلبار کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ دفتری امور سے زیادہ واقف نہیں تھے، اس لئے مولوی عبدالغفور دہلوی مدرس فارسی بطور نائب مہتمم دفتری کاموں کو انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کے آنے کے بعد مدرسہ کا پورا انتظام مفتی صاحب کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا تھا۔

مدرسہ میں کچھ جان پڑی تھی کہ مولوی امین الدین صاحب کی اہلیہ ۸ر جمادی الاول

۱۳۳۷ھ مطابق ۹ر فروری ۱۹۱۹ء کو فوت ہوئیں۔

مولوی صاحب کو اس کا شدید صدمہ ہوا، اہلیہ کے انتقال کے بارہ ماہ بعد ۱۹ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء کو مولانا صاحب کی وفات ہوئی، مولوی صاحب اور اُنکی اہلیہ کے مزار مہندیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ کے باہر ہیں [1]

---

[1] مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی ص ۲۳

حضرت مولانا ابو المنصور ناصر دہلوی

ناصر الدین آپ کا نام تھا، ابو المنصور کنیت تھی اور آپ کا لقب امام المناظر تھا۔ آپ کا تعلق سید آبادرائے پور سے تھا جس میں پشت ہا پشت سے علم و فضل کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ شجرہ نسب حضرت امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ قاضی القضاۃ قاضی سید عبد الغفور تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد علی ناظر ناگپور کی ریذیڈنسی میں میر منشی مقرر ہونے کے بعد نواب صدیق علی خاں والیٔ بھوپال کے معتمد اعلیٰ بنے۔

یہ خاندان تمام کا تمام شیعہ تھا لیکن آپ کا گھرانا سنّی تھا، ان کی خاندانی زمین بھی وہاں تھی۔ ناگپور میں آپ کی ولادت ۲۷ رمضان ۱۲۳۷ھ یوم شنبہ کو ہوئی۔

آپ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایام میں دہلی کی طرف رخ کیا۔ آپ کے ہمراہ آپ کے دونوں بچے اور آپ کی اہلیہ تھیں جنھوں نے پیدل سفر کیا۔ جب دہلی میں امن و امان ہوا تو مولانا نے میر مداری کی گلی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا اور وہیں رہنے سہنے لگے۔ شروع میں تنگی و ترشی سے بسر کی، بعد میں مالی حالت سدھر گئی تھی۔

آپ نے اپنے والد ماجد اور جد بزرگوار مولانا سید فاروق علی ناگپوری سے دینی کتب کی تحصیل کی۔ اس کے بعد سات سال تک لکھنؤ میں اہل تشیع کی صحبت میں رہے۔ اور کتابوں کا مطالعہ کیا اور حضرت مولانا شاہ رحیم بخش صاحب نقش بندی جانشین حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کی۔ اور آپ کی شادی مولوی محمد مہندی نزیل کانپور کی صاحبزادی سے ہوئی۔

آپ نے انجیل کی تعلیم پادری جے۔ ایل اسکاٹ مفسّر انجیل رومن کرکٹر سے حاصل کی اور ۱۸۷۴ء میں سند حاصل کی۔ عربی فارسی کے علاوہ ہندی سے بھی

واقف تھے۔ معمولی سی انگریزی اور رومن کرکے لکھ پڑھ لیتے تھے۔ توریت و انجیل ہی کی نہیں بلکہ کل دینوں کی کتابوں کی واقفیت حاصل تھی۔

آپ کا ۱۸۶۸ء میں الہ آباد میں پادریوں سے مقابلہ اور خاص طور پر پادری ڈیوڈ سے دو روزہ مناظرہ ہوا، جس کو آپ نے شکست دی۔

مولانا ابو المنصور صاحب ان لوگوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے جو اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی ہو جاتے تھے۔ آپ کوشش کرتے تھے کہ وہ پھر مسلمان ہو جائیں، چنانچہ عبداللہ بن مولوی مراد علی دلاور خاں مع زن و فرزند اور فضل علی نے دینِ مسیحی اختیار کر لیا تھا عبداللہ تو پادریوں کی صحبت میں ایک عرصے تک رہا یہاں تک کہ وہ عیسائی واعظ بن گیا تھا۔ مسیحی مذہب کی تبلیغ کرنے لگا تھا۔ ان تینوں کو آپ نے مسلمان کیا اور عیسائیوں کے پھندے سے نکالا۔

ردِّ نصاریٰ کے سلسلے میں مولانا نے واعظین کی اصلاح و درستگی اور مناظرہ سکھانے کے لئے دار الامامت قائم کیا تھا جس کی غرض یہ تھی کہ ردِّ نصاریٰ کے لئے مبلّغین و مناظر تیار کئے جائیں تاکہ پادریوں کے فریب میں نہ آئیں، ان کو شکست دینے اور مناظرے کرنے کے طور طریقے سیکھ لیں اور پوری معلومات حاصل کر لیں۔

دار الامامت کی طرف سے اعلان تھا کہ کوئی مسلمان واعظ و مناظر اس وقت تک ردِّ نصاریٰ نہ کرے جب تک وہ دار الامامت سے ردِ نصاریٰ کی سند حاصل نہ کرلے۔

ان واعظین میں تین طبقے ہوتے تھے اول، دوئم اور سوئم اور ان کو درجے کے مطابق خطاب بھی دیا جاتا تھا۔ اس دار الامامت کے امام فن مناظرہ مولانا ہی تھے، جو واعظین و مبلّغین کو پڑھا کر، ان کا امتحان لے کر سند دیتے تھے۔

نصرانیت کے ہتھکنڈوں سے بچانے کے لئے اور اسلامی احکامات و اصولوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لئے غیور مسلمانوں نے دہلی میں انجمن اسلامیہ قائم کی۔ اس انجمن کے اہتمام میں ایک مدرسہ بھی تھا جس کے مدرس مولانا شاہ محمد شاہ صاحب تھے۔ انجمن کے صدر حاجی الحرمین قطب الدین صاحب اور سکریٹری خواجہ علی احمد صاحب تھے

اور ممبران مولانا الطاف حسین حالی، مولوی الفت حسین، مولوی عبد المجید، حکیم ظہیر الدین صاحب میونسپل کمشنر وغیرہ مقتدر حضرات تھے اور اسی انجمن کے میر مجلس مولانا ابو المنصور صاحب تھے جو ہر ہفتہ انجمن کے پروگرام کے مطابق مختلف عنوانات پر مضامین پڑھتے تھے چنانچہ مولانا کا مضمون دعوت اسلام بے حد مقبول ہوا جو مولانا نے ۲۷ اپریل ۱۸۷۶ء کے اجلاس میں پڑھا تھا۔

مولانا کے ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے دیرینہ تعلقات تھے، عام طور پر ان کے خاندانوں میں جو شادی ہوتی تھی اس کا دعوت نامہ ڈپٹی صاحب لکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا ابو المنصور صاحب کے صاحبزادے مولانا ناصر علی ایڈیٹر رسالہ صلائے عام دہلی کی شادی کا رقعہ ڈپٹی صاحب نے لکھا تھا۔ یہ رقعہ منظوم تھا، اس واقعے کے راوی مصور غم علامہ راشد الخیری دہلوی ہیں ؎

ہمہ دان حامیٔ دین مولوی ابو المنصور	جن کے افضال سے آگاہ ہیں نزدیک و بعید
ان کا دولت کدہ ہے بزم گہہ عقد نکاح	کہ وہ خود جائے مبارک ہے مگر قابل دید
نہ مزامیر نہ باجا نہ سرود اور نہ رقص	اور نہ بدعت کے مراسم سے کوئی امر جدید
عقد کے دوسرے دن ہوگا ولیمے کا طعام	جو میسر ہو وہاں نان و نمک آش و ثرید

آپ اگر لائیں گے تشریف براہ شفقت
میں یہ سمجھوں گا کہ بے دام لیا مجھ کو خرید

آپ کی عمر کا بیشتر حصہ ردِّ نصاریٰ میں صرف ہوا، چنانچہ ۱۸۷۶ء کو چاند پور ضلع شاہجہانپور میں میلہ خدا شناسی میں پادری لوئیس سے مناظرہ ہوا جس میں مولانا قاسم نانوتوی، مولوی سید احمد حسن صاحب امروہوی، مولانا سید احمد علی، مرزا موحد، اور مولانا ابو المنصور شریک ہوئے، اس میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا ابو المنصور کی تقریریں لاجواب ہوئیں اور پادری جواب نہ دے سکا۔ چنانچہ مولانا بشیر الدین صاحب مؤلف واقعات دار الحکومت دہلی مولانا کی قابلیت و لیاقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپ کی تصانیف صرف ردِّ نصاریٰ میں سو سے کم نہ ہوں گی۔ آپ کی

کسی کتاب کا جواب عیسائی نہ دے سکے۔ بارہا پادریوں نے جمع ہو کر جواب لکھنا چاہا مگر عاجز آ گئے۔ علاوہ مستقل تصانیف کے آپ نے بڑے بڑے پادریوں کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں ——— نہایت دلیر اور بے دھڑک بولنے والے تھے۔ حق گوئی کے مقابلہ میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ مخالفین اسلام کے ایسے دانت کھٹے کئے تھے کہ وہ نام سن کر لرز جاتے تھے جس دن چودھویں صدی کا آغاز ہوا مرحوم نے دہلی کی سب سے بڑی شاہراہ پر ایک ایسا زبردست وعظ کہا تھا کہ سننے والے اب تک یاد کرتے ہیں۔" (۱۷۱۴)

مولانا کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی میں ایسی مہارت تھی جیسے کوئی اہل زبان ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے قرآن مجید کی ایک جامع فارسی تفسیر لکھی تھی۔

آپ کو امام فن مناظرہ کا لقب مولوی محمد قاسم و شمس العلماء سید نذیر حسین صاحب اور اس دور کے بڑے بڑے نامور و مستند علماء نے دیا تھا۔

مولانا ابو المنصور صاحب حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی اپنے عقیدت مندوں کو تلقین کرتے تھے۔ بعض مرتبہ گھنٹوں سرحد کے مجاہدانہ کارنامے سناتے تھے۔ اسی مجاہدانہ جذبے کی وجہ سے روس و ترکی کی جنگ کے زمانے میں ترکی کی مدد کرنے کے سلسلے میں آپ کو سلطان عبدالحمید خاں صاحب کی طرف سے تمغہ بھی ملا تھا۔

آپ کا انتقال ۱۳۲۰ھ میں ہوا، اور کلو کے تکیہ میں مدفون ہوئے۔ آپ نے دو صاحبزادے مولوی سید ناصر علی اور مولوی نصرت علی ایڈیٹر نصرت الاخبار دہلی اپنی یادگار چھوڑے جو ہندوستان کے چوٹی کے ادیب تھے۔

مولانا کے مزار پر پانچ شعر کا ایک تاریخی قطعہ لکھا ہوا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

مست از یک لطف نظر خدایم منصور
در بہشتم نہ کتابے نہ تلے محا باید

حضرت العلامہ مولانا سید امیر حمزہ دہلوی

مولانا سید امیر حمزہ نجیب الطرفین سید تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ تھے، آپ دہلی کے مشہور عالم و صوفی تھے، آپ نے اوائل عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ سرکاری مدرسے میں انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ کی طبیعت عربی کی تعلیم پر مائل ہوئی۔ کانپور پہنچے تو مولانا عبدالحق اور مولانا فضل اللہ صاحب لکھنوی فرنگی محلی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۰۰ھ میں مولانا عبدالحلیم بحر العلوم سے سلسلۂ تعلیم شروع کیا، چنانچہ مولانا عبدالحلیم صاحب تحریر کرتے ہیں:

"فقیر سے دو سبق کافیہ کے بشرکت مولوی شمس الدین کرسوی اور مولوی عزت حسین نانوتوی، پڑھے اور کچھ نحو میر سنائی۔ جب راقم الحروف کے والد ماجد مولانا عبدالحیٔ کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے کافیہ، قال اقول، قطبی، میبذی وغیرہ مولوی عبدالحیٔ بنگالی سے اور شرح ملّا و شرح وقایہ مولوی نظام الدین احمد سے اور نور الانوار اور مختصر المعانی، موطا، امام محمد وغیرہ پڑھیں، ان کتب کے پڑھنے کے بعد آپ یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کے ذکی، متین، مہذب، عابد و زاہد، متشرع، متصوف، سلیم الطبع اور سریع الفہم ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

۱۳۰۲ھ میں آپ گنگوہ تشریف لے گئے اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے علم حدیث کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی خدمت میں علم باطنی حاصل کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے اور بیعت کی اور سند خلافت حاصل کی۔ یہ واقعہ ۱۳۱۲ ہجری کا ہے۔ اسی زمانے میں مولانا اشرف علی صاحب بھی مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ ان دونوں

حضرات وغیرہ نے مل کر التنویر فی اسقاط التدبیر کا ترجمہ الاکسیر فی اثبات التقدیر کے نام سے اردو میں کیا۔ یہ کتاب مطبع احمدیہ کانپور میں طبع ہوئی۔ چنانچہ اس کتاب کے صفحہ ۴ پر مولانا اشرف علی صاحب تحریر کرتے ہیں :

"اس ترجمہ میں حضرت اخوان الطریقت مولوی محب الدین پشاوری و مولوی سید حمزہ دہلوی، جناب ابواحمد صاحب بمبوی، جناب مولوی محمد ابراہیم سنبھلی سے بہت مدد ملی، خصوص جناب مولوی سید حمزہ صاحب نے سب سے زیادہ مدد فرمائی۔"

یہ ترجمہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ارشاد کے مطابق ان حضرات نے کیا تھا۔ آپ نے سلسلۂ فخریہ کی اجازت میاں حبیب علی شاہ صاحب حیدرآبادی سے اور سلسلۂ اشرفیہ کی اجازت میر شاہ علی حسین صاحب اشرفی سے حاصل کی۔

آپ چند سال ہندو کالج کے پروفیسر رہے۔ کچھ عرصہ فرنگی محل میں درس و تدریس کا سلسلہ بحیثیت ملازم قائم رکھا۔ مگر اوّل سے آزاد طبیعت تھے، بھلا نوکری کی قید کب برداشت کرتے۔ گھر بیٹھے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ بہت سے عالم آپ کے شاگرد ہوئے جو بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے۔ چنانچہ مولوی بشیر الدین خلف ڈپٹی نذیر احمد صاحب واقعات دارالحکومت میں آپ کا ان الفاظ میں تذکرہ فرماتے ہیں :

"آپ عربی و فارسی کے منتہی اور انگریزی داں ہونے کے علاوہ زہد و تقویٰ اور شرافت خاندانی کے اعتبار سے آپ کا شمار مشاہیر دہلی میں کیا جاتا ہے۔ شعر گوئی کا شوق بھی تھا۔ آپ کا کلام درد سے بھرا اور تاثیر سے پُر اور تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا جو لوگوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ سخاوت کا لپکا تھا۔ پیسہ ہاتھ میں نہ ٹکتا تھا، ادھر ملا ادھر دیا۔ آپ تکلیف اٹھاتے مگر سائل کا سوال رد نہ کرتے۔ مختصر یہ کہ باخدا بزرگ تھے۔"

ایک مرتبہ دہلی میں بڑا خطرناک قحط پڑا۔ لوگ بھوک کی شدّت سے موت کا شکار ہونے لگے، بارش کے لئے عوام نے بہت دعائیں مانگیں۔ پانچ چھ دن تک گھروں پر رات دن اذانوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن بارش نہیں ہوئی۔ مولانا کرامت اللہ صاحب دہلوی اور مولانا اخونجی صاحب

دعائیں مانگ چکے تھے لیکن پھر بھی بارش نہیں ہوئی۔ حضرت مولانا سید امیر حمزہ کو ان کا ایک معتقد و مرید ایک وسیع میدان میں بلا کر لے گیا۔ ہزاروں کا مجمع تھا جس میں دہلی کے ہندو مسلمان شامل تھے۔ آپ تشریف لائے۔ دعا مانگنی شروع ہی کی تھی کہ دورانِ دعا بارش ہونے لگی۔

حضرت مولانا امیر حمزہ صاحب کا دہلی میں ۸۴ سال کی عمر میں پنجشنبہ کے روز ۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ کو عصر و مغرب کے درمیان انتقال ہوا۔ آپ کے دو صاحبزادے مولانا ناصر جلالی مرحوم اور مولانا حامد جلالی صاحب ہوئے۔

حضرت مولانا سید امیر حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ آپ کا کلام پُر درد اور تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں سلاست اور فصاحت ہے ؎

بلا سے گر نہ کچھ اقرار ہوتا ذرا تکرار سے انکار ہوتا
نہ چلیتی طور پر وہ لَن ترانی جو واں یہ ہاشمی دلدار ہوتا
نہ سوتا پہلوئے دشمن میں وہ کاش ہمارا طالعِ بیدار ہوتا
نہ شیدؔا مول لیتا دردِ اُلفت
نہ یوں رُسوا سرِ بازار ہوتا

مر گیا جو کہ موت سے پہلے گھر ہے اس کے لئے ممات کہاں
وصل میں بھی ہے ہجر کا کھٹکا! غم سے عاشق کو ہے نجات کہاں
پھر کہو گے تجھے حیرت کیوں ہے پوچھتے ہو میری چاہت کیوں ہے
تیری گردن پہ ہے خون عالم کا تجھ کو دعوائے نزاکت کیوں ہے
عقل حیراں ہے میری یا اللہ عشق کے درد میں لذّت کیوں ہے
شکل کس منہ سے دکھاؤں شاہا! کچھ نہ پوچھو کہ ندامت کیوں ہے
قتل شیدؔا کو کیا خوب کیا
یہ مُکرنا، یہ شرارت کیوں ہے

ہوش میں ہوں تیرے مے آشام کیا بے خبر ہیں صبح کیسی شام کیا
صدقے اس انداز کے ہاں پھر کہو "چل پرے ہٹ مجھ سے تجھ کو کام کیا

تھی مقدر میں گرفتاری لکھی دانہ کیا، صیاد کیا ہے، دام کیا

نام شیدا کا سُنا تو یوں کہا

"اور دیوانے کا ہوتا نام کیا"

مولانا سید امیر حمزہ مرحوم و مغفور کے بڑے صاحبزادے مولانا ناصر جلالی صاحب دہلی میں گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد ماجد صاحب سے پائی۔ کچھ دنوں مدرسہ فتحپوری دہلی میں مولانا محمد عمر صاحب سے پڑھا، اس کے بعد فرنگی محل لکھنؤ میں مولوی عظمت اللہ صاحب سے منطق، مولوی سلامت اللہ صاحب اور مولانا عبد الباری سے حدیث پڑھی اور مدرسہ عبد الرب میں دورہ کیا اور سند حاصل کی۔

آپ نے عرصہ تک مسجد حوض والی محلہ چوڑی والان میں وعظ کہا، وعظ اس انداز سے فرماتے تھے کہ جاہل وا جہل بھی مشکل سے مشکل مسئلہ کو سمجھ جاتا تھا۔ سیاسی تقریر بھی بلا کی تھی۔

مولانا ناصر جلالی صاحب بڑے وسیع القلب انسان تھے۔ دشمن کی بڑی سی بڑی زیادتی کو خندہ پیشانی سے معاف کر دیا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ سیاسی اختلافات کی وجہ سے ایک شخص نے آپ پر حویلی کلو خواص بازار سوئیوالان دہلی کے سامنے حملہ کر کے شدید زخمی کیا تھا۔ زخم کافی گہرا تھا، جس کی وجہ سے عرصے تک علاج ہوتا رہا۔ پولیس نے مقدمہ درج کیا تو آپ سے حملہ آور کا نام پوچھا، انھوں نے اس کا نام بتلانے سے صاف انکار کر دیا، حالانکہ آپ کو اس کا نام معلوم تھا۔

پاکستان بننے سے قبل آپ کا کراچی اور حیدر آباد سندھ میں کافی آنا جانا تھا جس کی وجہ سے وہاں آپ کے مریدوں کا حلقہ کافی وسیع ہو گیا تھا۔ وہیں سے آپ نے اپنا سب سے پہلا اخبار "سلامت" نکالا۔ اس کے بعد "زبانِ ہند" ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ گجرات میں اخبار "اتحاد" شائع کیا۔ ۱۹۱۳ء میں دربھنگہ میں "مسیحا" نکالا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں محلہ چوڑی والان دہلی سے ماہنامہ "شعلہ" جاری کیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد کراچی پہنچے تو رسالہ "اذان" کراچی سے اپنے بھائی مولانا حامد جلالی صاحب کی ادارت میں نکالا، جس کے سرپرست آپ تھے۔ یہ رسالے اور اخبار اُردو زبان میں نکلتے تھے۔

مولانا ناصر جلالی صاحب ۱۹۲۰ء میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ خلافت تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۲۲ء میں دہلی شہر کے علاوہ دیہات میں بھی کانگریس کے اغراض و مقاصد کا پرچار کیا۔ ممبر بنائے۔ آپ سید صغیر علی قادری کے بعد دہلی کانگریس کمیٹی کی دیہاتی سب کمیٹی کے انچارج مقرر ہوئے۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں کانگریس سے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے بعد مسلم لیگ میں شریک ہوئے۔ مسلم لیگ کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے آپ نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ اور مختلف شہروں اور قصبوں میں مسلم لیگ کو مضبوط بنایا، اور شاخیں قائم کیں۔

پاکستان جانے کے بعد کراچی و سندھ میں آپ کا پہلے ہی سے حلقہ تھا مصیبت زدہ اور مہاجر ہونے کی وجہ سے لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پاکستان کے عوام و خواص اور سرکاری طبقہ میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ریڈیو پر آپ کی تقریریں نشر ہوتی تھیں۔ اسلامی ملکوں میں سرکاری وفد کے ساتھ آپ کو بھی بھیجا گیا۔ کراچی کے علماء میں نمایاں پوزیشن تھی۔ دولت و ثروت کے دلدادہ نہیں تھے۔ قانع طبیعت تھی، جو مل جاتا اس پر قناعت کر لیتے۔ پیسہ ہاتھ میں ٹکتا نہیں تھا۔ ضرورت مند آیا۔ اس کی ضرورت پوری کی اور پھر ویسے کے ویسے تنگدست ہو گئے، اس طرح پوری زندگی گذار دی۔ شادی کی تھی۔ ایک لڑکی ہوئی جو حیات ہے، بیوی کا انتقال ہوا تو دوسری شادی نہیں کی۔

کراچی میں پاک بنگلہ جہانگیر روڈ ایسٹ میں مقیم تھے۔ اور وہیں ۳۱ دسمبر ۱۹۶۵ء مطابق ۷ رمضان المبارک بروز ہفتہ نو بجے شب کو فوت ہوئے۔ دوسرے روز نماز پڑھی گئی کراچی کے ہر طبقے اور ہر خیال کے عمائدین اور علماء نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

مولانا ناصر جلالی صاحب ایک جادو بیان مقرر ہی نہیں تھے بلکہ ہند و پاک کے مسلمہ ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی تقریباً پچاس تصانیف ہیں، تحریک آزادیٔ ہند کے ابتدائی دور میں آپ نے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان "ہمارا نصب العین" تھا۔ اس کے پانچ شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

سر دیکے محبت کی سرکار سے غم لیں گے　　اٹھے نہ فرشتوں سے جو بار وہ ہم لیں گے

وہ فکر معیشت ہو یا تیری محبت ہو — لیتے ہوئے گھبرائے دنیا جسے ہم لیں گے
شمشیر جفا سے تم ٹکڑے نہ کرو دل کے — رو دو گے جو ہاتھوں میں ہم تیغ قلم لیں گے
سمجھو تو کرو گے پھر تم مشقِ ستم کس پر — گھبرا کے اگر غم سے ہم راہ عدم لیں گے
وہ وقت بھی آتا ہے ہم گوشہ نشینوں کے
شاہانِ جہاں ناصر آ آ کے قدم لیں گے

ایک قوم پر نظم پندرہ شعروں کی ہے، جس کے تین شعر یہ ہیں ؎

آہ اے ملکۂ پنجاب محبت میں تیری — مجھ کو جز نالہ و فریاد کوئی کام نہیں
کر دیا حق پہ فدا تو نے جگر گوشوں کو — ہے عیاں ملک پرستوں کو یہ الہام نہیں
زر دیا مال دیا جان بھی آخر دیدی — تجھ سے یہ وصف ہے مخصوص کوئی عام نہیں

مولانا حامد جلالی صاحب کا تاریخی نام مظفر حسین ہے، جس سے سن پیدائش ۱۳۱۸ھ نکلتا ہے، آپ نے قرآن مجید سید محمد امام شاہی عیدگاہ سے حفظ کیا۔ قاری فضل الدین صاحب پانی پتی اور قاری محمد عظیم سے تجوید سیکھی، مدرسہ مظہر الاسلام میں پانچویں جماعت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ فتحپوری میں داخل ہوئے۔ مولانا سلطان محمود گجراتی، مولانا عبداللطیف صاحب سیفی مصطفیٰ آبادی، مولانا احمد علی صاحب میرٹھی، مولوی داؤد سرحدی اور مولوی نور محمد دہلوی سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ مدرسہ نعمانیہ سے دورہ کی سند حاصل کی، اس مدرسے کے اساتذہ مولانا عماد الدین سنبھلی اور مولوی عبدالحنان صاحب بھی تھے۔

پنجاب یونیورسٹی سے مولوی اور مولوی فاضل کے امتحانات دئے۔ طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں کچھ عرصے ٹیچری کی، آپ کو طب سے خاص لگاؤ ہے۔ بلا کے ذہین ہیں۔ مخلوقِ خدا کی خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ محنت و مشقت سے شکم پوری کرتے ہیں۔ نہ وعظ سے مطلب نہ لیڈری سے تعلق، نہ لیڈر بننے کی ہوس، نہ اسٹیج پر ناچنے کی تمنا، قوم کے نام پر خرید و فروخت کو حرام سمجھتے ہیں، اور اس لعنت سے دور رہتے ہیں۔ حالانکہ بہترین مقرر ہیں۔ اسی طرح تحریر میں اپنے طرز کے مالک ہیں، قلم

میں زور ہے، فصاحت و بلاغت کے ساتھ اردوئے معلّی کی چاشنی عجب لطف دیتی ہے۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے ہیں، بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کی تفسیر میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بہت سے پاروں میں آپ کا طرز تحریر ملے گا۔

آپ کے بڑے بھائی مولانا ناصر جلالی صاحب نے ۱۹۱۸ء میں جو رسالہ 'شعلہ' نکالا تھا، اسی نام سے ۱۹۲۵ء کو انھوں نے بھی رسالہ جاری کیا تھا، جو اپنی نوعیت کا انوکھا رسالہ تھا ــــــ اس کے بعد 'حقائق' ۱۹۳۲ء میں نکالا۔

مولانا حامد جلالی صاحب بھی ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد کراچی چلے گئے تھے، صاحب اولاد ہیں، ان کے بڑے صاحبزادے مسعود احمد جلالی نے عربی کی اعلیٰ تعلیم پائی۔ جامعہ اظہر کے فارغ التحصیل ہیں۔ سعودی عرب میں پاکستان کے سفارت خانہ میں کافی عرصے تک ملازمت کی۔

میرا اور میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب کا اس خاندان سے قریبی تعلق ہے۔ میرے والد ماجد اور حضرت مولانا سید امیر حمزہ پیر بھائی تھے۔ اس لئے میرے والد ماجد بھی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے اور ان کے خلفاء میں آپ کا بھی شمار تھا۔ میں بچپن میں مولانا ناصر جلالی صاحب کے وعظ سنتا تھا۔ جس زمانے میں مولانا صاحب حویلی اعظم خاں میں مقیم تھے اس وقت سے مجھ کو مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اب جو کچھ لکھ پڑھ لیتا ہوں ان ہی کی توجہ فرمائی کا نتیجہ ہے، اسی طرح مولانا حامد جلالی صاحب کے ساتھ زندگی کا کافی حصہ گذرا۔

جناب خان بہادر مولوی انوار الحق صاحب دہلوی

خان بہادر مولوی انوار الحق صاحب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں تھے، ان کے جد اعلیٰ آغا محمد صاحب علاؤالدین خلجی کے عہد میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ دہلی آئے اور گجرات و دنیار کی تسخیر کے لئے مامور ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد شیخ سیف الدین تھے جن کا ۲۷ر شعبان ۹۶۰ھ کو ستر سال کی عمر میں اکبر بادشاہ کے زمانے میں انتقال ہوا۔ شیخ عبدالحق محرم ۹۵۸ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے علم حدیث کی اس قدر خدمت کی کہ علماء متقدمین و متاخرین میں یہ بات کسی کو میسّر نہیں ہوئی۔ آپ کی تصانیف سو کے لگ بھگ اور تقریباً پانچ لاکھ اشعار ہیں۔ آپ کی ذات سے ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کو بہت فروغ ہوا۔ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں ۱۰۵۲ھ کو فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ قطب صاحب میں اولیا مسجد کے قریب حوض شمسی کے بائیں ہے۔ یہ مقبرہ آپ کے لئے مہابت خاں سپہ سالار شاہجہاں بادشاہ نے آپ کی حیات میں بنوا لیا تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ننھیال میں بھی اولیاء اور علماء ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ کے نانا شیخ زین العابدین المعروف شیخ ادھن دہلوی تھے، جن کا شمار عالم و عابد، زاہد و اولیاء میں تھا۔ سلطان سکندر لودھی نے آپ کو حاجب مقرر کرنا چاہا لیکن آپ نے اس عہدے کو منظور نہیں کیا۔

آپ کی زبان پر ہمیشہ ذکر خدا رہتا تھا۔ نہایت خوب صورت اور نورانی شکل تھی، آپ کے خسر کا قول تھا کہ میں نے سوائے ان کے کسی کا ظاہر و باطن ایک سا نہیں دیکھا۔ ۹۳۴ھ کو دہلی میں فوت ہوئے [1]

[1] تذکرہ اولیاء دہلی ص ۸۹

شیخ عبدالحق صاحب کے صاحبزادے شیخ نورالحق صاحب تھے جو شیخ عاشق حسلی نبیرزادہ شیخ نظام نارنولی سے بیعت تھے، ان کے بعد آپ نے شیخ احمد مجددی الف ثانی کے صاحبزادوں خواجہ معصوم اور خواجہ احمد سعید سے فیوض روحانی حاصل کئے۔ شرح بخاری اور شرح صحیح مسلم ان کی تالیف ہیں۔

عالمگیر کے زمانے میں ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔ اور اپنے والد کے برابر شرقی طرف مدفون ہوئے۔

مفتی اکرام الدین صاحب شیخ عبدالحق کے پوتے تھے، آپ صدر امین تھے۔ آپ نے اولیاء مسجد (دہلی) کے جنوب میں ایک شرق رویہ دالان تعمیر کرایا تھا جس سے لوگوں کو آرام ملتا ہے۔ اس خاندان کے نام سے تیراہا بہرام خاں کے پاس پھاٹک مفتیان مشہور ہے۔ مفتی اکرام الدین صاحب کے زمانے میں یہ پھاٹک تعمیر ہوا۔ اس میں اس خاندان کے لوگ بھی رہتے تھے۔ اس کو محلہ مفتی محمد اکرام الدین بھی کہا جاتا تھا۔

مفتی اکرام الدین صاحب کے صاحبزادے مولوی احسان الحق صاحب تھے، ان کے سب سے بڑے صاحبزادے خان بہادر مولوی انوارالحق صاحب، دوسرے مولوی وحیدالحق صاحب، تیسرے مولوی سیف الحق صاحب ادیب اور چوتھے مولوی شرف الحق صاحب تھے[۱]

مولوی شاہ محمد انوارالحق صاحب، مولوی مملوک علی صاحب اور مفتی صدرالدین صاحب صدرالصدور دہلوی کے شاگرد تھے، مدتوں ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے میر منشی رہے، نہایت نیک نامی اور ذمہ داری سے اس خدمت کو انجام دیا۔ کافی عرصے تک ریاست بھرت پور کی وکالت پر بھی رہے۔ بزرگان دین سے نہایت عقیدت رکھتے تھے، ان کی نیاز فاتحہ، امورات عرس فاتحہ، میلاد سرور انبیاء بالالتزام کرتے تھے۔ اور ۲۲ ربیع الاول کو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا عرس بھی اہتمام کے ساتھ فرماتے تھے۔ اکثر مزارات

۱۔ واقعات دارالحکومت دہلی، جلد سوئم ص ۳۰۴

مقدسہ کی مرمت و تعمیر کراتے اور فیض پاتے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں صاحبِ وصال الجمیل تحریر فرماتے ہیں:

"نہایت خلیق، منکسر المزاج، نازک خیال، شیریں مقال، پاکیزہ صورت، فارسی عربی وغیرہ علوم میں برجستگی و قابلیت کے علاوہ حافظہ و فہم و ذکا، میں گویا فیضیؒ ثانی تھے۔ مخصوصاً فنِ تاریخ خداداد حافظہ کے لحاظ سے شاہجہان آباد دہلی میں فرد تھے۔"

آپ کی مشہور تصانیف اقتباس الانوار اور بہشتی چمن ہے۔ بھرت پور کی ملازمت کے بعد پنشن یافتہ ہو کر خانہ نشین ہوئے۔

آپ جمعرات کے دن ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء کو فوت ہوئے۔ یہ دن جمعۃ الوداع کا تھا۔ اور اس زمانے میں ۱۹۰۲ء کی دربار کی دہلی میں تیاری بھی ہو رہی تھی۔ آپ کی نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھائی گئی تو بے شمار خلق اور علماء و مشائخ کے علاوہ والیانِ ریاست بھی شامل ہوئے۔

آپ کے صاحبزادے مولوی مصباح الدین اور مولوی منشی رکن الدین جادو تھے۔ منشی رکن الدین صاحب نے اپنے چچا مولانا سیف الحق ادیب سے تعلیم حاصل کی۔ پہلے ان کا تخلّص ناداں تھا۔ جب مرزا داغ کے شاگرد ہوئے تو جادو تخلّص تبدیل کیا۔ ریاست بھرت پور میں میر منشی تھے۔ ملازمت چھوڑ کے دہلی چلے آئے تو ان کو دوبارہ بھرت پور بلایا گیا۔ اور اسی عہدے پر مامور کیا۔ مزاج میں ظرافت تھی، انتہائی خلیق تھے۔ آپ نے اپنے والد کے ہمراہ راجپوتانہ کی اکثر ریاستوں کی سیر کی۔[۱]

آپ نے یکم جنوری ۱۸۸۵ء کو محلہ تراہا بہرام خاں دہلی سے ایک ماہانہ شعر و شاعری کا گلدستہ "جادو" جاری کیا، جو بارہ صفحوں پر نکلتا تھا۔ اس کے مالک آپ تھے، مہتمم بدیع الزماں صاحب شیوں تھے۔ مطبع مجتبائی میں چھپتا تھا۔[۲] شعر اچھا کہتے تھے۔

[۱] خم خانہ جاوید جلد دوم ص ۱۹۷ [۲] تاریخ صحافت اردو جلد سوم ص ۳۰۹ و اختر شہنشاہی ص ۹۸

سنتا ہوں کہ یہاں وہ بت، غیر کے گھر ہے
پتھر پڑیں اس پہ کہ دُعا، کا یہ اثر ہے

رہے کمبخت کیا ٹھکانے سے
بن گئی دل پہ دل لگانے سے

بالیں پہ سراسیمہ کوئی رشکِ قمر ہے
او بےخبری تجھ کو بتا کچھ بھی خبر ہے

دیکھ کر مجھ کو وہ کہتے ہیں یہی ہے جادو
یہ جو چلتے ہوئے انسان چلے آتے ہیں

یارب مرے ہوں دستِ دُعا اسقدر دراز
میں چھین لوں فلک سے اثر کو بڑھا کے ہاتھ

جناب سیّد محمد امیر رضوی عُرف میر پنجہ کش

دہلی میں کوئی کام یا کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں دہلی والے تمام ہندوستان میں کسی سے پیچھے رہے ہوں۔ بلکہ بعض فنون تو ایسے تھے جن میں ان کو افضلیت کا درجہ حاصل تھا۔ مثلاً خوش نویسی کے فن میں ایسے باکمال لوگ دہلی نے پیدا کئے جو بے نظیر تھے اور اپنے فن میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایسے فنکاروں میں سے ایک فنکار میر پنجہ کش اور انکے شاگردوں کے حالات زندگی اس مضمون میں تحریر کئے ہیں۔

میر پنجہ کش، سید صاحب میر کے صاحبزادے اور صحیح النسب سید تھے۔ پہاڑی املی جامع مسجد دہلی میں سکونت رکھتے تھے۔ اُن کے مکان پر نہایت خوش خط "عاقبت بخیر باد" لکھا ہوا تھا[1]۔ جو کمال ان کو خوش نویسی میں حاصل تھا وہ پنجہ کشی میں بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجہ کشی میں وہ زیادہ ماہر تھے جو اسی کی مناسبت سے ان کی عرفیت نے شہرت حاصل کی۔ میر صاحب لوہے کے پنجے سے زور کیا کرتے تھے اور آخر میں لوہے کا پنجہ مُڑ جاتا تھا[2]۔

ہندوستان میں بادشاہت کا خاتمہ سراج الدین ظفر پر ہوا۔ اور خوش نویسی کا آخری تاجدار میر پنجہ کش کو مانا جاتا تھا۔ شمالی ہند میں جو شہرت و مقبولیت ان کے خط کو حاصل ہوئی۔ وہ اور کسی کو نہیں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر بھی ان کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو میر صاحب کے لڑکے میر قطب عالم کی شادی کے موقع پر بادشاہ سلامت نے ایک پورا جوڑا اور سہرا مقیشی میر پنجہ کش کو مرحمت فرمایا[3]۔

[1] آثار الصنادید شاہجہاں آباد کے حال میں ص ۱۵۶   [2] کرزن گزٹ دہلی

[3] بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۲۳

خوش نویسی میں ان کے استاد مولانا غلام محمد ہفت قلمی دہلوی تھے۔ انھوں نے محمد حفیظ خاں سے خوش نویسی سیکھی تھی۔ میر کلن، قادر بخش، محمد اسماعیل، محمد تقی، لچھمن سنگھ، لچھمی نرائن پنڈت، سرب سکھ رائے، محبوب رائے اور کشن سنگھ وغیرہ ان کے معاصر تھے، ساتوں خط بہت اچھا لکھتے تھے، اس لئے ہفت قلمی مشہور ہوئے۔ فارسی، عربی اور انشار پردازی کی تعلیم حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی سے پائی اور شاعری میں بھی انہی کے شاگرد تھے۔ فارسی میں زیادہ اور اردو میں شعر کم کہتے تھے، راقم تخلص تھا۔ طبع آزمائی کبھی کبھار کرتے تھے[۱] دہلی وطن تھا۔ وطن کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہاں حکیم مرزا محمد عتیق سے علم ادب حاصل کیا۔ معلم پیشہ تھے۔ اور طب میں بھی دخل تھا۔ تقریباً ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء یا ۱۸۲۴ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ یہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان میں خوش نویسوں کا تذکرہ فارسی میں لکھا جو مولوی محمد ہدایت حسین مدرس عربی فارسی پریذیڈنسی کالج کے حاشیہ کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا۔ راقم شعر اچھا کہتے تھے، کلام موثر تھا[۲]

بس کر چکے عاشقی مری جان غصّے سے تیرے جو ڈر گئے ہم

جب میں نے کہا تم نے ملاقات اُڑا دی

تو اس نے ہنسی میں یہ میری بات اُڑا دی

میر صاحب خوش نویسی و پنجہ کشی کے علاوہ کُشتی، بانک بنوٹ، مصوری، نقاشی، لوح نویسی، جدول کشی، صحّافی، علاقہ بندی اور سنگ تراشی میں بھی ماہر تھے، ان کے استاد مولانا غلام محمد صاحب اپنی تصنیف "تذکرہ خوش نویساں" میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جنرل براؤن کے شروع زمانہ حکومت میں اس سید زادے سے میری ملاقات ہوئی تھی، اس وقت یہ فلاطون نامی اومنی کے گھر پہ آغا مرزا وغیرہ کے بچوں کو تعلیم دیا کرتا تھا، خط کی روش قدما کی روش پر تھی، مجھ سے اس کا اتحاد بڑھا اور باہم آمد و رفت ہوئی تو میں نے اس جوہر قابل کو پاکر صلاح

[۱] خم خانہ جاوید جلد سویم ص ۳۵۴ [۲] گلشن بیخار ص ۸۴

دی کہ آقا عبدالرشید کی طرز پر مشق کرے۔ اس زمانہ میں کوئی شخص آقا کا خط دکھانا گوارا نہ کرتا تھا۔ میں نے آغا کی وصلیاں اس کو دیکر مشق کرائی اور نقل کرنے تک کی اجازت دیدی۔ چونکہ سید زادہ نہایت طباع و ذہین اور صاحب ذوق و جفاکش تھا۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں ایسا لکھنے لگا کہ دونوں کے خط میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا۔ میں نے اس کی رہنمائی و امداد میں کوئی کسر نہ چھوڑی یہاں تک کہ استاد کامل ہوگیا۔ سید زادے نے بہت سے قطعات لکھ کر ان پر آقا رشید کا نام لکھ دیا اور خریداروں نے آقا کی اصلی وصلی سمجھ کر بلا جھجک خرید لیں۔ وہ شاہجہاں [آباد] میں آباد ہے اور کئی برس سے محرم کے مہینے میں آقا عبدالرشید کا عرس کرتا ہے، مجھے اس سے اور اس کو مجھ سے محبت و تعلق قلبی ہے۔ اس کی مجلس میں لوگ کثرت سے آتے ہیں اور فیض پاتے ہیں۔"

میر صاحب اس عرس میں مجلس کے سامنے پرانے خوش نویسوں خاص کر اپنے اُستادوں کے قطعے دکھا کر ایک ایک سے فرماتے کہ میں نے خوش نویسی میں بہت کچھ محنت کی لیکن ان خوش نویسوں کے کمال کو نہ پہنچ سکا[1] ـــــــ سر سید مرحوم بھی میر صاحب کے کمال کے قائل تھے۔ چنانچہ وہ آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:

"یہ جناب سادات کبار سے ہیں، خط نستعلیق اس جزو زمان میں آپ کی قلم صدائے صریر نے مثل صور ثانی کے دوبارہ زندہ کیا ہر دائرہ حروف کا ان کے اوصاف حمیدہ کے ذکر میں سراپا دہان اور مدات الفاظ کی ان کی محامد حمید کے بیان میں سراسر زباں، ان کی خوش نویسی کے دور میں میر عماد کی خوش قلمی پر اعتماد نہیں رہا۔ اور ان کے صانعی کے زمانے میں آرشید بندہ ہوگیا۔ باوجودیکہ درزش پنجہ اور یکبیتی میں کوئی ان کا نظیر نہیں جس پر ہاتھ ان کا ایسا سبک ہے کہ قلم کو ایک آن میں ہزار حرف لکھنا اس خوبی کے ساتھ کچھ گراں نہیں۔"

[1] صلائے عام دہلی مارچ ۱۹۲۶ء

میر صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے پاس کوئی سائل یا ضرورت مند جاتا تو بجائے نقد یا کوئی جنس دینے کے حرف لکھ کر دیتے جو بازار میں فوراً بک جاتا تھا، نیز جب کوئی شاگرد رہوتا تو اس سے کوئی وصلی لکھوا کر اپنے پاس رکھ لیتے اور جب اس کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے تو اس کو وہ ابتدائی تحریر دکھاتے کہ تم نے کتنی ترقی کی ہے۔[1] خطِ ثلث میں جرمنی میں سب سے پہلی ان کی حمائل چھپی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں فروخت ہوئی۔ میر صاحب جس سے خوش ہوتے تھے اس کو رباعی قطعہ خطِ ثلث میں لکھ کر دیتے تھے۔ آپ جامع مسجد شاہی دہلی کے نائب امام بھی تھے۔ امام سید محمد صاحب مرحوم و مغفور سے گہرے تعلقات ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو امام صاحب کا بھائی سمجھتے تھے۔

میر صاحب نے اپنے کمال کا اظہار کاغذوں کے صفحوں کے علاوہ اپنے مکان کی کڑیوں پر "یا فتاح" اور "بسم اللہ" لکھ کر بھی کیا تھا۔ ان کے فن کی دور دور شہرت تھی۔ ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں بھی ان کے قطعے پسند کئے جاتے تھے اور ان ممالک کی لائبریریوں کی زینت بنتے تھے۔ چنانچہ بیرن میکسویل صاحبہ نے ایران کے کتب خانے کے متعلق جہاں میر پنجہ کش دہلوی کے قطعے رکھے ہوئے ہیں۔ لکھا ہے:[2]

> "اس میں نہایت بیش قیمت کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں اور قطعوں میں سب سے زیادہ مشہور وہ ہیں جو میر پنجہ کش کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ میر موصوف کی ہر سطر کی قیمت دو تومان لگائی جاتی ہے، اس شرح سے اگر دیکھا جائے تو شاہ کے قبضے میں جو تحریریں موصوف کی ہیں ان کی قیمت کروڑوں پونڈ ہو جائیگی۔"

جن مقامات یا جن شہروں میں نستعلیق کے خط سے جو بھی واقف ہوتا تھا۔ وہ میر پنجہ کش کا نام لیتا تھا اور ان کے قطعوں کو پسند کرتا تھا۔ دہلی میں اشرفی حرف میر صاحب کے قطعوں کے مشہور تھے۔ اس زمانے میں ان کا ایک حرف ایک روپیہ میں فروخت ہوتا تھا۔ میر صاحب مہذّب و با اخلاق، خصائل پسندیدہ، شمائل حمیدہ سے آراستہ تھے۔ زندہ دل، یار باش و دوست نواز

[1] صحیفۂ خوش نویساں ص ۱۵۱ [2] صلائے عام دہلی مارچ ۱۹۲۶ء

اور خوش وضع ہستی تھی[۱]۔ خود داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی

میر پنجہ کش کے مکان کے دروازے دو تھے۔ ایک دروازے کی چھت کڑیوں کی نہیں بلکہ تختوں کی تھی۔ ان تختوں پر لاالٰہ الااللہ محمد الرسول اللہ میر پنجہ کش کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا۔ اس تحریر کو جناب امام سید حمید صاحب شاہی جامع مسجد دہلی نے بچشم خود دیکھا تھا، جس کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا۔

یہ تحریر میر پنجہ کش صاحب نے اس وقت تحریر کی تھی جب ایران میں بھی میر صاحب کی شہرت ہوگئی تھی۔ وہاں کا ایک ایرانی خطاط ان سے دہلی ملنے آیا ــــ ان کے دروازے پر پہنچا، یہ دروازے پر آئے، ان کو وہ پہچان نہیں سکا۔ اسی وقت کھڑے کھڑے انھوں نے چھت کے تختے پر کلمہ لکھ دیا۔ تو اس نے ان کو پہچانا۔ ہاتھوں کو چوما۔ اور کہا واقعی آپ کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔

میر صاحب کسرت بھی کرتے تھے۔ جوانی میں کڑیل ہیکل جوان تھے۔ راہ چلتے وقت ایک ہی جانب سے جاتے تھے، چنانچہ جس جانب چل رہے تھے اسی جانب جامع مسجد کے پاس ٹمکڑ مٹیا محل پر ایک سانڈ ان کے سامنے آگیا، تو انھوں نے اس کے دونوں سینگوں پر ہاتھ ڈالا پہلے سانڈ نے ریلا مار کے ان کو پیچھے دھکیلا۔ لیکن بعد میں انھوں نے سینگوں کو مضبوط پکڑ کر ایسا ریلا دینا شروع کیا کہ وہ ٹکڑ چاوڑی بازار تک چلا گیا۔ اس کو انھوں نے ایسا رگیدا اور اس طرح گرایا کہ بے جان سا ہو گیا۔ یہ واقعہ امام سیّد احمد صاحب مرحوم نے اپنے صاحبزادے امام سید حمید صاحب کو سُنایا تھا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جہاں دہلی کے عوام نے حصّہ لیا، وہاں علمی طبقے فنکار اور اہل کمال لوگوں نے بھی شرکت کی۔ مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کے ساتھ جس طرح محمد شریف نامور مصوّر دہلی، اپنے سارے گھر کا اسباب سوائے بیوی کے زیور کے، خیرات کر کے مجاہدین کے ساتھ شریک ہوئے اور پھر زندہ سلامت نہیں آئے[۲]۔ اسی طرح میر پنجہ کش نے بھی شرکت

[۱] تاریخ عروج سلطنتِ انگلشیہ ہند ص ۶۷۵

کی اور فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ اس وقت ان کی عمر ۹۴ برس کی تھی۔ چنانچہ مولانا ذکار اللہ صاحب اپنی تصنیف "تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند" میں تحریر کرتے ہیں:

"دوسرا باکمال جو قتل ہوا وہ سید احمد میاں میر پنجہ کش خوش نویس تھا۔ خوشنویسی میں سارے ہندوستان میں جواب نہیں رکھتا تھا۔"

بقول صاحب آثار دہلی وہ ۲۴ صفر المظفر ۱۲۷۳ھ کو شہید ہوئے، لوگ ان کا اسی تاریخ پر ہر سال عرس کرتے ہیں۔

نواب غلام حسین مؤلف "نصرت نامہ جنگ" میر پنجہ کش کی شہادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص میاں امیر خوش نویس بہت طاقتور اور لمبے تڑنگے آدمی تھے، چورانوے برس کی عمر تھی مگر پنجہ میں بڑی طاقت تھی، بے مثل خوش نویس تھے۔ اپنے زمانے کے کامل استاد سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی فوج کے ایک سپاہی کی گولی سے شہید ہو گئے۔"

جس وقت میر پنجہ کش پر انگریزوں نے حملہ کیا وہ دس بارہ انگریزوں کی ٹولی تھی۔ انھوں نے اس سے مقابلہ کیا۔ اور تلوار سے آٹھ گوروں کو مار کر ایک گورے کی گولی سے شہید ہوئے۔

غالباً ۱۹۱۰ء میں میر پنجہ کش کے مکان کی مرمّت ہوئی تو اس وقت ان کے رشتہ دار میر فاروق عالم وغیرہ کو خیال آیا کہ میر صاحب کی قبر میں پڑاؤ نہیں ہوگا۔ لاؤ قبر کو کھلوا کر اس میں پڑاؤ ڈلوا دیں، چنانچہ قبر کھولی گئی۔ نبیرہ میر پنجہ کش فاروق عالم نے اپنا چشم دید واقعہ امام عبداللہ جامع مسجد دہلی کو سنایا کہ جب قبر کھولی گئی تو میر صاحب کی پنڈلی معہ گوشت کے دکھائی دی، اس میں ایک طاق نکلا جس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا جو میر صاحب کے خاندان کا شجرہ تھا۔ دوسرے روز حمید عالم صاحب کی اہلیہ ذکریا بیگم نے اپنے پوتے فاروق عالم کو بلوایا اور ان سے کہا کہ قبر کھول کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمھارے جدّ امجد میر صاحب اس بات سے پریشان ہیں کہ تم نے قبر کھلوائی۔ وہ آج رات کو میرے خواب میں آئے تھے، وہ کہتے تھے قبر فوراً بند کرا دو، پڑاؤ ڈلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت قبر بند کر دی گئی اور پڑاؤ نہیں ڈالا گیا۔

میر پنجہ کش کا مزار پہاڑی املی پر ہے جہاں آج کل مڈل اسکول کھلا ہوا ہے۔ میر صاحب کا مزار مکان کے باہر جنگلے والے احاطے کے اندر ہے۔ ان کے مزار کے اوپری حصے پر ایک سنگ مرمر لگا ہوا ہے، جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے "ہذا مرقد۔ الماس رقمحال سید محمد امیر رضوی آفاقی عصر غفرلہ بسنہ۔"

میر صاحب کے مکان کے دروازے پر بعد میں اس عبارت کا پتھر آویزاں ہوا تھا۔ جو ان کے مزار کے پاس رکھا ہوا ہے "ایں مکان محمد امیر خوش نویس غفرلہٗ۔"

میر پنجہ کش صاحب کے صاحبزادے قطب عالم تھے۔ ان کی بیوی اور شاہی امام جامع مسجد حافظ سید محمد کی بیوی، بہنیں بہنیں تھیں۔ قطب عالم صاحب کے دو صاحبزادے حمید عالم اور محمود عالم تھے۔ حمید عالم کے دو صاحبزادے فرخ عالم اور مجید عالم۔ اور دو صاحبزادیاں قمر جہاں اور بدر جہاں اہلیہ جناب امام سید حمید شاہی جامع مسجد دہلی ہیں۔ فرخ عالم کے دو فرزند فخر عالم اور فاروق عالم ہوئے۔ یہ دونوں لاہور میں مقیم ہیں۔ سُنا ہے فخر عالم صاحب کا لاہور میں ایک شاندار ہوٹل ہے۔ محمود عالم کے دو لڑکے امیر عالم اور مقصود عالم اور دو لڑکیاں شاہجہاں بیگم اور احمد جہاں ہیں۔ امیر عالم دہلی میں اور مقصود عالم پاکستان میں فوت ہوئے۔ شاہجہاں بیگم دہلی میں فوت ہوئیں۔ احمد جہاں حیدرآباد دکن میں مقیم ہیں۔ یہ جب دہلی آتی ہیں، تو میر پنجہ کش صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے ضرور جاتی ہیں۔

میر صاحب کے تلامذہ کی تعداد کافی ہے، جن میں سے حسب ذیل کے حالات دستیاب ہوئے:

(۱) مرزا آغا جان عرف آغا صاحب دہلی کے باشندے تھے۔ اصل میں یہ عیسائی تھے۔ فہم و فراست میں انتہائی تیز تھے[۱]۔ مگر اپنے اُستاد سید محمد امیر پنجہ کش کی ہدایت و تلقین سے مسلمان ہوئے تھے۔ بکنیتی پٹے میں بھی ان کو وہ کمال حاصل تھا کہ بڑے بڑے اُستاد ان کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔ خوش نویسی میں ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ میر پنجہ کش

[۱] تاریخ تحفہ راجستھان ص ۳۴

کے شاگردوں میں سے ان سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید مرحوم آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ صاحب کمال شاگرد رشید سید امیر صاحب موصوف کے اور اس فن میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ اُستاد کو ان کے کمال پر ناز ہے اور اس فن کی تکمیل کے سبب اساتذہ سلف سے ممتاز ہیں۔ علاوہ اس کے فن بکیتی بھی میں اقران روزگار سے گوئے سبقت لے گئے اور اہلیت و صلاحیت ایسی ہے جس کا بیان نہیں۔"

کچھ عرصے ریاست جھجر میں مُلازم رہے۔ وہاں نواب صاحب نے ایک لاکھ رُوپے کے صرف سے ایک نہایت بیش بہا اور قابلِ قدر گلستاں ان سے لکھوائی۔ پھر الور میں ملازم ہوئے، ویسی ہی دوسری گلستان پچاس ہزار روپیہ کی بنے سنگھ والیٔ الور کی ایما پر لکھی۔ دونوں نسخے خوش خطی اور خوبیٔ نقش و نگار کے باعث عدیم النظیر ہیں۔ جھجر والی گلستاں مہاراجہ منگل سنگھ مرحوم والیٔ الور نے خرید کر دوران سیاحت پنجاب میں ۱۸۸۰ء میں مہاراجہ راجندر سنگھ والیٔ پٹیالہ کو بطور ہدیہ دی تھی۔ دوسرا نسخہ اب تک الور کے کُتب خانے کی زینت ہے، اس پر متعدد نمائشوں میں تمغہ بھی ملا ہے۔

الور کے مہاراجہ بنے سنگھ نے آغا صاحب کو بکیتی کا اُستاد بنایا تھا۔ یہ فن دوسروں کو سکھاتے تھے۔ مہاراجہ صاحب ان سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو قابلِ اعتبار سمجھتے تھے، ان کو دیوانی کے کاموں کے لئے ایک قابل و دیانتدار آدمی کی ضرورت تھی، چنانچہ مہاراجہ نے ان سے مشورہ کیا۔ مشورہ کے مطابق منشی عمّو جان دہلی سے طلب ہوئے۔ منشی عمّو جان سنجیدہ، متین اور لائق انسان تھے۔ انھیں عہدہ دیوانی پر مقرر کیا[۱]

(۲) آقا عبدالرشید دہلی کی طرز پر نستعلیق بہت اچھا لکھتے تھے۔ اُستاد کے خط سے ایسا ملایا تھا کہ یہ تمیز مشکل سے ہوتی تھی کہ میر پنجہ کش کی وصلی ہے یا آقا کی۔ خط شفیعہ بہت خوب

[۱] آئینہ تاریخ المعروف مرقع الور ص ۱۴۳

لکھتے تھے۔ لچھمن سنگھ بقال خوش نویس شفیعا نہیں کا شاگرد تھا۔ مگر آغا صاحب کی نستعلیق کی شان بہت بلند تھی۔ جس میں اکثر شاگردوں نے فیض پایا۔ ان میں منشی رحیم اللہ دہلوی اور میر محمد علی الوری بڑے پایے کے اُستاد نستعلیق گذرے ہیں۔

آغا صاحب آخر عمر کے حصے تک ریاست الور میں ملازم رہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء دہلی میں یہ دونوں اُستاد میر پنجہ کش اور شاگرد آغا صاحب فرنگیوں کے ہاتھ سے گولیاں کھا کر راہیٔ ملک بقا ہوئے، ان کی مادۂ تاریخ "آغا مر گیا" ۱۲۷۴ھ ہے۔ آغا صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ دو شعر دستیاب ہو سکے [1]

کوئی دارا کوئی جم کوئی اسکندر رہا داغ سر اپنا ہمیں نام خدا افسر ہوا

سُرخ ہے موباف، قاتل آج دیکھا چاہیئے

قصد اس قاتل کا اب ہے کس کے شبخون پر ہوا

لگے ہاتھوں آغا صاحب کے تلمیذ منشی رحیم اللہ صاحب کے حالاتِ زندگی بھی پڑھ لیجیئے، یہ بھی دہلی کے رہنے والے تھے۔ گویا ان کے دادا اُستاد میر پنجہ کش تھے۔ پوتے کو بھی دیکھیئے کس پایۂ کے خوش نویس تھے۔

منشی صاحب خط نسخ اچھا لکھتے تھے مگر نستعلیق میں بڑا کمال حاصل تھا۔ آقا عبد الرشید کی طرز پر لکھتے تھے اور ان کے خط کی نقل بالکل مشابہ کرتے تھے کہ وہی روش، وہی آب و تاب، وہی حسن آفرینی، وہی صفا و جلا تھا اور کمال یہ تھا کہ آقا کی وصلی کی نقل ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ نئی وصلیاں اپنی پسند کی تحریر کر کے آقا سے منسوب کر دیتے تھے۔ قدردان نئی اور نادر آقا رشید کی قلمی وصلی سمجھ کر بڑے شوق و اصرار کے ساتھ خرید لیتے تھے۔ نئے نئے انداز سے وصلی پر آقا کا نام اور سنہ تحریر بھی لکھتے تھے۔ لہٰذا بے تکلف فروخت ہو جاتی تھی۔ ان کے دو قلمی قطعات سعیدیہ لائبریری ٹونک میں موجود ہیں۔ ان کا شاہکار ایک گلستاں بھی ہے جو صرف ایک دن ایک رات میں تحریر کی تھی جس سے ان کی زود نویسی کا

[1] خم خانہ جاوید اوّل ص ۹۹

اندازہ ہوتا ہے ۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ الور میں گذارا ۔ جہاں کچھ عرصے کے لئے ملازم بھی رہے ۔ غالباً الور میں ہی ان کا انتقال ہوا ۔ ان کے شاگردوں میں بھی باکمال اُستاد ہوئے ۔ آخر عمر میں منشی صاحب کو ریاست سے وظیفہ بھی ملنے لگا تھا۔[۱]

(۲) بدرالدین مہرکن نہایت ذہین وطباع اور باعلم وہُنر تھے ۔ مرصع رقم ان کا خطاب تھا ۔ چھ قسم کے خطوط بہترین لکھتے تھے ۔ مگر نستعلیق میں بڑا کمال رکھتے تھے ۔ مہرکنی میں ایسے ماہر تھے کہ ان کے معاصرین میں کوئی شخص ان کا نظیر نہیں تھا ۔ بہادر شاہ ظفر جہاں ان کے قدرداں تھے وہاں گورنر جنرل بھی ان کے فن کا مداح تھا ۔ چنانچہ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء کو بدرالدین صاحب نے زمرّد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا ۔ گورنر کو نذر کے طور پر پیش کیا ، جس کے صلے میں گورنر کی طرف سے ان کو خلعت پارچہ عطا کیا گیا ۔ ۱۶ اگست ۱۸۴۶ء کی نواب گورنر جنرل کی چٹھی کے بموجب صاحبکلاں بہادر نے ان کو طلب فرما کر حکم دیا کہ نواب جنرل کے نام کی ایک مہر بنا دو ، ملکہ انگلستان نے جو نیا خطاب فتح لاہور کے وقت مرحمت فرمایا ہے وہ بھی مہر میں درج ہونا ضروری ہے ۔[۲] انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کے لئے بھی ایک نگینہ تیار کیا تھا اور انعام پایا تھا ، چنانچہ سرسیّد نے ان کا بھی ذکر "آثار الصنادید" میں کیا ہے :

> "خط نستعلیق لکھنے میں شاگرد ہیں سیّد امیر صاحب ممدوح کے ، اور مہرکنی کے فن میں تمام ہندوستان میں اس سرکردہ اہلِ کمال کا نظیر نہیں ۔ مہر حکام وقت کی نواب گورنر جنرل بہادر کی اسی یگانہ روزگار کے ہاتھ کھدا کرتی ہے ۔ جو دائرہ کہ ان کی قلم سے نکلتا ہے ہزار حرف ان کی یگانگی پر اپنی دہن سے ادا کرتا ہے ۔"

بدرالدین صاحب عربی ، فارسی ، ہندی ، سنسکرت اور انگریزی کی مہریں کھودتے تھے اور دریبہ کلاں دہلی میں اپنے مکان پر کام کرتے تھے ۔ دور دوران کے اس فن کا شہرہ تھا ۔

[۱] صحیفہ خوش نویساں ص ۱۰۸ [۲] بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۸۱

خوش نویسان عصر کی وصلیاں بڑی بڑی قیمت دیکر خریدتے تھے اور ان سے مدد لیکر اپنے فن کو ترقی دیتے تھے۔ آقا عبدالرشید کی وصلیوں کا کثیر سرمایہ ان کے پاس تھا، اور لوگوں کے مقابلے میں فنکار میں احساس زیادہ ہوتا ہے۔ بدرالدین مہر کن بھلا کیسے انگریزوں کی غلامی کو برداشت کر سکتا تھا، یہ بھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایام میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضری دیتے تھے اور انگریزوں کے خلاف منصوبے بنانے میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۳ اگست ۱۸۵۷ء کو جب مولوی احمد علی نے ناہر سنگھ راجہ بلب گڑھ کی جانب سے نذر پیش کی اور ناہر سنگھ کی عرضی سے یہ امر ظاہر ہوا کہ اس نے اپنے چچیرے بھائی نول سنگھ کو نامزد کر کے دہلی بھیجا ہے تو اس وقت بدرالدین خاں مہر کن نے دہانِ فرنگ کا ایک نگینہ جس پر آیت "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ" کندہ تھی نذر کیا۔[۱]

اسی اثنا میں، ۶ اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے بدرالدین خاں مہر کن کو پنسل سے لکھا ہوا یہ حکم بھیجا:

"تمھیں بہترین مہر تیار کر کے ہمارے حضور میں پیش کرنے کی تاکید کی جاتی ہے جس میں مشیر سلطنت وقار الملک مابدولت کے خادم محمد بخت خاں لارڈ گورنر بہادر ناظم جملہ معاملات ملکی و فوجی کا نام مع القاب کے کندہ کیا جائے۔ اور موافق دستور مہر میں سال جلوس ۲۱ بھی درج ہوگا۔"[۲]

جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد دہلی میں گرفتاریوں کا سلسلہ چلا، اور شریفی خاندان کے حکیموں کو گرفتار کر کے جس طرح چھوڑ دیا گیا تھا، اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب اور بدرالدین خاں مہر کن کو پکڑ کر کرنل برن صاحب کے پاس لے گئے، جب انھوں نے اپنے کمالِ فن کی اسنادِ ملکہ معظمہ دکھائیں تو ان کو چھوڑ دیا گیا۔ اور گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔[۳]

(۳) مرزا عبداللہ بیگ میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ نستعلیق کے ماہر تھے، آغا جان کے بعد

۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۵۶ ۲۔ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط ص ۱۸۱

۳۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۷۰۳

ان کے رُتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بقول سر سید مرحوم:

"اہلیت وسعادت مندی جو ان کے مزاج میں ہے قلم وزبان کی طاقت نہیں کہ اس کا بیان کر سکے"[1]

عبداللہ صاحب کے صاحبزادے مرزا عباد اللہ بیگ تھے، یہ بھی میر پنجہ کش کے تلمذ تھے۔ دربار شاہی سے ان کو زمرّد رقم کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر یہ دہلی سے ریاست پٹیالہ چلے گئے تھے جہاں انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ ریاست پٹیالہ میں انھوں نے ملازمت بھی کی۔ ان کو اعجاز رقم کا بھی خطاب تھا[2]

(۴) محمد یعقوب دہلی کے باشندے تھے۔ میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ خط نستعلیق کی شان اُستاد کے خط سے ہو بہو مشابہ تھی۔ ان کی ایک قلمی وصلی نہایت نفیس منشی رامچندر جواہر رقم جے پوری کے پاس محفوظ ہے۔

میر پنجہ کش کے چند ہم عصر و ہم پیشہ دہلی والے خوش نویسوں کے حالات بھی گوش گذار فرمالیں:

۱۔ شاہ میر وارث دہلی کے باشندے تھے، اساتذہ متقدمین کی راہ پر چلتے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ محلہ کھاری باؤلی میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کا خط گلزار و شکستہ بہت اچھا تھا۔ ہر مہینے کی چوتھی تاریخ کو رقص و سرود کی محفل کرتے تھے۔ تلامذہ و متعلقین اور مریدین شرکت کرتے تھے اور حال و وجد کی محفل گرم ہوتی۔ ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں فوت ہوئے[3]

۲۔ شیخ عطار حسین کے والد شیخ غلام حسین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اپنا وطن دہلی چھوڑ کر جے پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ شیخ صاحب نے جے پور میں تعلیم پانے کے بعد یہیں سرکاری ملازمت کی، عرصہ دراز تک محکمہ صدر فوجداری میں ناظر رہے۔ خط نستعلیق نہایت

[1] آثار الصنادید ص ۳۶۳ [2] صحیفہ خوش نویساں ص ۱۲۲

[3] تذکرہ صحیفہ خوش نویساں ص ۱۳۰

نفیس و پاکیزہ تھا۔ میر پنجہ کش کی طرز و روش پر لکھتے تھے، میر صاحب کے رشتے دار بھی تھے۔
آپ کے دادا شیخ پیارے صاحب شاہزادگانِ دہلی کے اتالیق تھے۔ شیخ صاحب کو شعر و شاعری
کا شوق تھا۔ گُل تلمیذ میر تقی میرؔ کو کلام دکھلاتے تھے، شورؔ تخلص تھا۔ ان کا جے پور کے اساتذہ
میں شمار تھا۔ مہاراجہ سوائی رام سنگھ کو تھیٹر دیکھنے کا شوق تھا۔ اسی وجہ سے "رام پرکاش
تھیٹر" قائم کیا، جس کا بعد میں "رام پرکاش سینما" ہوگیا۔ تھیٹر میں جو غزلیں گائی جاتی
تھیں ان کی اصلاح مہاراجہ صاحب کی فرمائش پر کرتے تھے۔ روزینہ تاحیات ملتا رہا۔
صاحبِ دیوان تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں دیوان طبع ہوئے تھے۔[۱]

جیتے ہیں آبرو سے تو مرتے ہیں بات پر
ہم خاک ڈال دیتے ہیں آبِ حیات پر

۳۔ حافظ بقاء اللہ کے والد ماجد حافظ ابراہیم خوش نویس دہلوی تھے۔ ان کے والد خلیق و متواضع
متقی اور متشرع بزرگ تھے، نسخ و نستعلیق کے مسلمہ استاد تھے۔ ابوالنصیر معین الدین اکبر شاہ
ثانی بادشاہ دہلی کے عہد میں مرشد زادگان کے خوش نویسی میں استاد تھے۔ ان کے صاحبزادے
بقاء اللہ بھی مسلم الثبوت استاد تھے، اُن کے خط میں بھی وہی شان پائی جاتی تھی جو ان کے
والد کے خط کی تھی۔ قلعہ معلیٰ میں سکونت رکھتے تھے۔ شاہزادوں کو بھی خوش نویسی کی تعلیم
دیتے تھے۔ ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۲ء کو انتقال ہوا۔

---

[۱] تذکرہ شعراء جے پور ص ۲۹۴

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

مولوی صاحب دہلی میں ۱۴ اگست ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد ہندوستان کے مشہور اہل قلم ڈپٹی نذیر احمد صاحب تھے۔ آپ نے اپنے والد سے اُردو، فارسی، عربی، انگریزی کی تعلیم پائی۔ آپ کے لئے ان کے والد نے چند پند تصنیف کئے تھے، جنھوں نے مواعظ حسنہ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا نے ان کی تعلیم و تربیت کیسی دلسوزی اور شفقت کے ساتھ کی۔ آپ کو صرف دو برس کے لئے گورنمنٹ اسکول دہلی میں داخل کرایا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حیدر آباد دکن گئے اور ضلع رائچور کی تعلقداری کے فرائض عدل و انصاف کے ساتھ انجام دیئے۔

مولوی صاحب متواضع خلیق اور ملنسار انسان تھے، ان کا نظریہ تھا کہ انسان بزرگوں کا نام لے کر نہیں بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرے کہ وہ کس عادت، خصلت کا ہے اور اس کا عمل اور کردار کیا ہے۔ چنانچہ حیدآباد کی ملازمت کے زمانے میں ان کے پاس ایک صاحب آئے اور اس نے کہا کہ آپ بڑے خاندانی ہیں۔ بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ آپ نے اس کو جواب دیا کہ اب زمانہ "پدرم سلطان بود" کہنے کا چلا گیا۔ اپنی سیرت و اخلاق سے ثابت کرو کہ تم کیسے ہو۔ اسلاف پر گھمنڈ کرنا صحیح نہیں ہے، انھوں نے اس خیال کا اظہار اپنے ایک شعر میں بھی کیا ہے ؎

بے کار فخر ہے تجھے اسلاف پر عبث
مانا کہ اے بشیرؔ بہت تو نجیب ہے

حیدر آباد دکن کا علمی طبقہ اور وہاں کے باثر اور معتقد حضرات ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کافی زمانہ آپ نے حیدر آباد دکن میں گذارا۔ چنانچہ واقعات

مملکت بیجاپور کی تین جلدیں آپ نے تالیف فرمائیں۔ اس کی مقبولیت کی وجہ سے نظام دکن نے آپ کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ اور اسی کتاب کی وجہ سے آپ کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کا ممبر بنایا گیا۔ نظام دکن کی حکومت سے آپ نے پنشن لی اور ۱۹۱۶ء میں وظیفہ پاکر دہلی واپس آئے۔ نظام دکن سے خاندانی تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

دو پشت سے سرکار دکن کا ہوں نمک خوار

جو حکم بشیر آئے وہ ٹالا نہیں جاتا

تاریخ بیجاپور کی شہرت کا یہ اثر ہوا کہ دہلی کے چیف کمشنر ڈبلیو ایم نے مولوی بشیرالدین صاحب سے کہا کہ تم بڑے لائق اور مصنف کے بیٹے ہو اور خود بھی صاحب تصنیف و تالیف ہو۔ ہم چاہتے ہیں جس نہج سے تم نے تاریخ مملکت بیجاپور لکھی، اسی طرز پر دہلی کی بھی تاریخ لکھو کیونکہ دہلی تمہارا وطن ہے اور دہلی کا بھی تم پر حق ہے۔ یہ کام تمہارے ہاتھ سے انجام پائے۔ اور ساتھ ہی چیف کمشنر نے ان کو محکمہ آثار قدیمہ کے نام ایک چٹھی لکھ کر دی کہ ان کو جس قسم کا مواد درکار ہو دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے واقعات دارالحکومت دہلی کے نام سے دہلی کی تاریخ تین جلدوں میں تصنیف فرمائی۔

جلد اول میں ۱۵۵۰ برس قبل مسیح سے ۱۹۲۰ء تک کے دہلی کے بادشاہوں کے حالات، نقشہ جات، تصاویر۔ اور دوسری جلد میں دہلی شہر و مضافات و شہر کی عمارتوں، ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں معلومات۔ اور تیسری جلد میں بیرون شہر دہلی کی تاریخی عمارتوں اور خانقاہوں کی کیفیت و حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب پر بھی آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

مولوی بشیرالدین صاحب کے نانا مولانا راشدالخیری کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب تھے۔ چنانچہ مولانا راشدالخیری کے پھوپھی زاد بھائی مولوی بشیرالدین کا جب انتقال ہوا۔ ان کی رحلت پر مولانا نے عصمت میں ایک مضمون میں لکھا:

"بھائی بشیر میں بعض باتیں اتنی اچھی تھیں کہ اب کم از کم ہمارے خاندان میں ایسے لوگ مشکل سے پیدا ہوں گے، ان میں ایک لاکھ روپیہ کی صفت

یہ تھی کہ وہ کسی شخص سے بھی سخت سے سخت تکلیف پہنچ جانے کے بعد قطع تعلق کرنا پسند نہ کرتے تھے بہت جلد برہم ہو جاتے تھے مگر غصّہ بہت جلد زائل ہو جاتا تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ان کے مزاج میں سادگی بہت تھی، تصنّع اور بناوٹ سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔"[۵۱]

مولوی بشیر صاحب اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جس طرح میرے والد ماجد شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور نے آخری عمر میں نظم کی طرف توجہ کی تھی میں نے بھی وہی ڈھنگ اختیار کیا۔"

مولوی صاحب نے اپنا کلام نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی، جناب وحید الدین بیخودؔ دہلوی اور احسنؔ مارہروی کو اصلاح کے لئے دیا۔ اور اپنا پورا "دیوانِ بشیر" جناب نوحؔ ناروی کو اصلاح کے لئے پیش کیا اور جب انھوں نے اصلاح کر دی تو یہ دیوان ۱۹۲۴ء میں طبع ہوا۔ آپ کی ایک مثنوی "دردِ دل" بھی ہے۔

مولوی صاحب علمی مشاغل میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ اطبّا کے منع کرنے پر بھی اپنی پیرانہ سالی کا بیشتر حصّہ تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔ بالآخر اس محنت شاقہ کی وجہ سے صحت نے جواب دے دیا۔ مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور ۲۴ر اگست ۱۹۲۷ کو فوت ہوئے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے کلام میں تاثیر ہے اور آسان و سہل ہے ؎

ٹھوکریں کھائیں حوادث کی ہزاروں میں نے — نفس سرکش میرا مجبور ہوا خوب ہوا

عمر تو رندی و مستی میں گزاری میں نے — اب مے عشق سے مخمور ہوا خوب ہوا

میری خوش نصیبیاں تھیں اگر آتا وہ ستم گر — کبھی جان صدقے کرتا، کبھی میں نثار ہوتا

مری دل کی آرزو تھی جو بر آتیں اہلِ گلشن — یہ چمن شگفتہ رہتا نہ یہ خار زار ہوتا

[۵۱] عصمت جولائی ۱۹۲۷ء

غرق دریائے معاصی ہوں مگر ہے اُمید
میں سہارے سے شفاعت کے اچھل جاؤں گا

شوق سے آپ ستا لیں مجھ کو — اس ستانے کا مزہ پائے گا
آپ کا حسن ہے دل کش لیکن — کچھ سمجھ سوچ کے اترائے گا
میں تو کہہ دوں گا پتے کی باتیں — آپ سُنکر تو نہ شرمائے گا

کون ہے آپ کا ہمدرد بشیرؔ
زخمِ دل کس کو یہ دکھلائے گا

جناب حکیم بقاء اللہ دہلوی

حکیم بقاء اللہ دہلوی مغلیہ دور کے شاہی طبیب اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز طبیب تھے۔ یہ خاندان دہلی میں آنکھوں کے علاج میں شہرت رکھتا تھا۔ حوض قاضی کے سامنے ایک گلی حکیم بقائی کے نام سے مشہور ہے۔ عہدِ مغلیہ میں انھوں نے قاضی حوض کے متصل اور تھانہ حوض قاضی کے قریب دو منزلہ مسجد تعمیر کی جس کا دس سیڑھیوں کا زینہ ہے اور اس کے نیچے سات دُکانیں ہیں۔

آپ کی ایک مشہور طبی تصنیف "مجموعہ بقائی" ہے جو کافی ضخیم ہے۔ اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۵۵۶ صفحات پر مشتمل ہے جو یکم دسمبر ۱۸۶۱ء میں مطبع ہندو پریس کوچہ مائید اس دہلی میں باہتمام پیارے لال طبع ہوئی۔ اور دوسری جلد ۵۱۲ صفحات کی ہے جو فروری ۱۸۶۲ء مطابق، شعبان ۱۲۷۸ھ کو ہندو پریس میں میاں عبد الغفور کی فرمائش پر چھپی۔ دونوں جلدوں کے ۱۰۶۸ صفحات ہیں۔ کتابت طباعت اچھی ہے، کاغذ معمولی ہے، بڑے سائز پر ہے۔ آپکا انتقال دہلی میں ہوا۔

آپ کے صاحبزادے محمد اسماعیل صاحب اور حکیم ذکاء اللہ تھے۔ مجموعہ بقائی محمد اسمٰعیل صاحب کی نگرانی میں چھپا۔ یہ شیخ ابوالرضا عم حضرت شاہ ولی اللہ کے مرید تھے اور اپنے دور کے مشہور حکیموں میں ان کا شمار تھا۔[1]

حکیم ذکاء اللہ اپنے فن میں مسلمہ روزگار تھے۔ قرابادینِ ذکائی آپ کی یادگار ہے، جس سے آج تک ہزاروں طالبانِ فن فیضیاب ہو رہے ہیں۔ یہ کتاب چھٹی مرتبہ منشی

[1] فہرست دواخانہ بقائی دہلی

نولکشور نے جنوری ۱۹۰۷ء کو چھاپی۔ مؤلف وقائع عبدالقادر خانی نے حکیم صاحب کا اوران کی قرابادین ذکائی کا ذکر کیا ہے اور مزید تصانیف لکھنے کا مشورہ دیا ہے:

"حکیم ذکاء اللہ خاں حاذق الملک تشخیص اور علاج میں بہت مشہور تھے، ان کی بھی معالجات میں ایک کتاب ہے بندہ نے معالجات ذکائی اور معالجات شریف خانی دونوں کتابیں دیکھی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے دونوں کتابوں میں پہلے لوگوں کی تصانیف پر اپنے مجربات اضافہ کئے ہیں جیسا کہ اس فن کے مصنفوں کا طریقہ ہے، ایک کا تجربہ دوسرے کو یقین کا فائدہ نہیں دیتا اور اپنے تجربہ کی روشنی میں یقین حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی عام طور پر ہر ملک ہر شخص اور ہر زمانے میں مشکل سے مفید ہوتا ہے ——
"سقمونیا صفرا کا مسہل ہے" یہ مقولہ اتنا مشہور ہے کہ منطقی رسالوں میں مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ علامہ قطب الدین درۃ التاج میں لکھتے ہیں کہ ملک صقلاب میں سقمونیا ہرگز اسہال کا فائدہ نہیں دیتا۔ میری یہ رائے ہے کہ اگر یہ بزرگ (حکیم ذکاء اللہ خاں) اتنی ہمت کرجاتے کہ —— چھوٹا سا رسالہ ایسا لکھ دیتے جس میں ہر مرض کی خاص خاص علامتیں ہوتیں اور مشترکہ علامتوں کو چھوڑ دیتے تو بہت مفید ہوتا اور یقیناً وہ اس پر قادر تھے۔ اور دوسروں کے لئے مشتبہ صورت میں نفع دیتا یا کوئی ایسا رسالہ لکھ دیتے جس میں اقسام نبض کی تصویریں ہوتیں تاکہ سیکھنے والا ہر قسم کی تصویر دیکھ لیتا۔ اب کسی اُستاد یا شاگرد کے اختیار میں نہیں کہ ایک قسم کی نبض کے مریضوں کو ایک مطب میں جمع کر سکے۔ اس تصنیف کی صورت یہ ہوتی کہ معتدل نبضہ کا ایک خط کھینچتے۔ پھر چونکہ ہر نبضہ میں دو حرکت اور دو سکون ہیں۔ انبساطی وانقباضی اور مرکزی ومحیطی، اس خط کو چار حصوں میں ہر ایک کے زمانہ کے اعتبار سے معتدل نبضہ میں تقسیم کر دیتے، اس کے بعد دوسری قسمیں لکھتے اور ہر قسم کے خط کو لکھ کر حرکات وسکنات میں فرق زمان کے لحاظ سے حصے کر دیتے

تو اس قدر دردِ سری اور دشواری نہ ہوتی جتنی کہ موٹی موٹی کتابوں کے تصنیف میں فرمائی ہے۔"

۱۸۵۷ء کے بعد حکیم ذکاء اللہ صاحب کے صاحبزادے حکیم حسام الدین عرف حکیم منجھلے صاحب نے خاندان کا نام روشن کیا۔ اور اطراف و جوانب ہند میں اپنی خدا داد طبی قابلیت کا سکہ بٹھایا۔ آپ نے بھی فن طب میں متعدد گرانقدر تصانیف چھوڑیں، جو طالبانِ فن کے لئے چراغ راہ ثابت ہوئیں۔ ان کے پاس دور دور سے لوگ آنکھوں کے علاج کے لئے آیا کرتے تھے۔

حکیم حسام الدین صاحب کے صاحبزادے حکیم قیام الدین صاحب تھے جن کے فرزند حکیم مکرم الدین صاحب تھے۔ اسی خاندان میں حکیم لطیف حسین خاں صاحب تھے، جو آنکھوں کے علاج میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ حکمت و طب کے علاوہ آپ علوم دینی سے واقفیت رکھتے تھے۔ عربی و فارسی زبان کے ماہر تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی و فارسی کے مدرس تھے۔ مولوی بشیر الدین مؤلف واقعات دار الحکومت دہلی نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔

آپ کا طریقۂ علاج اس قدر مؤثر تھا کہ دور و نزدیک سے مریض آپ کے مطب میں کھنچے چلے آتے تھے، آپ کی تجویز و تشخیص میں کسی بڑے سے بڑے طبیب کو معمولی سی ترمیم و تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ جناب حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں صاحب نے جب مدرسہ طبیہ جاری کیا تو آپ کے علاوہ کوئی ایسا استاد کامل نظر نہیں آیا، جس سے اس مدرسہ کے پرنسپل کا عہدہ جلیلہ سنبھالنے کے لئے کہا جاتا۔ آپ نے محض خدمتِ خلق کے خیال سے اس منصب کو قبول کیا۔ اور آخر دم تک علم طب کی خدمت کرتے رہے۔

آپ کے بعد خاندان بقائی کی عدیم المثال طبی روایات کو زندہ رکھنے اور ان میں چار چاند لگانے کی عزت حکیم منیر الدین صاحب کو حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں گلی حکیم بقائی میں اس خاندان کے چار مطب حکیم قیام الدین صاحب، حکیم بشیر الدین صاحب، حکیم منیر الدین صاحب اور حکیم مجیب الدین کے تھے۔ اسی گلی میں دواخانہ بقائی بھی تھا، جس کی نگرانی حکیم منیر الدین صاحب فرماتے تھے۔ آپ نے اپنی بے نظیر طبی قابلیت سے نہ صرف بزرگوں کی شہرت اور نیک نامی کو زندہ رکھا بلکہ آپ کی ذکاوت اور ذہانت سے فن طب کو بھی ترقی

ہوئی۔ حکیم منیرالدین صاحب اور ان کی اہلیہ سائیں توکل شاہ کی مُرید تھیں۔

حکیم منیرالدین صاحب کے دو صاحبزادے حکیم شجاع الدین صاحب اور حکیم شریف الدین تھے۔ ہنگامہ ۱۹۴۷ء سے قبل ان دونوں بھائیوں کا دواخانہ چوک چتلی قبر پر تھا۔ اس ہنگامے کے بعد حکیم شجاع الدین صاحب کراچی چلے گئے وہیں مقیم ہیں۔ لیکن حکیم شریف الدین صاحب کا دواخانہ بقائی اب تک چوک چتلی قبر پر ہے اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

حکیم شریف الدین صاحب نے طب حکیم امتیاز الدین صاحب سے سیکھی اور خاندانی منصب کے بار کو سنبھالا اور اپنے بزرگوں کے سچے جانشین ثابت ہوئے۔ آباؤ اجداد کی خصوصیات قیافہ شناسی، دقیقہ رسی، فہم و فراست، اخلاق و مروت اور مریضوں کی دلجوئی آپ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ دہلی کی مختلف دینی درسگاہوں، مسجدوں کی منتظمہ کمیٹی کے ممبر و عہدیداران ہیں۔ مدرسہ امینیہ کے قدیم ترین ممبر، مسجد حسین بخش گلی بختاور خاں مٹیا محل، مسجد حوض والی محلہ قبرستان ترکمان گیٹ اور مسجد سید رفاعی بازار چتلی قبر کے صدر ہیں۔ ان مسجدوں کا انتظام بہت خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا ہے۔

شاہ محمد جمیل الرحمٰن راشد دہلوی

شاہ ارشد کے بزرگ عرب وافغانستان وہندوستان کے بادشاہوں کے امرا میں تھے۔ نسباً سادات سے تعلق تھا۔ ان کے خاندان کے لوگ ۱۱۹۱ھ میں ہندوستان اور دہلی، جونپور، بنگال، بریلی اور حیدرآباد دکن میں آباد ہو گئے۔ بعض لوگوں کا محمد غوری و سکندر لودھی کے امراء میں شمار ہوتا تھا جو بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے تھے۔

آپ کے جدامجد میر سیف اللہ جو نظام الملک کی حیدرآباد کی فوج میں اپنے والد سردار حیدر خاں کی جگہ یک صدی لشکر کے سردار تھے۔ ۱۸۳۲ء کو اہل وعیال کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے اور راستے میں برہانپور متصل کھنڈوہ میں وفات پائی۔ اور ان کے صاحبزادے میر عبداللہ خاں پریشانی کی حالت میں مع خاندان کے دہلی تشریف لائے۔

میر عبداللہ خاں کے صاحبزادے مولانا حاجی حافظ قاری شاہ محمد عبدالرحیم ہادی، قادری محدث دہلوی تھے جو ۱۸۳۰ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ بہت بڑے عالم تھے، آپ نے کئی کتابیں چیستانی صوفیہ، مراۃ القرآنی، روضۃ النعیم، ترویج الدیاملی وغیرہ لکھیں، ہریانہ میں تبلیغ کی اور بدعت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جھجر ضلع روہتک میں جامع مسجد اور مدرسہ قوت الاسلام رحیمیہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ آپ جناب اخوند صاحب سوات سے بیعت تھے، جن کے صاحبزادے میاں گل سوات کے فرمانروا تھے۔ آپ کا دہلی میں ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ کو پیر کے روز عصر و مغرب کے درمیان میں ۵۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ نماز جنازہ بعد نماز مغرب جامع مسجد دہلی میں پڑھی گئی اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کے پانچ صاحبزادے شاہ محمد جمیل الرحمٰن، مولوی حبیب الرحمٰن،

شاہ امان الرحمٰن، سعید الرحمٰن اور حافظ عثمان الرحمٰن تھے۔

شاہ جمیل الرحمٰن صاحب ۲۳ رجب ۱۲۷۹ھ کو جمعرات کے دن دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی اپنے والد بزرگوار سے قرآن مجید حفظ کیا۔ ابتدائی کتابیں بھی اپنے والد سے پڑھیں اور مسجد فتحپوری کے مدرسے میں داخلہ لیا جبکہ یہ نیا نیا جاری ہوا تھا۔ اسی مدرسے میں ۱۸۸۳ء کو فارغ التحصیل ہوئے، اور سند حاصل کی۔ اور ساتھ ہی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۶ء میں مولوی فاضل و منشی فاضل کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے۔ طبیہ کالج دہلی میں حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے زمانے میں علم طب کی سند حاصل کی۔ اور اٹھارہ ماہ عربک اسکول دہلی میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی کی قائم مقامی فرمائی۔ اور بیس سال تک سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی کے عربی کے پروفیسر رہے۔ اٹھارہ ماہ طبیہ کالج دہلی میں اعزازی مدرسی کی۔ آپ حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسوی خلیفہ مولانا حاجی سید منور علی شاہ سے بیعت تھے۔ بڑی محنت و ریاضت کر کے خلافت کے درجے تک پہنچے۔ ۱۳۲۲ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر واپسی پر پروفیسری سے مستعفی ہوئے۔ آپ کوچہ رحمان میں رہتے تھے۔

بیس برس کی عمر سے آپ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت تھی۔ درگاہ خواجہ میں فرط محبت کے ساتھ حاضر ہوتے تھے اور چھٹیوں کے تمام دن یہیں بسر کرتے تھے اور اپنی آخری زندگی کے لئے اجمیر شریف کو گوشہ عزلت نشینی قرار دیا۔ آٹھ بجے صبح سے بارہ بجے تک مطب کرتے تھے۔ ظہر سے عصر تک تلاوت کلام اللہ وغیرہ میں مصروف رہتے تھے اور عصر و مغرب کے درمیان درگاہ شریف میں حاضر ہو کر معمولات پورا کرتے اور قبل نماز عشاء فاتحہ پڑھ کر واپسی ہوتی۔

آپ بڑے جفاکش، نفس کش تھے، غیور طبیعت پائی تھی، طبیعت کے صاف تھے، جو رائے قائم کر لیتے تھے اس پر بڑے مضبوط اور پختہ رہتے تھے۔ کبھی مذبذب نہیں ہوتے تھے صفائی معاملات میں اپنی نظیر آپ تھے۔ حتی الامکان زیر بار احسان ہونے سے گریز کرتے تھے، طمع و لالچ سے کوسوں دور رہے۔ بڑے قانع، متوکل اور متواضع بزرگ تھے۔ وضع قطع بہت سادہ تھی،

مدارات کرنے میں کوئی تمیز نہیں تھی، خواہ چھوٹا بڑا ہو، امیر و غریب ہو سب کے ساتھ ایک سا سلوک کرتے تھے۔

آپ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بارگاہ مخدومی سے محبت و عقیدت تھی۔ درگاہ ماہم شریف بمبئی میں آپ کا قیام رہتا تھا۔ جناب حسام الدین ناظم درگاہ اور آپ کی کوششوں سے کتب خانہ مخدومی قائم ہوا، جس میں آپ نے اپنے کتب خانہ میں سے چار سو سے زیادہ کتابیں کتب خانہ مخدومی کے لئے روانہ کیں۔

آپ کو شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ عربی فارسی اور اُردو میں فی البدیہہ شعر کہتے تھے اور ان تینوں زبانوں میں نثر میں بھی قلم برداشتہ لکھتے تھے۔

١٩٢٢ء کو آپ دہلی آئے۔ اور خلافِ عادت مکان پر کئی ماہ قیام کیا۔ ١٣ رمئی ١٩٢٣ء کو دہلی سے اجمیر شریف چلے گئے تو زندگی سے مایوس تھے۔ چنانچہ جب آپ اجمیر سے بمبئی پہنچے تو وہاں ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ کچھ حالت درست ہوئی تو درگاہ ماہم شریف میں حاضر ہوئے۔ احباب کے منع کرنے کے باوجود رمضان شریف کے پورے روزے رکھے۔ حالت نازک تھی، اور بھی نازک ہو گئی۔ اسی حالت میں اجمیر شریف گئے اور وہاں سے ٢٥ رجولائی ١٩٢٤ء کو میر نعمت علی صاحب سے اپنے بھائی مولوی امان الرحمٰن صاحب کو دہلی کارڈ لکھوا بھیجا کہ ٣٠ رجولائی کو بدھ کے دن دس بجے میل سے روانہ ہو کر پنجشنبہ ٣١ رجولائی ١٩٢٤ء کی صبح دہلی پہنچوں گا۔ تم ڈولی لے کر پلیٹ فارم پر ملنا۔

تاریخ مقررہ پر آپ اسٹیشن پر پہنچے۔ آپ کے بھائی مولوی امان الرحمان موجود تھے۔ گاڑی آئی رکی، جونہی آپ پر نظر پڑی تو دیکھا سوائے پوست استخوان اور انفاس بقیہ و رنگ ارغوان کے کچھ باقی نہ تھا۔ ٣١ رجولائی کو آپ دہلی آئے تھے اور ٢٣ راگست ١٩٢٤ء کو ہفتہ کے دن ٢ بجکر ٢٥ منٹ پر فوت ہوئے۔

جنابِ رائے بہادر چھنّا مل صاحب رئیسِ اعظم دہلی

لالہ چھنّا مل دہلی کی ایک معزز اور خاندانی ہستی تھیں۔ لیکن ان کے غور و فکر کرنے کا ڈھنگ علیحدہ تھا۔ ان کو اپنے ملک اور اس کے عوام سے نفرت تھی وہ غیر ملکی سامراجی حکومت کو پسند کرتے تھے، اس کو قوت دیتے اور انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے ہر قسم کے جتن کرتے تھے، انگریز دہلی کے بادشاہوں کو عوام کے سامنے ذلیل کرانا چاہتا تھا۔ ان کے اختیارات و اعزازات کو ختم کرنے کے منصوبے بناتا تھا۔ یہ اس سلسلے میں اس کی ہمنوائی کرتے تھے۔

جب لالہ چھنّا مل کے ہم خیال و متعلقہ لوگوں کو جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے دوران دہلی کی کوتوالی میں بند کر دیا تو اس کی شکایت خود لالہ چھنّا مل نے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں کی۔ چنانچہ اس زمانے کے روزنامچہ لکھنے والے عبد اللطیف نے لالہ چھنّا مل کی اس شکایت کا اور کٹرہ نیل کے لوگوں نے اکبر ثانی کے ساتھ جو ذلّت آمیز سلوک کیا تھا۔ اس کا ذکر اپنے روزنامچے میں کیا ہے:[1]

"چھنّا مل نے، ۷ ذی قعدہ یکم جولائی، ۱۸۵۷ء میں بارگاہِ شاہی میں فریاد کی۔ کہ کوتوال نے بے سبب بھانا مل کے لڑکے اور دو خانہ زادوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انھیں بند کر دیا۔ بادشاہ نے مرزا مغل سے کہا کہ کوتوال کو تحریر کریں کہ اور پوچھیں کہ ہماری رعایا میں تصرّف بے جا کیوں کرتا ہے؟ کہ یہ تو خدا کی امانت ہے اور اسے بے موقع تہدید اور ملامت کرنے کی کیا مجال ہے اور وہ لوگ دُکھ کے جائیں۔ اس حیاتِ فانی میں، ہمیں یاد ہے اور شاید تم نے بھی یہ بات

[1] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۴۲

سُنی ہو کہ ایک مرتبہ حضرت عرش آرام گاہ اکبر ثانی نے عید الضحیٰ کی نماز کا قصد کیا
جس وقت سواری بازار فتحپوری میں رونق افروز ہوئی تو کٹرہ نیل اور بازار
لاہوری دروازہ کے چند نادان باشندوں نے جو ہمیشہ سے فساد میں مشہور
ہیں، چند سنگریزے اس کوہ عظمت و وقار پر پھینکے۔ قریب تھا کہ بادشاہ کو
کچھ تکلیف پہنچے کہ امیر الدولہ بہادر فرزند عزیز نواب نوازش خاں نے جو حسبِ
معمول خواص میں تھے۔ بڑھاپے میں جوانمردی کا کام کیا اور چتر کو سپر بنا لیا۔
اور بڑی تکلیف اٹھا کر رزیڈنٹ کے پاس پہنچے اور اسے یہ طیش دلایا کہ کٹرہ
نیل اور بازار لاہوری دروازہ کا نام و نشان تک نہ رہنے دے۔ ایک ساعت
ہی گزری ہوگی کہ عمارتیں ڈھانے والی توپوں نے کٹرہ نیل سے لاہوری دروازہ
تک کے علاقہ کو گھیر لیا اور مصیبت آگئی۔ جب بادشاہ عیدگاہ پہنچے اور نماز
سے فارغ ہو کر سواری کا جلوس واپس ہوا اور خادموں کی صدائے "طرقوا
طرقوا" ایک طرف ہو جاؤ ایک طرف ہو جاؤ۔ اور بادشاہ کی زرنگاری عماری
جلوہ آرا ہوئی۔ تو انھوں نے دیکھا کہ رزیڈنٹ کسی تگ و دو میں ہے اور
امرا تلواریں سونتے ہوئے کسی جستجو میں ہیں۔ توپیں تیار ہیں اور لشکر
عجلت کر رہا ہے اور کٹرہ نیل دریائے نیل کی طرح جوش میں ہے اور قرب و
نواح کے باشندے سراسیمہ و پریشان ہیں۔ بادشاہ کا دریائے رحم جوش میں
آگیا۔ دریافت کیا کہ اس پریشانی کا سبب کیا ہے، لوگوں نے مفصّل بیان
کیا۔ بادشاہ نے انھیں معاف کر کے اپنے مہربانی کے سایہ میں لے لیا۔"

لالہ چھنّامل دہلی کی کھتری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اس واقعے سے پہلے بھی دہلی میں منشی
بھوانی شنکر کھتری کا اسی قسم کا ایک اور سانحہ گذر چکا تھا۔ منشی صاحب مرہٹہ گردی میں بڑے
سربرآوردہ رئیس اور دولت مند تھے۔ پہلے ریاست گوالیار میں منشی تھے۔ جب مرہٹوں نے
دہلی پر تسلّط حاصل کر لیا۔ تو منشی جی کو ایک بڑی ذمہ داری کی خدمت پر دلی بھجوایا۔ لیکن منشی جی
انگریزوں سے مل گئے اور مرہٹوں نے انھیں اس سازش کے الزام میں موقوف کر دیا اور

انگریزوں نے منشی جی کو پنشن دی، چونکہ وہ انگریزوں سے مل گئے تھے۔ مرہٹے نمک حرام کہنے لگے اور ان کا مکان نمک حرام کی حویلی مشہور ہوگیا۔ منشی جی کو یہ بات ناگوار گذری۔ انھوں نے انگریزوں سے شکایت کی جو اس زمانے میں دہلی پر قابض تھے۔ چنانچہ انگریزوں کی طرف سے عام منادی کرائی گئی کہ کوئی منشی جی کو نمک حرام نہ کہے۔ نہ ان کے مکان کو نمک حرام کی حویلی کہے۔ لیکن اس منادی کا کوئی اثر نہیں ہوا[1] اور منشی جی نمک حرام اور ان کا مکان نمک حرام کی حویلی کے نام سے مشہور ہوگیا۔

جب دہلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء جاری تھی، تو ۲۴ر جولائی ۱۸۵۷ء کو لالہ چھنا مل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مخبری کی معلومات حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور نذرانے پیش کئے۔ یہ واقعہ بھی اسی روزنامچے میں درج ہے:

"گوپال سنگھ ولد دھوکل سنگھ، لچھمی چند گماشتہ، چھٹن لال، گنگا رام، اتوری پرشاد، دیبی سنگھ، جواہر لال، چھنا مل، ہیرا سنگھ امید سنگھ کے لڑکے، تیلی واڑہ کا کوتوال گنگا پرشاد اور منی لال ڈپٹی انگریزی ان سب نے لالہ بھولا ناتھ اور عمدۃ الحکما، احسن اللہ خاں کے ساتھ بارگاہ میں شرف باریابی حاصل کی۔ اور نذر پیش کی۔ اور ہر ایک نے اپنا اپنا مقصد بیان کیا"۔

لالہ چھنا مل صاحب کرتے کیا تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی روزانہ کی خبریں اور شاہی دربار کی خبریں پہاڑی پر انگریزوں کے پاس پہنچاتے تھے۔ اور جب تک دہلی فتح نہیں ہوئی انگریزوں کی خیر خواہی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا کر نہ رکھا تھا۔ مجاہدین بھی ان کو بخشتے نہیں تھے۔ چنانچہ کلکتہ کے راستے سے لاکھوں روپے کا سامان انھوں نے لوٹا اور مجاہدین بار بار انکی چاندنی چوک والی کوٹھی کو لوٹنے کے لئے چڑھائی کرتے تھے[2]

مجاہدین کے زور دینے پر مرزا خضر سلطان اور مرزا مغل نے ان سے جنگ کے دوران مالی مدد لینی چاہی۔ لیکن لالہ چھنا مل صاحب نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا بلکہ روزانہ وعدہ کرتے

[1] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوئم ص ۲۴۸ [2] روزنامچہ ۱۸۵۷ء غلام حسین ص ۴۹

رہے۔ کہ آج دیں گے، کل دیں گے۔[۱]

"ملک اور قوم کے ساتھ غداری کرنے پہان لوگوں کو ناز تھا۔ لالہ چھنامل صاحب کے خاندان کے حالاتِ زندگی انگریزی زبان میں ان کے ایک عزیز و رشتہ دار نے لکھے ہیں۔ مصنف صاحب نے ان خدمات کا جو ان کے بزرگوں نے انگریزوں کی کی تھی۔ اس پر فخر کا اظہار کیا ہے اور ایسی فخریہ الفاظ سے کتاب کی ابتدا کی۔ لکھتے ہیں:

"یہ تھا وہ قابلِ احترام۔ مگر خطرناک راستہ جو رائے چھنامل نے اختیار کیا تھا۔ اس بحرانی دور میں ان کی ہمت و استقلال اور اعتماد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، ان کی نظر ۱۸۵۷ء کے فتنہ و آشوب سے ہٹ کر اس مستقبل پر جمی رہی جہاں ترقی و امن و امان اور خوشحالی کے امکانات موجود تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں حکومت سے وفاداری کی جو شاندار مثال قائم کی تھی وہ ان کے اہلِ خاندان کے لئے ایک ثلث صدی تک روشنی اور خوش حالی کا باعث بنی رہی۔ رائے چھنامل صاحب نے جب دہلی کی آبادی میں انگریزوں کا وقار اور اعتبار کم ہو گیا تھا، اس کو بحال کرنے میں قابلِ تعریف کام کیا۔"

چھنامل صاحب کی انگریز دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے انتقامی جذبے کے ساتھ دہلی کو برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی ——— ، خوب لوٹ مار ہوئی، قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ پھانسیوں پر چڑھایا گیا، غرض دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجوادی۔ لیکن کٹرہ نیل جس میں لالہ چھنامل صاحب اور ان کے خاندان کے لالہ مہیسری داس کمسریٹ رہتے تھے وہ بچ گیا۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ صاحب نے اس تباہی و بربادی کا نقشہ اپنی تالیف "تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ ہند" میں کھینچا ہے:

"بہت دنوں تک انگریزی سپاہ دن بھر شہر میں پھرتی اور آباد گھروں میں سب عورت مرد بچوں کو پکڑتی۔ یہ گرفتاری بھی بڑی دردانگیز تھی، عورتیں بچوں کو

۱۔ غدر کا نتیجہ ص ۵۰

گود میں لیتیں۔ مرد اوڑھنے بچھونے کا پشتارہ سر پر رکھتے، حوالات میں (کرنیل برن) پاس آتے۔ تلاشی میں ان کے پاس سے جو اسباب بیش قیمت نکلتا وہ چھین لیا جاتا اور جو اسباب ایسا ہوتا کہ وہ کسی قیمت پر بک نہیں سکتا تھا ہر پلادنے کے لئے دیدیا جاتا۔ کوئی برتن بھانڈا نہیں لے جاسکتے تھے۔ پھر وہ پہرہ کی حوالات میں شہر سے لاہوری دروازے سے باہر چھوڑ دئیے جاتے۔ کہ جہاں ان کے سینگ سمائیں وہاں چلے جائیں، بہت ہی کم خوش نصیب عورت مرد ایسے تھے جو روپیہ پیسہ اوڑھنا بچھونا لیکر شہر سے باہر نکلے ہوں، اس طرح سارا شہر خالی ہوگیا مگر اس میں ایک محلہ نیل کا کٹرہ لالہ مہیسری داس کمسریٹ کے گماشتہ کی خیرخواہی کے سبب آباد تھا۔ یہ غدر اس محلّے کے لئے مُبارک ہوا" (ص ۲۰۳)۔

دہلی کے لوگوں کو محکوم بنانے کے بعد انگریزوں نے اپنے ہمنواؤں کو نوازنا شروع کیا۔ لالہ چھنّامل جو لالہ متصدی لال کے بڑے لڑکے تھے ان کو سونے کے تمغے اور رائے بہادر کا خطاب ملا۔ جیسے ہی دہلی میں میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا، ۱۸۶۲ میں ان کو پہلا میونسپل کمشنر بنایا، ۱۸۶۴ء میں آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے۔ انھوں نے دہلی میونسپل کمیٹی کو ایک بہت بڑی رقم معمولی سے سُود پر بطور قرض دی۔ اور غریبوں کی مدد کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم سے خیراتی فنڈ قائم کیا، جس کی سُودی رقم سے ۱۹۳۰ء تک غریبوں کو کھانا کھلایا گیا اور روزانہ سوابرت بٹتا تھا۔ ایک کنواں گڑگانوا روڈ پر تعمیر کرایا تھا۔

سرائے چھنّامل بھی دہلی میں اسٹیشن سے قریب تھی جس کا ذکر مولانا عبدالحئی صاحب نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے، یہ سفر دہلی کا انھوں نے ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں کیا تھا اور وہ خود بھی اور ان کے پھوپھی زاد بھائی مولوی خلیل الرحمٰن صاحب رائے پوری بھی اسی سرائے میں ٹھہرے تھے۔ چنانچہ وہ اس سرائے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اسٹیشن سے بخط مستقیم چھنّامل کی سرائے آیا۔ یہ سرائے بہت قریب ہے بلکہ اسٹیشن ہی شہر سے متّصل ہے۔ سرائے میں بھائی جی (مولوی خلیل الرحمٰن صاحب) بیٹھے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی، اب میں یہاں ٹھہرا ہوں۔ سرائے کے دروازے

نہر بہتی ہے جس کا عرض تقریباً ۱۲ ہاتھ ہوگا۔ اس کے اوپر سرائے سے تھوڑے فاصلہ پر مسجد ہے۔ یہ مسجد غازی الدین خاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ نہر کو پُل کے طور پر پاٹ کر مسجد بنائی ہے ظہر کی نماز میں نے اس میں پڑھی۔ نماز پڑھ کر میں اور بھائی جی خراماں خراماں کمپنی باغ دیکھنے گئے۔ یہ باغ اسٹیشن کے محاذی اور سرائے کے بہت ہی قریب ہے، باغ بڑا ہے لیکن معمولی ہے۔" (۲۰)

قحط کے موقع پر ایک گراں قدر رقم قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے دی۔ اس کے علاوہ جوگ مایا مندر کے قریب عوام کے استعمال کے لئے ایک بڑی عمارت تعمیر کرائی۔ رائے چھنا مل صاحب سنسکرت اسکول دہلی کے بانیوں میں سے تھے، اس کی تعمیر کے وقت بھی گرانقدر رقم دی۔ اور اس کے بعد بھی برابر اس کی مدد کرتے رہے —— ان کا انتقال جنوری ۱۸۷۰ء کو دہلی میں ہوا۔

رائے بہادر چھنا مل کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لئے ان کی جگہ پر لالہ امراؤ سنگھ آئے جو ان کے بھتیجے تھے اور خاندان میں سب سے بڑے تھے۔ لالہ امراؤ سنگھ کو ۱۸۶۹ء میں میونسپل کمشنر اور دو برس کے بعد آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا، انھوں نے کیپٹن سی، ایچ ایوارڈ کو اس مقصد کے لئے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ رقم دی کہ وہ دہلی پولیس اسٹیشن میں ٹیلیفون کا سلسلہ قائم کرے۔ اسی سال وِلیسرائے ہند دہلی آئے، ان کی آمد کے سلسلے میں دہلی میں جو انتظامات کئے گئے تھے، اس میں لالہ امراؤ سنگھ نے نمایاں طور پر حصہ لیا، جس کے لئے گورنر پنجاب نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ لالہ امراؤ سنگھ کی پبلک خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں رائے بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ۱۸۷۷ء کے امپیریل دربار میں انھیں سونے کا تمغہ عطا کیا گیا۔

وہ ترقی پسند خیالات کے حامی تھے، انھوں نے اپنے شہری مکان میں ٹیلیفون کی مشین لگائی تھی۔ وہ میکینیکل انجینئرنگ سے خاص طور پر دل چسپی لیتے تھے۔ انھوں نے بہت معمولی پُرزوں سے ایک چھوٹا ریلوے انجن بنایا تھا۔ یہ انجن رائے بہادر کی مہارت کی یادگار کے طور پر ان کے خاندان والوں کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔

گلی باغ دیوار کٹرہ نیل کے اندر ایک عالی شان، خوب صورت اور مستحکم دھرم شالہ لالہ امراؤ سنگھ نے بنوائی تھی —— اکثر باہر کے لوگ یہاں آکر ٹھہرتے اور آرام

پاتے ہیں۔[1]

غربا کے لئے سدا برت جاری ہے —— یہ دھرم شالہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ رقم میں تیار ہوئی تھی۔ آخر ۱۸۷۸ء میں ان کی صحت خراب ہونی شروع ہوئی اور یکم جنوری ۱۸۷۹ء کو انتقال ہوا۔

ان کے انتقال کے بعد لالہ رام کشن داس جو رائے بہادر اُمراؤ سنگھ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے، خاندان کے سرپرست بنائے گئے۔ پبلک کی بھلائی کے کاموں اور گورنمنٹ کی وفاداری میں انھوں نے کلّی طور پر اپنے بڑے بھائی اور بزرگوں کی تقلید کی۔[2] وہ ۱۷ جون ۱۸۷۹ء کو میونسپل کمشنر بنائے گئے۔ انھوں نے عید و محرم اور دسہرے کے موقع پر جس میں فرقہ وارانہ فسادات کا خطرہ رہتا تھا سرکاری افسران کو جو تعاون پیش کیا۔ اور انتظام میں مدد دی اس کا حکام نے اعتراف کیا اور تعریف کی۔ ۱۸۸۶ء میں لیڈی ڈفرن کے فنڈ میں پانچ ہزار روپے کا چندہ دیا، جس کا مقصد ڈفرن ہسپتال کی تعمیر تھا۔ انھوں نے تعلیمی معاملات میں گہری دلچسپی لی۔ اینگلو سنسکرت ورنیکولر جونیئر ہائی اسکول دہلی کو مالی طور پر مدد کی جو ۱۹۳۰ء تک جاری تھی۔ ان کو زندگی بھر کے لئے اس اسکول کا صدر بنایا گیا تھا۔

رائے بہادر لالہ رام کشن داس مِل انڈسٹری سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کا مطالعہ کرنے کے لئے بمبئی گئے، احمد آباد اور ناگپور میں قیام کیا۔ جس کے بعد وہ دہلی کلاتھ اینڈ جنرل مِل کے بانی منیجنگ ڈائرکٹر اور سب سے بڑے حصّے دار بنے، انھوں نے اس کے انتظام کو بہت اعلیٰ سطح پر چلایا، جس سے کمپنی نے بے پناہ ترقّی کی۔ انھوں نے کھرکھودہ ضلع روہتک میں گاؤں والوں کے فائدے کے لئے ایک پکّا کنواں بنوایا، اور اسی کے ساتھ پیاؤ تعمیر کرائی۔ ایسے کنویں اور پیاؤ انھوں نے بعض دوسرے گاؤں میں بھی تعمیر کرائی۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے وکٹوریہ ہسپتال کی تعمیر کے لئے دس ہزار روپے کا چندہ دیا۔ یہ ہسپتال ملکہ وکٹوریہ کی یادگار میں تعمیر کیا جا رہا تھا۔[3]

فوّارہ چاندنی چوک کے مشرق میں رائے بہادر لالہ رام کشن داس نے بڑی رقم سے

[1] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص ۲۴۹

[2] بریف ہسٹری آف دی فیملی آف رائے صاحب چھنامل [3] ایضاً

رامانھیٹر بنوایا تھا، جس میں عمدہ عمدہ رنگ برنگ کی آمیزی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور برقی روشنی اور پنکھے غرض ہر قسم کا سامان تھا۔ اکثر تھیٹریکل کمپنیاں اس کو کرایہ پہ لے کر اس میں تماشا کرتی تھیں۔ تماشوں کے لئے یہ مکان بہت موزوں تھا۔[1] رائے صاحب ۶ مارچ ۱۹۰۲ء کو انتقال فرما گئے۔

رائے بہادر رام کشن داس نے اپنی خرابی صحت کی بنا پر ۱۹۰۱ء میں آنریری مجسٹریٹ شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کی جگہ پر خاندان کے سب سے بڑے لالہ شیو پرشاد کو جو اُن کے بھتیجے تھے اور لالہ امراؤ سنگھ کے بیٹے تھے یہ اعزاز دیا گیا۔ ۲۶ر اگست ۱۹۰۱ء کو آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے اور ۳ جولائی ۱۹۰۲ء کو انھیں صوبائی سطح پر دربار میں شرکت کی سند عطا کی۔ ۱۹۰۳ء کے تاجپوشی کے دربار میں ان کو مدعو کیا گیا۔ اور مڈل عطا کیا گیا۔ پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم کے لئے انھوں نے بہت بیش قیمت سنسکرت کی کتابیں عطا کیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ایک مکمل سیٹ بھی دیا۔ وکٹوریہ زنانہ ہسپتال میں نئے وارڈوں کے اضافے کے لئے ایک بڑی رقم دی، اس کے علاوہ ایکسرے کے آلات کا ایک مکمل سیٹ اس ہسپتال کو دیا۔ انھوں نے پبلک کے استعمال کے لئے کافی روپیہ خرچ کر کے ایک تالاب اور بارہ دری مہرولی میں بنوائی۔ وہ دہلی کے یتیم خانہ کو بھی چندہ دیتے تھے۔ جس کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں انھوں نے شملہ میں اپنا عظیم الشان محل سرکار کو اس مقصد کے لئے دیدیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے اپنی ضرورت کے لئے استعمال کرے۔ انھوں نے اندرپرستھا گرلز اسکول کے قیام کے لئے بھی رقم دی اور اس کے ماہانہ اخراجات کے سلسلے میں بھی چندہ دیتے تھے۔ انھوں نے محتاجوں اور اپاہجوں کے لئے پنجرہ پول کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا۔ اس کو وہ پانچ سو روپے سال کی امداد بھی دیتے تھے۔ یکم جنوری ۱۹۰۷ء کو لالہ شیو پرشاد کو رائے بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں سی، آئی، ای کے خطاب کا اضافہ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں او، بی، ای کا خطاب عطا کیا گیا۔ کٹرا نیل کا بڑا شوالا رائے بہادر لالہ شیو پرشاد کے دادا کا بنایا ہوا ہے، جو ڈیڑھ سو برس کا تعمیر کردہ ہے۔ لالہ شیو پرشاد کے مکان کے سامنے ایک مسجد ہے، اس کے نیچے دکانیں ہیں۔ مسجد تو وقف ہے مگر دکانوں کا کرایہ

[1] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دویم ص ۲۲۱

رائے صاحب کی ملکیت تھی، وہی اس کا کرایہ لیتے تھے[1] ۱۹ جولائی ۱۹۲۱ء میں ایک لمبی بیماری کے بعد فوت ہوئے۔

لالہ شیو پرشاد صاحب کے سب سے بڑے لڑکے لالہ جگن ناتھ داس ان کی زندگی میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دئے گئے تھے، رائے صاحب شیو پرشاد کی وفات کے بعد لالہ جگن ناتھ کو بھی رائے بہادر کا خطاب دیا گیا۔ یہ بہت ہی جوان العمری میں ۱۹۲۵ء کو سرگ باش ہوئے۔ لالہ رادھے شام جو رائے بہادر شیو پرشاد کے دوسرے بیٹے تھے وہ بھی تھوڑی عمر میں ۲۹ نومبر ۱۹۰۹ء کو ان کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے۔ لالہ شیو پرشاد کے باقی رہنے والے تینوں لڑکوں میں لالہ لاڈلی پرشاد اور لالہ رام پرشاد تھے۔ لالہ لاڈلی پرشاد کئی بار انگلینڈ اور دوسرے ملکوں میں گئے۔

لالہ شیو پرشاد کی وفات کے بعد لالہ بال کشن داس جو لالہ رام کشن داس کے سب سے بڑے بیٹے تھے خاندان کے سرپرست بنائے گئے، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے والد زندگی میں ہی ۱۸۹۶ء کو پرسکون زندگی گذارنے کے لئے اپنے خوب صورت محل میں جو اُن کے لئے خریدا گیا تھا جا رہے تھے۔ کبھی کبھی شملے بھی چلے جاتے تھے۔ ان کی پوری زندگی تنہائی میں گذری۔ یہاں تک کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۹ء کو دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔

لالہ بال کشن داس صاحب کے انتقال کے بعد ان کے جانشین لالہ رادھا موہن ہوئے، جب تک لالہ جگن ناتھ زندہ رہے ان کی زندگی میں بھی یہ نوجوان ہونے کی وجہ سے گھریلو معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اور یہ ہی زیادہ تر حکام سے ملتے جلتے بھی تھے۔ اور سرکاری اعزازات کے حصول کے موقع پر موجود رہتے تھے۔ ان کو یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو رائے بہادر کا خطاب دیا گیا۔ انھوں نے اندر پرستھ گرلز اسکول میں، بچیوں کو وظیفہ دینے کے لئے جو فنڈ قائم کیا جا رہا تھا، اس میں ایک ہزار بطور چندہ دیا۔ اسی کے ساتھ ماہانہ وظیفہ بھی اپنی طرف سے مقرر کیا۔ لالہ رادھے موہن نے سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اور پبلک بھلائی کے لئے بہت سے کام کئے۔ انھوں نے جوگ مایا جی کے مندر کو خوب صورت بنانے کے لئے جو مہرولی کا ایک تاریخی مندر ہے، ایک بڑی رقم دی۔

[1] آثار دہلی ص ۶۱

وہ ایک ترقی پسند آدمی تھے اور مذہبی کاموں کے علاوہ طرح طرح کے قومی کاموں اور معاشرتی دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے۔ نیشنل ہارس بریڈنگ اینڈ شو سوسائٹی کے ایک سرگرم ممبر تھے۔ انھوں نے اس سوسائٹی کے لئے ایک انعام اپنی طرف سے مقرر کیا تھا، جو بہترین گھوڑے سواروں کو دیا جاتا تھا۔ وہ بہت اچھے کھلاڑی تھے، پولو گیم کی سوسائٹی کو انھوں نے ایک کپ دیا تھا جو انھی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے تمام ہندوستان کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ یہ قدم دہلی میں کھیلوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اُٹھایا گیا تھا۔ ۱۹۲۵ء کو انھیں صوبائی سطح پر دربار میں حصہ لینے کا اعزاز دیا گیا تھا۔ انھوں نے ہی "بریف ہسٹری آف دی فیملی آف رائے بہادر چھنامل" انگریزی زبان میں تالیف کی تھی ـــــــ

لالہ رادھے موہن کے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جس کا نام من موہن ہے، جو اپنے والد کی طرح کھیلوں میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں اور ریس کے بہت شوقین ہیں۔ انھوں نے اپنے چچا لالہ لاڈلی پرشاد کے ساتھ کئی بار یورپ اور امریکہ کا سفر کیا تھا[۱]

---

[۱] بریف ہسٹری آف دی فیملی آف رائے صاحب چھنامل سے اس مضمون میں زیادہ مدد لی گئی۔

مولانا محمد حسینؒ فقیر دہلوی

مولانا فقیر علماء متاخرین میں بے مثل عالم تھے، اپنے وقت کے شاہ ولی اللہ تھے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت جمال المصری الیمنی سے ملتا ہے۔ آپ کے خاندان کے بزرگ محمد حمید صاحب سرہند شریف آئے اور سرہند سے آپ کے جدّ امجد بنت ضلع مظفرنگر میں منتقل ہوئے۔ حضرت فقیر کے والد ماجد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی میں آئے، آپ کے دادا مولوی منشی میر بخش صوفی قادری باغپت ضلع میرٹھ کے تحصیلدار تھے، ان کے والد ماجد مولوی منشی محمد اسمٰعیل صاحب تھے جو ریاست پٹودی میں میر منشی تھے۔ جو قوم وملت کی فلاح اور اصلاحی کاموں میں اور اخلاق درست کرانے میں مصروف رہتے تھے۔

مولانا فقیر ۱۲۴۲ھ کو بنت ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے، آپ نے مولوی مملوک علی، مولوی محبوب علی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے علوم دینی حاصل کئے۔ اور مولانا غافر مدنی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔[1]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد عین عالم جوانی میں جبکہ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ غالبؔ و مومنؔ اپنی علیحدہ شان دکھا رہے تھے۔ ذوقؔ اکثر قلعۂ معلّیٰ کے مشاعروں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔ فتح الملک مرزا داغؔ دہلوی، حافظ غلام رسول ویرانؔ دہلوی اور مولانا محمد حسین ذوقؔ کے تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس وقت مولانا فقیر کا تخلص جانبازؔ تھا جس کا اظہار خود مولانا فقیرؔ نے اپنے اشعار میں کیا ہے[2]

تو بھی تھا ذوقؔ کا شاگرد یہ میں جانتا ہوں	تھا بہت ذوقِ سخن اور سخن کی لذت
عاشقانہ ترے اشعار ہوا کرتے تھے	اور تخلص ترا جانبازؔ رہا ایک مدت

[1] تاج التواریخ [2] دیوان فقیر ص ۳۱۴

اس زمانے کے عاشقانہ کلام میں ایک واسوخت بھی تھا، جس کا ذکر مولانا راسخ فرمایا کرتے تھے، وہ واسوخت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کی وجہ سے آپ نے نذر آتش فرما دیا تھا چنانچہ اپنے اشعار میں انھوں نے عشقیہ کلام سے تائب ہونے پر روشنی ڈالی ہے[۱]؛

ایک دن میں نے کہا دل سے کہ تائب ہو کر
شکر ہے اب نہ رہی شعر و سخن کی عادت

میں نے مانا تجھے توبہ کی توفیق ہوئی
اور یہ راس آئی بہت کچھ علماء کی قربت

تجھ کو ہر شعر قبیحہ سے مبارک توبہ
پر جو ہو شعر حسن اس سے نہ ہو بے رغبت

سن حدیث نبوی مجھ سے کہ ہے شعر کلام
ہے قبیح اس کا قبیح اور حسن ہے حکمت

آج تو گلشن اوصاف ہیں اہل حق کے
دست گل چیں قلم اپنی کو بنا بے منت

رندانہ زندگی چھوڑنے کے بعد آپ نے رشد و ہدایت کا سلسلہ اور وعظ کی شکل میں تبلیغ اسلام شروع کر دی تھی، اس وقت آپ کو عشقیہ شاعری سے یہاں تک نفرت ہو گئی تھی کہ ایسے شاعروں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے[۲]۔

"تیغ فقیر بر گردن شریر" مولانا کی ایک معرکۃ الآرا منظوم تصنیف ہے، جس پر آپ کے خلاف دعویٰ ہوا، اور وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہوا۔ اس کے بعد آپ مولانا گنگوہی کی کملی میں جا کے چھپے تو کسی کو تلاش و جستجو میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اس کتاب کے چھپوانے والے حمید الدین کے خلاف مقدمہ چلا جس کی خبر ۱۵ جنوری ۱۹۰۲ء کے کرزن گزٹ دہلی میں شائع ہوئی:

"حمید الدین ولد مولا بخش اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے کہ اس نے ایک منظوم کتاب تیغ فقیر بر گردن شریر، مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب فقیر کی کسی مطبع میں چھپوا کر شائع کی۔ یہ شخص چتلی قبر کے قریب رہتا ہے۔ پولیس نے تلاشی میں دو سو نسخے اس کتاب کے اس کے گھر سے برآمد کیے۔ سرکاری ایڈوکیٹ نے دفعہ ۱۵۳ الف کا الزام اس پر لگایا ہے جس میں ضمانت نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ یہ کتاب لالہ اندرمن کی کتاب "اصول دین احمد اسلام" کے جواب میں لکھی گئی

[۱] کمال راسخ ص ۱

تھی۔ اس کتاب کو لکھے ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں۔ قانون تعزیرات ہند کی ترمیم سے پہلے یہ کتاب تصنیف ہوئی۔ تعجب ہے کہ اس پر مقدمہ دائر کیا گیا۔

فروری ۱۹۰۲ء میں حمید الدین صاحب کو ڈپٹی کمشنر دہلی کی عدالت سے چار مہینے کی سزا اور تین سو روپے جرمانہ ہوا۔ صفائی کے گواہوں میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلوی پیش ہوئے۔ اپیل میں اپریل ۱۹۰۲ء کو فیصلہ ہوا، جتنی سزا بھگتنی ہے وہ کافی ہے اور تین سو روپے جرمانہ بحال رہا۔"

اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ مولانا فقیر کے ہم مکتب منشی جمال الدین صاحب ریاست بھوپال کے مدار المہام تھے۔ جب روم اور روس کی لڑائی ہو رہی تھی اور تمام دنیائے اسلام کے ممالک سلطان روم کی خدمت میں چندہ روانہ کر رہے تھے اس وقت والئی بھوپال شاہ جہاں بیگم دو لاکھ روپے چندہ کا فوجیوں کو بھیجنا چاہتی تھیں، اس کے لئے ایک معتبر امانت دار آدمی کی ضرورت تھی۔ منشی جمال الدین نے مولانا فقیر کا نام تجویز کیا۔ منظوری کے بعد آپ کو دعوت دی گئی کہ آپ یہ رقم سلطان کو پہنچا دیں۔ آپ اس خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔ روانگی ہوئی۔ جب سلطان کی خدمت میں پہنچے، وہ رقم ان کو پیش کی جس سے وہ بہت مسرور ہوئے اور انھوں نے تین تمغے درجہ اوّل شاہ جہاں بیگم دوئم نواب صدیق حسن خاں اور تیسرا تمغہ مدار المہام منشی جمال الدین صاحب کے لئے مرحمت کیا۔ ان تمغوں کو لے کر مولانا بھوپال پہنچے تو ایک عظیم الشان دربار منعقد ہوا۔ اور مولانا فقیر کو نواب شاہ جہاں بیگم نے خلعت فاخرہ اور جواہر عنایت فرمائے۔

مولانا فقیر کی طبیعت فقیرانہ تھی۔ امیری سے طبیعت کو ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں تھا چنانچہ اس نوابی ماحول میں مولانا کی طبیعت نہیں لگی۔ یہ ماحول ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ آپ نے بھوپال سے جلدی چھٹکارا پایا۔

بھوپال سے آنے کے بعد آپ نے مدرسہ حسین بخش میں وعظ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پندرہ سال تک اس مدرسے میں وعظ فرماتے رہے۔ ایک روز حسین بخش کے نواسے محمد شفیع نے آپ کی وعظ میں مخالفت کی تو آپ اس وقت ممبر سے اتر آئے اور اسی وقت پاپوش فروشوں کے حاجی کریم بخش صاحب

نے آپ سے کہا، آپ وعظ فرمائیں دیکھیں کیسے بند کرتے ہیں، لیکن مولانا فقیر آمادہ نہیں ہوئے چنانچہ حاجی کریم بخش عرف حاجی نتھو ٹھیکیدار اور حاجی نور محمد عرف ننواں تیلی آپ کو ترکمان گیٹ کی مسجد میں لے گئے جہاں ڈھائی سال تک آپ نے اس مسجد میں وعظ کیا۔

اس کے بعد شیخ برکت اور حاجی فضل نان بائی (دونوں بھائی تھے) نے بازار ٹیا محل، محلہ گڑھیا اور کٹرہ گوکل شاہ کے درمیان جو کھنڈر تھے وہ مولانا فقیر کو مسجد کی تعمیر کے لئے دیئے، چناں چہ ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ قائم ہوا، اور ۱۳۲۲ھ میں مسجد تعمیر ہوئی۔ حجرے کے درمیانی صحن میں بیضوی حوض بنوایا۔ مدرسے کا نام حبیبیہ رکھا۔

مولانا فقیر نے اس مدرسے کی تعمیر کے بعد چھ سال تک وعظ فرمایا۔ اور ۸۱ سال کی عمر میں، ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ مولانا فقیر کی کافی کتابیں ہیں لیکن زیادہ شہرت دو کتابوں "تیغ فقیر بر گردن شریر" اور "نعتیہ دیوان" نے پائی۔ مولانا فقیر قادر الکلام شاعر تھے۔ زبان میں تاثیر، درد اور روانی ہے ؎

ایک ہم بھی بے نصیب ہیں اور ایک وہ بھی ہیں
جن کے لئے وطن ہے مدینہ رسولؐ کا

جب تو کہا تھا اگر جاؤں تو مر جاؤں وہیں
پھر فقیر اب تو مدینہ سے جدا کیوں کر ہوا

کیوں کے دل سیر ہو حضرتؐ کی زیارت سے فقیر
عمر بھر دیکھا تو گویا انھیں دم بھر دیکھا

بے مدینہ ہو کس طرح دل خوش
پر خوشی میں ہے یہاں غمی کا مزا

مثلِ جنت سکونِ دل ہے وہاں
کیا کہوں مسکنِ نبیؐ کا مزا

لے جائیں مرا کاش فرشتے وہاں سلام
جائیں اگر بخلوتِ پیغمبرِ خدا

ہم نمازِ حرم میں مر نہ گئے
ہم سے سجدہ ہی کچھ ادا نہ ہوا

محشر میں نہ رکھنا یا رب!
محروم وصال محمدؐ

روضۂ انور میں ہو یہ اے صبا عرض فقیر
اب اس بے دست و پا کو پھر بھی بلوائیں گے کیا

اغنیائے مُردہ دل گویا ہوئے مدفونِ ہند
سوئے مکہ اٹھ کے مُردے بھی چلے جائیں گے کیا

جب سے حسن احسن الکونین کا مداح ہوں
اے فقیر اپنا سخن شایانِ تحسین ہو گیا

مولانا محمد حسین فقیر دہلوی نے دو شادیاں کی تھیں پہلی بیوی سے مولانا حبیب الرحمان اور مولانا راسخ دہلوی تھے۔ مولانا حبیب الرحمان صاحب ۱۸۵۵ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے علوم دینی حاصل کئے۔ آپ مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت بھی تھے۔ ایک عرصے تک مدرسہ حسینیہ کٹرہ گوکل شاہ میں درس دیتے رہے، آخر عمر میں مسجد جفت فروشاں محلہ چوڑی والان میں بعد نماز فجر وعظ کہنا شروع کیا۔ گلی بدلیاں محلہ چوڑی والان میں مقیم تھے۔ ہر دو شنبہ کو اپنے مکان میں بھی وعظ فرمایا کرتے تھے۔

مولانا ایک باوضع، ملنسار، سنجیدہ اور انتہائی متین بزرگ تھے۔ اختلافی مسائل بہت کم بیان کرتے تھے، اور نزاعی مسائل پر کبھی بولتے تھے تو کسی کی ذات پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ دلائل و براہان سے سمجھاتے تھے۔ رمضان شریف کے آخری عشرے میں وعظ سے فارغ ہونے کے بعد فالج کا حملہ ہوا۔ مختلف اطبا کے زیر علاج رہے۔ درمیان میں تخفیف کے آثار ظاہر ہونے لگے، لیکن ۴ مارچ ۱۹۳۰ء کی درمیانی شب میں ۷۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔[۱] ان کے دو صاحبزادے خلیل الرحمٰن اور جمیل الرحمان پیدا ہوئے۔ آپ کو شاعری سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا کبھی کبھار شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے "تیغ فقیر بر گردن شریر" مصنفہ مولانا محمد حسین فقیر دہلوی پر تقریظ لکھی ہے۔ اور دیوان فقیر در مدح بشیر و نذیر کے دو تاریخی قطعے کہے۔ ایک تقریظ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں[۲]

جب کھینچی میان سے یہ تیغ فقیر — کھنچ گئی دشمنوں کے دل پہ لکیر

اس کی تاریخ حبیب الرحمان — یہی موزوں ہوئی وقت تحریر

کہ یہ کہتے ہوئے دشمن بھاگے

آ گیا کھینچ کے شمشیر فقیر

مولانا عبدالرحمان راسخ ۱۸۶۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت پا کر بڑے ہوئے، آپ بلا کے ذہین و ذکی اور فہیم تھے، ۹ سال کی عمر میں کلام مجید حفظ کر کے محراب سنائی۔ تعلیم کی طرف توجہ دینی شروع کی تھی کہ شاعری کے شوق نے آگھیرا۔ ایک دن اپنے والد کے پاس غزل کی اصلاح

[۱] اخبار الجمعیۃ دہلی ۱۳ مارچ ۱۹۳۰ء [۲] تیغ فقیر بر گردن شریر ص ۳۴۶

لینے کے لئے گئے، انھوں نے اصلاح دینے سے انکار کیا اور شعر گوئی سے منع فرمایا۔ اس دن سے انھوں نے ان کو ہی نہیں بلکہ کسی اور شاعر کو بھی کلام نہیں دکھایا۔ اور ہندوستان بھر میں کوئی استاد پسند نہیں آیا۔
مولانا راسخ دینی مکتب سے عشق و محبت کے مکتب میں کس طرح پہنچے وہ ان کی زبانی سنئے:

"زمانۂ طالب علمی میں جہاں معمولی کتابوں پر سبق ہوتے تھے وہاں بعض رسائل تصوّف کے بھی ایک دو ورق ہوتے تھے، گو وہ زمانہ نافہمی کا تھا، تاہم صوفیائے کرام کی باتوں میں بہت دل لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ عمر بڑھی، شوق بڑھا۔ کم بختی کے دن آگئے یعنی سر پر شاعری کا جنون آچڑھا۔ ہنوز تعلیم ہی کا سلسلہ ناتمام تھا کہ شعر گوئی کا شوق مدرسۂ عقل و نقل سے اٹھا کر مکتب عشق میں لے گیا۔ پیر مغاں سے دوستی ہوئی، اللہ کی رحمت ہوئی، دست سبو دعا کے لئے اٹھا۔ ساقی عنبریں سے زلفوں کا سلسلہ سند ملا، ابرو نے تلوار کے گھاٹ اتارا، اور کبھی کافر کی ترچھی نگاہ اور بانکی چتون نے ایک سیدھے سادے مسلمان کا کام تمام کر دیا۔ خاکسار کو شوق کیوں نہ ہوتا۔"[۱]

کچھ عرصے اسی رنگ میں رہے۔ مولانا راسخ کے والد نے دعا کی جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کو تعلیم کی تکمیل کی فکر ہوئی، مدرسہ حسین بخش دہلی میں داخلہ لیا۔ مولانا حافظ محمد عبدالغنی صاحب قاسمی کی خدمت میں پہنچے، ان ہی سے دستارِ فضیلت حاصل کی، اور واعظ بے بدل بننے کے بعد بھی نظم و نثر کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔[۲]

رسالہ زبان نکالنے کے بعد طبیعت کی بلند پروازی نے رنگ دکھایا۔ ایک ظریف اخبار بے مثل پنچ جاری کیا، جس میں آپ کو ظریف و شوخ نظموں کی اشاعت کے لئے میدان مل گیا۔ لیاقت و فراست کے جوہر دکھلائے، مشہور و معروف ظریف ایڈیٹروں سے مقابلے اور معرکے رہے۔ شاعروں سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی جس کی وجہ سے اہلِ علم اور اہلِ قلم طبقے میں شہرت حاصل کی۔ بے مثال پنچ ناقدری کا شکار ہوا تو اخبار خیر خواہ عالم چلا پڑا۔ ہفتہ وار اخباروں کی ایڈیٹری کی۔ ان سے قلیل آمدنی ہوتی تھی، اخراجات نے مجبور کیا تو "افضل الاخبار" اور "دہلی پنچ" کی ایڈیٹری سنبھالی۔

[۱] کمال راسخ
[۲] یادگار دہلی ص ۱۲۴

آپ کی ظریف نظمیں اور نثر کے مضامین دیکھ کر اہل الرائے یہ کہا کرتے تھے کہ منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" لکھنؤ جس مضمون کو ایک صفحے میں لکھتے ہیں، مولانا راسخ اس کا مفہوم پانچ سطروں میں تحریر کر دیتے ہیں۔

مولانا راسخ اوائل عمر سے مشق سخن میں مرزا ارشد گورگانوی، مولانا سیف الحق ادیب دہلوی اور پنڈت جواہر ناتھ ساقی وغیرہ کے ہم مشق اور ہم صحبت رہے اور اپنی میانہ روی، خوش مزاجی اور صلح کل پالیسی سے علمی صحبتوں میں امتیازی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دہلی کے شاعروں کی جان تھے۔ داغ مرحوم ان کی قادر الکلامی کے معترف تھے۔ اکثر اشعار پر ان کو داد دی اور متعدد موقعوں پر دہلی کے نوآموز شعرا کو ہدایت کی کہ راسخ کو اپنی غزلیں دکھاؤ۔ ان کے ساٹھ ستر کے قریب شاگرد تھے۔

مولانا راسخ کو فقہ معقول، منقول اور کتب حدیث پر پورا عبور تھا۔ آپ گلی قاسم جان بلی ماران اور مچھلی والان کی مسجدوں میں روزانہ قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا وعظ نہایت مؤثر اور دل کش ہوتا تھا۔ سننے والے ضبط نہیں کر سکتے تھے، بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے اور زار و قطار رونے لگتے تھے۔ خاص طور پر لوگوں کو جمعے کے وعظ کا انتظار رہتا تھا۔ آپ واقعہ اور موقع کی مناسبت سے اشعار کہا کرتے تھے جو اکثر آپ ہی کے ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے شعبان کی پندرھویں شب کا ذکر کیا جس میں جاگنے والے قبرستان جایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک واقعہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کیا۔ حضور اقدسؐ رات کو قبرستان روانہ ہوئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی اس خیال سے کہ آپ کسی دوسری بیوی کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں پیچھے پیچھے ہو لیں۔ آپ قبرستان میں ایک قبر پر کھڑے ہو کر ایصال ثواب فرمانے لگے۔

اس موقعے پر مولانا راسخ نے یہ اشعار پڑھے ؎

تم چلے آؤ کسی دن گیسوئیں کھولے ہوئے ـــ کاش تربت پر کسی دن سائبان ابر ہو
آرزو یہ ہے کہ بچھ جائے نہ میں ہم دفن ہوں ـــ فاتحہ جس پر پڑھو وہ ہماری قبر ہو

راسخ صاحب کے وعظ میں بڑی خلقت ہوتی تھی اور دہلی کے مشہور علما، فضلا اس میں شامل ہوتے تھے۔ چنانچہ جب آپ قرآن مجید ختم فرماتے تو اس مبارک مجلس میں حضرت شاہ ابوالخیر، مولانا کرامت اللہ صاحب اور مولانا شرف الحق صاحب وغیرہ رونق افروز ہوتے تھے۔

آپ جس بات کا ذکر فرماتے تھے اس کا سماں اور نقشہ ایسا کھینچ دیتے تھے کہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا، ایک مرتبہ وعظ میں جزا و سزا کا ذکر آیا، آپ نے میدانِ حشر کا نقشہ کھینچا۔ سامعین دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ایک شخص کی چیخ نکلی اور وہ اسی وقت جاں بحق ہو گیا۔

مولانا راسخ کو تصنع اور کر و فر سے نفرت تھی وہ سادہ زندگی پسند کرتے تھے اور معمولی لباس میں رہتے تھے۔ دیکھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہی مولانا راسخ ہیں جو علوم و فنون کے ایک قلزم ذخار ہیں۔ آپ کے والد ماجد مولانا فقیر کا انتقال ۱۳۲۴ھ کو ہوا جس کا اُن کو بیحد صدمہ ہوا، غش کھا کر گر پڑے۔ صدمے نے آپ کو گھلا دیا تھا کھانسی کا مرض لگا۔ مشہور و نامور ڈاکٹروں اور حکیموں نے علاج کیا کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اور ۱۰ شعبان ۱۳۲۵ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء کو ۴۴ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ مہندیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے ـــــ نمونہ کلام ؎

کلیم اللہ سے کہہ دو کہوں گا طور پر جا کر
الٰہی تجھ سے تجھ کو مانگنے آیا ہوں سائل ہوں

مجھ سے گناہ گار کو دوزخ میں ڈال کر
دوزخ کو ڈال رکھا ہے عذاب میں

راسخ کی فاقہ مستی ہے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

راسخ اُمیدِ عفو یہ کہتی ہے بار بار
دھوئے گئے، گناہ ہمارے شراب میں

شیخ محراب عبادت سمجھا
اُف رے عالم تری انگڑائی کا

موحد ہوں گر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
مؤذن بتکدے میں ہو برہمن خانقاہوں میں

نکالے سے کبھی یوں نکلا ہے راسخ ان کے کوچہ سے
چلا چل کر گرا، گر کر اُٹھا اُٹھ کر ذرا سرکا

ساقیا وہ بلانوش ہوں توبہ توبہ
خم کے خم اوک میں رہ جاتے ہیں چلّو ہو کر

وہ رند ہوں ہوتی ہیں نمازیں مرے پیچھے
بچھتا ہے شب و روز مصلّےٰ مرے آگے

داورِ محشر الگ ہو میرا حساب
داستاں لمبی، شکایت ہے بہت

مولانا محمد حسین فقیر دہلوی کی دوسری بیوی سے مولانا ابراہیم اور مولانا اسحاق صاحب تھے۔

مولانا ابراہیم صاحب ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی کتب عربی و فارسی کی اپنے والد سے پڑھیں اور دورۂ حدیث مولانا رشید احمد گنگوہی سے ختم کیا۔ اس دورے میں آپ میرے والد

مولوی شرف الحق صاحب کے ہم سبق تھے۔

مولانا ابراہیم بھی بہترین واعظ و مقرر تھے۔ مدرسہ حسینیہ کٹرہ گوگل شاہ میں وعظ فرماتے تھے۔ آپ کی تصانیف بھی ہیں۔ آپ کی واعظانہ کتابوں سے ہزاروں لوگ واعظ بنے۔ آپ کی حسب ذیل کتب ہیں:

(۱) احسن المواعظ (۲) افضل المواعظ (۳) اکرم المواعظ (۴) مجمع المواعظ (۵) علاماتِ قیامت (۶) طبِ روحانی (۷) کشف مغالطات در مسئلہ سماعِ اموات (۸) اقوال الصادقین۔

آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوئی۔ آپ ۵۱ برس کی عمر میں ۱۳۳۸ھ کو دہلی میں فوت ہوئے۔

مولانا اسحٰق ۱۸۷۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ آپ نے ابتدائی کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں۔ اور دورۂ حدیث مولانا رشید احمد گنگوہی سے ختم کیا۔

بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا۔ موزوں طبیعت تھی۔ آپ نے مولانا عبدالرحمٰن راسخ سے اصلاح لی۔ ابتدا میں ان کا تخلص ستم تھا۔ قلعۂ معلیٰ اور دہلی کی ٹکسالی زبان میں شعر کہتے تھے۔ دہلی کے مشاعروں میں لوگ ان کو سننے کے لئے بے چین رہتے تھے۔

آپ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب اور انشا پرداز، فسانہ نویس، مقرر اور واعظ بھی تھے۔ ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں آپ نے ایک مذہبی رسالہ "الوعظ" جاری کیا، جو تقریباً تیس سال چلا۔ آپ کا انداز تحریر دل چسپ تھا۔ مذہبی کتابیں اور مضامین عام طور پر مولویانہ انداز میں چھپتے تھے۔ آپ نے احادیثِ رسولؐ اور آیاتِ قرآنی کو سمجھانے کے لئے عام فہم طریقہ اختیار کیا۔ قرآن مجید میں جس قدر انبیاء علیہم السلام کے حالات درج ہیں آپ نے ان کو آیاتِ قرآنی اور احادیث کی روشنی میں قلمبند کیا۔ درمیان میں عبارت کی مناسبت سے اشعار بھی تحریر کئے۔ آپ نے اپنی عمر میں تقریباً ساٹھ ہزار اشعار کہے ہیں۔ نثر میں بیس ہزار صفحات لکھے ہیں اور تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں داستانِ یوسفؑ، بستانِ اولیاءؒ، معراجِ رسولؐ، ملتِ ابراہیمؑ، جلوۂ طور، فسانۂ آدمؑ، معجزاتِ مسیحؑ، تاجِ سلیمانی بہت مشہور و مقبول ہوئیں۔ نظم میں آپ کی دو کتابیں "آئینہ عبرت" اور "پیامِ عبرت" چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک غیر مطبوعہ ضخیم دیوان "مرقعہ عبرت" ہے۔

مولانا صاحب نے ۱۳۳۸ھ سے مدرسہ حسینیہ کے ممبر پر اپنے بڑے بھائی مولانا ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد بیٹھنا شروع کیا۔ ہر جمعے کو بعد نماز جمعہ سے عصر تک وعظ فرماتے تھے۔ یہ سلسلہ ۳۳ سال تک جاری رہا۔

مولانا اسحاق صاحب کا اندازِ تقریر محققانہ تھا۔ اور صاف گوئی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ انتہائی بے باکی کے ساتھ خُدا اور اس کے رسولؐ کے احکام اس کے بندوں کو سُناتے تھے۔ آپ کے وعظ میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ ہر بات قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کے حوالوں سے سمجھاتے تھے۔ لوگ دُور دُور سے آپ کا وعظ سُننے آتے تھے۔

آپ نے جب سے رسالہ "الوعظ" جاری کیا۔ اس وقت سے عشقیہ کلام کہنا ترک کر دیا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد جب سے منبر پر بیٹھے اور وعظ کہنا شروع کیا۔ آپ کے کلام کا رنگ بالکل ہی بدل گیا۔ اس زمانے میں ستم کے بجائے شیدا تخلص اختیار کیا۔۔۔ لیکن عشقیہ کلام سے تائب ہونے کے بعد شیدا تخلص نہیں باندھا بلکہ اسحاق لکھتے رہے۔

مولانا اسحاق صاحب کا ذکر لالہ سری رام صاحب کے "تذکرۂ خم خانۂ جاوید" جلد پنجم میں ہے۔ یہ جلد پنجم علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے مرتب کی ہے۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں:

" پہلے ستم تخلص تھا، بعد کو شیدا تخلص ہوا۔ چند روز فکر سخن کر کے شاعری سے دستبردار ہو گئے۔"

دُرست نہیں ہے۔ مولانا کا دیوان پیام عبرت وغیرہ موجود ہیں۔ مولانا نے عرصے تک شاعری کی۔ ہاں عشقیہ شاعری آپ نے ترک کر دی تھی اور نعتیہ شاعری جاری رکھی۔

مولانا اسحاق صاحب کی تقریباً پوری زندگی اشاعت اسلام اور علومِ دینی کے پھیلانے میں گذری۔ عبادتِ الٰہی میں ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ شب بیدار تھے۔ رات کا پچھلا حصّہ حمد و ثنا اور عبادتِ الٰہی میں گذرتا تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں ؎

محبّت سب اسحاق چھُٹ جائے گی
مگر راس آئے گی حُبِ الٰہ

مولانا اسحاق صاحب کا ۸۲ سال کی عُمر میں ۱۱ اپریل ۱۹۵۲ء مطابق ۱۵ رجب ۱۳۷۱ھ یوم جمعہ کٹرہ گوگل شاہ والے مکان میں انتقال ہوا۔ ؎

دِل لیا جس کا اسی کے جان کے دُشمن ہوئے
ساری دُنیا سے نرالا آپ کا دستور ہے

یاں تو اپنے حوصلے سے بھی کیا تھا بڑھ کے کام
جان و دِل لے کر وہ بولے بس یہی مقدور ہے

شیخ کی شان میں گستاخ بتوں میں توبہ
لوگ کہتے ہیں نکالے گئے بُت خانہ سے

ہائے دِلّی ترے صدقے تری باتوں کے نثار
یہ زبان ڈھونڈے نہ پائے گی نکل کر باہر

خُدا حافظ مسافر کوچۂ جاناں کی منزل کے
اسی رستے سے لُٹتے ہیں ہزاروں قافلے دِل کے

اے رحمت اللعالمین اور اے شفیع المذنبین
اے لختِ جانِ آمنہ، عالم ہو تم پر فدا

احمد مصطفےٰ صلِّ علیٰ، صلِّ علیٰ
اسحاق کہہ بے ساختہ یکتا احد بعد از خُدا

دیکھی پڑی ہیں محفلیں اسحاق سب کی سب
اونچا ذرا جو تھا وہی آنکھوں میں خار تھا

بُلبلا ہے، حباب ہے دُنیا
اک خیال اور خواب ہے دُنیا

اُلفت اسحاق اس کی کھو دے گی
وہ نشے کی شراب ہے دُنیا

مولانا حامد علی قریشی ناظمِ انجمن حمایت الاسلام دہلی و کراچی

مولانا کے خاندانی بزرگوں میں منظفر علی قریشی، تہور علی قریشی اور منصور علی قریشی دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ یہ تینوں سگے بھائی تھے۔ منصور علی قریشی ملتان چلے گئے، وہیں مقیم ہوئے۔ اولاد ہوئی اور سلسلۂ نسل وہیں پھیلا۔

منظفر علی قریشی اور تہور علی قریشی دہلی کے بادشاہ کی فوج میں ملازم ہوئے۔ دہلی کے گرد و نواح کے علاقوں میں جاٹوں اور گوجروں کی سرکشی، لوٹ مار، قتل و غارت گری کو انھوں نے دبایا۔ اسی اثنا میں تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے ایک مقام راؤ کوٹان میں ایک جاٹ راؤ کوٹ سنگھ نے بغاوت کی منظفر علی قریشی اور تہور علی قریشی کو اس کی سرکوبی کے لئے ایک مسلح فوجی دستے کے ساتھ بھیجا گیا۔ بڑی زبردست لڑائی ہوئی، راؤ کوٹ سنگھ کو شکست دے کر اور اس کی تمام جاگیر اور راؤ کوٹان کے تمام علاقے کو تباہ و برباد کرکے جب دربارِ شاہی میں پہنچے تو بادشاہ نے ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ اور حکم ملا کہ تم دونوں اسی مقام پر جاؤ اور بڑے بھائی منظفر علی قریشی کے لئے بادشاہ نے فرمایا کہ تم اپنے نام سے ایک بستی آباد کرو۔ چنانچہ دونوں بھائی اس جگہ پر آباد ہوئے اور منظفر علی نے اپنے نام پر منظفر آباد نام کی ایک بستی بسائی منظفر علی قریشی کا مزار اس بستی کے قبرستان میں اب بھی موجود ہے جو پکّی لکھوری اینٹ سے بنی ہوئی ہے۔

منظفر علی قریشی کے چار صاحبزادے تھے۔ ان میں سے ایک صاحبزادے کی اولاد میں مولانا حامد علی قریشی صاحب ہیں۔ ان کے پر دادا مسیت اللہ قریشی صاحب کے بھی چار لڑکے تھے۔ جن میں ایک ان کے دادا عنایت اللہ قریشی تھے۔ ان کے چاروں صاحبزادوں میں یہی پڑھے لکھے تھے —— انھوں نے مدرسہ عالیہ عربیہ میرٹھ میں تعلیم حاصل کی، وہاں سے فارغ ہوکر انھوں نے ایک مدرسہ ۱۸۸۵ء میں اسی منظفر آباد میں قائم کیا، جس میں آس پاس کے دیہات سے مسلمان طلباء جوق در جوق آنے لگے۔ ان کے دادا کے بھی چار صاحبزادے تھے جن میں ایک صاحبزادے مولانا کے والد ماجد بنیاد علی قریشی صاحب تھے، ان کو

ہی صرف تعلیم کا شوق تھا۔ انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر میرٹھ جا کر مڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کئے اور چپکے چپکے بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ خاموشی کے ساتھ انگریزی پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد انگریزی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ میرٹھ میں تعلیم پانے کے بعد انھوں نے میرٹھ میں محکمۂ بندوبست میں ملازمت کی۔ جہاں ان کی تنخواہ پچھتر روپے تھی۔ محکمہ بندوبست میں جب انھوں نے نیک نامی حاصل کی تو انھیں ریاست گوالیار میں عارضی طور پر بلایا گیا۔ اس کے بعد ریاست اندور میں ان کو طلب کیا گیا۔ پھر ریاست میسور چلے گئے۔ آخر میں ریاست بھوپال کے محکمۂ بندوبست کے مہتمم اعلیٰ ۱۹۰۳ء میں نواب علیہ شاہ جہاں بیگم کے عہد میں مقرر ہوئے۔ بھوپال میں ہی ۱۹۱۲ء میں ان کا انتقال ہوا، وہیں آرام فرما ہیں۔

میر سید ضامن علی صاحب گلاوٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی سادات کی بستی میں رہتے تھے۔ لیکن جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی میں آگئے تھے، اور کوچہ پنڈت میں مقیم ہوئے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، چار لڑکیاں تھیں۔ ان کی ایک صاحبزادی صغیر النساء سے جناب بنیاد علی قریشی کی شادی ہوئی جن سے ۹ اپریل ۱۹۰۱ء میں حامد علی قریشی صاحب دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء کو جہانگیریہ ہائی اسکول میں آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھ رہے تھے کہ والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ یہ اس وقت اپنے والد صاحب کے پاس بھوپال میں تھے۔ بھوپال سے ان کے نانا ان کو دہلی لے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے نانا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد یہ اپنے چھوٹے چچا کی سرپرستی میں آگئے۔ کچھ دنوں کے بعد چھوٹے چچا بھی فوت ہو گئے تو یہ منجھلے چچا کی سرپرستی میں چلے گئے۔

یہ زمانہ مولانا کے لئے بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ کوئی ظلم و زیادتی ایسی نہ تھی جو ان کے چچا نے ان پر روا نہ رکھی ہو۔ میرٹھ کی تمام جائداد و املاک انھوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں، ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مولانا کی زندگی تعلیم حاصل کرنے میں یا چچا سے مقدمہ بازی کرنے میں گذری۔ ان کاموں کی تکمیل کے لئے اگر ان کو مزدوری کرنے کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اس سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ انھوں نے تعلیم کچھ عرصے مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ، کچھ عرصے مدرسہ عالیہ میرٹھ، کچھ عرصے مدرسہ عالیہ قصبہ گلاؤٹھی اور کچھ عرصے مدرسہ فتح پوری دہلی میں پائی۔ لیکن کہیں فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل نہیں کی۔

۱۹۲۶ء میں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہر کی صحبت ان کو میسر آئی، کچھ عرصے بمبئی اور کچھ

عرصے دہلی ان کے ساتھ رہے، وہ زمانہ ان کو اچھی طرح یاد ہے جبکہ مولانا محمد علی تین سال متواتر قرول باغ سے تانگہ میں بیٹھ کر جمعے کی نماز کے لئے جامع مسجد آتے تھے۔ اور نماز کے بعد تقریر کرتے تھے اور خلافت کی ممبر سازی کرتے تھے اور چار آنے فیس ممبری وصول کرتے تھے۔ یہ پہلی بار خلافت کمیٹی کے ممبر بنے تو مولانا نے ان کو قرول باغ بلایا اور خلافت کی تحریک کا کام کرنے کے لئے حکم دیا اور انھوں نے بنگال، کلکتہ، ڈھاکہ، سلہٹ، راج شاہی، کھلنا، چٹاگانگ، رنگون، برما، سیلون، حیدرآباد دکن، بمبئی، پنجاب، سندھ اور سرحد کے طوفانی دورے کر ڈالے اور ۱۹۲۸ء میں کلکتہ خلافت کانفرنس میں شرکت کی۔

جب ہندو سنگھٹن اور آریہ سماج کا زیادہ پرچار ہونے لگا، اور آریہ سماج کی جگہ جگہ منڈھلیاں گھومنے لگیں تو مولانا قطب الدین برہمچاری، مولانا خلیل داس، مولانا محمد شفیع دلہن وارثی دہلوی، مولانا ابوالبرکات دانا پوری، مولانا شفیع داؤدی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالماجد بدایونی وغیرہ کی ایک میٹنگ لاہور میں ہوئی جس میں طے پایا کہ مسلمان بچے اغوا ہو رہے ہیں، عیسائی مشنری وسیع پیمانے پر بچوں کو اغوا کر رہے ہیں اور آریہ سماجی بھی یہی حرکت کر رہے ہیں، ان کے تحفظ کے لئے کچھ قدیم انجمنیں اور ادارے اگرچہ پہلے سے قائم ہیں اور کام بھی کر رہے ہیں۔ لیکن اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا طے پایا کہ دہلی میں مولانا حامد علی قریشی ایک ادارہ قائم کریں اور بنگال وغیرہ میں ایسے ادارے قائم کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کو مقرر کیا۔

مولانا حامد علی قریشی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں حاجی محمد ابراہیم صاحب جو جسٹس وحید الدین اور شیخ محمد شفیع ایڈوکیٹ کے والد تھے، جن کا انتقال کراچی میں ہوا، شیخ رضی الدین مرحوم اور علامہ ابوالبیان آزاد کے مشوروں سے چتلا دروازے کے سامنے چھتہ شاہ جی میں دوجانہ والوں کی دومنزلہ عمارت میں صرف مدرسہ حیات الاسلام قائم کیا۔ ایک سال کے بعد یہ مدرسہ چاوڑی بازار دوجانہ ہاؤس کی چھوٹی محل سرائے میں منتقل ہوگیا۔ اب یہ مدرسہ صرف مدرسہ نہیں رہا بلکہ دارالیتامیٰ کی شکل اختیار کر گیا اور انسداد شدھی وعیسائیت وگداگری کی دشوار گذار راہوں سے یہ انجمن گذرنے لگی۔ اور روز بروز ترقی اور مقاصد کی کامیابی سے ہمکنار ہونے لگی۔

یہ بات اس اختلافی زمانے میں بہت کم لوگوں کو میسر آئی ہے کہ کوئی شخص بیک وقت سیاسی اور سوشل خدمت کرے اور سب کے لئے ہردلعزیز بھی رہے، چنانچہ اس انجمن کا پہلا کارنامہ

تو یہ ہوا کہ مولانا حامد علی صاحب نے ان تھک شبانہ روز میونسپل کمیٹی دہلی سے بڑی لڑائی لڑی، اس جد و جہد میں ہندو اور مسلمانوں نے ان کا بڑا ساتھ دیا۔ یہ بازار حوض قاضی سے بسمت مشرق جامع مسجد کی پشت کے عین سامنے گھوم کر تیراہا بن جاتا ہے اور اس بازار کے دو راہا رنڈیوں کے کوٹھے ہوتے تھے، ان کوٹھوں پر آتے جاتے دوجانہ ہاؤس درمیان میں پڑتا تھا۔ اس بازار میں ایک لال پتھر کی اونچی مسجد بھی ہے، دوجانہ ہاؤس کے پیچھے آریہ سماج مندر آج بھی ہے اور اس مقام پر حیات الاسلام کے کمسن و نوجوان طلبا بھی رہتے تھے، چنانچہ اس بازار سے طوائفوں کو ہٹانے کی تحریک بڑے زوروں پر چلی اور تین سال کی جد و جہد کے بعد کامیاب ہوئی۔ اور یہ بازار طوائفوں سے خالی ہوگیا۔ اب بالاخانوں پر شریف لوگوں کی رہائش گاہ ہے یا مشہور تجارتی فرموں کے دفاتر ہیں۔

اسی انجمن کی عمر ابھی دو سال کی ہوئی تھی کہ ڈپٹی کمشنر اے۔ ایچ۔ لیرڈ نے مہتاب سنگھ سپرنٹنڈنٹ انڈسٹریز کے ذریعے ایک دن مولانا کو بلا بھیجا اور گفتگو کرنے کے بعد کہا کہ ہم صوبہ دہلی میں دیہات سدھار (سوشل ویلفیر صوبہ دہلی) کی ایک اسکیم جاری کرنا چاہتے ہیں، آپ سے ہمیں کافی توقع ہے کہ آپ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے حسب مقدور دیہات سدھار کے کام میں دہلی حکومت کا ہاتھ بٹایا تو ان کی خدمات کے صلے میں ڈپٹی کمشنر نے چاہا کہ ان کو خان صاحب کا خطاب دیا جائے۔ لیکن انھوں نے ڈپٹی کمشنر سے صاف انکار کر دیا۔ اور معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "جناب آپ کے ہاں خطاب دے کر ہمارے مذہب خریدے جاتے ہیں اور پھر دیہات سدھار کی آڑ میں جاہل عوام بچوں اور عورتوں کو مرتد بنایا جاتا ہے مجھ کو خدمت سے غرض ہے وہ میں انجام دیتا رہوں گا"۔ چنانچہ مولانا کو دیہات سدھار کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا، جس کی وجہ سے انجمن حیات الاسلام میں سرکاری افسران اور میونسپل کمیٹی کے ممبران جوق در جوق آنے لگے۔

مولانا ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ میں داخل ہوئے۔ دو سال کے بعد ۱۹۳۸ء کو پریڈ گراؤنڈ کے میدان میں مسلم لیگ پولیٹیکل کانفرنس ہوئی، اس کانفرنس کا بھی ان کو کنوینر بنایا گیا۔ ان میں انتظامی صلاحیتیں کافی موجود تھیں، اس لئے ہر سیاسی اور سوشل آرگنائزیشن میں ان کو بلایا جاتا تھا اور ان کے مشوروں کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔

انجمن حیات الاسلام کے لئے ابتدا میں مولانا نے دہلی شہر کے گلی کوچوں میں اور پورے ہندوستان

یں جگہ جگہ پہنچ کر جلسے منعقد کئے اور تقریریں کر کے چندے مانگے۔ لیکن کسی مجبوری حالت میں بھی حیات الاسلام کے طلبا، یا بچوں کو چندہ مانگنے کے لئے بھیجنا تو درکنار حیات الاسلام میں ایسا تخیل و تصور بھی پیدا نہ ہونے دیا ــــــ

مسلم لیگ میں داخل ہونے کے بعد مسلم لیگ کے کاموں کا بوجھ مولانا کے سر آپڑا۔ صوبہ مسلم لیگ کے کونسلر، صوبہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر، اور آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسلر منتخب ہوئے۔ اور ۱۹۴۵ء میں صوبہ مسلم لیگ دہلی کا جنرل سکریٹری بھی ان کو منتخب کیا گیا۔ لیکن مولانا کے سوشل کاموں اور تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انجمن حیات الاسلام میں انگریز، مقامی عیسائی، سیاسی جماعتوں کے اکابر، کانگریس، مسلم لیگ، مجلس احرار، جمیعۃ العلما، ہند اور دوسرے شہری معززین کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی آتے رہے اور ان کی خدمات کی داد دیتے رہے۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ لیڈرانِ مسلم لیگ اور علما، دیوبند انجمن حیات الاسلام کے دفتر میں جمع ہوئے اور جمیعۃ العلما، پاکستان اسی دفتر میں منعقد ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں جب دہلی میں ہندو مسلم فساد ہوئے تو دہلی میونسپل کمیٹی میں ہندو مسلمان جمع ہوئے اور ایک امن کمیٹی قائم ہوئی جس کے چیرمین لالہ دیس راج چودھری بنائے گئے اور سکریٹری مولانا حامد علی قریشی منتخب ہوئے۔ جب امن کمیٹی کی طرف سے دورے ہوتے تھے تو مسلم نیشنل گارڈ اور کانگریس کے والنٹیر سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، یہ کھانا کبھی مولانا کی طرف سے ہوتا تھا، کبھی لالہ دیس راج چودھری کی جانب سے ہوتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جب دہلی میں مردم شماری ہوئی تو مسلم لیگ صوبہ دہلی کی طرف سے مردم شماری کے لئے مولانا کو کنوینر بنایا گیا۔

۱۹۴۶ء میں انجمن حیات الاسلام کی طرف سے اردو پارک میں تبلیغی کانفرنس ہوئی۔ بہت بڑا پنڈال بنا۔ شہر کے عمائدین نے جوق در جوق حصہ لیا۔ بیگم مولانا محمد علی، حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالحامد بدایونی، حسین امام اور بہت سے احراری و مسلم لیگی رہنما شیخ شجاع الحق مرحوم، حاجی محمد شریف ہڈی والے، شیخ عبدالسلام، شمس العارفین صاحب جن کے صاحبزادے جناب نور العارفین آج کل کراچی میں ہیں نے اس تبلیغی کانفرنس میں شرکت کی اور تقریریں کیں۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانے میں انجمن حیات الاسلام کراچی میں منتقل ہو گئی۔ مولانا نے تمام

حوادث اور مالی پریشانیوں کے باوجود اس انجمن کے لئے اپنی کافی جائیداد فروخت کردی تھی۔ تیراہا بیرام خاں پھاٹک مفتی والاں کے عقب میں باغیچی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی میں ایک بہت بڑی زمین ۲۵ ہزار روپے کی اپنی ذات سے خریدی تھی، اس پر ۱۶ مکان بنوائے۔ انجمن کے کراچی پہنچنے کے بعد سنی مجلس اوقاف دہلی نے اس جائیداد پر قبضہ کرنا چاہا۔ تو مولانا ۱۹۵۸ء میں دہلی گئے، اور ڈپٹی کسٹوڈین جنرل کے سامنے یہ حقائق پیش کئے اور اس کو واگذار کرایا۔

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس انجمن نے کراچی میں رہ کر بھی اپنے ۲۳ سال کامیابی کے گذارنے کے باوجود اب تک کم و بیش ۲۵ ہزار بچوں کی تعلیم و پرورش پر نمایاں حصہ لیا۔ ان میں کے بیشتر طالب علم ہند و پاکستان میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر تجارت و صنعت و حرفت اور ملازمتوں میں کامیاب زندگی گذار رہے ہیں۔ کراچی میں انجمن کے کئی شعبے کام کر رہے ہیں، جن میں خصوصی طور پر مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دینیات کا بہت بڑا مدرسہ اور ایک پرائمری اسکول۔

(۲) حیات الاسلام عثمانیہ کالج آرٹ و کامرس۔

(۳) مفت لائبریری۔

(۴) مفت دواخانہ۔

(۵) بچوں کے لئے صنعت و حرفت کا درزی خانہ۔

تقریباً کالج کے علاوہ یہی شعبے دہلی میں بھی کام کر رہے تھے۔ کراچی میں اس وقت انجمن کے نام پر تقریباً ۲۵ لاکھ روپے کی جائیداد موجود ہے۔ مولانا اس انجمن کے بانی و ناظم ہیں۔ اردو بازار کوچہ خانخاناں میں مولانا کا ایک دو منزلہ مکان ۶۰ مربع گز زمین پر تھا۔ کراچی میں ان کو ۶۰ مربع گز کا دو منزلہ مکان کلیم میں ملا۔

مولانا حامد علی قریشی صاحب انتہائی خوش طبع، ملنسار، خلیق، متواضع، دوست نواز، علم دوست اور ہمدرد خلائق انسان ہیں۔ وضع کے پابند ہیں۔ میرے ان سے ۳۵ سالہ تعلقات ہیں کبھی ان تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کراچی ۱۹۶۹ء میں عرصے کے بعد گیا۔ دو مہینے رہا۔ میری رات کی نشست مولانا کے کمرہ نیو ٹاؤن پر رہتی تھی جہاں دوست و احباب تشریف لاتے، تبادلۂ خیال کرتے۔ اس محفل کی یاد اب تک آتی رہتی ہے۔

مولانا کی پہلی شادی ۱۹۲۰ء میں ان کی چھوٹی خالہ کی لڑکی اصغری بیگم سے ہوئی۔ ان سے تین بچے

ہوئے دو کا انتقال ہو گیا۔ ایک سب سے بڑے لڑکے جس کی عمر تقریباً ۴۲ سال ہے حیات ہیں، ان کی ۱۹۵۱ء میں شادی ہوئی، ۲۰ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ۹ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ان کو ایک لڑکا عطا کیا، جس کا نام عارف علی قریشی ہے۔ مولانا کی پہلی بیوی کا انتقال ۱۱ر جون ۱۹۳۸ء کو دہلی میں ہوا۔ دو ماہ کے بعد ان کی خالہ کی منجھلی لڑکی زلیخا بیگم بنت مولوی ابوالحسن سے شادی ہوئی، ان سے چار اولادیں ہوئیں جن میں سے دو موجود ہیں، ایک کا نام راشد علی قریشی ہے، انھوں نے بی۔ اے کیا ہے، اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازم ہیں اور لا، پڑھ رہے ہیں، ان کی شادی دہلی کے مشہور خاندان علامہ راشد الخیری کے خاندان میں ہوئی۔ مولانا کی بہو مولوی سید انیس الرحمٰن مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ جناب رازق الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت کراچی انیس الرحمٰن کے پھوپی زاد بھائی ہیں جو اس بہو کے چچا ہوتے ہیں۔ انیس الرحمٰن امان الرحمٰن کے لڑکے تھے اور جو کپتان عبدالرحمٰن کے چچا زاد بھائی تھے۔ راشد علی قریشی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی عمر پانچ سال کی ہے۔ نیز مولانا کی موجودہ بیوی سے ایک لڑکی نور الصباح کراچی میں ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئی، جس نے اس سال ۱۹۷۱ء میں آرٹ سکنڈ ایر کا امتحان دیا ہے۔

منشی محمد دین ایڈیٹر اخبار الاخیار دہلی

منشی محمد دین صاحب کے والد حافظ قاری شیخ محمد حسین صاحب ایک متقی پرہیزگار تجارت پیشہ، دیانتدار وصوفی منش انسان تھے جو اپنے وقت کے دہلی کے بہترین قاری تھے۔ جامع مسجد کے شمالی دروازے میں رمضان شریف کو محراب سناتے تھے، ان کے سننے والوں کی تعداد امام جامع دہلی کے سننے والوں سے زیادہ ہوتی تھی۔

منشی محمد دین صاحب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے گیارہ سال قبل ۱۸۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ مولوی نذر حسین محدث دہلوی کی خدمت میں ان کو لیجایا گیا۔ ابتدائی کتابیں پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہو گئی اور فکر معاش کی الجھنوں میں الجھ کر رہ گئے، لیکن مطالعہ جاری رکھا۔ علماء کی صحبتوں میں کافی وقت گذارتے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔

صحافت کی طرف منشی صاحب کی طبیعت مائل ہوئی اور دہلی پر ہی منحصر نہ تھا، بلکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں عیسائی مشنری اپنی دولت وثروت اور حکومت کی دھونس سے غریب ہندوستانیوں کو اپنے پھندوں میں پھانس رہے تھے۔ پہاڑ ہو یا دیہات ہو، یا شہر ہو، غرض گلی گلی میں عیسائیت کا پروپیگنڈا پادری زوروں پر کرتے پھرتے تھے۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا، اس ناقابلِ برداشت حالت کو دیکھ کر منشی صاحب نے "اخبار الاخیار" محلہ چوڑی والان دہلی سے یکم اپریل ۱۸۸۷ء کو جاری کیا۔ یہ اخبار نڈر اور بے خوف اخبار تھا۔ حکومت پر بھی نکتہ چینی کرتا تھا، اور ملکی وغیر ملکی خبریں شائع کرتا تھا۔ —— کافی عرصے تک چلا۔ اس نے عیسائیت کی بیخ کنی کرنے اور اسلام کو فروغ دینے کے لئے حتی الامکان کوشش کی —— اخبار کے بند ہونے کے بعد بھی منشی محمد دین صاحب مشنریوں کے خلاف کام کرتے رہے، خاموش نہیں بیٹھے، ۱۸۹۲ء میں دہلی کے معززین اور سربرآوردہ حضرات نے ایک انجمن مؤید اسلام اور لڑکوں و لڑکیوں کے لئے ایک یتیم خانہ و اسکول قائم کیا، جس میں حکیم اجمل خاں صاحب، مولوی عبد الاحد صاحب

مالک مطبع مجتبائی، سید احمد امام جامع مسجد دہلی، نواب فیض احمد خاں صاحب، حکیم ظہیر الدین صاحب، حکیم رضی الدین صاحب، نواب غلام محمد حسن خاں صاحب، مولانا عبدالرحمن راسخ، خان بہادر محمد اکرام اللہ خاں صاحب، مولوی عبدالحق حقانی، خان بہادر الٰہی بخش صاحب اور منشی محمد دین صاحب وغیرہ حضرات اس کے سرگرم کارکن، معاون اور سرپرست تھے۔ ان اداروں کی غرض یہ تھی کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں مسلمانی اسکول نہ ہونے کی وجہ سے عیسائی اسکولوں میں داخل ہو کر عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح یتیم خانہ نہ ہونے کی بنا پر مسلمان لاوارث بچے مشنریوں کے ہاتھوں میں چلے جاتے تھے۔

ان لوگوں کی ان اداروں میں برائے نام شمولیت نہیں تھی جیسے آج کل کا دستور ہے کہ انجمنوں اور جماعتوں میں لیڈروں نے نام لکھوا دیا اور اپنی ذمّے داریوں سے غافل رہے۔ یہ حضرات گھر گھر اور دکان دکان جا کر چندہ کیا کرتے تھے۔ ہر ایک کے ذمّے ایک علاقہ تھا چنانچہ ۱۳۱۱ھ کی سالانہ رپورٹ میں منشی محمد دین صاحب کی کوششوں کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

"شیخ محمد دین صاحب ممبر کارکن نے تقریباً تین مہینے سے کام شروع کیا ہے۔ اس قلیل عرصے میں دو ہزار روپے وصول کئے۔ شیخ صاحب بھی اپنے علاقہ میں سرگرمی اور استقلال سے کام کر رہے ہیں"

منشی محمد دین صاحب دور اندیش اور دور بیں انسان تھے، ان کے بڑے صاحبزادے معین الدین صاحب عیسائی مشنریوں کی صحبت میں بیٹھنے لگے تھے جس کی وجہ سے ان پر عیسائیوں کے خیالات کا اثر ہونے لگا تھا۔ گھر والوں کو معلوم ہوا، تو انھوں نے ان کو گھر میں آنے جانے پر پابندی لگانی چاہی۔ منشی صاحب اس پابندی کے مخالف تھے، جب لوگ زیادہ زور دینے لگے تو انھوں نے گھر والوں کو سمجھایا یہ ابھی چھوٹا ہے۔ خدا نے چاہا اس کو عیسائیت سے جلد نفرت پیدا ہو جائے گی۔

چنانچہ ان کی دور اندیشی کام آئی اور میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب کے سمجھانے پر ان کو عیسائیت سے نفرت ہو گئی۔

منشی محمد دین صاحب ایک وجیہہ، خوب صورت، با وضع اور دبدبے والے بزرگ تھے۔ سانولا پکا رنگ تھا، متوسط قد، آنکھیں بڑی بڑی، پیشانی کشادہ اور چوڑی تھی، کبھی انگرکھا کبھی اچکن پہنتے تھے۔ گرگابی کے جوتی پہننے کے عادی تھے۔ آپ کے ہمعصر دوست مولوی کرامت اللہ، مولوی شرف الحق صاحب

مولوی عبدالحق مفسّر تفسیر حقانی، مولانا سید امیر حمزہ اور مولانا محمد حسین فقیر دہلوی تھے۔ یہ حضرات ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی دانائی و فراست کے قائل تھے۔

منشی صاحب کو قرآن مجید سُننے کا بہت شوق تھا تمام مشاغل سے فارغ ہو کر بعد نماز عشاء حافظ حفیظ الدین صاحب برادر حافظ زین العابدین صاحب مالک ویسٹ اینڈ ٹاکیز سے جو دہلی کے مانے ہوئے قاری تھے، قرآن مجید سُنتے تھے۔ آپ کو شکار کا بھی شوق تھا۔ دہلی کے اعلیٰ افسران آپ کے ساتھ شکار کھیلتے تھے۔ نشانہ بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ پہلوانی کے بچپن سے عادی تھے۔ ڈھائی من کی جوڑی آخر عمر تک اُٹھاتے رہے۔

منشی محمد دین صاحب پہلے محلہ چوڑی والان گلی تخت والی میں رہتے تھے۔ ان کا یہ مکان ذاتی تھا، جب یہ مکان فروخت کر دیا تو گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والان میں سکونت اختیار کی اسی مکان میں ۵۰ برس کی عمر میں ۱۹۲۱ء کو ۲۶ رمضان المبارک کی شب قدر میں فوت ہوئے مہندیوں میں آپ کی قبر ہے۔[1]

---

[1] تاریخ صحافت اردو جلد سوم ص ۴۸۳

جناب سیٹھ رامجیداس گڑ والے

رامجیداس ابن سیٹھ بخشی رام ابن سیٹھ متھرا داس ابن سیٹھ رادھاکشن دہلی کے قدیمی باشندے تھے، یہ خاندان انتہائی دولتمند تھا، ان کی دولتمندی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس خاندان کے ایک فرد موتی رام کے پاس ۱۸۵۳ء میں چار ملین پونڈ تھے[1] اس زمانے کے برطانوی حکمرانوں کی نظر میں شمالی ہند کے بے حد متمول خاندانوں میں یہ خاندان بھی تھا۔ پی، این اگرتن مجسٹریٹ دہلی نے لالہ رامجیداس کے بارے میں ایک سرٹیفکٹ ۱۸۵۶ء میں تحریر کیا تھا کہ رامجیداس دہلی کا "روتھس چائلڈ" ہے۔ روتھس چائلڈ انگلستان کا سب سے بڑا امیر تھا۔

ان کا پیشہ راجوں، مہاراجوں، تعلقداروں اور بادشاہوں کی جاگیریں رہن رکھ کر قرض دینا اور سود وصول کرنا اور تجارت تھا۔ اس خاندان کو گڑ والا اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے بزرگ یاتریوں، مسافروں اور غریب لوگوں میں گڑ تقسیم کرتے تھے۔

اس خاندان کے افراد کی مغلیہ درباروں میں رسائی ہی نہیں تھی بلکہ حکومت کے رکن تھے۔ دہلی میں ان کو بڑی عزت و توقیر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ رامجیداس بہادر شاہ ظفر کے عہد میں فخر الممالک کے پیش کار تھے، ان کو ۳۰ اپریل ۱۸۴۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار سے خلعت چہار پارچہ رقم جواہر اور مرزا قطب الممالک کی مختاری کا عہدہ عطا ہوا[2]

دہلی میں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی، تو دہلی کے اور لوگوں کے ساتھ سیٹھ رامجیداس نے بھی جنگ میں کافی امداد دی، چنانچہ ۸ جون ۱۸۵۷ء میں سالگ رام خزانچی، زور آور سنگھ، راجہ بھولا ناتھ، منشی سلطان سنگھ، متھرا داس اور سیٹھ رامجیداس بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہوئے۔ پائے تخت کو

[1] ہسٹری آف فریڈم مومنٹ ص ۱۶۶ [2] بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ص ۱۴۳

بوسہ دیا اور دو دو روپے تخت پر نثار کر کے دس دس روپے نذر گزارے اور شاہی وظیفہ داروں کی تنخواہ تقسیم کرنے کا وعدہ کیا۔ اور عرض کیا کہ جب تک نیرنگیٔ زمانہ سے خوشنما نقش اور عمدہ نتیجہ نہ نکلے گا اس وقت تک ان لوگوں کی تنخواہیں ہمارے ذمے ہیں۔[۱]

شاہی وظیفوں کی ادائیگی کے علاوہ لالہ راجمیداس صاحب وغیرہ حضرات جنگی معاملات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اور اپنے مشوروں سے جنگ کو کامیاب کرنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ ۸ اگست ۱۸۵۷ء کے قلعے کے گارڈ روم میں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، راجہ دیبی سنگھ، سالگرام، رائے گنجارام اور لالہ راجمیداس نے ملاقات کی۔ فوجیوں کے جذبات اور حالات کے پیشِ نظر یہ طے کیا گیا کہ اگر فوجیوں کو تنخواہ ادا نہیں کی گئی تو وہ لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ اس لئے باہمی مشورے کے بعد ان حضرات نے فوج کی تنخواہ کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے جمع کرنے کا وعدہ کیا۔[۲]

ان کوششوں کے باوجود روپیہ پورا جمع نہ ہو سکا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بہادر شاہ ظفر نے دہلی کے متمول لوگوں سے روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کے ارکان نواب حامد علی خاں، راجہ دیبی سنگھ، سالگرام، نواب موسیٰ خاں، نواب احمد مرزا اور حکیم عبدالحق تھے۔ ان ممبران کمیٹی کو بہادر شاہ ظفر نے یہ ہدایت دی تھی کہ آپ جتنا روپیہ اکٹھا کریں۔ —— وہ دینے والوں کی مرضی کے مطابق اور رضاکارانہ ہونا چاہیئے۔ ان سے بیحد نرمی اور شرافت کا سلوک کیجئے۔ آپ کا مقصد پبلک کی حفاظت اور عیسائیوں سے جنگ کرنا ہے یہ تمام رقم قرض کے طور پر ہوگی۔ اور جیسے ہی سرکاری محصولات موصول ہوں گے۔ یہ قرض ادا کر دیا جائے گا۔ اس کمیٹی کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بہت تھوڑی اور چھوٹی رقمیں قرض کے طور پر دی گئیں۔ اور جگل کشور، شیو پرشاد، منشی جیون لال، سالگرام اور دیوی سنگھ جیسے ساہوکاروں نے زیادہ مدد نہیں کی، لیکن ایک شخص اس میں مستثنیٰ تھا۔ جو اس وقت دہلی کا بہت ساہوکار تھا، جس کا نام سیٹھ راجمیداس تھا، اس نے بہادر شاہ ظفر کو بہت بڑی رقم چندہ کے طور پر دی۔ اسی کے ساتھ ایک کثیر رقم قرض کے طور پر بادشاہ کو پیش کی، اور بہت سا غلہ بھی دیا۔[۳]

یہ رقم کن صورتوں میں دی گئی تھی۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر تارا چند صاحب نے اپنی تصنیف ہسٹری

[۱] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۴۲ [۲] روزنامچہ جیون لال ص ۲۰۶ [۳] دہلی ان ۱۸۵۷ء ص ۸۳

آف فریڈم مومنٹ" میں کی ہے:

"سیٹھ رامجیداس گڑ والے تھے بہادر شاہ ظفر کو بہت بڑے دو قرضے دیئے تاکہ وہ برطانوی افواج کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جنگ کر سکے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اتنی ہی بڑی مقدار میں مغل شہنشاہ کو اتنا غلہ دیا تھا، جو چودہ کشتیوں پر لادا جاسکتا تھا۔"

دہلی میں ایسے بھی متمول اور ساہوکار تھے جنھوں نے اس جنگ آزادی میں مالی مدد دینے سے گریز ہی نہیں کیا، بلکہ منشی جیون لال اور نواب امین الدین قسم کے لوگ اُلٹے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے، چنانچہ ایسے لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم ۸ راگست ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ۲۵ ساہوکار گرفتار ہوئے جنمیں لالہ سالگ رام، لالہ گردھر لال اور زور آور چند کے ساتھ رامجیداس گڑھ والے بھی تھے۔

گڑ والوں کے خاندان والوں نے بہادر شاہ ظفر سے شکایت کی کہ سیٹھ رامجیداس دو مرتبہ بڑی بڑی رقمیں دے چکے ہیں اور کسی بھی شاہی حکم سے گریز نہیں کیا۔ ہر حکم کی تعمیل کی، اس کے باوجود سیٹھ رامجیداس کو گرفتار کیا گیا ہے، چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے ۲۷ راگست ۱۸۵۷ء کو مرزا مغل کے نام یہ حکم بھیجا:[1]

"معلوم ہو کہ سوداگر رامجیداس گڑ والا خزانہ شاہی کو دو مرتبہ روپیہ دے چکا ہے اور نیز سلطنت کے قرض فراہم کرنے میں بھی بہت امداد دی ہے، پس فرزند تمھیں لازم ہے کہ اس سے اب کچھ طلب نہ کیا جائے۔ ہمارے احکام کو ضروری سمجھو اور ان پر عمل کرو۔"

اس کے برعکس انگریزی حکام نے سیٹھ رامجیداس سے روپیہ قرض دینے کی خواہش کی تو انھوں نے انکار کیا[2]۔ سر جون لارنس نے ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں مارو ے گری تھڈ کو یہ مشورہ دیا کہ محبوب علی خاں، امین الدین خاں، ضیاء الدین خاں اور الٰہی بخش کو لکھیں، کہ وہ رامجیداس گڑ والا اور متھرداس سالگرام کو جو سرکار کے وفادار ثابت ہوئے تھے ان کو آمادہ کریں کہ وہ گری تھڈ کے ساتھ اپنی خط و کتابت جاری کریں۔

جب یہ پیغام سیٹھ رامجیداس کے پاس پہنچا تو وہ خط و کتابت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے جنگِ آزادی میں جب ناکامی ہوئی تو سیٹھ رامجیداس شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ پھرتے پھراتے رہے، سفر کی پریشانیاں

۱۔ گرفتار شدہ خطوط ص ۹۷، ۲۔ ہسٹری آف فریڈم مومنٹ ص ۱۶۷

برداشت نہیں کرسکے، بڑے نازک نحیف الجثہ تھے اور اکثر مریض رہتے تھے۔ سفر میں ہی فوت ہوئے۔[1] ان کے پڑپوتے لالہ ست نرائن کا کہنا ہے کہ ان کو فوارہ چاندنی چوک کے قریب پھانسی پر چڑھایا گیا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے گھر کو انگریزی فوج نے لوٹا اور ان کی ملکیت کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔[1]

سیٹھ راجمی داس کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے سیٹھ نرائن داس ان کے جانشین ہوئے، ان کی دیانت داری و ایمان داری مشہور تھی۔ نواب محبوب علی خاں کا بیالیس ہزار روپیہ ان کی کوٹھی میں جمع تھا۔ انگریزوں کو بیس ہزار روپے کا سراغ ملا۔ جب لارنس دہلی کے چیف کمشنر بنائے گئے تو اس نے ان روپے کے بارے میں معلوم کیا تو انھوں نے بیالیس ہزار روپے کا اقرار کیا، ان کی سچائی سے انگریز بہت خوش ہوئے اور ان کو کرسی دی گئی۔[2]

لالہ نرائن داس صاحب انگریزی اچھی جانتے تھے۔ پندرہ سال تک آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر رہے۔ دہلی سوسائٹی کے ممبر ابتدا سے رہے۔ سوسائٹی کو چندہ دینے میں پیش پیش رہتے تھے۔ میٹنگوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اور مضامین پر جو تبادلہ خیال ہوتا تھا اس میں اپنی رائے بھی دیتے تھے۔

لالہ نرائن داس صاحب کے صاحبزادے رائے بہادر سری کشن داس تھے، انھوں نے گھر پر تعلیم پائی۔ ان کے استاد انگریز بھی تھے۔ ان کی انگریزی کی لیاقت موجودہ گریجویٹوں سے زیادہ تھی۔ یہ تیس سال آنریری مجسٹریٹ اور تیس سال ہی میونسپل کمشنر رہے۔ کئی برس تک سینیر وائس پریذیڈنٹ بھی بنائے گئے۔

۱۸۹۸ء میں ہندو کالج قائم کیا اور کافی عرصے تک اس کے خرچ کا بار خود برداشت کیا۔ چنانچہ مدن موہن مالویہ جی نے ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کی ایک چٹھی میں اس بات کی تصدیق ہے کہ لالہ لالہ نرائن داس ہندو کالج کے بانی تھے اور سالہا سال تک انھوں نے اپنے ذاتی خرچ سے کالج کو چلایا۔

چرخے والان میں لالہ سدا سکھ کاغذی تاجر کتب کی کوٹھی پر ڈاک خانہ تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر سنسکرت ہائی اسکول تھا۔ اس کے بانی لالہ سری کشن داس گڑ والے تھے۔ اس اسکول کو میونسپل کمیٹی دہلی ۵، روپے ماہانہ وظیفہ دیتی تھی۔[3]

[1] روزنامچہ نواب غلام حسین ص ۵۹ [2] ہسٹری آف فریڈم مومنٹ ص ۱۶۷

[1] 〃 〃 ص ۵۹ [3] آثار دہلی ص ۶۹

لالہ سری کشن داس جی نے تمام ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور سیلون بھی تشریف لے گئے تھے، بمبئی میں انھوں نے کپڑے کے مل دیکھے تو انھوں نے دہلی میں آکر دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ کمپنی قائم کی اس وقت اس کے ایک حصے کی قیمت ڈھائی سو روپے تھی۔ لالہ سری کشن داس جی نے ڈھائی لاکھ کے حصے خریدے، چنانچہ آج تک دہلی کلاتھ مل کا پہلا حصہ اسی خاندان میں چلا آرہا ہے۔ اس وقت بھی پہلے حصے دار لالہ سنت نرائن گڑھ والے ہیں۔ ان کو حکومت برطانیہ کی طرف سے رائے صاحب کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ان کے نام کی سری کشن داس روڈ قرولباغ میں اب بھی ہے۔ اس سڑک کا نام انگریزی دور میں رکھا گیا تھا۔ رائے صاحب سری کشن داس کا انتقال دہلی میں ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

رائے صاحب سری کشن داس جی کی پہلی شادی لالہ جوالا پرشاد بہادر گڑھ والے آنریری مجسٹریٹ کی بہن سے ہوئی، ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی کوچہ پاتی رام، بازار سیتارام کے رہنے والے لالہ پربھودیال کی لڑکی سے کی، جن سے دو صاحبزادے لالہ ست نرائن، سدانند اور ایک لڑکی ہوئی۔ سدانند نے ہندو کالج سے بی اے کیا تھا۔ شادی کی تھی، لیکن لاولد فوت ہوئے۔

لالہ ست نرائن سمت ۱۹۵۳ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ماسٹر امی چند اور ماسٹر اودھ بہاری شہید فرنگ سے گھر پر تعلیم پائی۔ گورنمنٹ اسکول میں بھی داخلہ لیا۔ انگریزی اچھی جانتے ہیں، لکھ پڑھ لیتے ہیں اور بول بھی خوب لیتے ہیں۔ بارہ سال ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۷ء تک دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔ آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑے۔ آخر میں لالہ ہنومان پرشاد سے شکست کھائی۔

باغیچہ مادھوداس نزد لال قلعہ میں جہاں کافی مندر ہیں، ان کا بھی وہاں ایک خاندانی مندر اور دھرم شالہ ہے، اس کا اہتمام انھی کے سپرد ہے۔ یہ اپنے والد سری کشن داس کی طرح خلیق اور منکسر المزاج ہیں، اور غریب پرور ہیں۔ طبیعت میں تمکنت و غرور نہیں ہے۔ اپنی ممبری کے زمانے میں انھوں نے غریبوں کی کافی مدد کی۔ کٹروں کا سدھار کرایا۔ ان کی عمر ۱۹۷۱ء میں ۷۶ سال کی ہے۔

لالہ ست نرائن جی کی شادی لالہ پرشوری داس کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے دو لڑکے سری نرائن اور شیو نرائن اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔

سری نرائن دہلی کے مشہور و معروف ایڈوکیٹ ہیں۔ اور شیو نرائن بی اے ڈائرکٹر جنرل آف پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ہیں۔

پروفیسر رامچندر

ماسٹر صاحب پانی پت کے رہنے والے تھے۔ پانی پت میں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سندر لال بن ٹیک چند تھے جو دہلی کے باشندے تھے۔ دہلی میں نائب تحصیلداری اور تحصیلداری کی خدمت انجام دی۔ ان کے والد دفعتاً بیمار ہوئے اور ۱۸۳۱ء میں انتقال ہوا۔ چھ اولاد چھوڑیں۔ اس وقت ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ والد کی وفات کے وقت ماسٹر صاحب کی عمر نو سال کی تھی، ماں نے بڑی مشکلوں سے پالا پرورش کیا۔ ابتدائی تعلیم پرائیوٹ طور پر پائی۔ پھر ۱۸۳۳ء میں گورنمنٹ انگلش اسکول دہلی میں داخلہ لیا۔ اس وقت ہر طالب علم کو دو روپے مہینہ دیا جاتا تھا۔ ماسٹر جی کو بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ خوب دل لگا کر پڑھا۔[1]

گیارہ بارہ سال کی عمر میں خاندانی رواج کے مطابق خوشحال رائے کایستھ کی لڑکی سیتا سے انکی شادی ہوئی۔ ان کی اہلیہ گونگی بہری تھیں شاید لالچ میں (جیسا کہ ہندوستان میں اکثر ہوتا ہے) یہ رشتہ ہو گیا ہوگا[2] فکر معاش نے تعلیم چھڑائی محرری پر ملازم ہوئے۔ دو تین سال نوکری کرنے کے بعد ۱۸۴۱ء میں جبکہ دہلی کا مدرسہ کالج ہو گیا تو اس میں داخل ہوئے، بڑی محنت کی سینیر وظیفہ ۳۰ روپے ماہانہ پایا[2] ان کے بھائیوں کو بھی وظیفہ ملتا تھا جس سے خاندان کی گذر اوقات ہو جاتی تھی۔ ماسٹر صاحب ہر امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۴۴ء میں دہلی کالج میں شعبہ مشرقی میں پچاس روپے ماہانہ پر یورپین سائنس کے مدرس ہوئے۔

اسی زمانے ۱۸۴۴ء میں ورنیکولر ٹرانس لیشن سوسائٹی دہلی قائم ہوئی، جس کے سکریٹری مسٹر بتروس پرنسپل دہلی کالج تھے اور روح رواں ماسٹر رامچندر اور مولانا امام بخش صہبائی تھے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا:

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۰ [2] اے میموئر پروفیسر دلیو داس رامچندر ص ۶

(۱) عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت کی بلند پایہ کتب کا ترجمہ اردو، ہندی اور بنگالی زبانوں میں کیا جائے اور سب سے اول دیسی زبان کی درسی کتابیں تیار کی جائیں۔

(۲) ترجموں کو شائع کرنے نکرنے کی ذمہ داری انتظامیہ کونسل پر ہو۔

(۳) ابتدا میں انجمن چار پانچ سو صفحات کی ضخامت کی کتب ہی شائع کرنے کے لئے خریدے۔

ترجمہ کرنے کے لئے حسب ذیل قواعد مقرر کئے گئے:

(۱) اگر سائنس، تاریخ یا دوسرے علم میں کسی مستند لفظ کا ترجمہ اردو میں نہ ملے تو اس لفظ کو اپنا لینا ہی بہتر ہے۔

(۲) اگر دو مرکب الفاظ کا ترجمہ اردو میں نہیں ہے تو اسے ہی زبان میں شامل کر لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے کا پورے انگریزی فقرہ استعمال میں آجائے۔

(۳) اگر یہ قاعدہ بآسانی کسی مرکب انگریزی لفظ پر لاگو نہ ہو سکے تو پھر غیر لفظ کو زبان میں ملا لینا بہتر ہے۔

(۴) ہندوستانی انگریزی زبان سے واقف نہیں لہذا لازم ہے کہ ترجمہ کرتے وقت آسان اور بامحاورہ زبان استعمال میں لائی جائے، وہاں اگر کہیں اشارتاً کوئی انگریزی فقرہ لکھنا مقصود ہو تو حاشیے میں اس پر نوٹ دیدینا ضروری ہے تاکہ ناظرین کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو۔

(۵) دیسی زبانوں کی مفید جدید تالیفات اور انگریزی، سنسکرت، عربی کی اعلیٰ کتابوں کے مسودے بہ شرح ۶ آنے سے ایک روپیہ تک (حسب حیثیت تالیف یا ترجمہ) خریدے جائیں گے۔

ماسٹر رامچندر کالج سے فرصت پاکر حساب اور فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ کرتے اور پرنسپل اس کی اصلاح کرتے تھے۔ چنانچہ لوکل تعلیمی کمیٹی کی سفارش پر ۱۸۴۶ء میں ماسٹر صاحب کو حساب اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے کرنے کی اجازت دی گئی، جس پر آپ نے الجبرا اور علم مثلث پر کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ اس سوسائٹی نے سوا سو کے قریب کتابیں جو ترجمہ تھیں طبع کرائیں۔ اس نے علم ریاضی، تاریخ، سائنس، جراحی، جغرافیہ، مناظرہ، سوانح عمری، تذکرے اور ادب کے ساتھ حفظانِ صحت، علم نباتات، معدنیات، گرامر، طب، لغات، سیاسیات اور معاشیات کے بیش بہا اور نادر نسخے پیش کئے۔

ماسٹر رامچندر صاحب ابتدائی دور کے صفِ اول کے صحافی تھے۔ رسالہ فوائد الناظرین دہلی سے ۱۸۴۵ء کو جاری کیا۔ پہلے یہ ماہانہ تھا بعد میں پندرہ روزہ ہوگیا، پہلے چار صفحے پر پھر آٹھ صفحے پر نکلنے لگا

ماسٹر رامچندر ایڈیٹر اور سید علی صاحب نائب مدیر تھے۔

دہلی کے رسالوں میں باوقار جامع رسالہ فوائد الناظرین مانا جاتا تھا۔ اس میں نقشے و سائنٹفک مضامین کے علاوہ تاریخی اشخاص آلات کی تصویریں اور قطعات وغیرہ کے نقشے شائع ہوتے تھے۔ اکثر علمی بحثیں بھی ہوتی تھیں، خدا قادر و توانا، انسان کی تقدیر، عام توہمات، ذہانت، ضبط و نظم، اخلاقیات اور بالغوں کی تعلیم جیسے مضامین چھپتے تھے جس میں مذہب پر نکتہ چینی کی جاتی تھی، جن کو پڑھ کر لوگ ماسٹر صاحب کو بدمذہب اور ملحد سمجھتے تھے۔ اس اخبار میں یورپین علوم کی اشاعت بھی ہوتی تھی۔

دوسرا "خیر خواہ ہند" رسالہ ستمبر ۱۸۴۷ء کو شائع کیا، اس کے مہتمم و ایڈیٹر ماسٹر صاحب ہی تھے۔ اس نام کا رسالہ مرزا پور سے بھی نکلتا تھا، اس لئے اس کے دو نمبر نکال کے "محب ہند" کے نام سے نومبر ۱۸۴۷ء کو دوسرا رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس میں بڑے جامع و مستند مضامین چھپتے تھے۔

ماسٹر صاحب کو ریاضی سے خاص لگاؤ تھا، انھوں نے مطالعے سے اس میں بہت ترقی کرلی تھی ابتداء میں ریاضی کی کتابوں کے ترجمے کئے، جس سے ان کا ذوق و شوق اور بڑھ گیا۔ جبر و مقابلہ انگریزی کتابوں کی مدد سے تالیف کی۔ اس کے بعد اصول علم مثلث بالجبر اور تراش مخروطی اور علم ہندسہ بالجبر امیں لکھا، ۱۸۵۰ء میں جبکہ ماسٹر جی مغربی سائنس کی تعلیم دے رہے تھے، کلیات و جزئیات کتاب شائع کی، یہ کتاب کلکتے میں چھپی، کلکتے کے اخباروں اور رسالوں اور خاص طور پر کلکتہ ریویو نے اس پر مخالفانہ تنقید کی جس سے ماسٹر صاحب کو بہت مایوسی ہوئی۔

۱۸۵۱ء کی تعطیلوں میں ماسٹر صاحب کلکتہ گئے، دوستوں کی ایماء پر آپ نے کلکتہ کے اخبارات کی نکتہ چینیوں کا جواب دیا جو انگریزی میں شائع ہوا۔

کلکتہ میں دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے آپ کو آنریبل ڈی بیتھیون ممبر سپریم کونسل اور صدر لاکونسل آف ایجوکیشن سے ملاقات کرائی، انھوں نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور دو سو روپے عنایت کئے۔

ماسٹر صاحب نے یہ کتاب اپنے خرچ سے چھپوائی تھی جس کے لئے انھیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ قرض بھی لیا۔ مسٹر بیتھیون نے اس کتاب کے نسخے لوگوں کے پاس بھجوائے، جس میں ایک پروفیسر ڈی مارگن، پروفیسر ریاضیات لندن یونیورسٹی بھی تھے۔ پروفیسر مارگن نے اس کتاب کی بہت قدر

کی اور کورٹ آف ڈائرکٹر ایسٹ انڈیا کمپنی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اپنے خط میں ماسٹر صاحب کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی اور یہاں تک لکھا تھا کہ :"رامچندر کی کتاب کے انتخابات اس ملک (انگلستان) کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شریک کئے جائیں۔"

غرض ایک مدت کی خط وکتابت کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹر کے ممبروں نے ایک خلعت پنج پارچہ اور دو ہزار روپے نقد بطور انعام ماسٹر رامچندر کے لئے منظور کیا۔ ۱۸۵۹ء میں مسٹر ولیم ڈی آرنلڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے دہلی میں ایک مجلس کی اس میں تمام معززین، امراء اور افسروں کو مدعو کیا۔ اس مجلس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ فضیلت پناہ ماسٹر رامچندر کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات پر سرکار کی طرف سے خلعت عطا کیا جائے۔ چنانچہ رقم اور یہ خلعت اس جلسے میں عطا کیا گیا۔

اس کے علاوہ ماسٹر صاحب نے ایک کتاب جس میں تفرقی احصا کا ایک نیا طریقہ بیان کیا، اس پر پروفیسر کلانڈ اڈنبرا یونیورسٹی اور پروفیسر اینڈریوس نے بہت اچھی رائے کا اظہار کیا۔ ان کتابوں کے شائع ہونے سے ماسٹر صاحب کی اور شہرت ہوگئی اور ان کے ایجاد کئے ہوئے طریقے یورپ اور ہندوستان کے کالجوں میں رائج ہوگئے۔[۱]

دہلی میں مشنریوں کا مرکز دہلی کالج بنا ہوا تھا۔ مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج اور ماسٹر رامچندر عیسائیت کا پروپیگنڈہ کرنے میں پیش پیش تھے، طلبا، عیسائیوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے ناواقف تھے، اس لئے ماسٹر رامچندر ان پر چھا جاتے تھے، چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اس ماحول کا ذکر اپنے لکچر میں کیا ہے:

"سائنس کی صدائیں کالج کے در و دیوار میں پڑی گونج رہی تھیں بلکہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ گونجتے گونجتے ڈھول بجنے لگے یعنی سائنس کے پروفیسر جناب ماسٹر رامچندر صاحب جو ذات کے کایستھ تھے اور جنھوں نے "میکسما اینڈ منیما" تصنیف کر کے تمام یورپ میں اپنی ریاض دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اصطباغ لینے پر آمادہ ہوئے۔ وہ علمی سوسائٹی میں بڑے نامی نامور آدمی تھے اور انھوں نے ٹونکے کی چوٹ

[۱] مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۳

عیسائی ہونا چاہا تو تمام شہر میں ڈھنڈورا سا پٹ گیا۔ اور جا بجا مباحثے کی مجلسیں گرم ہو گئیں۔ عربی جماعتوں مولویوں اور طالب علموں کے ساتھ بھی آئے دن جھوڑ ہوتی رہتی تھی۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ مولوی چپ تو نہیں ہوتے تھے۔ کچھ نہ کچھ کہے ہی جاتے تھے مگر وہ کہنا سمجھنے والے کے نزدیک لاجواب ہونے کے برابر تھا اس لئے کہ یہ لوگ عیسائی مذہب کے کونے کھدرے سے محض ناواقف تھے۔ ان کو خبر ہی نہ تھی کہ عیسائیوں کہاں کہاں پانی مرتا ہے۔ ورنہ نرا معاوضہ بالمثل ماسٹر صاحب کو بند کرنے کے لئے بس کرتا تھا۔ غرض بات کہوں صاف سائنس کے زہر نے باوجود یکہ میں نے اس کو ذرا چکھا ہی تھا۔ میرے ایمان کو ڈانواڈول کر دیا تھا[۵]۔"

غرض ماسٹر صاحب پر عیسائیوں کے خیالات کا اثر اور مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کے جادو کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے ۱۱ر جولائی ۱۸۵۲ء کو بپتسمہ لیا۔ گویا عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ ان کے ساتھ ہی ڈاکٹر چمن لال اسسٹنٹ سرجن بھی عیسائی ہو گئے۔ جس سے دہلی میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ اس ہنگامے کی خبر دہلی اردو اخبار نے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۲ء کے شمارے میں شائع کی۔ سرخی کا عنوان تھا "رامچرن اور چمن لال نو مریدوں کی خبر" :

> "دو صاحب دہلی کے رئیس نے اپنی حویلی بوقت ہندوستانی مجلس کے لئے کھول دی تھی اور ہندوؤں اور اہل اسلام کی دعوت کی کہ دین کے مقدمہ کی خوب تحقیق کریں فقط ایک شرط تھی کہ جو شخص اپنے دین کی بے بنیادی کا قائل ہو جائے اس پر یہ فرض ٹھہرا کہ اسے چھوڑے اور سچے دین کو اختیار کرے۔ اس مجلس میں رامچرن اور چمن لال دونوں شامل تھے اور دین عیسوی کی سچائی کے قائل ہو کے دونوں نے اسے منظور کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اتوار کو جب گرجا گھنٹہ بجانے لگے، ایک بڑی بھیڑ فوراً چاروں طرف سے دوڑی، پادری صاحب اتوار کی نماز پڑھتے پر بلڑ کے سبب تمام نہ کر سکے۔ اسی حالت میں باقی نماز کو چھوڑ دیا۔ اور حوض کے پاس جا کے مریدی نو اہوں کو بلایا، جبکہ اصطباغ ہو چکا۔ ایک بڑی بھیڑ نے دونوں

[۵] ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے لکچروں کا مجموعہ ص ۳۲۴

لگا پیچھا کیا۔ اور ظاہر ضرر پہنچانے پر مستعد ہوئے، پر دونوں نے ہسپتال میں
پناہ لی اور پھاٹکوں کو بند کرا لیا۔"

عوام میں اس قدر غصہ تھا کہ ماسٹر صاحب کے ایک شاگرد نے ان کے عیسائی ہونے پر حسب ذیل دو قطعے کہے۔ شروع میں استاد کے احترام کا خیال کیا، اس لئے ان کو نہیں سنائے۔ لیکن آخر لوگوں کے اصرار پر سنانے پڑے۔ ے

ہزدہ صد پنجاہ و دو یازدہم جولائی — ماسٹر ڈاکٹر ہند کرشتان گشتند
ایں ندا از دہن خلقِ خدا بر ترشد — آمدن بر دو لعینان بہ جہنم رفتند

رام چندر بہ مذہب عیسیٰ — طوق لعنت کشید در گردن
ہاتف نغمہ زد کہ آں بے آب — در جہنم رسید تر دامن

ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال کے عیسائی ہونے سے دہلی کالج کو بھی دھچکا لگا۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۵۲ء تک کالج میں برابر داخلہ ہوتا رہا۔ لیکن ۱۱ر جولائی کے بعد ان دونوں کے عیسائی ہونے کی خبر اڑنے پر داخلہ بند ہو گیا اور طلباء نے نام کٹوانے شروع کر دئے۔ اور فوراً ہی چوبیس پچیس لڑکوں نے اپنے نام کٹوا دئے تھے[1]

مذہب کی تبدیلی کی وجہ سے ماسٹر رامچندر صاحب سے تمام تعلقات ذات اور برادری کے منقطع ہو گئے تھے اور انگریزوں سے جس طرح ہندوستانی نفرت کرتے تھے ان سے بھی جلنے لگے تھے۔ اس کی وجہ سے ماسٹر صاحب کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑی اور ان کے مزاج میں ایک قسم کی سختی اور خشونت پیدا ہو گئی تھی جو مناظرے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی[2] جو ان کے شان کے شایاں نہیں تھی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتداء جب دہلی میں ہوئی اور میرٹھ کے مجاہدین دہلی میں آ گئے تو دہلی والے بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اور ان لوگوں کو جو عیسائیت کا پروپیگنڈہ کرتے تھے یا عیسائیوں کے مرکز تھے، انھوں نے پہلے روز سے ہی ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ان سے انتقام لینا شروع کر دیا۔

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۴۸ [2] تاریخ ادب سکینہ دوم ص ۸۰

دریا گنج کے انگریزوں کو مارتے ہوئے لال قلعہ کے پاس پہنچے، ڈاکٹر چمن لال کا ہسپتال نظر آیا، اس کو تہ و بالا کیا اور ڈاکٹر صاحب کو ختم کرنے کے بعد مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کے پاس فرشتہ اجل بن کر پہنچے، ان کو قتل کیا۔ دن کے بارہ بجے کے قریب دہلی کالج کا کتب خانہ لٹنا شروع ہوا، انگریزی کی کتابوں کی خوب صورت جلدیں پھاڑ دیں اور ورقوں کا کالج کے تمام باغ میں دو دو انچ موٹا فرش بچھا دیا، سائنس ڈیپارٹمنٹ میں جتنے آلات تھے انھیں بھی توڑ پھوڑ ڈالا اور لوہا پیتل وغیرہ دھاتیں لے گئے۔ یہاں تک کہ دروازوں کی چوکھٹ تک نکال کر لے گئے۔[1]

ماسٹر رامچندر صاحب ان ایام میں چاندنی چوک کے ایک کوٹھے پر رہتے تھے، جب انھوں نے مجاہدین کی شورش دیکھی، عیسائیوں اور انگریزوں کے قتل کی خبر سنی تو اپنے بالاخانہ سے پیدل چل کر پن چکی کی سڑک پر ہوتے ہوئے قلعے کے سامنے آئے، انھوں نے دیکھا کہ چند ترک سوار یا مغلوں کا دستہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ہوئے لال ڈگی کی سڑک پر آرہا ہے، یہ اسے دیکھ کر اپنے گھر کی طرف مڑ گئے اور چاندنی چوک کے کوٹھے پر صحیح وسلامت پہنچ گئے، وہاں سے ان کے بھائی رام شنکر داس اپنے ساتھ لے گئے اور کالیستھوں کے محلے میں اپنے کسی عزیز کے ہاں جا چھپایا۔ مگر ان کے اقربا نے اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے کہیں ہم پر کوئی آفت نہ آجائے، ان کو وہاں زیادہ رکھنا گوارا نہ کیا۔ انکا ایک قدیم نوکر جاٹ تھا، اس نے بڑی رفاقت اور وفاداری کی، انھیں جاٹ بنا کر گنواروں کے کپڑے پہنا کر، پگڑ بندھوا کر گاؤں لے گیا، وہاں رکھا۔ وہاں سے ماسٹر صاحب باؤلی کی سرائے میں انگریزی لشکر سے جا ملے[2] اور جب شہر میں امن وامان ہو گیا تو واپس آ گئے۔ اس واقعے کو ماسٹر رامچندر نے تحریر کیا ہے اور مذکورہ واقعہ سے جو مولانا عبدالحق صاحب نے تحریر کیا ہے کچھ مختلف ہے[3]:

"باغیوں نے تو مجھے بہت تلاش کیا مگر میرے چھوٹے بھائیوں نے جو ابھی تک ہندو ہیں مجھے میرے آبائی مکان کے زنان خانے میں چھپا دیا جو ایک گلی میں واقع تھا میرے پڑوسیوں اور جان پہچان والوں نے بھی از راہ کرم مجھ سے بے وفائی

[1] دہلی اردو اخبار ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء [2] مرحوم دہلی کالج ص ۶۲

[3] اے میمویر پروفیسر ییسوداس رامچندر ص ۱۰۲

نہ کی۔ تیسرے روز یعنی ۱۳ رمئی، ۱۸۵۷ء کی شام کو جب اندھیرا چھاگیا، تو میں اپنے دو ملازموں کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلا، یہ لوگ مجھے دہلی سے کوئی دس میل دور منتولا گاؤں میں لے گئے میں اس گاؤں میں تقریباً ایک ماہ تک اس خطرے میں بھی ٹھہرا رہا کہ جس زمیندار نے مجھے از راہِ عنایت اپنے یہاں رکھا ہے اس کے مخالفین کہیں میرا پتہ نہ بتا آئیں۔ یہاں میں روزانہ زمینداروں کو انگریزوں کے ذرائع، قوت اور علم کے بارے میں بتاتا اور انہیں سمجھاتا تھا کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ انگریز ہمیشہ کے لئے جا چکے ہیں۔ ۱۰ رجون، ۱۸۵۷ء کو باغیوں کا ایک دستہ گاؤں سے ہو کر گذرا، اور کسی نے انھیں بتایا کہ یہاں ایک عیسائی ٹھہرا ہوا ہے مگر میرے بوڑھے ملازم کو چند منٹ پہلے اس کی اطلاع ہو چکی تھی، اس لئے مجھے جگا کر خطرے سے آگاہ کیا۔ پہلے تو میں یہ جانتے ہوئے بھی زمیندار کے گھر کے اندر چھپا رہا کہ اب مجھے ڈھونڈ کر مار ڈالا جائے گا۔ مگر ایک بہت ہی ہوشیار برہمن زمیندار نے مجھے اور ملازم کو مشورہ دیا کہ ہم باغیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جنگل میں پہنچ جائیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا مگر ابھی ہم کوئی پون میل بھاگے ہوں گے کہ گاؤں میں شور غل سنائی دیا۔ ہم لوگوں کے چاروں طرف گولیاں سنسنا رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ سوار ہمارا پیچھا کر رہے ہیں کیونکہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی میں اس وقت ایک خار دار جھاڑی میں گھس گیا۔ ان کانٹوں کا خیال کئے بغیر جو میری بوٹی بوٹی میں پیوست تھے خدا کی عنایت سے باغیوں نے لوٹنے کھسوٹنے اور ان زمینداروں کی خاصی پٹائی کرنے کے بعد جن کے ساتھ میں گاؤں میں رہا تھا۔ جنگل میں گھسنے کی بجائے دہلی کی سمت اپنی راہ لی جب گاؤں کی طرف کچھ سکون ہوا تو میں اپنے پرانے جاٹ ملازم کے ہمراہ سارا جنگل کھنگالتا ہوا بہ مشکل تمام ۱۲ رجون ۱۸۵۷ء کو انگریزی کیمپ میں جا پہنچا۔"

انگریزی کیمپ میں ماسٹر صاحب کو دہلی سے روزانہ پہنچنے والی خبروں کا مترجم مقرر کیا گیا۔ وہاں ۲۰ رستمبر، ۱۸۵۷ء تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد دہلی واپس چلے آئے۔

جب دہلی انگریزوں نے فتح کرلی تو انگریزی فوجیوں نے حکومت سے درخواست کرکے ایک محکمہ پرائز ایجنسی کا قائم کیا، جس کا کام یہ تھا کہ دہلی میں تین دن کے اندر جو مال لوٹ کا جمع ہو جائے اس کو نیلام کرکے اس کا زر نقد فوج میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس محکمے کے کارکنوں نے اس کے کاموں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ کسی نے شہر کے تیغوں کو توڑ کر اور زمین کو کھود کر مال نکالنے کا کام اپنے ذمے لیا۔ کسی نے کتابوں کو جمع کرنے کی ڈیوٹی اپنے ذمے لی، اور کوئی برتنوں، چارپائیوں اور چکیوں کے جمع کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ انگریزوں نے ماسٹر رامچندر سے اپنا دھرم چھڑوا کر عیسائی بنوایا اور جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی کوٹھی بھی اپنی غرض کے لئے استعمال کیا، جس میں انگریزی فوجی لوٹی ہوئی کتابیں جمع کرتے تھے[1]

ماسٹر صاحب جنوری ۱۸۵۸ء میں نیٹو ہیڈ ماسٹر ٹامسن سول انجنیرنگ کالج رڑکی مقرر ہوئے۔ ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ چند ماہ کے بعد دہلی پہنچے۔ ستمبر ۱۸۵۸ء کو دہلی ڈسٹرکٹ اسکول کے عارضی ہیڈ ماسٹر لگائے گئے۔ مسٹر کلارک جو اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے کے آجانے کے بعد انھیں ریاضی کا استاد مقرر کیا۔ تنخواہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ اور ایک سو پچاس روپے ماہوار پنشن ملتی رہی۔

ماسٹر صاحب بہت اچھے مدرس تھے، اپنے شاگردوں پر بہت شفقت کرتے تھے اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ عیسائی ہونے کے باوجود آپ کا شاگرد بہت ادب کرتے تھے۔ اور خلاف مرضی بھی آپ کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب جو ماسٹر جی کے شاگرد تھے۔ جب ماسٹر صاحب نے مذہب اسلام کی تردید میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی تھی۔ ماسٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ کرنے کے لئے کہا، آپ نے بسر و چشم اس کا ترجمہ کر دیا۔ جس پر ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خلاف بڑا شور و غوغا ہوا۔ یہاں تک کہ مولوی عبدالقادر صاحب فتوے کے لئے پھرے کہ ڈپٹی صاحب کا نکاح رہا یا گیا[2]

پنشن پانے کے بعد ۱۸۶۶ء کو ماسٹر صاحب کو راجہ مہندر سنگھ کے اتالیق کی حیثیت سے

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، جلد سوم ص ۴۴۱ [2] حیات النذیر حصہ چہارم

پٹیالہ کے دربار میں ملازمت مل گئی۔ ان کی خدمات کو حکومت ہند اور سرکار پٹیالہ نے بہت سراہا اور جب مہاراجہ جولائی ۱۸۶۸ء کو تخت نشین ہوئے تو ماسٹر صاحب کو ایک ہزار روپے کی جاگیر اور خلعت عطا کیا۔

۱۳ر جون ۱۸۷۰ء کو جب ریاست پٹیالہ میں محکمہ تعلیم قائم ہوا، تو ان کو اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔ ان کے ملازمت کے دور میں تعلیم کافی پھیلی۔ پٹیالہ کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ نے ان کی پنشن مقرر کر دی تھی۔

ماسٹر صاحب کی پہلی بیوی سیتا، ۲ فروری ۱۸۷۰ء کو فوت ہو گئی تھیں۔ انھوں نے دوسری شادی ایک بنگالی عورت سے مئی ۱۸۷۱ء میں کی۔ ان کی دوسری بیوی عیسائی تھی جو عیسائی عورتوں کی فلاح کے کاموں سے دل چسپی رکھتی تھی اور بیواؤں کی ایک سوسائٹی کی روح رواں تھی۔

دہلی سوسائٹی کے ماسٹر پیارے لال، منشی ذکاءاللہ صاحب جہاں روح رواں تھے، وہاں ماسٹر رامچندر صاحب بھی سوسائٹی کے کاموں میں بے حد حصہ لیتے تھے اور رہنمایانہ حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ ان کو ابتدائی مٹنگ ۲۱ نومبر ۱۸۶۵ء میں یونیورسٹی کی سب کمیٹی اور انتخاب مضامین کی سب کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا۔ یہ سوسائٹی کی مٹنگوں میں شرکت کرتے تھے، انھوں نے ۱۸۶۶ء کی ایک مٹنگ میں اپنا مضمون تعلیم نسواں پر، دوسرا مضمون ۱۸۷۲ء کی ایک مٹنگ میں سرکار کا فرض ہے کہ "علوم فنون سکھائے اور کارخانے لگوائے" اور تیسرا مضمون ۱۸۷۴ء کی ایک میٹنگ میں "بھونچال" سنایا ــــــ سوسائٹی کا قاعدہ تھا کہ مٹنگ میں جو بھی مضمون پڑھا جاتا تھا، اس پر ممبران بحث کرتے تھے، چنانچہ ماسٹر صاحب بھی ان بحثوں میں حصہ لیتے تھے۔

۳۱ جولائی ۱۸۷۲ء کی میٹنگ میں ماسٹر جیند و لال مترجم کمشنری دہلی نے اپنا ایک مضمون "تعلیم یافتہ لوگ اپنے تئیں اور اپنے ملک کو کس طرح زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں" پڑھا۔ اس مضمون پر تبادلہ خیال ہوا جس میں ماسٹر کنھیا لال، ماسٹر لچھمن داس، پادری تارا چند اور ماسٹر رامچندر صاحب نے حصہ لیا۔

پادری تارا چند صاحب نے کہا اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک آدمی جس نے اعلیٰ درجے کی تعلیم پائی ہے ان لوگوں پر جو علم سے بے بہرہ ہیں فوقیت رکھتا ہے۔ تعلیم یافتہ کا فرض ہے کہ وہ اوروں

کو ان باتوں سے جو اس نے حاصل کی ہیں فائدہ پہنچائیں۔ جیسا کہ ماسٹر چندو لال صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ کچہریوں میں علاقہ جات حاصل کریں کیونکہ ان کو ایسی جگہ بہت سے موقع عوام سے ملنے گفتگو کرنے کا حاصل ہو سکتا ہے، دویم انگریزی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے وسیلے سے، سویم اپنے ہم وطنوں سے با اخلاق پیش آنے اور اکثر ان کے ملنے جلنے سے۔

اس کے بعد ماسٹر رامچندر نے کہا "بلاشبہ ان لوگوں کے جنھوں نے اعلیٰ درجے کی تعلیم زبان انگریزی کی پائی ہے کچہریوں میں علاقہ جات حاصل کرنے سے بڑا فائدہ ان کے ہم وطنوں کو ہوگا۔ ان سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے غریب اور جاہل ہم وطنوں سے بڑی مروت سے پیش آئیں گے۔ اب یہ بات رہی کہ یہ لوگ کیوں کر کچہریوں میں علاقہ جات حاصل کر سکیں اس کے لئے یہ بات مناسب ہے کہ قوانین کی کتابیں مدارس میں اور کتابوں کے ساتھ پڑھائی جائیں تاکہ حکام ایسے آدمیوں کو علاقہ جات دیں۔"[1]

ماسٹر صاحب کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ تذکرۃ الکاملین کے مصنف بھی تھے جس میں روم اور یونان کے مشہور و معروف فلاسفروں اور شعراء کے مختصر حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں اس میں بعض انگریزی شعراء اور فلسفی بعض مشہور اہلِ ہند مثلاً والمیک شنکراچارج اور بھاسکر جوتشی کے حالات بھی درج ہیں۔

یہ کتاب پہلے ۱۸۴۹ء میں چھپی، دوبارہ ۱۸۷۵ء میں مطبع نولکشور میں طبع ہوئی۔ عجائب روزگار بھی آپ کی تالیف ہے، جس کا قلمی نسخہ میرے والد ماجد مولانا اشرف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے میں ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ ہے۔

بھوت نہنگ، اصول گورنمنٹ کے، اصول علم حساب جزئیات و کلیات۔ سریع الفہم، رسالہ اصول کلوں کے باب میں۔ یہ کتابیں بھی ماسٹر صاحب کی تالیف ہیں۔

ماسٹر رامچندر صاحب نے قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تین کتابیں اعجاز القرآن، رسالہ مسیح الدجال، اور رسالہ تحریف القرآن لکھی ہیں۔ اور ان میں رکیک حملے کئے ہیں۔

[1] رسالہ دہلی سوسائٹی اگست ۱۸۷۲ء

ماسٹر رامچندر صاحب کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی ـــــ وہ آئے دن بیمار رہتے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں جب کہ ان کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی، ان کو اپنی خرابی صحت کی وجہ سے پنشن کی درخواست دینی پڑی۔

اس کے بعد ماسٹر رامچندر صاحب کی صحت رفتہ رفتہ گرتی ہی گئی ـــــ بالآخر ۱۱ اگست ۱۸۸۰ء کو ۵۹ سال کی عمر میں فوت ہوئے ـــــ

جناب مولوی رشید الدین خاں دہلوی

مولوی رشید الدین خاں بن امین الدین بن وحید الدین کشمیر الاصل تھے۔ دہلی میں بلبلی خانہ بازار سیتارام میں رہتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کے رشتہ دار تھے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ عبدالقادر سے ابتدائی تعلیم پائی۔ لیکن تمام علوم وفنون کی تکمیل مولانا رفیع الدین صاحب سے کی۔ مولانا رفیع الدین صاحب آپ کی تربیت پر خاص توجہ فرماتے تھے جیساکہ باپ بیٹے پر توجہ دیتا ہے۔ آپ بھی ان کی خدمت میں اکثر وبیشتر رہتے تھے۔ گرچہ آپ کو تمام علوم وفنون میں ملکہ حاصل تھا، لیکن ہیئت وہندسہ میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔[1]

مولوی صاحب انتہائی متقی وپرہیزگار ومتشرع بزرگ تھے، حکام وقت آپ کو عہدہ قضا پر مامور کرنا چاہتے تھے تاکہ آپ کی دیانت داری اور عدل وانصاف سے خلق اللہ مستفید ہو۔ لیکن آپ نے اپنی معروفیت کی وجہ سے اس عہدے کو قبول نہیں کیا۔

آپ عوام الناس میں تعلیم پھیلانے کو مقدم وضروری سمجھتے تھے، اس لئے دہلی کالج کی مدرسی کی۔ سو روپے ماہوار پر مقرر کیا۔ غریبوں سے آپ کو ہمدردی تھی، سخاوت کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ قدمے درمے اور سخنے فقیروں محتاجوں، للاوارثوں اور مسکینوں کی مدد کرتے تھے۔ مباحث علمی اور دینی علوم کی تعلیم پر زیادہ توجہ تھی اس لئے شعر وشاعری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ مولوی رشید الدین خاں اور شیخ احمد شیروانی صاحب نفحۃ الیمین کے خطوط کا ایک مختصر مجموعہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں "المکاتیب" کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوا۔

آپ نے مدت العمر فرقہ امامیہ کے مجتہدین سے مباحثہ ومناظرہ کیا۔ مسئلہ متعہ کے بارے میں

[1] آثار الصنادید ص ۵۱

لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں ایک کتاب "الصولۃ الغضنفریہ" تحریر فرمائی۔ ان کی دوسری مشہور کتاب شوکت عمریہ ہے، جو "بارقۂ ضیغمیہ" کے جواب میں لکھی گئی۔[1]

شاہ اسماعیل شہید جہاں رد بدعت و شرک میں گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے، وہاں وہ مسائل آمین بالجہر، قراۃ خلف امام، امکان نظیر اور امتناع نظیر پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ جب ان مسائل میں زیادہ اختلاف پیدا ہوا تو ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں جامع مسجد دہلی میں ہر دو فریق کے درمیان ایک مباحثہ ہوا، جس میں ایک فریق کی طرف سے مولوی عبدالحئ صاحب داماد شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ اسماعیل شہید اور دوسرے فریق کی جانب سے مولوی رشیدالدین خاں، مولوی مخصوص اللہ اور مولوی محمد موسیٰ فرزندان شاہ رفیع الدین دہلوی تھے۔ اس مباحثہ کی پوری روئیداد و کیفیت مولوی برہان الدین سکنہ دیوہ نے ایک رسالہ میں قلمبند کی تھی، جو رسالہ "محاکمہ" کے نام سے چھپا۔ اسی بحث کے سلسلے میں تنبیہ الغافلین وہدایت الصالحین وغیرہ رسالے بھی شائع ہوئے۔ جو مطبع سیدالاخبار ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں چھپا۔ اس میں تقلید کے جواز میں علماء دہلی و حرمین شریفین کے فتوے درج ہیں۔[2]

آپ کی قابلیت ولیاقت و ذہانت و فراست کا ہر شخص معترف تھا۔ چنانچہ مولوی بشیرالدین صاحب مؤلف واقعات دارالحکومت دہلی تحریر فرماتے ہیں:

"جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول عالم باعمل تھے۔ طریقہ مناظرے کا ایسا لاجواب تھا کہ تقریر یا تحریر میں خصم کو بجز اعتراف عجز کے چارہ تھا۔ تقویٰ و زہادت و تشرع و عبادت محتاج بیان نہیں۔"

صاحب تذکرہ علماء ہند بھی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ذہن وقاد وطبع نقاد و در علم کلام کمالی وافر داشت۔"

لیکن مولوی عبدالقادر رامپوری مؤلف وقائع عبدالقادر خانی جبکہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "اب اس شہر میں ان جیسا دوسرا نہیں ہے۔" مگر ان کی ذات پر حملہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۶۳ [2] علم و عمل، اول ص ۲۵۳

"ان سب بزرگواروں (شاہ محمد اسماعیل، مولوی رفیع الدین، شاہ عبد القادر) کے شاگرد رشید خاں تھے، اگرچہ اتنے تیز فہم نہ تھے مگر تعلیم و تعلم کی خوب مشق تھی ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے مگر مناظرہ میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے "نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے"۔ ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے، جو کچھ لکھتے بسط و تفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز و طویل، بالخصوص مباحثہ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں رد و قدح کی گنجائش نہیں رہی"۔ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا مقدمہ کئی جز کا ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح و بسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں پوری ہو جائے گی۔ اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء۔ اس کے جواب کی فکر میں مرجائیں گے۔ اور گریباں سے سر نہ اٹھا سکیں گے۔"

آپ کی ہر ذی علم عزت کرتا تھا ——— حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کے والد ماجد اکبر بادشاہ بھی آپ کو بمنت اکثر قلعہ معلیٰ میں بلاتے تھے۔ اور تسبیح خانے میں بیٹھ کر آپ کی نصیحتوں اور ارشادات کو سنتے اور حدیث نبوی کی توضیحات و تشریحات کو سُن کر مستفیض ہوتے تھے اور عزت و تکریم کے ساتھ خلعت فاخرہ دے کر رخصت فرماتے تھے[۱]۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کی تصانیف مذکورہ کتابوں کے علاوہ حسب ذیل بھی تھیں ——— :

(۱) لطافۃ المقال

(۲) تفصیل الاصحاب

(۳) اعانۃ الموحدین

(۴) اہانۃ الملحدین ——— موخر الذکر کتاب راجہ رام موہن رائے کے رسالے کے رد

[۱] جام جہاں نما کلکتہ ۶ ستمبر ۱۸۲۶ء

میں لکھی گئی تھی۔

مولوی صاحب ستر برس کی عمر میں حج بیت اللہ کا ارادہ کر رہے تھے جو پورا نہیں ہوا۔ اور مرض صعب میں مبتلا ہو گئے[1] اور ۱۸۳۳ء مطابق ۱۲۴۹ھ میں فوت ہوئے۔

آپ کے تلامذہ کافی تھے۔ آپ کے ارشد تلامذہ مولانا مملوک علی نانوتوی تھے جن کے شاگرد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے —— آپ کی ذات سے علوم دینی کو کافی فروغ ہوا۔

---

[1] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دویم ص ۴۱۰

سید سردار علی صاحب تابؔ نقشبندی دہلوی

تابؔ صاحب کے والد سید علی صاحب نانگلوئی دہلی کے دیہات میں پیدا ہوئے۔ نانگلوئی کے زمیندار تھے، وہیں ان کی بہت سی زمینیں تھیں، خدمت خلق کا جذبہ ان میں تھا، بہت سے دیہاتیوں کی مالی مدد کرتے تھے۔ نانگلوئی میں ایک دینی مدرسہ بھی جاری کیا تھا اور مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔

تابؔ صاحب بھی ۱۸۹۲ء میں نانگلوئی میں پیدا ہوئے، دہلی میں ان کے والد نے ۱۹۱۰ء میں سکونت اختیار کی۔ تابؔ صاحب نے چھتہ شاہ جی کے سکول میں جس کے ہیڈ ماسٹر عبدالستار صاحب تھے، تعلیم پائی۔

خلافت کے دور میں مولانا محمد علی مرحوم کی تقریروں نے ان کے دل پر اثر کیا۔ خلافت کور میں والنٹیر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور خلافت کی تحریکوں میں جیل گئے۔ پہلی مرتبہ ایک سال اور دوسری مرتبہ دو سال کی قید کاٹی۔

جب خلافت کمیٹی اور کانگریس کا اتحاد عمل ہوا، اور سودیشی کی تحریک چلی، اس میں آپ نے کافی حصہ لیا۔ آپ وارڈ ۹ کانگریس کمیٹی چوڑی والان کے عرصے تک سکریٹری بھی رہے اور اس زمانے میں چھ مہینے کی سزا ہوئی، ملتان جیل میں اسیری کے دن گذارے۔

۱۹۳۶ء میں محمد عثمان کے ساتھ ایک والنٹیرز کور قائم ہوئی، جس نے شہر کے لوگوں کی مصیبت کے وقت امداد کی، آگ بجھانے میں حصہ لیا۔ لاوارث میتوں کو دفنایا۔ بہت سے جلوسوں اور جلسوں میں شامل ہو کر ان کے انتظامات کئے۔

۱۹۴۷ء میں یہ کور خلاف قانون قرار دی گئی اور تابؔ صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تو یہ لاہور چلے گئے۔ وہاں بھی خدمت خلق کرتے رہے اور اصلاحی و سیاسی کاموں میں حصہ

لیتے رہے۔

پاکستان میں میرے لئے اگر کوئی کشش ہے تو یہ ہے کہ دہلی کے دوست احباب کافی وہاں پہنچ گئے ہیں، ان خاص دوستوں میں تائب نقشبندی بھی تھے۔ لیکن افسوس جتنی مرتبہ پاکستان گیا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ایسی پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے ان سے ملاقات نہ ہوسکی اور ایک دن یہ خبر اخبار جنگ میں پڑھی کہ ۷ مئی ۱۹۵۱ء کو دن کے دس بجے تائب صاحب انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تائب صاحب ایک اچھے نثر تھے۔ دوستوں کی مصیبت میں کام آنے والے انسان تھے، محبت بھرا دل انھوں نے پایا تھا۔ قومی کاموں کے لئے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، اس لئے مالی حالت کبھی درست نہیں ہوئی، جو کچھ ورثے میں ملا تھا وہ قوم کے نذر کر دیا۔

اچھے شاعر تھے، اخبارات و رسائل میں ان کی غزلیں اور نظمیں چھپتی تھیں۔ استادی مولانا ناصر جلالی سے خاص تعلقات تھے، ان پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔ ان کی ہی سعی وجد و جہد سے رسالہ "اذان" ماہنامہ کراچی نکالا، جس کے سرپرست حضرت مولانا ناصر جلالی تھے۔ تائب صاحب کی ایک غزل دستیاب ہوئی ہے ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔[۱]

فنافی الوفا ہوں، جفا چاہتا ہوں — میں اپنے کیے کی سزا چاہتا ہوں
الٰہی! تکالیفِ دنیا کے بدلے — فقط ایک آہِ رسا چاہتا ہوں
نہ عزت کی خواہش نہ دولت کی پروا — نگاہِ وفا، آشنا چاہتا ہوں
ہیں دیر و حرم سجدہ گاہِ خلائق — مگر میں ترا نقشِ پا چاہتا ہوں
فنا ہو رہی ہے نگاہوں میں دنیا — کہ محوِ نظارہ ہوا چاہتا ہوں
ستم لاکھ کیجئے، تغافل نہ کیجئے — کہ میں درد بھی بامزا چاہتا ہوں
مرے درد کی ابتدا کرنے والے — میں اب درد کی انتہا چاہتا ہوں

ازل سے جو توبہ کی عادت ہے تائب
تو ہر دم خطا ہی خطا چاہتا ہوں

[۱] عوامی رائے دہلی

جناب سردار علی صابری صاحب ایڈیٹر اخبار آزاد، دہلی

آپ کا کابل کے پرانے خاندان سے تعلق ہے۔ آپ کا خاندان سپاہی پیشہ تھا۔ آپ کے پردادا عبداللہ ۱۸۰۰ء کے آغاز میں غزنی کابل سے رام پور تشریف لائے۔ یہاں آپ ریاست کے وزیر بنائے گئے، طبیعت میں سختی تھی۔ ڈسپلن کے پابند تھے، اور بڑے بہادر شجاع اور قوی ہیکل تھے، ایک ہیجڑے نے پیچھے سے آکر آپ پر تلوار کا وار کیا، جاں بحق ہو گئے۔

آپ کے دادا اشرف علی خاں پانچ چھ سال کے تھے کہ رام پور سے اپنی والدہ کے ساتھ مرشد آباد کلکتہ چلے گئے اور مولانا شریف اللہ صاحب کے یہاں مقیم ہوئے۔ انھوں نے ہی آپ کو تعلیم دلوائی اور اپنی پوتی کی، مولوی محمد عظیم کی لڑکی سے شادی کی۔ آپ کلکتہ میں ہائی کورٹ کے چیف ٹرانسلیٹر تھے۔ غدر سے تین چار سال قبل کانپور آگئے۔

صابری صاحب کے والد ماجد شہزاد علی خاں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ پوری زندگی کانپور میں زمینداری میں گذاری۔ آپ کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا، آپ شاہ کریم اللہ ضلع پانی پت کے خلیفہ تھے۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو انتقال فرمایا۔

صابری صاحب ۲۱ فروری ۱۹۰۱ء مطابق یکم ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ میں محلہ ناظر باغ کانپور میں پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی نام محمد سردار علی خاں ہے جس سے ۱۳۱۸ھ نکلتا ہے۔

آپ نے اپنی والدہ سے ابتدائی اردو وغیرہ کی تعلیم پائی۔ مشن سکول میں داخل ہوئے۔ نصرانیت کا غلبہ ہوا، ۱۹۱۲ء میں میتھوڈسٹ سکول میں مشن کی جانب سے الٰہ آباد میں بائیبل سکالرز شپ کا امتحان ہوا، جس میں تین سو کے قریب امیدوار داخل ہوئے، صابری صاحب اس امتحان میں سیکنڈ نمبر آئے، جس پر دس روپے نقد اور سو روپے کی کتابیں انعام میں ملیں۔

صابری صاحب کا عیسائیت کی طرف رجحان دیکھ کر آپ کی والدہ نے مشن سکول سے اٹھا کر

آپ کے خالو مولانا عبدالرزاق، مصنف "البرامکہ" کے پاس بھوپال بھیج دیا۔ مولانا کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی، انھوں نے صابری صاحب کو اپنا بیٹا بنالیا۔ بھوپال میں آپ جہانگیر ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ مڈل پاس کیا، ۱۹۱۶ء میں کانپور واپس آگئے۔ اور وہاں میتھوسوفیکل ہائی سکول سے میٹرک کیا۔

۱۹۱۸ء میں سیڈکرسچن کالج میں ایف اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ مولانا حسرت موہانی کی صحبت نصیب ہوئی، سیاسی ماحول کا اثر ہوا۔ حسرت صاحب کی ایمار پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کیا، اور اپنے بہنوئی مولانا فضل حسین صاحب کے اخبار "البرید" میں ترجمہ کرنے پر مامور کر دئے گئے۔ مولانا حسرت نے ۱۹۲۰ء میں خلافت سودیشی اسٹور لمیٹڈ کمپنی دس لاکھ روپے سے قائم کی، اس میں آپ نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

۱۹۲۱ء میں مین پوری سازشی کیس میں گرفتار ہوئے۔ اور ڈیڑھ سال کی سزا پائی۔ اسی سیاسی زندگی کی وجہ سے آپ کی اپنے چچا شہزاد علی صاحب سے ناچاقی ہوگئی، جس پر ان کے چچا نے ان کو موروثی جائیداد سے محروم کردیا۔

۱۹۲۴ء میں آپ تنظیم اخبار روزانہ امرتسر میں کام کرنے لگے۔ یہ اخبار ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے جاری کیا تھا، اس کے انچارج مولانا قریشی اور عبداللہ منہاس چیف ایڈیٹر تھے۔

چھ ماہ کے بعد آپ لاہور چلے آئے۔ سید جبیب صاحب کے اخبار "سیاست" میں مولانا حسرت کے ارشاد و حکم کے مطابق کام کرنے لگے، اس اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی۔ اس لئے صابری صاحب وہاں زیادہ عرصے نہ رہ سکے، اور اخبار "ہندوستانی" ہفتہ وار میں ملازم ہوگئے۔ یہ اخبار سردار سردول سنگھ کویشر کے اہتمام میں نکلتا تھا، اور اس کے چیف ایڈیٹر صلاح الدین (ایڈیٹر "ہمایوں") تھے۔

اس زمانے میں کویشر صاحب لالہ پنڈی داس اور لالہ کدار ناتھ سہگل، ڈاکٹر ست پال نے کانگریس پبلشنگ کمپنی لیمیٹڈ کے نام سے قائم کی تھی، اور روزانہ "سوراج" نکالنے کا فیصلہ کیا تھا، جس کے ایڈیٹر صابری صاحب مقرر کئے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا حسرت موہانی کی تحریک اور کویشر صاحب کی رضامندی سے آپ اخبار "ریاست" میں ایڈیٹری کے فرائض انجام دینے کے لے مقرر ہوئے۔

۱۹۳۹ء تک ریاست میں کام کیا، اسی سال اپنا ذاتی اخبار "آزاد" دہلی سے نکالنا شروع

کیا۔ یہ اخبار تین سال تک چلا اس کے بعد روزانہ "انجام" کی ایڈیٹری کی ذمہ داری قبول کی۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان چلے گئے، کچھ دن لاہور میں مقیم ہو کر کراچی تشریف لے گئے۔ وہاں "انجام"، "الامان" میں کام کیا۔ ایک سال شدید بیمار رہے، پاؤں نے جواب دیدیا تھا۔ تندرستی کے بعد اخبار "احسان" کراچی میں اپنی قلم کے جوہر دکھائے۔ اور عرصے تک اخبار "انجام" میں کام کرتے رہے۔ خدا کی قدرت دیکھئے اولاد بھی ادیب پیدا ہوئی۔ باجی اور محمودہ کے نام سے انجام میں غزلیں اور برق و شرر کے عنوان کے تحت دلچسپ تبصرے شائع ہوئے [۱]

صابری صاحب نے پوری زندگی اخبار نویسی میں گذاری۔ پرانے اخبار نویسوں میں محترم سردار علی صابری صاحب اور مولانا محمد عثمان فارقلیط ایڈیٹر اخبار الجمعیۃ نظر آتے ہیں۔ صابری صاحب صاحبِ تصنیف ہیں۔ ان کی کافی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

میرے صابری صاحب سے تیس بتیس سالہ تعلقات ہیں۔ تعلق کی وجہ یہ تھی، ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ دہلی کی سیاست پر ایسے لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا، جو کانگریسی، جمعیۃ العلمائی اور مسلم لیگی کا جامہ پہنے ہوئے تھے۔ لیکن سرکار پرستی میں پیش پیش تھے۔ ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر کی قصیدہ خوانی کرتے تھے۔ دہلی کے آزاد خیال نوجوانوں نے جو حکومت پرستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، یہ طے کیا کہ وہ خواہ مسلم لیگی ہو، احراری، ہو یا کانگریسی ہو، متحد ہو کر حکومت کی خوشامدیوں کی نقاب کشائی کرے۔ اور عوام کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

دہلی میں سوائے میونسپل کمیٹی کے اور کوئی سیاسی اکھاڑہ نہیں تھا۔ میونسپل کمیٹی پر سرکاری لوگوں کا قبضہ تھا۔ اور ان سرکاری لوگوں کی حمایت کانگریسی، جمعیۃ العلمائی اور مسلم لیگی حضرات فرماتے تھے۔ چنانچہ اصلاح میونسپل کمیٹی قائم کی گئی۔ اور اس پلیٹ فارم سے علامہ ابوالبیان آزاد ایڈیٹر اخبار تیغ ہفتہ وار دہلی، عبداللہ شمیم ایڈیٹر اخبار چنگاری ہفتہ وار دہلی، واحد قریشی، یوسف بخاری، مولانا حامد علی قریشی، سردار علی صابری، پنڈت ہر سروپ شرما، چودھری حکم سنگھ، ناظر علی صاحب مالک ناظر پریس، سید سردار علی تائب نقشبندی، لالہ شنکر لال، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا نورالدین بہاری اور راقم الحروف امداد صابری

[۱] اخبار عوامی رائے دہلی، ۲۷ اپریل ۱۹۵۶ء

نے عوام کے مسائل یعنی ڈبل ہاؤس ٹیکس، بناسپتی میں رنگ نہ ڈلوانے، بجلی کی شرح میں اضافہ، میونسپل کمیٹی کے سرکاری صدر کے خلاف، اور ٹریموے کی بائیکاٹ اور غلے کی گرانی کے خلاف بھوکوں کے جلوس کی تحریک چلائیں۔ اس سلسلے میں جلسے کئے، جلوس نکالے اور میونسپل کمیٹی پر مظاہرے ہی نہیں کئے بلکہ غیر ذمہ دار میونسپل کمیٹی کے عہدیداروں کے جنازے بھی جلائے ــــ مقدمے بازی کی بھی نوبت آئی۔ جناب سردار علی صابری اور عاشق علی پبلشر و پرنٹر اخبار الامان دہلی وغیرہ کے خلاف ہتک عزت کا ایک مقدمہ محترم جناب عزیز حسن بقائی صاحب ایڈیٹر رسالہ "پیشوا" دہلی نے دائر کیا۔ اس کی پیروی کی۔ غرض ہر محاذ پر اس پارٹی نے سرکار پرست ٹولی سے مقابلہ کیا۔ اور عوام کی آواز کو ابھارا۔

ملک کی تقسیم ہونے کے بعد دہلی میں اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انجمن اتحاد ہند قائم ہوئی، جس کا صدر راقم الحروف امداد صابری اور جنرل سکریٹری جناب سردار علی صابری صاحب منتخب ہوئے، جو بعد میں پاکستان چلے گئے۔ پاکستان جانے کے بعد ان حضرات سے ویسے ہی تعلقات قائم رہے اور الحمد للہ علیٰ احسانہٖ اب تک قائم ہیں۔

۱۹۵۰ء کا وہ زمانہ تھا جب پاکستان میں کھدر پوشوں کی شکل دیکھ کر نفرت کرتے تھے، لیکن میں ۲۸ اپریل ۱۹۵۰ء کو اپنی پرانی وضع قطع کے ساتھ کراچی گیا۔ وہی پرانی محبت عود کر آئی، سب دوست احباب محبت و اخلاص کے ساتھ پیش آئے۔ اس لئے کہ وہ لوگ میری روش اور زندگی سے بخوبی واقف تھے۔ اس وقت ہر شخص پریشان تھا۔ صحیح طور پر سیٹ نہیں ہوا تھا، رہنے سہنے کے ٹھکانے بھی بہت سو کو میسر نہیں آئے تھے، لیکن دوستوں نے تواضع کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ ڈیڑھ ماہ رہا۔ کسی وقت کا بھی گھر پر کھانا نہیں کھایا، دعوتوں کی بھرمار رہی۔ چنانچہ ایک پر تکلف دعوت شیخ ناظر علی مالک ناظر پریس کراچی نے ۲۲ مئی ۱۹۵۰ء کو کی، جس میں کراچی کے اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر، رپورٹر، مالکانِ پریس اور معزز حضرات نے جس کی تعداد اسّی کے قریب تھی شرکت کی، جن میں یہ حضرات بھی شامل تھے:

ضمیر صدیقی ریپریزنٹیٹو امریکن پریس، عبد الحفیظ یونائٹیڈ پریس، عبد الروف صدیقی نمائندہ سول ملٹری گزٹ کراچی، فرید احمد جعفری ایڈیٹر ڈان، عبد اللہ شمیم ایڈیٹر چنگاری، عمر فاروقی ایڈیٹر انجام کراچی۔ سردار علی صابری ایڈیٹر انجام، عثمان آزاد بانی اخبار جنگ، یوسف بخاری آف

جنگ اخبار، مولانا قاری زاہر قاسمی صاحب، علامہ ابوالبیان آزاد، واحد قریشی، پیرجی اظہر علی ایڈیٹر اخبار آغاز، انعام الٰہی پردیسی ایڈیٹر نوروز، گلزار باغ احمد ایڈیٹر نئی روشنی، محمد رحیم ایڈیٹر پاکستان فٹ دیر، مسٹر طلیق ایڈیٹر ہزار داستان، لئیق قریشی ایڈیٹر شبنم، مولانا حامد علی قریشی ایڈیٹر رسالہ حیات الاسلام، منظر الدین احمد صدیقی، خورشید احمد کاظمی ایڈیٹر خورشید، امداد اللہ چشتی، ڈاکٹر حمید نظامی ایڈیٹر تازیانہ، مولانا حامد جلالی ایڈیٹر رسالہ شعلہ، مولانا ناصر جلالی ایڈیٹر اتحاد، الیاس رشدی وغیرہ۔

اٹھارہ انیس سال کے بعد میں اپنی اہلیہ کے بھائی حافظ منظر احمد صاحب کی صاحبزادی کی شادی میں شرکت کے لئے ۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو کراچی پہنچا۔ یہ وقت پاکستان کی بدنصیبی کا تھا، ایوب صاحب کے خلاف ہنگامے ہو رہے تھے اور میرے پہنچنے کے ایک ماہ بعد مارشل لا نافذ ہو گیا تھا۔ اس ہنگامی حالات میں کراچی کے اہل قلم، اہل علم و ادبی حضرات نے دل کھول کر عزت افزائی فرمائی۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسران سے لے کر تمام دوست احباب تک نے دعوتیں کیں۔ میری شام کی نشست مولانا حامد علی قریشی کے کمرہ نیو ٹاؤن میں ہوتی تھی، ۱۲ر مارچ ۱۹۶۹ء کو اسی کمرے پر صابری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اسی کمرے پر ۶ر اپریل ۱۹۶۹ء کو مولانا حامد علی قریشی صاحب نے بڑی پرتکلف دعوت کی جس کا اہتمام علامہ ابوالبیان آزاد صاحب نے فرمایا، اس دعوت میں حسب ذیل حضرات شریک ہوئے:

علامہ رازق الخیری صاحب ایڈیٹر رسالہ عصمت، شیخ محمد شفیع ایڈوکیٹ، گلزار باغ احمد صاحب ایڈیٹر نئی روشنی، قاری زاہر قاسمی، عمر فاروقی صاحب ایڈیٹر اخبار آغاز روزانہ، الیاس رشدی ایڈیٹر نگار ویکلی، پروفیسر ایوب قادری، جلیل الرحمٰن صاحب مطبع مجتبائی والے، ناظر علی مالک ناظر پریس، سردار علی صابری، مولانا حامد جلالی، جمیل حید رضوی، حافظ محمد اسلام چیف رپورٹر اخبار جنگ، یوسف بخاری، واحد قریشی، عبد اللہ شمیم، منیر بہاری، حافظ منظر احمد، ضمیر صدیقی، حافظ بشیر غازی آبادی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور میرے بھانجے ارشد صدیقی قاری مصباح الدین مسعود اور جناب ایوب قادری وغیرہ۔ وہ وقت بھی آیا کہ میں سول ہسپتال کراچی میں ۲۹ر اپریل ۱۹۶۹ء کو شام کے چار بجے — سردار علی صابری صاحب اور عمر فاروقی صاحب سے ملنے گیا — صابری صاحب کمرہ ۳ میں اور عمر فاروقی صاحب کمرہ ۱۲ میں داخل تھے۔ شدید بیمار تھے، لیکن جس وقت میں ملنے گیا، ان کو کافی افاقہ ہو چکا تھا — عمر فاروقی صاحب کی معدہ کی خرابی کی شکایت تھی اور یہ شکایت انکی

کبھی ختم نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ پرلے درجے کے چٹورے تھے ــــــ نہاری، کباب اور لذیذ کھانوں سے پرہیز کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ صابری صاحب کے کمرے میں ان کے صاحبزادے راشد صابری، چشتیہ، نجمہ صابری سے ملاقات ہوئی۔

ان دعوتوں اور ملاقات کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ ہمارے مخلصانہ تعلقات باوجود اتنی دوری کے بھی اب تک قائم ہیں اور تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اور "دہلی کی یادگار ہستیاں" میں ان احباب کا بھی ذکر خیر ہے۔

مولانا سیف الحق ادیب دہلوی

مولانا ادیب شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دو سو، سوا دو سو برس سے زیادہ گذرے جب شاہ صاحب بخارا سے دہلی تشریف لائے اور علم حدیث کے نور سے ہندوستان کو منور کیا۔

۱۹۴۷ء سے قبل تک مفتی صاحب کے اکثر خاندان کے لوگ دہلی میں رہتے تھے۔ مولانا ادیب کے والد مولوی احسان الحق صاحب تھے جن کے چار صاحبزادے مولوی وحید الحق، خان بہادر مولوی شرف الحق، مولوی انوار الحق صاحب اور مولانا سیف الحق ادیب تھے۔

یہ چاروں بھائی علمی لیاقت اور عزت و عظمت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھے اور مولوی انوار الحق صاحب کی زندگی کتب بینی اور یادِ الٰہی میں گذری۔ نہایت منکسر المزاج فقر دوست شہر کے رئیسوں میں تھے۔ آپ مدت دراز تک گورنر پنجاب کے میر منشی رہے۔ اس کے بعد بھرت پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد آپ نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ آپ نے ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۰۲ء کو جمعرات کے روز انتقال فرمایا۔

اس خاندان کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا کوئی بھی مرد اَن پڑھ نہیں ہوا —— مولانا سیف الحق صاحب ۱۸۴۶ء میں پھاٹک مفتی والان تیراہا بہرام خاں دہلی میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد سے ابتدائی تعلیم پائی، اور سرکاری مدرسے میں معمولی عربی، فارسی اور برائے نام انگریزی کی تعلیم حاصل کی، مڈل کا امتحان دیا، انتہائی ذہین و فہیم تھے۔ اسی معمولی تعلیم سے انھیں اتنی قابلیت پیدا ہو گئی تھی کہ اچھے اچھوں سے ٹکر لینے لگے تھے۔ اور بچپن میں ہی قابلِ رشک علمیت و لیاقت کے مالک بن گئے تھے۔ شعر کہنے کا شوق تھا، شروع میں مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ سے جو کہ مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے، اصلاح لی اور کئی برس تک ان کی طرز پر کہتے رہے۔ ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں غزل پڑھی

جس کا مطلع یہ تھا ؎

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے
پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

اس وقت مرزا غالب بھی موجود تھے۔ پاس بلا کر پیار کیا اور فرمایا کہ میاں سیفو ہمارے پاس آیا کرو، آج سے ہم تمھیں بتائیں گے۔ مرزا غالب کی توجہ سے رنگ ہی بدل گیا۔ کچھ دن عدالت منصفی میں نائب ناظر ہوئے، لیکن طبیعت میں آزادی تھی، نوکری کی غلامی پسند نہیں تھی، صحافت کی طرف توجہ دی۔ اور "نیو گزٹ" ایک پرچہ نکالا جو بہت مقبول ہوا، اس میں خبروں اور مضمون کے ساتھ شعراء کا کلام بھی چھپتا تھا، پرچہ بند ہونے کے بعد مختلف اخباروں میں مضامین لکھے۔ اسی اثنا میں انجمن قصور کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ قصور سے انجمن کا رسالہ چلانے لگے، جب وہاں بھی جی نہ لگا تو لاہور چلے گئے۔ یہاں دہلی کے ادیبوں کا جمگھٹا تھا۔ وہ سب محکمہ تعلیم میں کام کرتے تھے۔ آپ بھی ان کے ساتھ کام کرنے لگے اور اسی محکمے میں ملازم ہو گئے۔ "کوہ نور" اخبار کا جلوہ نظر آیا، اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بڑے بڑے نامور ادیبوں اور مشہور اہل قلم حضرات سے تحریری معرکہ آرائی رہی۔ "رفیق ہند" کے بعض مضامین سے متاثر ہو کر اس کے مقابلے میں "شفیق ہند" اخبار لاہور سے جاری کیا جس کے دو ضمیمے "نسیم صبح" اور "شام وصال" بھی نکلے، ان پرچوں کا ایک ایک فقرہ شوخی سے بھرا ہوا، اور مذاق میں ڈوبا ہوا تھا، جس سے ان کی قابلیت کا ڈنکا بج گیا اور پنجاب کے مشہور ایڈیٹروں نے ان کی ذہانت و فراست کا لوہا مانا۔ آپ بلا کے جدت پسند تھے، جو سوجھتی تھی غضب کی سوجھتی تھی۔ غالب کی شاگردی نے آپ کے کلام میں ایک عجیب شان پیدا کر دی تھی۔ مومن و غالب کے رنگ کو سمو کر ایک نیا دلچسپ اور پسندیدہ طرز اختیار کیا، جس میں فصاحت و بلاغت، شوکت لفظی اور نازک خیالی سب اپنی اپنی جگہ جداگانہ شان دکھاتی تھی۔ اردو فارسی کا کلام نہایت بلند پایہ تھا۔ مگر ان کی بے توجہی کی وجہ سے بہت سا تلف ہو گیا اور جو کچھ بچ گیا وہ بھی نایاب ہے۔

تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، بات بات میں مادہ تاریخ نکالتے تھے۔ اکثر تاریخی فقرے بولتے تھے۔ ہزاروں قطعات، بیسیوں عرضیاں اور خطوط تاریخی ہوتے تھے جن کے ہر دلکش فقرے سے سن و تاریخ نکلتی تھی۔ چنانچہ نظام حیدرآباد دکن کی پیدائش پر انھوں نے تاریخی نام،

قصیدے اور قطعے اتنے موزوں و مناسب لکھے کہ دھوم مچ گئی۔

ان کی تاریخ گوئی کا کمال تھا کہ ۱۳۰۲ھ میں ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے اپنی بیٹی کی شادی کی وقت وداع جہیز کے سامان کی فہرست لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا، چنانچہ فہرست بڑی تھی۔ مع عنوان بقید نام جنس تمام و کمال تاریخی تھی۔ ہر شے کے ساتھ ایسے موزوں الفاظ ملائے تھے کہ ہر جملے سے تاریخ نکلتی تھی ـــــ مختلف جلسوں اور قومی کانفرنسوں میں تقریر بھی کیا کرتے تھے جس کو دہلی کے مشہور ادیبوں اور اہل قلم حضرات نے بنایا تھا۔ مولانا کی چار دانگ شہرت کی وجہ سے نظام حیدر آباد نے ساڑھے چار سو روپے ماہانہ گورنمنٹ رپورٹری کی خدمت پر مامور کیا۔ آپ کو چھیڑ خانی اور نوک جھونک کی عادت تھی۔ کسی کو بخشتے نہیں تھے۔ امیر، ارشد دہلوی، مرزا داغ، مولانا راسخ، مولانا شوکت میرٹھی اور مولانا احسن مارہروی سے مزیدار جھڑپیں اور چونچیں ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن راسخ جس کے والد بہت کے رہنے والے تھے، انھوں نے غالب کی طرز میں غزل کہی جس کے مقطع میں غالب کی ہم سری کا دعویٰ کیا ؎

کہیں چھپ چھپ کے مے پیتے ہیں شاید حضرت راسخ
ترے اشعار بھی غالب کی ٹکر ہوتے جاتے ہیں

پھر کیا تھا ادیب نے میاں ملنگ سبزی فروش سے اسی زمین میں غزل پڑھوائی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

عجب چھم چھم کا مضمون ہے کہ ہیں بس اپنے دعوے میں
بنت والے بھی اب غالب کی ٹکر ہوتے جاتے ہیں

آپ کو دق کا مرض لگ گیا تھا اور اسی موذی مرض کے نذر ہوئے، لیکن باہمت انسان تھے۔ وقت نزع بھی ہوش و حواس درست تھے۔ نویں محرم کو انتقال سے چند گھنٹے پہلے جب تعزیئے گشت کرتے ہوئے تیراہا بہرام خاں کے قریب پہنچے تو ماتمی تاشے کی آواز سن کر آپ نے ایک عزیز کو اپنے پاس بلایا اور یہ رباعی اس سے لکھوا کر اس سے کہا کہ اسے تعزیئے پر لٹکا آؤ ؎

بیمار ہوں، ناتواں ہوں، زار ہوں میں   وقف غم و درد و رنج و آزار ہوں میں
اے سبط رسولؐ، راکب دوش نبیؐ   کچھ عقدہ کشائی کیجیے ناچار ہوں میں

آپ ۵۹ برس کی عمر میں جون ۱۸۹۱ء کو دہلی میں ہی فوت ہوئے۔

سب کچھ ادیب عشق نے جی سے بھلا دیا
جانا کہاں ہے اور تھے آئے کہاں سے ہم

کر چشم و دل کی خیر خدا سے طلب ادیب
لپکا پڑا ہے تجھے انتظار کا !

رکھے عدو نے پھول سر تربت ادیب
کیا شمع زیست کر کے وہ گل خار ہو گیا

روز رہتی ہے یہ پامالی تربت کیسی
خاک میں مل گئے جب ہم تو کدورت کیسی

کہدیا اس سے کہ اب یہ بھی نہ دیکھو گے کبھی
جب کہا میں نے کہ منہ دیکھے کی الفت کیسی

غیر سے چار گھڑی کو بھی جدا ہوں تو کہوں
کہ گذرتی ہے کسی کی شب فرقت کیسی

ہو جان پر جو ایک مصیبت تو روئیے
دل بھی ملا یہاں تو ترے اختیار کا

آئے تھے جب تو لائے تھے کیا ساتھ واں سے ہم
حرمان و یاس لے کے چلے ہیں یہاں سے ہم

رہا گر یہی بت پرستی کا عالم
تخلص ادیب اپنا رامی کریں گے

جناب مولانا شرف الحق صاحب صدیقی

مولانا شرف الحق صاحب کا سلسلہ نسب حضرت ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، آپ کے والد ماجد قاری جلال الدین صاحب انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ محلہ چوڑی والان لال قلعہ سے بہت دور نہیں ہے، تھوڑی دور کے فاصلے پہ ہے۔ لال قلعہ کے سامنے جامع مسجد ہے اور جامع مسجد کے سامنے پچاس قدم کے فاصلے پر محلہ چوڑی والان شروع ہوجاتا ہے۔ اسی چوڑی والان سے چاوڑی بازار کو جاتے وقت گلی میگزین والی آتی ہے جس کے در و دیوار حافظ بنے کی گلی سے ملتے ہیں۔ یہ گلی میگزین والی کیوں مشہور ہے، اس لئے کہ اس میں شاہی میگزین رکھا جاتا تھا۔ جس محلے میں شاہی میگزین ہو، اس محلے کے رہنے والے آزادی کی تحریک سے بچ جائیں یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔

جب دہلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتداء ہوئی تو اس محلے کے برگزیدہ حضرات قاری جلال الدین صاحب حافظ بنے کے بہنوئی، قدرت اللہ صاحب اور حافظ بنے کے بیٹے، کریم بخش کے داماد عبدالقادر صاحب جو محلہ چوڑی والان میں رہتے تھے اور حاجی امان اللہ کے تایا زاد بھائی حاجی محمد بخش جو چمڑے والی گلی میں سکونت رکھتے تھے یہ اور دوسرے حضرات اس میگزین کے اسلحات فراہمی وغیرہ پر مامور تھے، ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ یہ اسلحات خریدیں۔ اور میگزین میں پہنچائیں۔

جب جنگ آزادی میں ناکامی ہوئی تو یہ اور ان کے ساتھی کافی عرصے تک روپوش رہے، اور بڑی مشکلوں کے بعد ان کو رہائی ملی، چنانچہ قاری جلال الدین صاحب کا ذکر بہادر شاہ کے مقدمے کے فائل میں جو نیشنل آرکائیوز نیو دہلی میں ہے، ایک مخبر نے اپنی چٹھی میں کیا ہے جو اس نے انگریزی حکومت کو لکھی تھی۔ وہ تحریر کرتا ہے:

"قاری جلال الدین روزانہ قلعہ معلیٰ میں بہادر شاہ ظفر سے ملنے جاتا ہے جو میگزین شاہی میں اسلحات فراہم کرنے میں پیش پیش ہے۔"

قاری جلال الدین صاحب جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے بعد حیدر آباد دکن تجارت کے سلسلے میں جانے لگے تھے اور آخر عمر میں انھوں نے وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ ان کا انتقال ۱۸۹۱ء میں وہیں ہوا۔ شاہ خاموش کی درگاہ کے قریب ان کا مزار ہے۔ قاری جلال الدین صاحب کے پانچ صاحبزادے شیخ نظام الدین صاحب، مولانا شرف الحق صاحب، شیخ برکت اللہ، شیخ حشمت اللہ اور شیخ غلام اولیاء تھے۔

مولانا شرف الحق صاحب کی ولادت ۱۸۶۷ء کو گلی جوتے والان محلہ چوڑی والان دہلی میں ہوئی۔ آپ کو دو برس کی عمر سے ہی صاحبِ دل، بابرکت اور مقدس ہستی مولانا شاہ رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی فیض حاصل تھا۔ شاہ صاحب حضرت شاہ ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ چتلی قبر میں سکونت رکھتے تھے جہاں اب شاہ صاحب کا اسی خانقاہ میں مزار ہے۔ شاہ صاحب ہی نے آپ کی پرورش فرمائی۔

آپ کی والدہ ماجدہ مولانا رحیم بخش صاحب سے بیعت تھیں، کبھی کبھی حاضری دیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ کے لئے دعا کرائی، تو آپ نے فرمایا اس کی پرورش احتیاط سے کرنا اور صبح و شام میرے پاس بھیجدیا کرو۔ چنانچہ پانچ برس کی عمر تک یہ صبح و شام ان کی خدمت میں جاتے تھے۔ اس کے بعد شاہ صاحب سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ کافی وقت ان کے پاس گذرنے لگا۔ شاہ صاحب نے ہی قرآن مجید پڑھایا، اور اردو لکھنی پڑھنی سکھائی اور شاہ صاحب کے معتقد درگا پرشاد نے ہندی اور سنسکرت کی تکمیل کرائی۔

۱۸۷۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں داخل ہوئے۔ مڈل پاس کیا اور انگریزی کے مضمون میں فسٹ نمبر آئے، ۱۸۸۱ء میں مولانا الطاف حسین حالیؔ صاحب سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا کو جب کسی شاگرد پر غصہ آتا تھا تو اس کو وہ "کودن" کہہ کے ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں فتحپوری مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی میں بیٹھے، اور تمام پنجاب میں اول آئے۔ منشی کے امتحان سے

فارغ ہو کر عربی کی ابتدائی تعلیم صرف و نحو مدرسہ الاسلام دہلی میں حاصل کی۔

اس زمانے میں مناظروں کا دور تھا۔ محلہ در محلہ، گلی در گلی پادری نصرانیت کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے، محکوم ہندو اور مسلمانوں کو اپنے مذہب کی فکر تھی، وہ بھی پوتھیاں دبائے، گلوں میں حمائل ڈالے ہوئے اپنے دھرم اور مذہب کی عظمت کا ڈنکا بجانے میں مستغرق نظر آتے تھے، کوئی دن ایسا نہیں گذرتا تھا جس میں مناظرہ نہ ہوتا ہو۔ ہر روز لسانی اکھاڑے جمتے تھے۔ ہزاروں کا مجمع کسی مناظرے میں ہو جانا معمولی بات تھی۔

جس کی حکومت ہوتی ہے اسی کے مذہب کو عروج ہوتا ہے یہ بات مسلمہ ہے۔ حکومت اپنے مذہب کے مبلغین کو سہولتیں پہنچاتی ہے، جو آسانیاں ان کو حاصل ہوتی ہیں وہ حکومت کے غیر مذہب والوں کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ یہی شکل عیسائی پادریوں کی تھی، حکومت انکا خاص خیال رکھتی تھی۔ محکوم قومیں ان مراعات سے بدکتی تھیں، اور ہر وقت اپنے مذہب کی خدمات کے لئے اور ان کو بچانے کے لئے مستعد رہتی تھیں۔ ان حالات نے مولانا اشرف الحق صاحب کو بھی متاثر کیا۔ مناظرے کا شوق پیدا ہوا، جس کا آغاز اس طرح ہوا۔ گھنٹہ گھر دہلی پر ایک پادری مذاحیہ اور تمسخرانہ لہجے میں فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کے پیغمبر حبیب اللہ کہلاتے ہیں، لیکن جب ان کے پیغمبر کے نواسوں کو مخالفین نے قتل کیا تو اس وقت پیغمبر صاحب نے خدائے تعالیٰ سے فریاد نہیں کی، حالانکہ حبیب کا محبوب زیادہ محبوب ہوتا ہے، اگر پیغمبر صاحب فریاد کرتے تو خدائے تعالیٰ ان کی ضرور سنتا۔

مولانا اشرف الحق صاحب بھی اس مجمع میں پادری کی تقریر سن رہے تھے، جب پادری نے یہ کہا تو آپ کو برداشت نہ ہو سکا۔ تقریر سے ابھی واسطہ پڑا نہیں تھا۔ یہ سیدھے سادھے انداز میں پادری صاحب سے مخاطب ہوئے اور کہا آپ غلط کہتے ہیں کہ پیغمبر صاحب نے خدائے تعالیٰ سے فریاد نہیں کی۔ فریاد کی اور ضرور کی، جو نواسوں پر ظلم ہوئے ان کو تمام و کمال بیان کیا۔ مگر جواب ملا، بے شک تمہارے نواسوں کو مخالفین نے شہید کیا اور ان پر نہایت ظلم ہوئے، لیکن اس وقت مجھے اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کا سلیب پر چڑھنا یاد آ رہا ہے اور اس کا غم بے چین کئے ہوئے ہے۔ اس جواب سے پیغمبر صاحب خاموش ہو گئے کہ واقعی اکلوتے بیٹے سے بڑھ کر میرا نواسہ نہیں ہو سکتا۔ جب بیٹا نہ بچ سکا تو میرا نواسہ کس گنتی میں ہے۔

اس جواب سے مجمع میں جان پڑگئی اور ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندو تھا، یا مسلمان، سب مسرور ہوگئے، اور پادری صاحب پر سکوت کا عالم طاری ہوگیا۔

اس واقعے کے بعد مناظرے کا شوق بڑھتا چلا گیا۔ وقت کافی خرچ ہونے لگا، اور تعلیم میں فرق پڑنے لگا، تو مولانا الطاف حسین حالی صاحب نے ان کو سمجھایا کہ پہلے تعلیم کی طرف توجہ دو، اس کے بعد مناظروں میں الجھنا۔ چنانچہ مولانا اشرف الحق صاحب نے دہلی کو خیر باد کہا اور مدرسہ دار العلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ وہاں عربی کی درمیانی کتابیں پڑھیں، جب دورہ کا وقت آیا تو اس وقت حضرت العلامہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی قابلیت اور علمیت کا ڈنکا بج رہا تھا، اور خاص طور پر کتب احادیث کے اسباق مولانا کے ہاں بڑے معرکے ہو رہے تھے۔ بڑا شہرہ تھا۔ دیوبند کے طلباء گنگوہ کھنچے چلے جا رہے تھے، آپ کو بھی شوق ہوا، اور گنگوہ چلے گئے ..... اور دورہ میں شرکت کی۔

سال بھر میں کتب صحاح ستہ، صحیح بخاری، صحیح مسلم نسائی، ابو داؤد، جامع ترمذی، ابن ماجہ، اور موطا امام مالک انھوں نے مولانا گنگوہی سے پڑھیں اور سند حاصل کی۔

مناظرے کا شوق تھا، پھر ابھرا۔ اس مرتبہ مولانا گنگوہی کا حکم تھا کہ ردِ نصاریٰ اور تبلیغ اسلام کرو۔ چنانچہ ردِ نصاریٰ اور باطل مذاہب کی بیخ کنی میں مصروف ہوگئے۔ پادریوں سے مناظرے ہونے لگے۔ محسوس کیا کہ ان مناظروں کے لئے عبرانی و یونانی جاننا ضروری ہے، چنانچہ آپ نے عبرانی و یونانی حکیم عبد المجید خاں صاحب کے زیر علاج ایک یہودی عالم سے پڑھی، اس نے آپ کو تحریری سند دی، تحریری سند عبرانی زبان میں تھی جس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کے نیچے بھی عبرانی میں اس یہودی عالم کے تصدیقی دستخط ہیں۔ پشتو آپ نے مولوی عبد الحکیم افغانی سے سیکھی اور ترکی مولانا ابو الخیر سے تحصیل کی۔

الغرض آپ ۳۰ سال کی عمر میں عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، عبرانی، یونانی، پشتو اور ترکی آٹھ زبانوں کے ماہر ہوگئے تھے۔ ان تمام علوم کے باوجود آپ کو ایک کامل و ماہر فن مناظرہ کی تلاش تھی، آپ کے کان مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کا نام نامی سن چکے تھے، چنانچہ ۱۳۰۵ھ کو آپ عازم حج بیت اللہ ہوئے اور مکہ معظمہ میں حضرت العلامہ امام فن مناظر مولانا

رحمت اللہ کی زیارت بابرکت سے فیض یاب ہوئے اور تین ماہ شب و روز خدمت میں حاضر رہے اور مختلف مسائل کو سمجھا اور بہت سے شبہات دور کئے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم و مغفور نے آپ کی خداداد قابلیت کو دیکھ کر مناظرہ کرنے کی عام اجازت دی اور مکہ معظمہ میں قیام و طعام کا انتظام اپنے ہاں رکھا۔ دوسری جگہ کھانے نہیں دیا۔ رخصت ہوتے وقت ایک بناتی پاجامہ جو سلطان عبدالحمید خاں نے خلعت میں دیا تھا، اور اپنی تصانیف اظہار عیسوی، ازالۃ الشکوک اور اظہار الحق زبان عربی و فرانسیسی تبرکاً عنایت فرمائیں۔ اور ردِ نصاریٰ کرنے کی حسب ذیل اجازت مرحمت فرمائی:

"میرے پاس عالم و فاضل، ماہر و کامل مولوی شرف الحق صاحب قاری جلال الدین کے فرزند تشریف لائے۔ مجھ سے اجازت طلب کی، حالانکہ میں اس لائق نہیں کہ اس سے اجازت کا سوال کیا جائے۔ نیز یہ کہ وہ علماء اور مشاہیر و فضلاء کی اجازت سے پہلے ہی آراستہ و پیراستہ ہیں اور ان کے علوم کے سایہ میں پناہ گزین اور ان کے لطائف کے پھولوں کو چنے ہوئے ہیں۔ خاص کر دو صاحبانِ علم و فضل اور موجزن سمندر ہیں اور عالم ظاہر و باطن کے جامع ہیں اور جن کی شہرت نیکنامی کے ساتھ ہر ملک میں ضرب المثل ہے یعنی حضرت فقیہ و محدث قاری و مولوی عبدالرحمٰن اور حضرت فقیہ و محدث مولوی رشید احمد مگر چونکہ ان کو میرے ساتھ حسنِ ظن ہے تو میں نے ان کی درخواست قبول کرلی اور ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اس امید پر کہ ان علماء کے سلسلے میں، میں بھی منسلک ہو جاؤں، سو میں کہتا ہوں کہ رحمت اللہ ابن خلیل الرحمٰن کہ میں نے ہر اس چیز کی روایت کی اجازت دی، جس روایت کی مجھ کو اجازت حاصل ہے، جو کچھ میں نے اپنے شیوخ سے (اللہ تعالیٰ ان کو اجر عطا فرمائے) روایتاً یا درایتاً حاصل کیا، اس شروط پر جو علماء حدیث کے نزدیک معتبر ہے نیز چونکہ مولوی صاحب کو دیکھا کہ وہ نصاریٰ کے فریب سے واقف و آگاہ ہیں اور اس کے اسرار سے آشنا ہیں، اس لئے میں نے ان کو اجازت دی کہ وہ اس کے متعلق تہذیب و شائستگی کو مدنظر رکھتے ہوئے وعظ کرتے رہے اور نصرانیت کی تردید فرماتے رہیں، اور یہ کہ مجھے اپنی نیک دعاؤں میں خواہ جلوت

یا خلوت میں ہوں نہ بھولیں اور اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے رہیں کہ میرا بھی اور ان کا بھی نیک اعمال پر خاتمہ ہو۔ اور امیدوں میں کامیاب کرے۔"

(رحمت اللہ ۱۳ / ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ)

آپ نے جہاں مکہ معظمہ میں علوم ظاہری کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، وہاں آپ نے علوم باطنی کی بھی تکمیل کی۔ اور حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے وہیں بیعت ہوئے۔ اور حضرت حاجی صاحب نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا کیا۔ اور سلسلہ چشتیہ وصابریہ میں مرید کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

یوں تو آپ نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں مناظرے ہندوستان کے مشہور و معروف پادریوں سے کئے۔ لیکن دسمبر ۱۸۹۱ء میں پادری ایم جی گولڈ اسمتھ سے حیدر آباد میں۔ ۸ فروری ۱۸۹۳ء کو پادری جے سمول سے پونہ میں اور ۸ مارچ ۱۸۸۳ء کو پادری رفس اور پادری اے بیرگ سے غازی پور میں کئے۔ ان تاریخی مناظروں نے آپ کی علمیت کا سکہ تمام ہندوستان میں بٹھا دیا تھا۔

جس موضوع تحریف انجیل پر یکم اپریل ۱۸۵۴ء میں آپ کے استاد مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فنڈر کو مناظرے میں لاجواب کیا تھا۔ اسی موضوع پر آپ نے ۱۸۹۱ء میں دہلی کی مسجد فتحپوری کے اندر لارڈ بشپ جے اے لیفرائے سے مناظرہ کیا۔

دہلی اور اس کے اطراف کے اضلاع میں اس مناظرے نے ایک ہلچل مچا دی تھی، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ پادری صاحب اور مولانا صاحب میں یہ طے ہوا تھا کہ جو شخص مناظرے میں ہار جائے گا وہ عام مجمع میں اپنی شکست کا اعتراف کرے گا اور شکست نامہ لکھ کر دے گا، نیز ہارنے والا اپنے مقابل کا مذہب اختیار کرے گا۔

اس مناظرے میں آگرہ، علی گڑھ، میرٹھ دہلی سہارنپور کے معززین و مشاہیر علما، مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب، حکیم احمد سعید خاں صاحب، حکیم غلام محمود خاں، مولانا عبد الحق مفسر و مصنف "تفسیر حقانی"، امام سید محمد جامع مسجد، حکیم سمیع الدین خاں صاحب بقائی، مولانا عبد الرحمٰن راسخ، مولوی کرامت اللہ، شاہ محمد عمر اخوندجی، ڈپٹی سید ہادی حسین خاں صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، سید سلطان مرزا آنریری مجسٹریٹ، منشی محمد الدین ایڈیٹر اخبار الاخیار دہلی، حافظ عزیز الدین ایڈووکیٹ، مولوی امین الدین صاحب

بانی مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا احمد حسین صاحب، مولوی بشیر الدین صاحب مؤلف واقعات دار الحکومت دہلی وغیرہ نے شرکت کی، عیسائی حضرت بھی بڑی تعداد میں آئے تھے، مناظرہ دو دن ہوا۔ مناظرے میں بیس پچیس ہزار سے کسی طرح مجمع کم نہ تھا۔ پہلے دن کی بحث پانچ چھ گھنٹے جاری رہی لیکن ناتمام، دوسرے دن پھر ہوئی پہلے روز کی عالمانہ و فاضلانہ بحث نے شہر میں اور آگ لگا دی تھی۔ دوسرے روز کے مناظرے میں قریب قریب پورا شہر امنڈ آیا تھا۔ مناظرہ شروع ہوا کہ ابھی ایک گھنٹہ گذرا تھا کہ فیصلہ ہو گیا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے شاگرد رشید نے اپنے مقابل لیفرائے کو شکست فاش دی، اس جم غفیر میں پادری صاحب نے اپنے مذہب کو تو نہ بدلا لیکن تسلیم کیا کہ واقعی انجیل شریف میں تحریف ہوئی ہے اور حسب ذیل تحریر لکھ کر مولانا شرف الحق صاحب کو دی:

"میں اقرار کرتا ہوں کہ لوقا کی انجیل شریف کے ترجمے اور علاوہ اس کے اصلی نسخوں میں جو اس وقت موجود ہیں چند آیتیں غلط ہیں اور بھول سے داخل کی گئی ہیں۔ یہ بات سب سے قدیم نسخوں، ٹریکٹوں کے ملانے سے معلوم و ظاہر ہوئی وہ آیتیں ان میں نہیں۔ لہٰذا میں وہی اصلی انجیل کی باتیں سچی مانتا ہوں۔ چند مستشرق شعراء کے قول انجیل شریف میں ملے ہوتے ہیں۔"

غازی پور مشن اسکول میں ۸ مارچ ۱۸۸۵ء یکشنبہ کو دن کے تین بجے پادری روفس سے مباحثہ ہوا۔ پادری صاحب نے تین گھنٹے کی بحث کے بعد لاجواب ہو کر آخر تین چار ہزار کے مجمع میں اعتراف شکست ان الفاظ میں کیا کہ:

"ہم میں اتنا علم اور لیاقت نہیں ہے کہ مولانا صاحب سے مقابلہ کر سکیں۔ مولانا صاحب نے ہمارے مذہب میں ایسی تحقیق اور وسیع معلومات حاصل کی ہیں کہ اس پر مولانا صاحب کو صد آفریں ہے۔"

مولانا شرف الحق صاحب کی تقریر اور مناظرے کا ڈھنگ عالمانہ اور محققانہ ہوتا تھا۔ آپ کی قابلیت و لیاقت اور آپ کی ذہانت کا سکہ جس نے آپ کی تقریر سنی اسی نے مانا۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے ملٹری ڈیپارٹمنٹ کے رجسٹرار نے آپ کی تقریر شملہ میں سنی تو اس رائے کا اظہار کیا:

”میں نے مولوی اشرف الحق کی تقریر شملہ کے سکریٹریٹ کی بلڈنگ میں ۸ستمبر ۱۹۰۱ء کو سنی، اس جلسے میں ۳-۴ ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ بڑی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ تقریر سن رہا تھا، مجمع پر خاص اثر تھا، ان کا وعظ بہت پسند کر رہا تھا، اس مجمع میں یوروپین حضرات بھی تھے جنھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مولانا کا یہ مذہبی کام مسلمانوں کے لئے بہت مفید ہے، وہ ہندوستان کے کثیر علاقوں میں کام کرتے ہیں۔“

چھوٹا ناگپور کے راجہ مولانا اشرف الحق صاحب سے ملاقات کے بہت شائق تھے، انھوں نے مولانا سے ملاقات کی اور ان کے متعلق انھوں نے یہ رائے قائم کی۔

”مولانا اشرف الحق دہلوی کے بارے میں جب میں نے یہ سنا کہ بہت اچھے عالم اور فاضل ہیں اور لہردگہ ورانچی میں تقریر کر رہے ہیں تو میں نے ان سے ملاقات کرنے کی خواہش کی۔ وہ تشریف لائے، تبادلہ خیالات کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فاضل وقابل مولوی ہیں۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو سنسکرت، عربی، فارسی اور عبرانی میں بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔ وہ ان زبانوں کے ماہر ہیں۔ مولانا صاحب نہ صرف ایک اعلیٰ خاندان کے ہیں بلکہ ایک معزز شہری ہیں اور ایک شریف انسان ہیں (۲۲ دسمبر ۱۸۹۹ء)۔“

جو مسلمان مرد اور عورتیں عیسائی مشنریوں کے فریب میں آکر اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کو آپ نے اپنی قابلیت سے اپنا مذہب قبول کرنے پر آمادہ کیا اور عیسائی مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا۔

بڑے بازار ہزاری باغ میں ایک دو منزلہ مکان کی پہلی منزل میں عبدالغنی بنگالی رہتے تھے، دوسری منزل پر پادریوں کے مشن کا دفتر تھا، قربت کی وجہ سے عبدالغنی کی لڑکی قمرالنساء جس کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی، پادریوں سے تعلیم پانے لگی۔ پادریوں نے اس پر اپنا رنگ چڑھایا اور پانچ چھ برس تک اس کے ذہن پر نصرانیت کی فوقیت جمائی۔ نوعمر لڑکی تھی پھندے میں پھنس گئی، جب پادریوں نے دیکھا کہ اب شکار جال میں آگیا ہے تو انھوں نے اس کو گھر سے نکال کر گرجا گھر پہنچا دیا۔

عبدالغنی کو جب اس سازش کا علم ہوا تو اس نے اپنے ہمسایہ اور جگری دوست پوسٹ ماسٹر عباس بہاری سے ذکر کیا، انھوں نے پولیس میں اطلاع کرائی، اس وقت مسٹر گائی (کرسٹان) سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، جو پادریوں کے مشنری کاموں سے دلچسپی اور ہمدردی رکھتا تھا، اس نے اس رپورٹ پر کوئی عمل نہیں کیا۔ عبدالغنی کو کسی نے بتایا کہ آٹکی میں مولانا اشرف الحق صاحب آئے ہوئے ہیں جن کے نام سے پادریوں اور عیسائی مشن کی روح قبض ہوتی ہے ان کو بلاؤ، وہی پادریوں کے قبضے سے لڑکی نکال سکتے ہیں۔

عبدالغنی آٹکی گئے، ان کے کہنے پر مولانا صاحب ہزاری باغ آئے، سیدھے گرجا گھر پہنچے، وہاں ڈاکٹر ہیرل، مس میری اور مس جیلٹ جو مشنری کاموں کی انچارج تھیں ان سے ملے اور ان کی زیادتی پر تنبیہ کی اور اس بات پر آمادہ کیا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھ کو بھی اپنے مذہب میں شامل کرو۔ ورنہ مذہب اسلام قبول کرو۔ اس فیصلے پر مناظرہ ہوا، اور یہ بھی طے پایا کہ لڑکی بھی مناظرہ سنے گی۔

مناظرہ ہوا۔ ہندوستانیوں کے علاوہ ہزاری باغ کے ہزاروں عیسائی جلسے میں آئے۔ آخر دلائل سے مجبور ہو کر پادریوں کو لاجواب ہونا پڑا۔ کہ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے، ان حالات میں لڑکی کو بھی جرأت ہوئی، اس نے اپنے خیالات کے مطابق مولانا سے سوالات کئے، جوابات اطمینان بخش سننے کے بعد اس جلسے میں وہ مسلمان ہو گئی۔

مسلمان ہونے کے بعد شادی کا مسئلہ سامنے آیا، اس وقت وہ ۱۸ - ۱۹ برس کی تھی، جلسے میں اعلان کیا گیا کون اس سے شادی کرتا ہے، کافی نام آئے تو قرعہ اندازی ہوئی، جس میں ایک شخص کریم الدین لائن کانسٹبل ہزاری باغ کا نام دوستوں نے مذاقاً دے دیا تھا۔ قدرتی بات اسی کا نام قرعہ میں آگیا، اور شادی ہو گئی۔

یہ تمام کارروائی دو دن اور دو راتوں میں ہوئی، آخری دوسری رات کو تین بجے پادری نے ہار مان لی تھی اور یہ عقد ہوا۔ اس وقت کریم الدین احمد کے والد مولوی مدار بخش تھانہ مانڈو ضلع ہزاری باغ میں جمعدار تھے، مسٹر گائی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو وہ صبح کو تھانہ مانڈو کے ملاحظہ میں آیا، اور مولوی مدار بخش سے سخت طریقہ اختیار کیا۔ کچھ بس نہ چلا تو ملاحظہ میں ان کے خلاف ریمارکس لکھ آیا۔ یہ بھی نہیں چوکے، انھوں نے کلکتہ پولیس ہیڈ آفس کو تمام

واقعہ سے آگاہ کیا، جس کے نتیجے میں دونوں کا تبادلہ دور دراز مقام پر ہوا۔

اللہ رب العزت کو یہ رشتہ اتنا پسند آیا کہ کریم الدین احمد کے گھر پر رحمت و اکرام کی بارش ہونے لگی۔ کانسٹبل سے تھوڑے عرصے میں ہیڈ کانسٹبل، اسسٹنٹ سب انسپکٹر، سب انسپکٹر سے انسپکٹر بنادئے گئے۔ اس وقت کریم الدین احمد اور قمر النساء کا انتقال ہوچکا ہے۔ لیکن ان کی اولاد میں معین الدین، امین الدین دو لڑکے اور سارہ خاتون ہیں۔ معین الدین رانچی میں کاروبار کرتا ہے اور امین الدین مین پوری میں۔ یہ واقعہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔

مولانا شرف الحق صاحب کو جہاں کہیں عیسائیوں کی سازشوں اور شرارتوں کا علم ہوتا تھا یا کوئی اور طبقہ اسلام پر حملہ کرتا تو اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے تھے۔ یوں تو آپ نے ہندوستان کے ہر صوبے میں تبلیغی کام کیا، لیکن زیادہ توجہ دہلی، یوپی اور بہار کے صوبوں پر رہی، ان میں عیسائیوں سے معرکۃ الآراء مناظرے ہوئے اور خاص طور پر سہارنپور کے تقریباً ہر قصبے ہر دیہات اور ہر شہر میں انھوں نے وحدانیت کا پیغام پہنچایا۔ ہردوار اور ہر کی پیڑی پر عیسائیوں کو علی الاعلان للکارا۔

مولوی شرف الحق صاحب جب جوالاپور جاتے تھے تو راؤ منیر خاں کی کوٹھی میں مقیم ہوتے تھے راؤ صاحب کا خاندان آپ کا مرید تھا۔ آپ کی ایماء پر ۱۸۸۱ء کو جوالاپور میں انجمن اسلامیہ قائم ہوئی اور اس کے اہتمام میں ایک مدرسہ بھی جاری ہوا۔ جب اس کی حالت خستہ ہونے لگی اور لوگوں نے چندہ دینا بند کر دیا تو آپ کو اہل جوالاپور نے ۱۴؍جون ۱۸۹۶ء کو مدعو کیا۔ آپ جوالاپور پہنچے، آپ کی موثر تقریروں کی وجہ سے کافی چندہ جمع ہوگیا اور مدرسے میں دوبارہ جان پڑگئی۔

اسی اثناء میں آپ کو معلوم ہوا کہ ایک مشنری سموئیل کی جدوجہد سے مسلمان مردوں اور عورتوں کے ایمانوں میں خلل آرہا ہے اور مسلمان لڑکے مدرسہ نوادر میں جو مشنریوں کا اسکول ہے تعلیم پا رہے ہیں اور عبدالرحمٰن کا لڑکا وصیت اللہ عیسائی بھی ہوگیا ہے۔ چنانچہ آپ نے ان طالب علموں کے ناموں کی فہرست بنوائی۔

اس کے بعد مولوی شرف الحق صاحب نے جوالاپور کی مسجدوں اور بازاروں میں عیسائیوں کے خلاف تقریریں کرنی شروع کیں اور ان کی مکاریوں کو آشکارا کیا۔ اور مسلمانوں سے وعدے اور حلف لینے شروع کئے۔ ان کوششوں کا ذکر آپ نے اپنے روزنامچے میں کیا ہے:

"۱۸ر جون۔ آج ہی لڑکوں کو مدرسے سے جدا کرنے کی کوشش کی گئی جو مدرسہ مشن میں شریک ہیں بفضلہ کئی لڑکے جدا ہو گئے، بعد نماز عصر وعظ ردِ نصاریٰ ہوا عصر کی نماز کے بعد سموئیل میری شکل دیکھ کر بھاگ گیا، عیسائی تعلیم سے نفرت دلائی گئی، سب نے اقرار کیا کہ ہرگز ہرگز مدد نہ دیں گے۔"

"۲۰ جون۔ ہر نماز کے بعد تخریب مدرسہ نوادر کی گئی۔ اور حلف و عہد وا قرار لیا گیا۔ بعد نماز عشار وعظ مکان حکیم عبداللہ پر ہوا۔ سلطان کے بھتیجے عبدالرحمٰن کے بیٹے کو ازسرنو مسلمان کیا۔"

لہردگہ ضلع رانچی میں محمد علی صاحب عرف مہروا ور ان کے صاحبزادے منشی عبدالقادر صاحب ایک معزز و مقتدر ہستی تھیں۔ ۱۹۰۰ء کی بات ہے، مولانا نے لہردگہ میں وعظ و نصیحت کا سلسلہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تلقین شروع کر رکھی تھی، آپ کی جادو بھری والہانہ، مدلل اور مبسوط تقریروں کا پورے قصبے میں چرچا تھا۔ محمد علی صاحب نے اپنے صاحبزادے کو ہدایت کی کہ وہ بھی مولانا کا وعظ اپنے ہاں کرائے، مولانا کو مدعو کیا گیا۔ آپ نے جب منظوری دے دی، تو واقف کار لوگوں نے ان کو بتایا کہ جس کے ہاں آپ کا وعظ اور دعوت ہے وہ کلال کا پیشہ کرتا ہے، ضلع رانچی کی شراب کی بھٹیوں کا ٹھیکیدار ہے، مولانا دعوت میں پہنچ گئے اور وعظ شروع کیا۔ لیکن جب منشی عبدالقادر صاحب عطر کی شیشی لے کر مولانا کے لگانے کے لئے بڑھے اور چاہتے تھے کہ عطر ان کے لگا دیں، ہاتھ کی جنبش ہی ہوئی تھی، کہ مولانا نے پُرجلال اور رعب دار لہجے میں کہا۔ خبردار ہاتھ آگے مت بڑھاؤ۔ عطر کی صورت میں میرے لباس کو شراب کی غلاظت سے غلیظ کرنا چاہتے ہو۔ ان فقروں سے جلسہ گاہ میں ایک ہو کا عالم چھا گیا۔ منشی عبدالقادر صاحب اور ان کے والد پر خاموشی چھا گئی۔ دو منٹ کے بعد ان لوگوں نے خاموشی توڑی اور توبہ کا اعلان کیا۔ مولانا نے اور حاضرین نے مسرت اور شادمانی کے ساتھ عطر لگایا۔ اسی وقت محمد علی صاحب نے شراب کی بھٹیوں کو توڑ دینے کا حکم دیا، تین ماہ ٹھیکے کی مدت باقی تھی، جس میں نفع ہی نفع تھا۔ اس پر انھوں نے ٹھوکر مار دی۔ اور اس کے بعد سے اس حرام کی کمائی کی طرف توجہ نہیں کی ــــ۔

اسی طرح قصبہ اٹکی کی پوری آبادی کلال پورہ بنی ہوئی تھی۔ ہر مسلمان شراب فروخت

کرتا تھا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتا تھا، مولانا وہاں پہنچے تو آپ نے تلقین کی، جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام قصبے نے شراب بیچنے سے توبہ کی اور ہر ایک آدمی نے شراب کی بھٹیوں کو توڑا۔ اور دوسرا حلال کاروبار شروع کیا۔

مولانا شرف الحق صاحب کا ولی اللّٰہی تحریک سے تعلق تھا، جس کے سرگرم و ذمے دار حضرات مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی اور روح رواں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی تھے۔ اسی طرح مولانا رحمت اللہ صاحب نے دہلی میں اور کیرانہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا، ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے، جس کی بنا پر آپ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حاجی امداد اللہ صاحب آپ کے پیر، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی آپ کے استاد تھے بھلا حکومت برطانیہ کیوں نہ مولانا شرف الحق صاحب کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی۔ حکومت ان کی سخت نگرانی کرتی تھی۔ سی، آئی، ڈی پیچھے پیچھے لگی رہتی تھی، عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی، کبھی مریدوں کے بھیس میں، کبھی مناظرین کے گھر میں مہمان رہتے۔

۱۹۳۰ء میں ایک صاحب بہار کے مرید ہونے کے ناتے ٹاٹ کے کپڑے پہنے فقیری صورت میں گھر پر آئے۔ مہمان بنے گھر کے چھوٹے کمرے پر ٹھیرے، ایک دن اتفاقیہ طور پر ان کی عدم موجودگی میں راقم الحروف امداد صابری کا چھوٹے کمرے میں گیا، تو مجھ کو... وہاں بستر کے نیچے ایک ڈائری کا کونا نظر آیا۔ میں نے اٹھایا۔ ورق گردانی کی تو روزنامہ والد ماجد مولوی شرف الحق کے قول و افعال تاریخ وار درج تھے۔ اور اس انداز سے لکھے تھے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ انگریزی حکومت کے سخت مخالف ہیں۔ یہ ڈائری میں نے اپنے قبضے میں کی اور والد صاحب کو دکھائی تو ہنس دئے اور کہا وہیں رکھ آؤ جہاں سے اٹھائی ہے، جو کام اس کا ہے کرنے دو۔ میں نے ان کے حکم کے مطابق وہ ڈائری بستر کے نیچے رکھ دی۔ وہ حضرت کچھ دن اور رہے اور پھر چل دئے۔ اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہیں لگا جلسوں، مناظروں میں سی، آئی، ڈی آپ کے ساتھ سایہ کی طرح لگی رہتی تھی۔ ایک دراز ریش بنگالی مناظرین کے آپ کے ساتھ جلسوں میں رہنے لگا۔ مناظر بھی اچھا تھا۔ آپ کا ایک معتقد انسپکٹر پولیس آپ سے ملاقات کرنے آیا۔ اس بنگالی مناظر کو دیکھا تو چونکنا ہو گیا۔ اور علیحدگی میں آپ کو اس سے آگاہ کیا۔

بعض لوگوں نے حکومت سے آپ کی شکایت کی کہ حکومت ترکیہ سے مولانا رحمت اللہ صاحب کی معرفت ان کی سازباز ہے اور آپ ہندوستان میں حکومت ترکیہ کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات حقیقتاً صحیح تھی۔

سلطان عبدالحمید خاں صاحب نے ایک ملاقات میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے کہا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں کس طرح قبضہ کیا ہے، اس کے حالات مجھ کو چاہئے ہیں۔ چنانچہ جب مولانا شرف الحق صاحب نے پہلے حج میں مولانا رحمت اللہ صاحب سے ملاقات کی اور ان کے پاس مقیم ہوئے تو اس وقت انھوں نے اس کام کے لئے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ تم ہندوستان جانے کے بعد یہ حالات لکھ کر بھجوا دینا۔ چنانچہ یہ کام انھوں نے انجام دیا۔

اس بات کا اچٹتا ہوا علم حکومت کو ہو گیا تھا، پوری معلومات تو حاصل نہیں ہوئی تھی اس شبہ کی وجہ سے آپ کے خلاف دہرہ دون میں تقریر کرنے کے سلسلے میں مقدمہ چلانے کی تجویز ہوئی تھی، تفتیش دہلی کے حکام نے کی۔ معززین شہر کی کوششوں سے یہ مقدمہ رفع دفع ہو گیا اور مقدمہ پولیس نے واپس لے لیا۔

آپ نے مصر میں ایک نیم سیاسی، نیم مذہبی تقریر کی تھی۔ مصر سے تفتیش کے کاغذات دہلی میں آئے۔ دہلی پولیس کے ہاتھ میں جب یہ کیس آیا۔ اور تفتیش شروع ہوئی تو دہلی کے معزز حضرات نے اپنے بیان مولانا شرف الحق صاحب کے حق میں قلم بند کرائے، جن میں حکیم عبدالمجید خاں صاحب بھی شامل تھے۔ یہ مقدمہ سنگین قسم کا تھا، لیکن دہلی پولیس نے تفتیش میں ہی ختم کر دیا تھا۔

آپ کی پہلی شادی بیس برس کی عمر میں ہوئی جن سے ایک لڑکی امت البصیر صاحبہ ہوئیں۔ دوسری شادی ۳ اگست ۱۹۰۲ء مطابق ۲۸ جمادی الاول ۱۳۲۲ھ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید حاجی شجاعت علی صاحب رئیس جوالاپوری کی صاحبزادی اللہ بندی سے ہوئی جن سے راقم الحروف امداد صابری اور دو لڑکیاں امت الرشید اور صفیہ سلطان ہوئیں۔ امت البصیر اور امت الرشید فوت ہو چکی ہیں۔

آپ نے ۱۳۰۵ھ کے پہلے حج کے بعد ۱۳۲۲ھ میں دوبارہ حج کیا۔ اس حج میں ڈیڑھ سال تک ممالک اسلامیہ قسطنطنیہ، قاہرہ، قونیہ، طرابلس، شام، حمص، بعلبک، بیروت، یافہ،

بیت المقدس، مصر، بصرہ، کوفہ، نجف اشرف، کربلا، دمشق، بغداد اور فلسطین کی سیاحت کی۔

آپ انتہائی ذہین اور خود دار تھے، سپاہیانہ اور رندانہ وضع رکھتے تھے۔ عالمانہ شان بھی قائم تھی، اور تصوفانہ رنگ بھی تھا، قد وقامت میں بلند وبالا، رنگ گورا، آنکھیں بڑی بڑی، نگاہ تیز اور چہرہ بھاری بھرکم اور رکتابی تھا۔ بقول خواجہ حسن نظامی صاحب:

"ان کی خوش بیانی اور وعظ گوئی کی دھوم تھی، وہ جسامت کے اعتبار سے مولانا شوکت علی سے کم نہ تھے، آواز بھی گرجدار تھی، اور طرز بیان بھی فوجی تھا، جس طرح ایک فوجی افسر حکم دیتا ہے۔ اسی طرح وہ تقریر کیا کرتے تھے۔" (منادی)

آخر عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے، پاؤں لنگ کرنے لگا تھا، بینائی میں بھی معمولی سا فرق آگیا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں دقت محسوس کرنے لگے تھے مگر حافظ اس قدر تیز تھا کہ ڈھائی تین ہزار کے کتب خانے میں سے کوئی کتاب آپ کے سامنے رکھ دیتے تھے یا اس کا نام معلوم ہو جاتا تو یہ تک بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر اس مضمون کا میرا حاشیہ لکھا ہوا ہے۔

انتقال سے ڈیڑھ سال قبل لقوہ کا حملہ ہو گیا تھا، جسم کا نصف حصہ اس کی زد میں آگیا تھا۔ علاج ومعالجہ ہونے پر افاقہ ہوا، اور تندرستی کے آثار نظر آنے لگے تھے، لیکن وہ سب وقتی تھے، حکیم نابینا صاحب، حکیم محمد احمد صاحب، حکیم ظفر احمد صاحب اور حکیم عبد الغنی کلکتہ والوں سے خاص تعلقات تھے، وہ ادویات دیتے رہتے تھے مگر بے سود تھیں، پھر لقوہ ابھرا۔ ہوتے ہوتے تمام جسم پر چھا گیا۔ اعضا نے جواب دے دیا۔ اور آخر ستر برس کی عمر میں ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۳۵۴ء کو بروز منگل بوقت ۸ بجے شب، گلی بدلیان محلہ چوڑی والان والے مکان میں جبکہ جارج پنجم کی وفات پر تمام ہندوستان میں ہڑتال تھی آپ نے رحلت فرمائی اور خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

رسم تدفین میں مفتی محمد کفایت اللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم محمد احمد خاں، حکیم ظفر احمد خاں، مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا عبد الرحمٰن صاحب پروفیسر مشن کالج دہلی، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، امام سید احمد جامع مسجد شاہی دہلی، مفتی مظہر اللہ صاحب امام مسجد فتح پوری دہلی، مولوی عبد الغفار صاحب امام مسجد قاضی حوض، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا نور الدین بہاری، پیر جی

عبداللہ صاحب و دیگر معززین شہر علما اور مشائخین نے حصہ لیا۔

ڈھائی تین ہزار عبرانی، یونانی، پشتو، ترکی، انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور ماروڑی کی قلمی و مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ اور حسب ذیل اپنی تصانیف چھوڑیں:

(۱) دافع البہتان بہ تنزیہ الرحمٰن (دو حصہ)۔ (۲) استیصال دین عیسوی بمقابلہ دین محمدی۔

(۳) مناظرہ غازی پور۔ (۴) مناظرہ کالکا۔

(۵) مناظرہ دہلی۔ (۶) مناظرہ حیدر آباد دکن۔

(۷) مناظرہ پونا۔ (۸) مناظرہ ہنکنڈہ

(۹) لکچر امریکہ۔ (۱۰) سفرنامہ حج (قلمی)۔[۱]

دہلی کے مشہور تاریخ گو مولوی محمد ادریس صاحب نسیم دہلوی نے آپ کی تاریخ وفات کہی ؎

"وہ شہرہ آفاق شرف الحق مناظر دین کے — جن کا کہ تھا رد نصاریٰ شغل بائیں ہاتھ کا

تھے یادگار حاجی امداد و مولانا رشید — رحلت سے ان کی ہو گیا سارا جہاں ماتم سرا

تاریخ ایسی بے بدل تو نے کہی اے نسیم! — مرحوم کا درجہ حقیقت میں جو تھا ظاہر ہوا

بحث و نظر، فضل و کرم، حلم و ادب، اور مجد و جاہ — سیف قضا نے آہ سب کو بے سرو پا کر دیا

۱۹۳۶ء

---

[۱] تاریخ جرم و سزا جلد اول

مفتی صدرالدین آزردہ

مولوی مفتی صدرالدین خلف الرشید مولوی لطف اللہ کا خاندان کشمیری تھا۔ مفتی صاحب ۱۲۰۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، ان کی تاریخ ولادت لفظ "چراغ" ہے۔ دہلی میں ہی تربیت و پرورش پائی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا عبدالقادر اور مولانا اسحاق دہلوی سے علوم نقلیہ اور مولوی فضل امام خیرآبادی سے علوم عقلیہ تحصیل کی۔[1]

دہلی کا ہر طبقہ حتی کہ انگریزی حکام آپ کی قابلیت ولیاقت و ذہانت کے قائل تھے اور انکی عزت و توقیر کرتے تھے، جنرل اکٹرلونی کے نفس ناطقہ تھے، جس آسانی سے راجپوتانہ کی پیچیدگیوں کو حل کرکے سرکار انگریزی سے معاہدے کرائے تھے وہ انھیں کا کام تھا۔ انگریزی حکومت نے ان کو عہدہ صدرالصدور پر فائز کیا تھا جو ہندوستان کے لئے اس زمانے میں اعلیٰ ترین عہدہ سمجھا جاتا تھا۔[2] اس زمانے کی عدالتیں مشن کالج (کشمیری گیٹ) پر تھیں۔ یہیں پر مفتی صاحب عدالت کیا کرتے تھے۔ آپ کی میز پر ایک لمبا بانس رکھا رہتا تھا جب عدالت میں زیادہ شور و غل ہوتا تھا تو بانس میز پر بجا دیا کرتے تھے، اسی زمانے کا واقعہ ہے آپ مغلوں کی گلی میں مرزا محمد علی بیگ خلف مرزا خدابخش خاں قزلباش رسالدار میجر کے لڑکے کو گرفتار کرنے گئے تو مغل بچے مفتی صاحب سے بری طرح پیش آئے۔ یہاں تک کہ مفتی صاحب اس کو گرفتار نہ کرسکے، آپ کی عمر میں یہ پہلا واقعہ تھا جو سخت تکلیف دہ گذرا تھا۔[3]

ایک دفعہ مرزا غالب بہت مقروض ہوگئے، قرض خواہوں نے ان پر مقدمہ دائر کردیا، جوابدہی میں طلب ہوئے، مفتی صدرالدین صاحب کی عدالت تھی ـــــ جس وقت پیش ہوئے تو

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳ [2] گلشن بیخار ص ۱۰ [3] کرزن گزٹ دہلی ۸ مارچ ۱۹۱۲ء

یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب نے یہ شعر پڑھ کر ان کے قرضے کا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا[1] مفتی صاحب دہلی کے مشہور مفتی تھے، ان کا فتویٰ قابل احترام سمجھا جاتا تھا، آپ جیسے معقولات کے ایک جید عالم تھے ویسے ہی منقولات میں بھی کمال کی مہارت حاصل تھی۔ عدل و انصاف کرنے کے علاوہ آپ کو درس و تدریس سے بے پناہ شغف تھا۔ آپ کا خرچ زیادہ تر طلبا پر ہوتا تھا، طلبا کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا اور لباس تک آپ ہی دیتے تھے۔ مدرسہ دارالبقا کی عمارت شکستہ ہو گئی تھی، آپ نے اپنے خرچ سے اس کی مرمت کرائی۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں جو ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی تھی، آپ کی اس علم نوازی کا ذکر کیا ہے:

"(جامع مسجد کے جنوبی) دروازہ کی طرف مدرسہ دارالبقا ہے، اگلے زمانے میں اس میں طالب علم رہا کرتے تھے اور معقول و منقول پڑھاتے تھے، یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، زمانہ اہل اللہ سے خالی نہیں اور ہر وقت میں کوئی نہ کوئی صاحب ہمت عالی اور فطرت بلند ہوتا ہے اور یہ ہمت اور دل اور داد و سخا سوائے اس کے جس پر اللہ کا سایہ رحمت ہو اور کسی کو میسر نہیں ہوتا اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے جناب مولانا مولوی محمد صدرالدین خان بہادر صدر الصدور شاہجہاں آباد کو ہمت بلند اور فطرت ارجمند عنایت کی ہے کہ شاید اگلے زمانے میں کسی کو نہیں ہو گی، جناب ممدوح نے اپنی عالی ہمتی سے اس دارالبقا کو زر خطیر صرف کرا کر از سر نو مرتب کیا ہے اور شاہجہانی طور پر جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے، ان کو نئے سرے سے بنایا ہے اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں، ان کی خبر گیری، نان و پارچہ کی ان کی سرکار عالی سے ہوتی ہے، سبحان اللہ غور کرو کہ یہ چشمہ فیض ہے کہ ان کی ذات فیض آیات سے جاری ہے اور شجر ہائے پُر بار دین کو پانی دیتا ہے۔ دنیا میں بجز نیک نامی کے کچھ نہیں رہتا اور عقبیٰ میں بجز اعمال کے اور کچھ نہیں جاتا ہے، یہ دونوں

[1] خم خانہ جاوید اول ص ۵۴۴

باتیں اللہ تعالیٰ نے انھیں کے لئے پیدا کی ہیں"

بحیثیت صدر مدرس منتہی طلباء کو مفتی صاحب بذات خود درس دیتے تھے، جمعہ کو جو تعطیل ہوتی اس دن تمام طلباء کو اپنے ہمراہ لے کر باغ لے جاتے، طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے کھلا کر خوش ہوتے تھے [۱]

بازار مٹیا محل میں پھاٹک عزیز آبادی اور پھاٹک دوجانہ کے درمیان ایک مسجد ہے جو آج کل دوجانہ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے، یہ مسجد ۱۸۵۷ء سے قبل بہت شکستہ ہو گئی تھی، اس کی بھی مفتی صدرالدین صاحب نے زر کثیر خرچ کر کے مرمت کرائی اور ایک نیا کنواں کھدوایا۔

ہر ہفتہ باری باری سے مفتی صدرالدین صاحب اور نواب شیفتہ کے ہاں مشاعرے ہوتے تھے۔ جس میں دہلی کے معزز و مقتدر اہل علم، اہل قلم اور اہل سخن اور اہل فن شامل ہوتے تھے، ان لوگوں کے دیوان خانیں مرکزی حیثیت رکھتے تھے، ان میں شعر و شاعری پر ذہن رسا کی ڈور نہیں ہوتی تھی بلکہ ملک و شہر کے ہر مسئلے پر بڑے غور و فکر کے ساتھ تبادلہ خیال ہوتا تھا اور اس کے نتائج پر دماغ سوزی کی جاتی تھی۔

ہر ذی ہوش و باشعور انسان غلامی کی لعنت کو اچھا نہیں سمجھتا۔ ہر طرح سے اپنے آپ کو بے بس سمجھنے لگتا ہے، عزت و آبرو قائم نہیں رہتی، مذہبی شعار، رسم و رواج، تمدن و معاشرت اور سماجی زندگی پر محکوم قوموں کو کچھ بھی اختیار نہیں رہتا، وہ غیر محفوظ ہی نہیں ہوتیں بلکہ خطروں سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان پر تسلط و قبضہ حاصل کرنے کے بعد ہندوستانیوں کی عزت و آبرو، مذہبی شعار، رسم و رواج اور سماجی زندگی کو طاقت کے زور پر بدلنے کی کوشش کی اور عیسائیت کی طرف راغب کرنے کے لئے ناپاک ہتھکنڈے استعمال کئے۔

اپنی اپنی جگہ پر ہر ہندوستانی نے احساس کیا، جس طرح مولانا فضل حق خیر آبادی نے انگریزوں کے خطرناک و تباہ کن حرکات و سکنات کا جائزہ لیا، انہی نگاہوں سے ان کے ساتھی مولانا امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین رخشاں وغیرہ وغیرہ نے بھی انگریزوں کے ناپاک منصوبوں کو دیکھا۔ چنانچہ ان اعمال بد کی وجہ سے ہندوستانیوں کے

[۱] گل رعنا ص ۳۲۷

دل ودماغ میں غلامی کی لعنت کے خلاف نفرت وحقارت وانتقام کے جذبات پیدا ہوئے، بغاوت نے جنم لیا، جس کا ظہور میرٹھ سے ہوا، اور ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں آکر قدم جمے، جس کے اثرات ملک کے کونے کونے میں پہنچے۔ دہلی کا ذی شعور طبقہ بھی حرکت میں آیا۔ مفتی صدرالدین خاں صاحب جو انگریز کی عدالت میں صدر الصدور کی کرسی پر رونق افروز تھے، ان کو جب دہلی میں مجاہدین کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ اجلاس برخواست کر کے چلے گئے [۱] اور مسٹر لیاس مجسٹریٹ کو بھی اجلاس برخواست کرنا پڑا، یہ صاحب بہادر اجلاس ختم کر کے مجاہدین کی بیخ کنی میں لگ گئے، لیکن مفتی صاحب انگریزی صدر الصدور ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے حامیوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے ۱۹ر رمضان مطابق ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل ہوئے۔ چنانچہ عبداللطیف خاں صاحب کا روزنامچہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے، اس کی عبارت یہ ہے [۲]:

"صبح کے وقت جب بادشاہ کو اصلاح ملکی کا خیال پیدا ہوا، میاں نظام الدین، نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، نواب حسن علی خاں، نواب احمد علی خاں، اعتماد الدولہ میر حامد علی خاں، نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب محمد صاحب، خان جہاں خاں، ارادت خاں، مفتی صدرالدین خاں، اور کرم علی خاں ایوان شاہی میں آداب بجالانے کے لئے حاضر ہوئے اور زمین بوسی سے سرخروئی حاصل کی اور ہر ایک نے ایک ایک خرمہرہ پیش کیا۔"

مفتی صاحب جنگجو قسم کے آدمی نہیں تھے، زندگی بھر عدل وانصاف کیا، چنانچہ ۲۳ شوال مطابق ۱۷ر جون کے دربار میں مفتی صدرالدین خاں بہادر شاہ ظفر کو دیوان حافظ دینے کے لئے آئے، بادشاہ نے ان سے فوجداری مقدمات فیصلہ کرنے کا شغل قبول کرنے کی بابت دریافت کیا، اگرچہ انھیں اس کی بہت آرزو تھی لیکن نامساعد حالات کی بنا پر انھوں نے معذرت کر دی۔

لیکن غلام حسین خاں خلف نواب غلام حسن اپنی تالیف "نصرت نامہ جنگ" میں مفتی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے قلعے میں عدالت کا کام کیا۔ کس صورت میں کیا وہ بھی پڑھ

[۱] کنز التاریخ ص ۳۰۷ [۲] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۲۳

لیجئے کہ کہاں تک صحیح ہے۔ اور مصنف نے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تو ایسا نہیں لکھا[۱]:

"مفتی صدرالدین ۳۵ سال سے انگریزوں کے ملازم تھے، بڑے بڑے عہدوں پر رہے، اب پچیس سال سے دہلی کے صدر الصدور تھے، بڑے ایماندار حاکم تھے اہل مقدمہ ہمیشہ ان کے انصاف سے خوش رہتے تھے، جب غدر میں کچہریاں اور دفتر جلا کر خاک سیاہ کر دئے گئے تو یہ بھی گھر میں بیٹھ رہے، بادشاہ کے بلانے سے مجبور ہو کر جبراً قہراً قلعہ میں عدالت کا کام کرنے لگے۔"

عدل وانصاف کرانے کے علاوہ مفتی صاحب سے بہادر شاہ ظفر نے بڑے نازک موقعے پر اہم کام لئے اور ان کو جھگڑوں کو طے کرانے کے لئے مقرر کیا، چنانچہ جنگ آزادی کے درمیان ایک خطرناک قضیہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، جس کو نمٹانے کے لئے ۸ ذی الحجہ، ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے مفتی صدرالدین صاحب کو بھیجا جس میں یہ کامیاب ہوئے —— عبداللطیف کے روزنامچے کی عبارت یہ ہے:

"(ایک گروہ) نے قربانی کے متعلق یہ منادی کی ہے کہ گائے کی قربانی ہرگز نہ ہونے پائے، جب ان کی سرکشی حد سے گذر گئی تو تمام مسلمانوں نے ان کی تادیب کی کوشش کی، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین مولانا شاہ احمد سعید جو قابلِ تعریف اور برگزیدہ ہستی ہیں، سب سے پہلے ان مفسدوں سے جہاد کے لئے اٹھے اور جہاد کا جھنڈا جامع مسجد کے سامنے نصب کر دیا اور جہاد کی تلقین کی اور عام دعوت دی، جوں ہی لوگوں نے سنا، ان کے گرد آکر جمع ہونے لگے، جامع مسجد کے سامنے عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگ گیا، اکثر مجاہدین نے اسی جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا، اکثر دکانداروں نے انھیں خورد و نوش دینے کی ہمت کی، جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا مفتی صدرالدین کی زبانی جو سنجیدہ گو، شگفتہ مزاج، ذی علم اور با لحاظ آدمی تھے (مولانا شاہ احمد سعید) کے پاس کہلا کر بھیجا اور یہ شعر بھی اپنی قلم سے لکھ کر دیا۔

رخ متاب اے یار گر پیشت نیاز آرد کسے   ناز زیں آں بہ کز و ہرگز نیاز آرد کسے

---

[۱] غدر کا نتیجہ ص ۵۶

مولانا نے بادشاہ کی ایما، پر اپنا ارادۂ جہاد ترک کر دیا۔"

روزنامچہ جیون لال میں مفتی صاحب کے مذکورہ واقعہ اور مذکورہ تاریخوں میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شریک ہونے کی تصدیق کی ہے اور مزید حسب ذیل تین تاریخوں میں شرکت کے بارے میں لکھا ہے:

"۲؍اگست: آج بادشاہ دربار عام میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ جلوہ فرما تھے، مولانا امین الدین، سعادت علی خاں وکیل، فضل حسن خاں، ابراہیم علی خاں وکیل، اکبر علی خاں بھی دربار میں حاضر تھے، جنرل سمند خاں رسالدار، غلام نبی خاں وکیل، حسن علی خاں اور مولوی صدر الدین خاں بھی شریک ہوئے، ۱۲۶ روپے اور نو اشرفیاں بطور نذر پیش ہوئیں، بالعموم جنگی حالت پر گفتگو ہوئی، اس کے بعد بادشاہ نے چند اشعار سنائے، جنھیں انھوں نے موزوں کیا تھا، یہ اشعار جنرل بخت خاں کے پاس بھیج دئے گئے تھے ان کا مفہوم یہ تھا:

خدا کرے کہ دین کے دشمن تباہ و برباد ہوئیں خدا کرے فرنگی نیست و نابود ہو جائیں، قربانیاں کر کے عید قربان کے تہوار کو مناؤ اور دشمنوں کو تہ تیغ کر دو، کوئی بچنے نہ پائے۔"

"۹؍اگست: مولوی صدر الدین کے مکان پر آج پچاس انگریزی سپاہیوں نے حملہ کیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہاں ۰۰، جہادی مقابلہ کے لئے تیار ہیں واپس آگئے"۔

"۱۲؍اگست: بادشاہ دربار میں جلوہ گر ہوئے، بادشاہ نے مولوی صدر الدین خاں سے کہا جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال جنھیں سپاہیوں نے لوٹ لیا تھا واپس نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک تمھیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

روزنامچے کے ان اندراجوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی صدر الدین بہادر شاہ ظفر کی جنگی مشوروں میں شامل ہوتے تھے، ان کے ہاں مجاہدین کا جھمگٹا لگا رہتا تھا۔ اور ان کی ایما پر مجاہدین نے حکیم احسن اللہ خاں کا مال لوٹا تھا۔ اس لئے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزی حکام سے ساز باز رکھتے تھے۔

جنرل بخت خاں جب دہلی میں آئے تو انھوں نے جنگ میں شامل ہونے کے لئے دہلی کے علماء کو

جامع مسجد میں جمع کیا اور فتویٰ جہاد پر دستخط کرائے، جس پر مفتی صدر الدین صاحب نے بھی دستخط کئے تھے۔
فتویٰ جہاد یہ تھا، جو ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار دہلی میں چھپا تھا:

"کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں، اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں، اور جو لوگ اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں، ان کو بھی جہاد چاہیئے یا نہیں، بیان کرو اللہ تم کو جزائے خیر دے۔"

جواب:

"در صورت مرقومہ یہ فرض عین ہے، اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے، چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے، بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے، ہاں اگر شہر کے باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جاوے گا اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرعاً اور حرباً فرض عین ہو گا اور جو عدو بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر فرض ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ان کی طاقت۔

اس جواب کے نیچے حسب ذیل علماء کے دستخط ہیں:
رحمت اللہ، سید محمد نذیر حسین، نور جمال، عبد الکریم، سکندر علی، مفتی صدر الدین، مفتی اکرام الدین، محمد ضیاء الدین، احمد سعید، محمد عنبر جان، محمد کریم اللہ، سعید شاہ نقش بندی، عبد القادر، مولوی عبد الغنی، محمد علی، سرفراز علی، سید محبوب علی جعفری، محمد حامی الدین، مولوی سعید الدین، فرید الدین، سید احمد، الٰہی بخش، محمد انصار علی، حفیظ اللہ خاں، نور الحق، محمد رحمت علی

خان عدالت العالیہ، محمد علی حسین قاضی القضات، سیف الرحمٰن، محمد ہاشم، سید عبدالحمید، سید محمد۔

مفتی صاحب کے فتویٰ پر دستخط کرنے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے، جس کو لالہ سری رام صاحب نے "خم خانہ جاوید" میں نقل کیا ہے:

"مفسدوں نے آپ کے جہاد کے جواز کے فتویٰ پر زبردستی مہر کرانی چاہی، تو آپ نے مہر کے ساتھ یہ الفاظ بھی لکھ دیے (فتویٰ بالجبر) مفسدوں نے اس لفظ کو بالخیر سمجھ کر پیچھا چھوڑ دیا۔ مگر جب بعد از فتح دہلی دفتر سے وہ کاغذ برآمد ہوا تو سرکار نے پکڑا اور جواب طلب کیا، آپ نے فتویٰ بالجبر ثابت کر کے رہائی پائی۔"

"ثورۃ الہندیہ" میں مولانا شاہد شروانی نے لفظی تبدیلی کے ساتھ روایت کو اس طرح بیان کیا ہے:

"مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی نے بھی علامہ (فضل حق) کی خاطر سے فتویٰ پر شہدت بالجبر لکھ کر دستخط کر دیے تھے، گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنے پڑ رہے ہیں، بالجبر پر نقطے نہ لگائے تھے، علماء وقت نے اسے بالخیر پڑھا اور مفتی صاحب نے بالجبر بتا کر جان چھڑالی۔"

امتیاز علی عرشی صاحب نے اس روایت کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ انھوں نے یہ اعتراض کیے:

"یہ موقع گواہی کا نہ تھا جو آزردہ "شہدت" لکھتے بلکہ توثیق جواب کا تھا، اس لئے کم از کم "کتبت" لکھنا چاہئے تھا جس کا مطلب تھا میں نے لکھا۔ فتویٰ کی جو نقل صادق الاخبار میں چھپی ہے اس میں مولانا کی مہر کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "شہدت بالجبر" کا کوئی واقعہ نہیں ہے۔"

منشی ذکاء اللہ صاحب مہر فتویٰ کے بارے میں ایک نئی بات فرماتے ہیں:

"(جنرل بخت خاں) نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتویٰ پر دستخط و مہریں کرالیں اور مفتی صدرالدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔"

گویا مفتی صاحب نے دو مہریں بنوا رکھی تھیں ایک نقلی اور ایک جعلی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تینوں رائے — بالجبر، شہدت بالجبر اور جعلی مہر ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

مفتی صاحب معمولی آدمی نہیں تھے بلکہ ہندوستان کے مسلمہ مدبروں اور مفکروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، وہ یہ جانتے تھے کہ وہ انگریز کے قدیمی ملازم تھے، اس کے باوجود انھوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کسی قسم کا تعلق ہی نہیں رکھا بلکہ ابتدار جنگ سے خاتمے تک بہادر شاہ ظفر کے درباروں میں نذرانے پیش کیے جنگی کونسلوں میں شامل ہوتے رہے اور نازک معاملات طے کراتے رہے، ان کا گھر مجاہدین کا سہارا تھا، ایسا شخص بھلا فتویٰ جہاد پر مہر کرتے وقت مکر و فریب سے کام لے گا۔

مفتی صاحب کو اس نظر سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا کہ وہ انگریز سے ساز باز رکھتے تھے۔۔۔ مجاہدین نے جنگ کے دوران بہت سے لوگوں پر شبہ کیا لیکن ان کی ذات اس سے مبرا رہی کسی نے ان پر کسی وقت بھی انگلی نہیں اٹھائی۔

اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مفتی صاحب پر الزام انتہائی سنگین تھا، ان کے بچاؤ کی اور کوئی شکل نہیں تھی کہ یہ اپنی مہر سے انکار کر دیں، چنانچہ انھوں نے جب یہ دیکھا ہو گا کہ سب لوگ یعنی سید نذیر حسین اور نواب ضیاء الدین وغیرہ اپنی مہروں سے انکار کر رہے ہیں تو انھوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہو گا، آخر انسان تھے جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ —— ایک اور وجہ مفتی صاحب کی رہائی کی منشی ذکاءاللہ صاحب نے بیان کی ہے:

"ایک اور طریقہ بھی امیروں کے لوٹنے کا تھا بعض ذی اختیار انگریز مجرموں کو سب طرح سے جرم سے بری ہونے کی اسناد دیدیتے، اور ان سے خاطر خواہ روپیہ لے لیتے، مشہور ہے کہ نواب حامد علی خاں، مفتی صدرالدین خاں اور مکندلال مصر نے اس طرح زر کثیر دے کر اپنی جانیں بچائی تھیں"

یقین تو نہیں آتا کہ مفتی صاحب نے ایسا کیا ہو گا ہو سکتا ہے کہ مفتی صاحب کے کسی رشتہ دار یا دوست نے یہ معاملہ طے کر لیا ہو۔ مفتی صاحب گرفتار ہوئے، رہائی ہونے کے بعد کیا سزا ملی، اس کا حال مرزا غالب نے حکیم سید احمد حسن مودودی کے ایک خط میں لکھا ہے:

"مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے، کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا، نوکری موقوف جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر

نے از راہِ ترحم نصف جائیداد واگذاشت کی، اب نصف جائیداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں، کرایہ پر معاش کا مدار ہے، اگرچہ یہ آمدان کے گذارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس چالیس روپیہ مہینہ کی آمد لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی عترت ہے، اور وہ دس بارہ آدمی ہیں لہذا فراغ بالی سے نہیں گذرتی ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے، عشرۂ ثامنہ کی اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے غنیمت ہیں (۱۹ر جنوری ۱۸۶۲ء)"[۱]

مفتی صدرالدین صاحب اپنے دور میں فضل و کمال اور فنون ادبیہ میں بے نظیر تھے اور جامعیت کے اعتبار سے اپنا جواب آپ تھے، اپنے ہم عصروں میں انتہائی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مسلمہ شخصیتیں ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، سرسید مرحوم ان کی تعریف و توصیف کی ابتدا اس شعر سے کرتے ہیں ؎

"ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

بے شائبہ تکلف و بے آمیزش مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی اور مستجمع علوم بے منتہا ہو اب سوا اس سرگروہ علمائے روزگار کے بساط عالم پر جلوہ گر نہیں... اگر مولوی جامی زندہ ہوتے، یہ بیت ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد بہ تدبیر عبید اللہی آمد

سوا اس برگزیدہ انفاس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے"۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ فرماتے ہیں:

"باعتقاد من روزیکہ بہ شرف مجالست ایشان بپایان اید داخل ایام عمر نیست خلق مجسم است و لطف مصور مانی اندیشہ را بہتر ازیں نقشی نہ بر صفحہ خاطر است و نہ پیش گاہ نظر در فنون ادبیہ ثانی اعشی و جریر است و در مراتب حکمیہ ثالث باقرد نصیر رسیدن بانداز فہمش نہ سہل است و دعوی ادراک علمش از جہل خیال ازل

[۱] اردوئے معلی ص ۲۴۱

بایں خوبی قبای قابلیت بربالائے بندوختہ درو شنگر قضا بایں روشن دلی و آگاہی آئینہ ضمیری نیفروختہ۔"

مولوی عبدالحی مؤلف گلِ رعنا تحریر کرتے ہیں:

"جناب آزردہ مرحوم ان چند اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجہ جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملک میں بھی اپنی اعلیٰ استعداد کا سکہ بٹھایا، خود آپ اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، علمار کی مجلس ہو تو صدر نشین، مشاعرہ ہو تو میر مجلس، حکام کے جلسوں میں موقر و ممتاز، بیکسوں اور محتاجوں کے ملجا و ماویٰ، منصب اعلیٰ پر ممتاز، حکام رس ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت ظاہری نمائش سے کوسوں دور تھی، دنیاوی آسائش کے تمام سامان بہم ہوتے ہوئے سیدھی سادھی وضع سے بسر کرتے تھے۔"

مرزا غالب مفتی صاحب کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے، لیکن مفتی صاحب مرزا غالب کی شاعری کی خاص طرز کو جو انھوں نے شروع میں اختیار کی تھی پسند نہیں کرتے تھے اور جو رائے انھوں نے ابتدار میں مرزا غالب کے بارے میں قائم کی تھی وہ آخر تک اسی پر قائم رہے۔ چنانچہ مرزا غالب نے مفتی صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے، جس میں انھوں نے مفتی صاحب کی رائے کی طرف اشارہ کیا ہے:[1]

باچنیں اندہ کہ گفتیم و دل خالی نہ شد	خواجہ گر اندوہ گسارِ من نبودے وائے من
آں کہ در یکتائی مے در فن فرزانگی	متفق گردیدہ رائے بوعلی با رائے من
آنکہ چوں خواہد بنا مش نامہ نامی ساختن	بر نگارد عقل فعالش کرم فرمائے من
دل بدیں و صفم بنا سایدسخن کوتہ کنید	آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من

مرزا غالب کے انتقال سے چھ سات سال قبل کی بات ہے کہ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان پر دعوت تھی۔ مفتی صاحب، مولانا الطاف حسین حالی اور مرزا غالب وغیرہ جمع تھے، کھانا تقسیم ہونے میں کچھ دیر تھی، وہاں پر مرزا غالب کے فارسی دیوان کے کچھ اوراق رکھے ہوئے تھے جس کا مطلع یہ تھا ؎

[1] یادگارِ غالب ص ۱۸۱

نشاطِ معنویہ از شراب خانۂ تست

فسوں بابلیاں فصلے از فسانۂ کنت

اس غزل کے مقطع میں مرزا غالب نے اپنے منکروں سے خطاب کیا تھا۔ مرزا نے وہ اوراق اٹھائے تو اس غزل پر نظر پڑی۔ مفتی صاحب سے مزاحیہ طور پر کہا کہ دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیسی عمدہ و زبردست غزل کہی ہے۔ پہلے دو تین اشعار پر مفتی صاحب نے داد دی مگر جب ان کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ غزل مرزا غالب کی ہے تو عادت کے مطابق مسکرائے اور کہنے لگے کلام ہے تو مربوط لیکن کسی نو آموز کا معلوم ہوتا ہے۔ حاضرین ہنس دئے۔ مرزا غالب جب مقطع پر پہنچے تو مفتی صاحب کی طرف مخاطب ہوئے اور در دبھری آواز سے یہ مقطع پڑھا:[۱]

تو اے کہ محوِ سخن گستران پیشینی

مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

جس سے لوگوں نے بہت اثر لیا۔ اور مفتی صاحب خاموش ہو گئے ——— ایک روز کسی صاحب نے مفتی صاحب کے سامنے مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

مفتی صاحب عام فہم اشعار کو پسند کرتے تھے، مرزا کا کلام ادق اور عام فہم نہیں ہوتا تھا، اس لئے اس کو سن کر اکثر الجھتے تھے۔ اور ان کے اس طریقے پر ہمیشہ اعتراض کرتے تھے مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر دریافت کیا یہ کس کا شعر ہے، بتایا گیا مرزا غالب کا ہے، چونکہ مفتی صاحب مرزا غالب کے شعر کی تعریف کرنے سے گریز کرتے تھے اس روز لاعلمی میں تعریف ہو گئی، فوراً سنبھلے اور عادت کے مطابق فرمایا اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے، یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے۔

ایک روز منشی بہاری لال مشتاقؔ اپنے دوست لالہ رام چند قمرؔ کے ہمراہ مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شعر و شاعری کا ذکر چلا، قمرؔ نے مرزا غالب کی نکتہ سنجی اور نازک خیالی کی بہت تعریف کی۔

[۱] یادگار غالب ص ۱۸۲

مفتی صاحب نے چیں بجبیں ہو کر فرمایا نہایت مشکل کہتا ہے اور پھر زانو پہ ہاتھ مار کر شگفتہ جبیں ہوئے اور فرمایا ہائے اچھا کہتا ہے تو ایسا کہتا ہے :[1]

گما سمجھ کے وہ چپ تھا جو شامت آئی

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

دلی میں ایک مشاعرہ تھا، مرزا غالب نے اپنی فارسی کی غزل پڑھی، مفتی صدر الدین اور مولوی امام بخش صہبائی بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ مرزا غالب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا ع

بوادیٔ کہ در آں خضر را عصا خفت است

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است میں کلام ہے۔ مرزا غالب نے کہا حضرت میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا، اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا ع

ولے بجملہ اول عصائے شیخ بخفت

انھوں نے کہا اصل محاورے میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں؟

ایک روز مرزا غالب گرمی اور لو کے موسم میں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مفتی صاحب ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے چلے آئے اور اسی کوٹھری میں پہنچے، مرزا کو رمضان شریف کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر مفتی صاحب نے فرمایا ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔

مفتی صاحب ایک وضعدار انسان تھے۔ ایک دفعہ قلعے کے ترپولئے میں بہادر شاہ ظفر کی سواری قریب سے گزر گئی نہیں معلوم آپ اس وقت کس خیال میں تھے، سلام نہ کر سکے جب رزیڈنٹ کو یہ خبر ہوئی تو انھوں نے بلا کر دو روپے جرمانہ کر دیا، آپ نے اس دن سے مرتے دم تک کسی کے ساتھ سلام کرنے میں سبقت نہیں کی گویا خود سلام کرنے کی عادت ہی اٹھا دی۔

[1] خم خانۂ جاوید جلد اول ص ۵۲

مفتی صاحب مجالس علمیہ کے رکن تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے جامع مسجد پر قبضہ کر لیا تھا، اس لئے کہ یہ مجاہدوں کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں فوجی ہسپتال پانچ سال تک رہا۔ مفتی صاحب وغیرہ کی کوششوں سے یہ مسجد اسی سال ۱۸۶۲ء میں واگذار ہوئی، جبکہ بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا۔ اس مسجد کے انتظام کرنے کے لئے دس آدمیوں کی کمیٹی بنائی گئی جس میں مفتی صدرالدین صاحب، منشی تراب علی، مرزا الٰہی بخش اور تفضل حسین خاں وغیرہ بھی ممبر تھے۔

مفتی صاحب سادہ وضع کے انسان تھے، لباس بھی سادہ تھا، ایک برکا پائجامہ، سفید کرتا پہنتے تھے۔ سفید ہی صافہ باندھتے تھے، گٹھا جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی اور بڑھی ڈاڑھی تھی۔

مفتی صاحب کے کافی نامور اور مشہور شاگرد تھے، آپ کے متعلق یہ بات زبان زد خاص عام تھی کہ جس نے آپ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا وہ اعلیٰ مدارج پر پہنچا، اور عزت پائی۔ نواب یوسف علی ناظم والیٔ رامپور نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں مفتی صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی، سر سید احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں، مولوی ذوالفقار علی دیوبندی، مولوی فیض الحسن، مولوی محمد حسن امروہوی، مولوی احمد حسین مرادآبادی، مولانا سید نواب علی، مولوی سمیع اللہ خاں، مفتی سعد اللہ مرادآبادی آپکے ہی شاگرد تھے۔ مفتی صاحب کثرت کے ساتھ درس و افتاء میں مصروف رہتے تھے، اس لئے تصانیف زیادہ مرتب نہیں کر سکے۔ (۱) رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال (۲) دارالمنضود فی حکم امراۃ المفقود، اور فتاویٰ ان کی یادگار ہیں۔

مفتی صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی، اپنی بیوی کے حقیقی بھانجے مولوی عنایت الرحمٰن صاحب سابق ڈپٹی کمشنر محکمہ دریافت انعامات گورنمنٹ نظام دکن کو متبنّیٰ بنا لیا تھا۔

دو سال تک مفتی صاحب فالج کے مرض میں مبتلا رہے، بقول مرزا غالب پرسوں (۱۱ر دسمبر) کو فالج ہو گیا، سیدھا ہاتھ رہ گیا، زبان موٹی ہو گئی ہے، بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔[1]

اکیاسی سال کی عمر میں جمعرات کے دن ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۶ر جولائی ۱۸۶۸ء کو

[1] اردوئے معلیٰ ص ۲۳۴

مفتی صاحب نے انتقال کیا، درگاہ روشن چراغ دہلی میں مدفون ہوئے۔

مفتی صاحب کی مادہ تاریخ وفات "چراغ امم" اور غم جدائی آزردہ ہیا۔ ان کے ایک شاگرد شمس الشعراء مولوی ظہور علی نے حسب ذیل تاریخ وفات کہی[1]:

چہ مولانائے صدرالدین کہ درعصر	امام اعظم آخر زمان بود
زہے صدر الصدور نیک محضر	بعدل و داد چوں نوشیراں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت	کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم	وداع او سوئے دار الجنان بود
ظہور افسوس آں استاد ذی قدر	پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود

چراغش ہست تاریخ ولادت

کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

۱۲۸۵ھ

اکمل الاخبار دہلی عرصے تک مفتی صاحب کی تاریخ وفات شائع کرتا رہا، چنانچہ ۱۹ اگست ۱۸۶۸ء کے شمارے میں پنڈت لشن نرائن مہجور کی حسب ذیل تاریخ وفات درج کی ہے ؎

مفتی ذیجاہ صدرالدین خاں ذی کمال

چوں ازیں دارِ فنا شد عازم باغِ جناں	
سال تاریخ وفات آں مہ اوج شرف	درخور خود ہر یکے آورد در نظم بیاں

ازپئے تاریخ آں مہجور دل مجروح ہم

ازسر افسوس گفتہ مرد صدرالدین خاں

۱۲۸۵ھ

مفتی صاحب شاعری میں اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتے تھے، سخن گوئی کے علاوہ سخن فہم بھی بلا کے تھے، آپ نے شروع میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں، کچھ دنوں میاں مجرم اکبرآبادی سے بھی مشورہ لیا، بعد میں میر ممنون کو کلام دکھانے لگے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، شعر کی طرف توجہ کم تھی، دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھار شعر کہہ لیا کرتے تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد تو شعر کہنا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ مرزا غالب میر مہدی کے خط میں لکھتے ہیں[2]:

---

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۹۴ [2] عود ہندی ص ۱۰۱

"او میاں سید زادے، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ خود بیخود مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی۔"

اس کے باوجود مفتی صاحب شاعری کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے اور اپنا سکہ منوایا، ایک مرتبہ آپ کے حسبِ ذیل شعر پر ؎

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے
گر ہم بھی سبک حرکت و نا اہل سے ہوتے

کسی نے اعتراض کیا، کہ کیا حرکت بفتحتین چاہئے، اس پر آپ نے اساتذہ فارس کے بیسیوں شعرائے مہملہ کے سکون کی سند میں پیش کر کے مخالف کو ساکت کر کے چھوڑا۔

آپ کا کلام ہر قسم کے اغلاق و تنافر سے پاک ہے۔ عربی زبان پر قادر ہونے کے باوجود اس کا اثر ان کے اشعار میں نہیں پایا جاتا ہے۔ شوخیٔ طبع اور سلاستِ زبان ان کے کلام کی جان ہے، کلام کا بہت سا حصہ تلف ہو گیا، اس لئے دیوان مرتب نہیں ہوا۔ عربی و فارسی کا کلام آثار الصنادید میں ملاحظہ کیجئے۔ یہاں اردو کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کے زبان کے ہیں

اس درد جدائی سے کہیں جان نکل جائے
آزردہ مرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر

کروں چاک سینہ، تو سو بار، لیکن
نہیں داغِ دل یہ دکھانے کے قابل

اے بلبلان شعلہ دم، ایک نالہ اور بھی
گم کردہ راہِ باغ ہوں، یاد آشیاں نہیں

افسردہ دل نہو، درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا، درِ پیرِ مغاں نہیں

کیا کچھ نکر دکھاؤں، پر اک دن کے واسطے
ملنا بھی ہم کو منصب ہفت آسماں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی، آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب ہے
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

ہم جان و دل کو دے چکے موہوم امید پر
اب ہو سو ہو ڈبو دی یہ کشتی شراب میں

ذکر وفا وہ سنتے ہی مجلس سے اٹھ گئے
کچھ گفتگو ہی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ! جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اِس کو آرام، اُس کو خواب نہیں

گیا کون صید افگن ادھر سے
کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں

گو اسیری میں ہوں پر مثلِ اسیر تصویر
نہ غم قید، نہ پروائے رہائی مجھ کو

الجھنے کو بلا ہیں آپ بھی کچھ خیر ہے صاحب
لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلفِ پریشاں کو

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضع داریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے، ہم بیشتر ملے

اس کی گلی میں لے گئے آزردہ کو اسے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

مکھڑا وہ غضب، زلفِ سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

نقشے تو بہت صانع قدرت نے بنائے
پر بن نہ سکا پھر دہن ایسا کمر ایسی

بالیں پہ کھڑا روتا ہے راتوں کو مسیحا
کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

پروانہ وار ہے حدِ پرواز شعلے تک
جلنے ہی کے لئے مجھے یہ بال و پر ملے

عالم خراب ہے، نہ نکلنے سے آپ کے
نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر!
کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں

حکیم طالب احمد صاحب مالک قومی دواخانہ دہلی

حکیم طالب احمد صاحب کا وطن ہمدان تھا، جو ایران کا دار الخلافہ تھا۔ آپ کے بزرگ نادر شاہ بادشاہ کے ہمراہ دہلی آئے اور کلاں محل کے قریب ایک بڑی حویلی میں مقیم ہوئے۔ حکیم صاحب کے والد حکیم غلام مولا بخش قلق تھے۔ فارسی مولانا امام بخش صہبائی شہید فرنگ سے پڑھی، ان کے ہم سبق مولانا عبدالعزیز سوز خلف مولانا امام بخش صہبائی تھے۔ صرف و نحو و منطق اور دیگر فنون عربیہ ملا انتظام علی سہارنپوری سے تحصیل کئے اور طب ارسطوئے زمان حکیم غلام نقش بند خاں دہلوی سے کسب کی۔ شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کو اپنا کلام دکھایا۔ نہ معلوم کیوں دہلی سے میرٹھ گئے، وہیں مقیم ہوئے، چنانچہ دہلی چھوڑنے اور میرٹھ میں سکونت رکھنے کے بارے میں کہتے ہیں ؎

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو، کیوں میرٹھ میں آرہتا

گدائی کے بھروسے پر لٹایا بادشاہی کو

میرٹھ میں مقیم ہونے کے بعد وہاں کے علمی و دینی اور ادبی طبقے میں قلق صاحب وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، میرٹھ کے بعض مدرسوں میں جس میں فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی، ان کے طلباء کی یہ مدد کرتے تھے۔

ان کا شمار ہندوستان کے مشہور طبیبوں میں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی، چنانچہ طبابت کے پیشے کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

اب اطبا کیا جئیں جاتی رہی وجہ معاش

بچ گیا بیمار غم، اور ہوگیا رسوا علاج

مولا بخش قلق کے حالاتِ زندگی کسی تذکرے میں تفصیل کے ساتھ نہیں ملتے۔ گلستانِ سخن اور بزم سخن میں نہ ہونے کے برابر ذکر ہے، ایک یا دو شعر سے زیادہ ان میں نہیں ہے۔ کلیاتِ قلق پر مولانا الطاف حسین حالی، مولوی سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" اور مولوی عبدالحق بدایونی

مؤلف "تذکرہ شمیم سخن" وغیرہ نے تقریظیں لکھی ہیں، اس میں قلق صاحب کے بہت ہی مختصر حالات ملتے ہیں، چنانچہ مولوی عبدالحیٔ صاحب قلق کے بارے میں لکھتے ہیں :

"زمانہ آخر میں ہر چند بہت شاعر ہوئے مگر صاحب کمال کا کلام ہمیشہ اپنا جلوہ علیحدہ ہی دکھاتا رہا، اس کا گواہ دیوان قلق ہے، حضرت حکیم غلام مولیٰ صاحب عرف مولا بخش قلق میرٹھ کے خطہ میں ایک باکمال سخن فہم، سخن سنج شاعر تھے، آپ کو تلمذ حضرت مومن دہلوی سے حاصل تھا۔ آپ کا کلام صاف و سلیس، محاورات دل پسند و تشبیہات مناسبہ سے مملو نظر آتا ہے۔۔۔ فراقیہ اور مایوسانہ اشعار آٹھ آٹھ آنسو رلاتے ہیں۔ ہر لفظ زبان ادنیٰ کا مزہ دیتا ہے، ہر غزل میں شوخی بھری ہے، بلند پروازی خیالات معانی کو لے اڑی ہے۔"

مولوی سید احمد مؤلف "فرہنگ آصفیہ"، اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں :

"آپ کے شعر وہ تڑپتے ہوئے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو تڑپ ہی جاتا تھا۔۔۔ غرض معاملہ بندی بلاغت، فصاحت، متانت ساری خوبیاں آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ مرثیہ بھی لکھا تو اس زور کا میاں انیس و دبیر کو پرے بٹھا دیا، اچھے اچھے سنگدلوں کو اپنی کیفیت بندی سے آٹھ آٹھ آنسو رلا دیا۔ رباعیاں عمر خیام سے لگا کھاتی ہیں اور قصائد خاقانی و انوری کا لطف دکھاتے ہیں۔"

حضرت قلق کا انتقال، شعبان ۱۲۹۷ھ کو میرٹھ میں ہوا۔ قلق کے دوست اور شاگرد رشید جناب گلاب سنگھ مشتاق میرٹھی نے ان کی تاریخ وفات کہی ؎

مرگیا یکتا، عصر کی سن کر ہر سخنور کا دل دو نیم ہوا
بولا مشتاق بے سر امید حیف ہے اب سخن یتیم ہوا
۱۲۹۷ھ

جناب قلق نے انتقال سے قبل اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا، چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فرشتہ اجل نے مہلت نہیں دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی منشی محمد عبداللہ اکاونٹنٹ نہر جمن نے ۱۸۸۳ء مطابق ۱۳۰۰ھ کو مطبع انصاری دہلی میں طبع کرایا، جس کا تاریخی قطعہ مولانا عبدالحیٔ

صفا بدایونی نے حسب ذیل فرمایا ؎

مشتاق تھا جس کا ایک عالم | دیوان وہ خوشنما چھپا ہے
تاریخ طبع صفا یہ لکھو | دیوان قلق کا خوش نوا ہے
۱۳۰۰ھ

قلق کے خیالات انوکھے اور طرز ادا نرالی تھی ؎

اشک کے گرتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا | کون سی حسرت کا یارب یہ چراغ خانہ تھا
اپنا ہی وادی ہے وہ، موسیٰ جہاں بھٹکا بہت | طور جس کے گرد ہے وہ اپنا ہی کاشانہ تھا
ہمیں کیوں دل دیا اور دل ربائی ان میں کیوں رکھی | خدا دشمن بتوں کی بندگی سے ہو نہیں سکتا
وہاں خلد دے تو یہاں مئے و معشوق دے ہمیں | بے لذت گناہ، نشاط کرم نہیں
ہماری پرسشِ اعمال اور بے حس فرشتوں سے | لے ہیں کیا ہی اہلِ دل محبت کی گواہی کو
تری مایوس کی تشویش مٹانے کے لئے | فتنہ حشر اٹھا دستِ دعا سے پہلے
وہ کیا کرے گا کوثر و حورانِ خلد کو | جس کو کہ ذوقِ بادہ و روئے نکو نہو

میں اپنی بے نشانی کا نشان ہوں
ہجوم ماتم عمرِ رواں ہوں

حکیم طالب احمد صاحب میرٹھ میں پیدا ہوئے، تعلیم حاصل کرنے کے لئے نوجوانی میں دہلی تشریف لائے، اور یہیں سکونت اختیار کی، شہزادہ ہائی اسکول دہلی میں تعلیم پائی، اس کے بعد بی اے کیا، اور محکمہ ریلوے میں گارڈ مقرر ہوئے، ملازمت کا سلسلہ زیادہ نہیں چلا، وہاں سے علیحدہ ہوکر حکیم علی رضا دہلوی سے حکمت سیکھی اور اسی دوران میں خلافت کی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا ۱۹۲۰ء میں حکیم علی رضا صاحب کے اصرار پر کوچہ چیلان میں ایک دواخانہ "قومی دواخانہ" کے نام سے قائم کیا، جس کا افتتاح حکیم اجمل خاں صاحب کے دستِ مبارک سے کرایا۔ دواخانہ کو بھی چلاتے تھے اور قومی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے، آپ نے کانگریس کمیٹی میں بھی شرکت کی، کافی عرصے تک کوچہ چیلان کانگریس کمیٹی کے صدر رہے اور کانگریس کے پروگراموں کو کامیاب کرنے کی سعی کرتے رہے۔ سرسید کے تعلیمی کاموں کے بڑے مداح تھے۔ علی گڈھ یونی ورسٹی کی تعمیر میں انھوں نے بھی کافی جدوجہد کی، ان کی ساری عمر سیاست، حکمت اور مذہبی کاموں میں گذری۔

۱۹۱۸ء میں مولانا محمدی شاہ الہ آبادی چشتی نظامی کے مرید ہوئے، اس کے بعد خواجہ حسن نظامی صاحب سے بیعت کی، حزب البحر اور بسم اللہ وغیرہ کے عامل تھے۔

ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ، حکیم اجمل خاں صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، سید احمد امام جامع مسجد دہلی، مولانا عبداللہ آٹے والے، مسٹر آصف علی، مولوی شرف الحق صاحب، لالہ دیش بندھو گپتا، لالہ شنکر لال سے ان کے تعلقات تھے۔

حکیم طالب صاحب اپنے عزیزوں کے ساتھ نوجوانی میں بھوپال گئے، وہاں نواب شاہجہاں بیگم والیٔ بھوپال تک رسائی ہوئی، انھوں نے حکیم صاحب کی اپنی عزیزہ فاطمہ بی بنت واصل محمد خاں جاگیردار بھوپال سے شادی کرادی، فاطمہ بی کو زندگی بھر بھوپال سے وظیفہ ملتا رہا۔ اور آخر عمر ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔

فاطمہ بی سے پانچ فرزند مطلوب احمد، حکیم محبوب احمد، مرغوب احمد، حکیم منظور احمد، مشتاق احمد دو لڑکیاں کلثوم بی اور ہاجرہ بی ہوئیں۔

مطلوب احمد صاحب نے اینگلو عربک اسکول دریا گنج سے آٹھویں کلاس تک تعلیم پانے کے بعد میٹرک کیا۔ دہلی میں ڈاک خانے کی ملازمت کرتے تھے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور چلے گئے وہاں بھی محکمہ ڈاک میں ملازم ہیں۔

حکیم محبوب احمد صاحب جامعہ طبیہ دہلی کے سند یافتہ ہیں۔ والد صاحب کے دواخانے میں بھی کام کیا، حکیم عاقل صاحب کے مطب میں کام کرتے تھے، وہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد گھر پر مطب کرتے ہیں۔

مرغوب احمد صاحب نے میٹرک تک تعلیم پائی —— ۱۹۴۷ء سے قبل کاروبار کے سلسلے میں کراچی چلے گئے تھے۔ لالوکھیت میں "طالب قومی دواخانہ" قائم کیا جو اب تک جاری ہے۔

حکیم منظور احمد صاحب نے اینگلو عربک اسکول دریا گنج میں آٹھویں تک تعلیم پائی، اس کے بعد اپنے والد جناب حکیم طالب احمد صاحب، حکیم اسماعیل صاحب سکنہ محلہ رودگران اور پروفیسر رام لبھایا صاحب سے طب سیکھی "حکمت" کی ڈگری حاصل کی —— اپنے والد ماجد کے "قومی دواخانہ" کو سنبھالے ہوئے ہیں —— اس دواخانے کا مکمل انتظام ان ہی کے

ہاتھوں میں ہے۔

حکیم طالب احمد صاحب کے پانچویں لڑکے صوفی مشتاق احمد صاحب ہیں ـــــ انھوں نے بھی اینگلو عربک اسکول دریا گنج دہلی سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ مشتاق صاحب کو عملیات کا بچپن سے شوق تھا۔ اپنے والد صاحب کے دواخانہ کے پاس ایک دکان میں عملیات کرتے ہیں ـــــ خواجہ حسن نظامی صاحب سے بیعت ہیں۔

جناب منشی سید ظہور احمد صاحب وحشتی ایڈیٹر تجلی دہلی

منشی سید ظہور احمد صاحب وحشتی شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے، سادات سے ان کا تعلق تھا۔ محلہ جھنڈا کلاں یا جھنڈا نور دمیں رہتے تھے، اس لئے ان محلوں میں سادات آباد ہیں، بچپن سے بڑے ذہین تھے، مختلف اساتذہ سے عربی و فارسی کی تحصیل کی، ندوۃ العلماء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ہم درس تھے، ۱۹۰۲ء میں جب نواب محسن الملک نے دارالعلوم کا معائنہ کیا تو علامہ سلیمان ندوی کے ساتھ انھیں بھی امتحاناً پیش کیا گیا۔

۱۹۱۷ء سے "پیسہ" اخبار لاہور میں عربی کے مترجم کے فرائض انجام دینے شروع کئے۔ عربی کے مشہور ادیب جرجی زیدان کے ناولوں کا ترجمہ کیا، جن کو "پیسہ" اخبار والوں اور دوسرے پبلشروں نے چھاپا۔ ۱۹۲۰ء میں وحشتی صاحب دہلی آئے، بھیا احسان الحق میرٹھی نے ۱۹۲۱ء میں دہلی سے "دین دنیا" رسالہ جاری کیا، اس کے چیف ایڈیٹر وحشتی صاحب مقرر ہوئے، نگرانی شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب فرماتے تھے، پانچ سال رسالہ دین دنیا میں کام کرنے کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کی۔ چتلا گیٹ کے ایک بالاخانہ پر سکونت رکھتے تھے، اسی محلے میں انھوں نے ۱۹۲۶ء کو اپنا ذاتی رسالہ "تجلی" ماہنامہ جاری کیا، ایک سال کے بعد حکیم جمیل خاں صاحب کی اعانت سے تجلی پریس قائم کیا، اس میں ابتداء میں ہندوستانی دواخانہ کا کام چھپتا تھا، بعد میں متفرق لوگوں کے کام چھپنے لگے۔ پانچ سال تک رسالہ تجلی جاری رہا، رسالہ بند ہونے کے بعد آپ نے رودگراں لال کنواں میں سکونت اختیار کی، تو وہاں تجلی پریس تبدیل کیا، پریس نے دس سال کی عمر پائی، پریس اور رسالہ سے سبکدوش ہونے کے بعد تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے، کافی کتابیں تصنیف کیں، جن میں اسلامی زندگی، فن شاعری، وسائل تجارت، فن دکانداری، فن اشتہار نویسی، عملیات، میاں بیوی، اور بیوی کے فرائض کافی مشہور ہوئیں اور اب تک طبع ہو رہی ہیں، ان کی کل کتابیں جناب مفتی شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر

رسالہ دین دنیا نے شائع کیں۔ اقتصادیات پر ان کو کافی عبور حاصل تھا، اس سلسلے کی جو کتابیں انھوں نے لکھیں ان سے عوام کو بہت فائدہ پہنچا۔

میاں بیوی کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے یہاں تک کہ ان خاص تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جنھیں لوگ غلط طور پر خلاف تہذیب خیال کرتے ہیں۔

بیوی کے فرائض میں ایک طرف تو نہایت موثر پیرایے میں عورتوں کو ان کے فرائض بتائے گئے ہیں اور دوسری طرف وہ طریقے سمجھائے گئے ہیں جن پر عمل کر کے عورتیں اپنے شوہروں کو اپنا والہ و شیدا بنا سکتی ہیں، آخر میں عورتوں کے متعلق نصیحت آموز افسانے بھی درج ہیں۔

فن شاعری میں بغیر استاد کے شاعری کی تعلیم دی گئی ہے جس کا کمال یہ ہے کہ کیسی ہی معمولی قابلیت کا آدمی کیوں نہ ہو اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اندر شعر کہنے کی غیر معمولی صلاحیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس میں علم عروض کو آسان طریقے پر سمجھایا گیا ہے۔

منشی ظہور احمد صاحب کو شعر و شاعری سے بھی دل چسپی تھی، حکیم اجمل خانصاحب ان کی شاعری کی بڑی قدر کرتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے حکیم جمیل خانصاحب نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی، ان کے احباب کا حلقہ بڑی وسیع تھا، یوں تو ان کے دوستوں میں جناب انوار ہاشمی صاحب، جناب شوکت فہمی صاحب، اکبر حیدری صاحب، سمیع آرٹسٹ اور ملا واحدی صاحب وغیرہ تھے۔ لیکن ان کا انتہائی خصوصی تعلق دہلی کے مشہور خاندانی رئیس رائے بہادر پارس داس دہلوی سے تھا۔ یہ علم دوست انسان تھے، وحشی صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی ہر ایک بات کا خیال رکھتے تھے۔

منشی ظہور احمد صاحب دبلے پتلے درمیانہ قد کے تھے، ڈاڑھی رکھتے تھے، شیروانی پہنتے تھے۔ بالوں دار ٹوپی اوڑھتے اور چشمہ لگاتے تھے، ظرافت پسند آدمی تھے، بہت خوش گفتار، خوش ذوق، خوش مزاج تھے، لطیفہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ بات بات میں لطیفے سناتے تھے، اردو کے مشہور شعراء کے اشعار بہت یاد تھے، حافظ شیرازی کے اشعار کثرت سے پڑھتے تھے، کبھی کوئی پریشانی اور مشکل پیش آتی اور کسی معاملے میں الجھ جاتے تو حافظ کے دیوان سے فال نکالتے تھے۔

سید صاحب کو اپنے سید ہونے کا بڑا فخر اور ناز تھا، مذاقیہ طور پر کچھ ملنے والے ان کے سید ہونے پر شک کا اظہار کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ اس قسم کی بحث چھڑ گئی، عام طور پر یہ بات

مشہور ہے کہ جو اصل نسل سید ہوتا ہے اس پر آگ اثر نہیں کرتی، چنانچہ بحث کے دوران وحشی صاحب نے جلتی ہوئی چمنی کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ معترضین بہت شرمندہ ہوئے اور پھر کبھی ایسی گفتگو نہیں کی۔

وحشی صاحب کے دفتر کی نشست انتہائی دل چسپ تھی، چاروں طرف کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور یہ کتابوں کے درمیان بیٹھے ہوئے کتابوں کے پڑھنے یا مضامین لکھنے میں مگن رہتے تھے۔ ان کا کتب خانہ کافی بڑا تھا۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی تاریخی کتابیں اچھی تعداد میں تھیں، اردو، فارسی اور عربی شعراء کے دیوانوں کی معقول تعداد تھی، نادر اور نایاب قلمی کتابیں بھی تھیں، ان کے پاس ایک قلمی اور قدیمی دیوانِ حافظ بڑا خوش خط لکھا ہوا تھا۔ اس کتب خانے کا کیا ہوا، اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

وحشی صاحب پابند صوم وصلوٰۃ تھے، نماز عام طور پر جامع مسجد یا چتلا گیٹ کی مسجد میں پڑھتے تھے، رمضان کی کبھی تراویح نہیں چھوٹی، پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے، حج بیت اللہ کے لئے بیتاب و بیقرار رہتے تھے، بڑی خواہش تھی حج کرنے کی اور حضورؐ کے روضۂ اطہر پر حاضری دینے کی، لیکن وہ پوری نہ ہو سکی۔

ان کی پہلی شادی شاہجہاں پور میں ہوئی تھی، جن سے ایک لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ دوسری شادی جناب پیرجی عبدالصمد صاحب کی بھتیجی سے ہوئی، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وحشی صاحب کا انتقال ۱۹۴۴ء میں دہلی میں ساٹھ برس کی عمر میں ہوا۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ میں دفن ہوئے۔

وحشی صاحب مسلمہ ادیب ہونے کے ساتھ قادر الکلام شاعر تھے، وحشی تخلص تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ دہلی کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ صاحبِ دیوان تھے [۱]

کیوں مجھ کو ستاتے ہو، کیوں خواب میں آتے ہو　　بھولا ہوا فسانہ کیوں یاد دلاتے ہو!

[۱] رسالہ دین دنیا دہلی

پھر کھا کے قسم جھوٹی پھر نام وفا لے کر — کیوں آگ لگاتے ہو کیوں مجھ کو جلاتے ہو
اظہار تاسف سے رو رو کے تکلف سے — کیوں دل کو دکھاتے ہو کیوں مجھ کو رلاتے ہو

پھر قدر ہوئی شاید وحشی کی پسِ مردن
کیوں اشک بہاتے ہو کیوں رنج اٹھاتے ہو

کبھی اس کی نگاہ شرمگین اٹھتے نہیں دیکھی — سکھایا کس نے یارب آسمان کو فتنہ گر ہونا
کوئی آیا ہے پھر دل میں ہزاروں حسرتیں لیکر — ذرا پھر برق خرمن سوز بنکر جلوہ گر ہونا

اگر اس پردۂ قدرت میں کوئی سننے والا ہے
تو وحشی اک قیامت ہے دعا کا بے اثر ہونا

چنیں، کریم و چنیں مہربان خداوندی — اگر خطائے کند بندہ ات صواب کند
دعائے ہمت ترکِ دعا کنم وحشی — بود کہ خالق کونین مستجاب کند

جناب منشی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ مولوی دہلی

منشی عبدالحمید صاحب دہلی کے پرانے باشندے تھے، ان کے آباو اجداد دہلی میں پیدا ہوئے۔ منشی صاحب گلی انبیار محلہ کوچہ چیلان میں رہتے تھے، اسی مکان میں رسالہ "مولوی" کا دفتر تھا، ان کے والد ماجد ڈاکٹر عنایت اللہ خاں صاحب تھے، نیک آدمی تھے، آج کل کے ڈاکٹروں کی طرح بے دردی کے ساتھ لوٹتے کھسوٹتے نہیں تھے، جو مریض ان کو دکھانے کے لئے لے جاتا، اس سے فیس نہیں لیتے تھے، ٹیکے زیادہ لگاتے تھے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب کے تین صاحبزادے منشی عبدالحمید صاحب اور عبدالرشید غزالی صاحب، محمد بشیر خاں صاحب ہوئے، غزالی صاحب کو شمس العلماء مصور فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا بہت قرب حاصل تھا، اس لئے خواجہ صاحب نے ان کو غزالی کا خطاب دیا تھا۔

منشی عبدالحمید صاحب کی تعلیم زیادہ نہیں تھی، کتابت سیکھی تھی، شروع میں انھوں نے ملا واحدی کی مددگار کی حیثیت سے نظام المشائخ میں کام کیا اور بقول مفتی شوکت فہمی صاحب انھوں نے نظام المشائخ کی کتابت بھی کی تھی۔

۱۹۲۳ و ۲۴ء میں منشی عبدالحمید صاحب نے اپنا ذاتی رسالہ "مولوی" دہلی سے جاری کیا۔ تھوڑے عرصے میں یہ رسالہ معیاری رسالہ بن گیا، اس کے عنوانات بڑے دقیق و معلوماتی تھے، عنوانات کے تحت رسالے میں مضامین چھپتے تھے، اگر رسالہ مولوی کے فائلوں کے مضامین کتابی شکل میں چھاپے جائیں تو سینکڑوں کتابیں چھاپی جاسکتی ہیں۔ اس کے مضمون نگار ملک کے مایہ ناز عالم صوفی تھے، جن کی قلم نے وہ شاہ پارے پیش کئے کہ رسالے کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہ تھا کہ جہاں رسالہ مولوی نہ پہنچا ہو اور پڑھا نہ جاتا ہو ــــ

لائبریریوں کی زینت بنتا تھا۔ ہندوستان کے مذہبی طبقے میں اس کی مانگ تھی، ملک بھر میں کافی رسالے نکلتے تھے لیکن اس کی اشاعت ان کے مقابلے میں سب سے زیادہ تھی، دوسرے رسالوں کی اشاعت زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار تھی، لیکن رسالہ مولوی کی اشاعت پینتیس اور چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ دوسرے رسالوں نے اپنی سالانہ قیمت زیادہ مقرر کر رکھی تھی، لیکن رسالہ مولوی نے اپنی سالانہ قیمت ایک روپیہ سے زیادہ نہیں بڑھائی۔

دوسرے رسالوں کے ایڈیٹر ملک کے مشہور عالم اور ادیب تھے لیکن رسالہ مولوی کے ایڈیٹر منشی عبدالحمید خاں صاحب تھے، جن کے پاس علمیت کی کوئی ڈگری نہیں تھی۔ منشی صاحب خود ہی رسالہ کی کتابت کرتے تھے، خود ہی ایڈیٹر تھے، خود ہی منیجر و کلرک تھے، حتیٰ کہ تہمند باندھ کر رسالوں کے بنڈل خود بناتے اور ٹکٹ بھی خود ہی لگاتے تھے۔ رسالے کے دفتر میں کسی آدمی کا مستقل طور پر اضافہ نہیں کیا، اگر کام کی زیادتی ہوتی تو پارٹ ٹائم کے لئے کسی آدمی کو لگا لیتے تھے۔ دوسرے مصنفوں کی چالیس پچاس کے قریب کتابیں چھاپیں جو انتہائی مقبول ہوئیں، خوب چلیں اور ایک ایک کتاب کے کافی ایڈیشن طبع ہوئے۔

منشی عبدالحمید صاحب نے ان کتابوں اور اسی رسالہ مولوی کی آمدنی سے اپنے خاندان کی پرورش کی اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے بعد چار پانچ لاکھ روپیہ کی جائداد بھی پیدا کی، اور باعزت زندگی گذاری۔

ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی، سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر اخبار "ریاست" دہلی، منشی عبدالحمید صاحب اور حافظ عزیز حسن بقائی ایڈیٹر رسالہ "پیشوا" دہلی اور منشی شوکت فہمی ایڈیٹر رسالہ "دین دنیا" دہلی ہم عصر صحافی ہیں، جو کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔ اردو میں کافی لٹریچر کا اضافہ کیا اور اس کے پھلنے اور پھولنے میں بھی حصہ لیا۔

منشی صاحب دیانت دار آدمی تھے، پابند صوم و صلوٰۃ تھے، انتہائی جررس تھے، معاملے کے نہایت اچھے تھے، نہ کسی پر ادھار رکھتے تھے اور نہ ان پر کسی کا تھا، خوش مزاج، خوش گفتار، ملنسار اور انتہائی منکسر المزاج اور بے ضرر انسان تھے، کوئی کچھ بھی کہہ دیتا تو برا نہیں مانتے تھے سب سے جھک کر ملتے تھے، زندگی بھر کسی سے ان کا جھگڑا نہیں ہوا۔ ملازم زیادہ رکھتے نہیں تھے، لیکن ایک ہی چپراسی ملازم

تھا، وہ ان سے خوش اور مطمئن تھا۔

منشی عبدالحمید صاحب کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی، بھیا احسان الحق، حافظ عزیز حسن بقائی، ملا واحدی صاحب اور شوکت فہمی صاحب ان کے ہم پیشہ اور ہم جلیس تھے۔ البتہ مولانا عارف ہسوی ان کے خاص الخاص مقربین میں تھے، ان کا یہ بہت خیال رکھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے معتقد تھے۔

رسالہ مولوی کے دفتر کے پتے پر منشی عبدالحمید صاحب کے نام لوگ زکوٰۃ کی رقم بھیجتے تھے جس کو یہ بڑی احتیاط کے ساتھ تقسیم کرتے تھے، ان کے پاس امانتیں بھی رکھی رہتی تھیں جن کی بڑی حفاظت سے رکھتے تھے اور طلب کرنے پر فوراً دیدیا کرتے تھے۔

منشی عبدالحمید صاحب کے بیوی بچے دہلی سے ۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانے میں پاکستان چلے گئے اس وقت ان کو کھانے پینے کی بہت تکلیف ہوئی، دونوں وقت تندور سے روٹی اور سالن منگا کر کھالیتے تھے۔

۱۹۶۰ء میں رسالہ مولوی اور مولوی بکڈپو کو جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب صدیقی مالک اخبار "پیام مشرق" دہلی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس پرچے میں ملازمت اختیار کرلی، اب اس پرچے کو شیخ عطاء الرحمٰن صاحب چلا رہے ہیں۔ وہی اس کے ایڈیٹر ہیں۔

منشی عبدالحمید صاحب ۱۹۶۴ء میں بیماری کی حالت میں پاکستان گئے۔ وہاں بیماری نے شدت اختیار کی تو ۸۰ برس کی عمر میں ۵ ر اپریل ۱۹۶۴ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔

منشی عبدالحمید صاحب کے غالباً تین صاحبزادے ڈاکٹر خالد، ڈاکٹر ماجد اور زاہد، اور پانچ لڑکیاں ہوئیں، جن میں دو لڑکیاں بھی ڈاکٹر ہیں۔ صاحبزادے کینیڈا اور امریکہ میں ہیں، اور صاحبزادیاں لاہور اور کراچی میں ہیں۔

جناب مولانا عبدالغفارؔ صاحب دہلوی

مولانا عبدالغفار صاحب کا نسبی سلسلہ حضرت شیخ نور الدین ملک پران سے ملتا ہے، شیخ صاحب پرگنہ لار ایران سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں دہلی پہنچے، جہاں حضرت بابا ابوبکر طوسی مشکے شاہ کا مزار ہے، اس کے سامنے کی جگہ پر مقیم ہوئے۔ بابا ابوبکر نے آپ سے کہا یہاں ٹھہرنے کے لئے بادشاہ کی اجازت ضروری ہے۔ اس وقت سلطان ٹھٹہ میں تھا، آپ اسی وقت اپنی روحانی قوت سے ٹھٹے پہنچے، سلطان سے ملے اور اپنا مدعا بتایا۔ بادشاہ فقیروں سے عقیدت رکھتا تھا، اس نے وہ جگہ اس کی معافی اور لنگر خانے کے خرچ کے لئے چار گاؤں دئے۔ آپ اسی وقت فرمانِ شاہی لے کر دہلی آئے اور بابا ابوبکر طوسی سے ملے، ان کو فرمان شاہی دکھایا۔ بابا اس کو دیکھ کر بہت متحیر ہوئے۔ اور خیال کیا کہ اس درویش کے فرشتے تابع ہیں جو یوں پران لے گئے اور پران ہی پر واپس لائے۔ اس روز سے آپ ملک یار پران کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ ۹۸۰ھ میں فوت ہوئے، اور اپنی رہائش گاہ کی زمین میں دفن ہوئے۔ ان کا مزار حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے راستے میں ہے۔

شیخ نورالدین صاحب کے صاحبزادے محمد شعیب تھے، ۹۷۶ھ میں انتقال کیا، ان کے فرزند قاضی مولوی محمد نور اللہ تھے، ۱۰۴۵ھ میں فوت ہوئے، ان کے لڑکے قاضی مولوی ہدایت اللہ صاحب تھے جو ۱۱۱۹ھ میں اللہ کو پیارے ہوئے، ان کے صاحبزادے قاری مولوی نبی اللہ ہوئے، جن کا ۱۱۶۶ھ میں انتقال ہوا، آپ کے فرزند ارجمند مولوی قاضی محمد لطف اللہ تھے، ۱۲۳۴ھ میں جان بحق ہوئے[1]

[1] آوازِ مسلم ص ۸

قاضی لطف اللہ صاحب کے صاحبزادے مولوی کریم اللہ صاحب ہوئے، جنھوں نے مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا رشید الدین دہلوی اور مولوی محمد کاظم دہلوی سے اکتساب علوم کیا۔ سید آل احمد مارہروی عرف اچھے میاں سے بیعت کی اور خلافت پائی[1]

شاہ عبدالعزیز صاحب نے مولوی کریم اللہ صاحب کی ذہانت وفراست کو دیکھنے کے بعد جوانی میں ہی سند افتار کی اجازت دیدی تھی۔ آپ اپنے مدرسے میں بیٹھ کر درس وتدریس کے ساتھ افتار کی بھی خدمت کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے ضعیفی کے زمانے میں جبکہ آپ کی بصارت نے جواب دیدیا تھا، مولوی کریم اللہ صاحب کو بلوایا اور فرمایا میرے فتویٰ کا کام بھی تم انجام دو[2]۔ چنانچہ جو فتوے اس زمانے میں شاہ صاحب کے پاس آتے تھے، وہ ان کے پاس بھیجدیتے تھے۔ آپ بہترین واعظ بھی تھے۔

چوک قاضی حوض پر ایک قدیمی مسجد ہے جو ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۹-۱۷۱۸ء میں تعمیر ہوئی جس کو مفتی کریم اللہ صاحب نے ازسرنو بنوایا اور توسیع بھی کی۔ مسجد کے جنوب مشرق کے کونے میں ایک مکان تھا جس کے دروازے پر باغ نبی اللہ ۱۱۳۱ھ لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں باغ ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس باغ کی جگہ یہ مکان بنا ہوا ہو، اور باغ کا کتبہ اس مکان کے دروازے پر لگا دیا ہو۔

مولوی کریم اللہ صاحب قناعت پسند تھے، باوجود عیال دار ہونے کے دنیا کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ صاحب "آثار الصنادید" لکھتے ہیں:

> "جامع فنون ہیں، خصوصاً دینیات میں دستگاہ کامل ہے، توکل وقناعت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ باوجود عیالداری اور تاہل کے اہل دنیا کی طرف کم رجوع کرتے ہیں، بیشتر اوقات گرامی کو تدریس طلبہ شائق میں مصروف اور عنانِ ہمت افادۂ طالبین کی طرف معطوف رکھتے ہیں۔"

آپ صاحب تصانیف تھے۔ نوّے سال کی عمر میں ۴ شوال ۱۲۹۰ھ کو دہلی میں فوت ہوئے، اور

[1] تذکرہ علماء ہند
[2] عظمت انسان ص ۵۹

قبرستان خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوئے، آپ کی تاریخ وفات یہ ہے [1]

فاضلِ بے مثل مولانا کریم اللہ آہ رفت　　چوں زیر زمیں آں آفتابِ اوج علم

آسمان از سر کلاہ افگند بہر سال گفت　　در زمین گردیدہ پنہاں آفتابِ وج علم

۱۲۹۰ھ

مولوی کریم اللہ صاحب کے فرزند مولانا مولوی محمد یعقوب تھے جو ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۸-۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد کی طرح جید علماء میں سے تھے۔ یہ بھی متوکل اور درس وتدریس کے دلدادہ اور شائق تھے، فتویٰ نویسی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ قاضی حوض کی مسجد میں درس وتدریس اور فتویٰ نویسی کے ساتھ ہر جمعے کو وعظ فرماتے تھے۔ جزئیات پر بڑا عبور تھا۔ خدمتِ خلق کا جذبہ رکھتے تھے۔ آپ کے تلامذہ میں ہندوستان کے مشہور علماء ورہنما بھی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ان کے سامنے زانوئے ادب طے کیا تھا، چنانچہ آپ کے بارے میں مولانا آزاد تحریر کرتے ہیں:

"حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے حضور میں، میں نے اپنے والد بزرگوار کے بعد سب سے پہلے زانوئے ادب تہ کیا اور ان سے عربی ادب اور منطق کا درس لیا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب سے ہم لوگ قطبی شرح ملاحسن پڑھتے تھے۔ شرح ملا کسی وجہ سے ختم نہیں ہوئی، البتہ قطبی ختم ہوگئی تھی اور اس کے علاوہ مختصر المعانی کا ایک حصہ پڑھا تھا۔ آپ ایک اچھے اور مستعد شخص تھے اور سوچتا ہوں تو واقعی ان کو درسیات خوب مستحضر تھیں۔"

آپ کا دہلی میں جمعرات ۹ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ کو انتقال ہوا، آپ بھی قبرستان خواجہ باقی باللہ میں آرام فرما ہیں۔ کسی نے آپ کی وفات پر یہ تاریخی قطعہ کہا ہے

مفتی و فاضل و عالم بود آثار سلف　　مولوی یعقوب صاحب واعظ سحر البیان

از قضائے ایزدی اندر ربیع اوّلین　　روز پنجشنبہ نہم تاریخ رفتہ زیں جہان

از سرِ آہ گفت مسکین بہر سال ارتحال

شد ازیں دنیائے دوں بگزیدہ در جنت مکان

۱۳۲۴ھ

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی، جلد دوم ص ۵۲۳

مولانا عبدالغفار صاحب نے علوم دینی کی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا یعقوب سے حاصل کی، حضرت محمد عمر اخوندجی سے قادریہ سلسلے میں بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔ اپنے خاندانی مدرسہ یعقوبیہ میں عرصے تک تعلیم دی، فتویٰ نویسی بھی کی۔ دہلی کے علماء میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، حکام بھی ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دینی معاملات میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کام کرتے تھے، خواجہ نورالدین ملک پران کا سالانہ عرس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کرتے تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت سے بے پناہ محبت تھی۔ عشرہ محرم میں عرصے تک شہادت کا بیان کیا۔ طب حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے سیکھی، تجربے کار طبیب تھے، ان کا مطب مسجد قاضی حوض کے بالاخانہ پر تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفادی تھی، تعویذ ان کا مؤثر ہوتا تھا، جس کی وجہ سے ان کے پاس ہندو مسلمانوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

آپ نے مسجد حوض والی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں از سر نو تعمیر کرائی، عمر بھر اس کی تعمیر و درستی میں لگے رہے۔ مسجد کا عالی شان حوض، دالان اور کمرہ بنوایا۔ جناب ناصر نذیر فراق دہلوی نے اس سلسلے میں دس شعروں کا ایک قطعہ کہا، جس کے چند اشعار یہ تھے ؎

بزرگانِ جناب عبد غفار — بہ ماضی مسجدے کردند تیار
بمسجد چونکہ گلشن بر فزوده — سنش باغ نبی اللہ بوده
دو تا پشتے کریم اللہ یعقوب — ولی اللہ مفتی خوش اسلوب ۱۱۳۱ھ
بمسجد جانشینی می نمودند — در تعلیم و افتادہ بر کشودند
پسر جانِ پدر خوش خلق و دیندار — سراپا علم مفتی، عبد غفار

فراق از بہرِ تاریخ و محامد
بگو، زیبا شده فخر المساجد
۱۳۴۸ھ

مولانا عبدالغفار صاحب اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پہ چلے اور ان کا نام روشن کیا۔ آپ نے رسالہ "المفتی" جاری کیا تھا جو مضامین کے اعتبار سے بڑا وقیع تھا۔

۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانے میں مسجد و مدرسہ اور مولانا کے گھر پہ حملے ہوئے، کوئی چیز نہیں بچی جس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی گئی ہو، مولانا عبدالغفار صاحب کے بڑے صاحبزادے

مولانا ابوالفضل کو سخت مجروح کیا۔ ذاتی کتب خانہ کی کتابیں، نادر نسخے، مدرسے کی قدیم لائبریری اور درسی کتابیں جو تعداد میں آٹھ ہزار تھیں، تپائیں اور جلدیں، گھر کا سامان، مسجد و مدرسے کا سامان دیگر اعزا و متعلقین کا سامان جو لاکھوں کا تھا بے دردی کے ساتھ لوٹا گیا۔ گھر کو آگ لگی، مسجد پر حملہ ہوا، محراب، مسجد و ستون و مصلیٰ کو نقصان پہنچا، بڑے صبر اور دلیری کے ساتھ مولانا نے یہ دن گذارے۔ مسجد سے ایک منٹ کے لئے علیحدہ نہیں ہوئے، پنج وقتہ نمازیں ہوئیں، اذانوں کی صدائیں بھی گونجیں۔ مطب بھی جاری رکھا، اپنے خاندانی قبرستان کی بھی مستعدی کے ساتھ حفاظت کی۔ شیخ نورالدین ملک یار پران کا عرس ہر سال وقت مقررہ پر کیا۔

مولانا ۲۱ستمبر ۱۹۶۳ء کو اپنے رہائشی مکان اندرون مسجد حوض قاضی کی مرمت و تعمیر کی، دیکھ بھال کر کے مسجد کے دروازے کے بالائی حصے پر اپنے معمول کے مطابق اپنے مطب میں جہاں بہت سے مریض آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے تشریف لے گئے اور مریضوں کے دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ گیارہ بجے دن کے، طبیعت ناساز ہوئی۔ معائنے کے لئے ڈاکٹر بلایا۔ ڈاکٹر نے بتایا۔ فالج کا اثر جسم کے دائیں طرف ہوا ہے، چنانچہ دائیں طرف کے اعضا مفلوج ہو گئے تھے، زبان پر بھی اثر تھا، لیکن ہوش و حواس بالکل صحیح تھے، خود اشاروں سے سہ منزلہ پر لیجانے کے لئے کہا۔ علاج کے دوران مسجد کی تعمیر و مرمت جاری رہی کیونکہ چھتیں منہدم ہو گئی تھیں، بارش ہو رہی تھی۔ مستری اسلام الدین کو اشاروں سے کام سمجھا دیتے تھے۔ یہ حالت سترہ روز تک رہی ۱۸ر جمادی الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء کو پیر کے دن صبح پونے آٹھ بجے جاں بحق ہوئے اور اپنے خاندانی قبرستان شیخ نورالدین ملک پران میں مدفون ہوئے۔

مولانا کے تین صاحبزادے ابوالفضل، ابوالفتح اور ابوالفرح اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ ایک صاحبزادے ابوالفضل اور ایک صاحبزادی فوت ہوئیں۔ دونوں صاحبزادے مسجد و قبرستان خاندانی کا اہتمام کرتے ہیں اور والد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شیخ عطاء الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ

شیخ صاحب کے آباد اجداد ضلع خوشاب (پنجاب) سے دہلی آئے، یہاں حضرت شمس الدین سبز وار نے دہلی کی پنجابی برادری کو مشرف باسلام کیا۔ یہ برادری شاہ عالم کے زمانے میں پنجاب سے دہلی آئی۔ مورثِ اعلیٰ شیخ صاحب کے عبدالسلام صاحب اتالیق شاہ عالم اور ان کے والد حافظ عبدالرحیم مفتی وشہر قلعہ تھے، جن کا ذکر مولانا محمد حسین صاحب آزاد نے کیا ہے:

"حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے بہت سے لوگ گرد جمع ہیں وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں اور شیخ علیہ الرحمہ حضرت ذوقؔ کو اس میں سے چمچے بھر بھر دیتے جاتے ہیں، حافظ موصوف نے ان سے پوچھا یہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے، انھوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے، اور میاں ابراہیم ان کے قائم مقام ہوئے ہیں۔

حافظ احمد یار جہاں انشاؔ کے یار تھے۔ وہاں نو عمر ذوقؔ سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے یاروں کی طرح ملتے تھے۔ یہ عجیب شگفتہ مزاج، خوش طبع، سخن فہم شخص تھے۔ حافظ مرحوم ان ہی مولوی صاحب کے داماد تھے، جنھوں نے حلّتِ زاغ کا فتویٰ دیا تھا، اور سوداؔ نے آپ کی ہجو کہی تھی، ترجیع بند مخمس ؎

ایک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے"[1]

صاحبِ آبِ حیات نے حافظ احمد یار کی یاری کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

[1] آبِ حیات ص ۴۵۶

"دہلی میں حافظ احمد یار ایک معقول صحبت یافتہ نامور حافظ تھے اور سرکار شاہی میں حافظان قرآن میں نوکر تھے۔ اگرچہ دنیا میں ایسا کون تھا جس سے سید انشاؔ یارانہ نہ برتیں۔ مگر حافظ احمد یار کے بڑے یار تھے، ان کا سجع کہا تھا ؎ اللہ حافظ احمد یار۔

حافظ صاحب ایک دن مل گئے، راستے میں مینھ آگیا اور وہاں پہنچنے تک موسلا دھار برسنے لگا، یہ جا کر بیٹھے ہی تھے جو حرم سرا سے ننگے منگے ایک کھاردے کی لنگی باندھے آپ دوڑے آئے، انھیں دیکھتے ہی اچھلنے لگے، ہاتھ پھیلا پھیلا کر گرد پھرتے تھے اور کہتے جاتے تھے ؎

"بھر بھر چھاجوں برست نور

ردّ بلیاں دشمن دُور"[1]

حافظ صاحب کے فرزندِ ارجمند جناب غلام رسول شوقؔ استادِ اکبر شاہ و ذوقؔ تھے۔ کابلی دروازے میں رہتے تھے، ان کا بھی مولانا آزادؔ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف میں ذکر کیا ہے:

"حضرت ذوقؔ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے، اس وقت کسے خبر ہوگی کہ رمضان سے وہ چاند نکلے گا جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلے کے اکثر لڑکے ان ہی کے پاس پڑھتے تھے۔ انھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے، شوقؔ تخلص کرتے تھے، اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلے کے شوقین نوجوان دلوں کی امنگ میں ان سے کچھ کہوا لیا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت ان کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی، اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا، اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد کا تھا اور ایک نعت میں۔ اس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ

[1] آب حیات ص ۲۹۳

اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں، جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک حال سمجھوں، غرض اس عالم میں کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلے میں میر کاظم حسین ان کے ہم سبق تھے جو کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے، حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق ہے کبھی باد و باراں، انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لئے اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ گھوڑے دوڑاتے تھے ——— نمونہ کلام کا یہ ہے ؎

مزا انگور کا ہے رنگترے میں ۔۔۔ عسل زنبور کا ہے رنگترے میں

ہیں اشعار ہلالی اس کی پھانکیں ۔۔۔ یہ مضموں دور کا ہے رنگترے میں

نہیں ہے اس کی پھانکوں میں یہ زیرا ۔۔۔ یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں

ہے گلگوں مجسّم یا بھرا خوں ۔۔۔ کسی ناسجور کا ہے رنگترے میں

مزاج اب جس کا صفراوی ہے اے شوقؔ
دل اس رنجور کا ہے رنگترے میں

لکھا ہوا تھا یہ اس مہ جبیں کے پرچے پر ۔۔۔ نہیں ہے کوئی اب ایسا زمین کے پرچے پر

کر لک مژگاں چشم ستمگر آکے جگر میں گھوپ چلی ۔۔۔ آہ کی ہمدم ساتھ ادھر سے جنگ کو اپنے دھوپ چلی

وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوقؔ جنھوں نے کل دن کو ۔۔۔ آج وہ آئے پاس مرے، جب ڈیڑھ پہر کو توپ چلی

فاقہ مست عدو نے بد ایسا ہی چھٹی کا رچا ہے ۔۔۔ نانی جس کی آئی چھٹی میں دھوم سے لیکر گھی کھچڑی

شیخ بگھارے شیخی اپنی مفت کے لقمے کھاتے ہیں
دودھ ملیدا کھاتے ہیں یا مست قلندر گھی کھچڑی

حضرت شوقؔ کے ایک ہی لڑکے تھے، خلیفہ احمد حسن آتالیق حضرت فخر جواں بخت فیروز شاہ۔ فارسی عربی کے بڑے عالم تھے، ان کا مدرسہ غدر کے بعد تک کٹرہ عالم بیگ بلی ماران میں تھا۔ ان کے صاحبزادے مظفر حسین اپنے والد کے سچے جانشین فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ ان کے

صاحبزادے شیخ عطاء الرحمن ایڈوکیٹ کے والد شیخ فضل الرحمن تھے جو راقم الحروف کے والد ماجد مولانا شرف الحق رحمۃ اللہ علیہ کے جگری دوست تھے۔

اس برادری کے افراد سب سے زیادہ دہلی میں تھے، اس کے بعد دوسرا بڑا مرکز کلکتہ ہے۔ وہاں زیادہ تر دہلی ہی کے لوگ تجارت کرنے گئے ہوئے ہیں۔ دوسرے صوبوں میں زیادہ آبادی یوپی میں ہے۔ جہاں یہ سب لوگ میرٹھ، بریلی، مرادآباد، ہاپوڑ، امروہہ، سہارنپور، آگرہ، بنارس، علی گڈھ اور لکھنؤ میں ہیں۔ آنولہ میں بھی بڑے بڑے لوگ ہیں، پنجاب میں انبالہ اور لدھیانہ میں بھی بسے ہوئے ہیں۔

دہلی میں ان کی فسادات سے قبل تعداد بیس پچیس ہزار تھی، کچھ محلے پورے ان ہی کے تھے اور کچھ میں ان کی اکثریت تھی۔ غدر سے پہلے جہاں اب اسٹیشن بنا ہوا ہے، وہاں کابلی دروازے (جس کو اب چھوٹا دروازہ کہتے ہیں) میں یہ برادری آباد تھی — پنجابی کٹرہ اور گلی بتلان ۱۹۴۷ء تک ان ہی لوگوں سے آباد تھے! — جو محلے کل ان کی آبادی کے تھے وہ یہ تھے:

پھاٹک حبش خاں، حویلی حسام الدین، احاطہ کالے صاحب، کشن گنج نزد تیلی واڑہ۔
پھاٹک حبش خاں میں گلی ہیلنگا بیگ، دھوبیوں کا کٹرہ، رنگ محل، چمن واڑہ خورد، کلاں، گلی زگریا والی، گلی باقر والی، کٹرہ گھی، بارہ دری نواب وزیر کٹرہ شفیع، طوطا میناجی۔ جن محلوں میں ان کی اکثریت تھی ان کے نام یہ ہیں: باغیچی اچھے جی، نواب گنج، نیا محلہ، باغ بیری والا، باڑہ ہندوراؤ، فیاض گنج۔

ان محلوں میں جن مکانات میں رہتے تھے، وہ یا تو انکی ذاتی ملکیت تھی یا اُنکے کسی دوسرے بھائی کے تھے، اور یہ کرایہ پر رہتے تھے۔ کسی غیر برادری کے مکان میں غالباً کوئی نہیں رہتا تھا عقیدے کے لحاظ سے زیادہ حنفی مسلمان تھے، یا کچھ اہل حدیث اور تفضیلی۔

یہ ہمیشہ کی تجارت پیشہ قوم ہے۔— ان کے یہاں ڈاکٹر اور وکیل بھی ہیں، امپیریل ایجوکیشنل سروس میں تھے، سکریٹریٹ میں سپیریر اور انفریر دونوں سروسوں میں تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر اور دہلی میونسپل کمیٹی میں بھی تھے۔ کشن گنج، احاطہ کالے صاحب اور حویلی حسام الدین میں ان کی خاصی آبادی تھی۔

۱۹۴۷ء سے قبل دہلی کی میونسپل کمیٹی پر ان ہی کی برادری کے بااثر لوگ قابض تھے اور ان کے اشارے پر ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر ناچتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ خان بہادر ایس۔ ایم عبداللہ اور خان بہادر حبیب الرحمٰن نے دہلی میں اپنا سکہ جما رکھا تھا۔

شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کے آباء واجداد کھتری تھے، چنانچہ آج تک ان میں کھتریوں کے طبقے موجود ہیں، جیسے بٹلہ، چاؤلہ، چھابڑہ، کھتوریہ، ماندیہ وغیرہ

شیخ صاحب کا خاندان

کھتوریہ سے تعلق ہے۔ اس خاندان میں بہت سے لوگ تفضیلی عقائد کے ہیں۔

شیخ صاحب کی پیدائش گلی نیم والی حویلی حسام الدین، بلی ماران مکان ۲۲۴۳ میں ہوئی، آپ کے والد ماجد استاد کامل جناب قبلہ آفتاب حسین صاحب کے شاگرد ہیں، اسی طرح شیخ صاحب کے صاحبزادے سید محمد صاحب خطیب اعظم کے شاگرد تھے، علوم رسمی ان ہی سے حاصل کئے۔ نیز عباس حسین صاحبزادے ماسٹر ذاکر حسین صاحب اور لطافت حسین صاحب سے بھی تلمذ کا شرف رکھتے ہیں۔

شیخ صاحب عربک سکول میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے، وہاں ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، اس اسکول میں آپ کے اساتذہ حسب ذیل حضرات تھے:

ماسٹر فضل الدین صاحب (انگریزی)، سید محمد صاحب خطیب اعظم (فارسی)، سید محمد علی صاحب (اردو)، نور محمد صاحب (ڈرائنگ)، ماسٹر اصغر حسین (جغرافیہ تاریخ)، سید محمد رضا (انگریزی)۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں آپ سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہوئے، جس میں آپ نے حسب ذیل مضمون، حسب ذیل استادوں سے پڑھے:

ریورنڈ (پادری) این۔ ایف۔ نیگ، اور پادری ایف۔ ایف۔ منگ (انجیل انگریزی)، شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب (اردو) مولانا اظہر علی (فارسی) مسٹر ایس۔ کے سین (فلسفہ)۔

۱۹۲۲ء میں انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کر کے شیخ صاحب بی۔ اے میں داخل ہوئے، اساتذہ مذکورہ ہی تھے، لیکن ان کلاسوں میں پرنسپل کالج ایس کے رود صرف انجیل کی تعلیم دیتا تھا۔

یہ کالج مشنریوں کے انتظام میں تھا، انجیل پڑھنا لازمی تھا، تعلیم شروع ہونے سے پہلے عیسائیوں کی دعائیں پڑھنی پڑتی تھیں اور پہلا پیریڈ انجیل کا ہوتا تھا، جو شخص اس دعا میں نہ جاتا تو اس پر فی یوم چار آنے جرمانہ کیا جاتا تھا۔ سالانہ امتحان میں انجیل بھی داخل ہوتی تھی، اس کا بھی ایک پرچہ ہوتا

تھا۔ فلسفے میں آپ کا امتحان کے اندر پہلا نمبر تھا، بی۔ اے کے زمانے میں آپ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک رہے۔ اس ایسوسی ایشن کے ماتحت علمی لکچر اور مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ ان مشاعروں میں آپ کے زمانے میں سر راس مسعود، سر سری رام مصنف "خم خانۂ جاوید"، حضرت سائل اور حضرت بیخودؔ نے بھی شرکت فرمائی۔

۱۹۲۴ء میں یونیورسٹی کے لاء کالج میں شریک ہوئے، اور سر عبدالرحمٰن، رائے بہادر رام کشور اور ڈاکٹر سر ہری سنگھ گور سے قانون (لاء) کے درس لیے۔

۱۹۲۶ء میں امتحان دینے کے بعد دہلی کے مشہور قوم پرست اور محنتی، دیانتدار، قابل و لائق شیخ محمد تقی ایڈوکیٹ آپ کے رشتے کے چچا تھے، ایک سال وکالت کے طریقے اور گر سیکھے، ۱۹۲۷ء میں آپ نے وکالت شروع کی۔ بہت جلدی فروغ حاصل کیا۔ دو سال کے بعد ہی آپ نے قتل کا ایک معرکۃ الآرا عربک کالج کے طالب علم سبحان الدین مبینۂ قاتل حسینہ کا سشن کورٹ میں مقدمہ لڑا، اس کیس میں وعدہ معاف گواہ منور جہاں تھی، ـــــ جس میں ثابت کیا کہ اصل قاتل سبحان الدین نہیں بلکہ وعدہ معاف گواہ منور جہاں قاتل ہے، چنانچہ عدالت سشن نے سبحان الدین کو بری کیا۔ اور اپنے فیصلے میں لکھا کہ منور جہاں پر قتل کا مقدمہ چلایا جائے، چنانچہ اس پر مقدمہ چلا، اور اس کو سزا ملی۔

آپ نے وکٹری ڈے کے زمانے میں جبکہ دہلی میں مختلف مقامات پر میونسپل کمیٹی وغیرہ میں آگ لگی تھی، تقریباً چالیس مقدمات کی مفت پیروی کی، اس میں سنگین مقدمے بھگت سنگھ، شیام لال وغیرہ کے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح راقم الحروف کے، سید احمد امام جامع مسجد مرحوم، اور گوپال داس وغیرہ کے معرکۃ الآرا مقدمات میں پیروی کی اور کامیاب ہوئے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک آپ آل انڈیا پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف یونین کے نائب صدر رہے، اس زمانے میں جبکہ سیٹھ عبداللہ ہارون سہروردی اور سر ہیر گڈنی اس یونین کے سلسلے وار صدر رہے۔ اسی زمانے میں آپ پوسٹل ایڈوکیٹ یونین کے ایڈیٹر رہے، اور یونین کے مطالبات حکومت سے منواتے رہے۔ جس میں افسران کی غفلت اور بدعنوانیوں کو دور کرنے کے لیے کافی مضامین ہوتے تھے، چنانچہ مکندی لال کا لکا آر ایم۔ ایس کے انچارج کے بارے میں آپ نے حسب ذیل بدعنوانی کا ذکر کیا:

"ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ انبالہ سب ریکارڈ آفس کے متعدد افسران دس بارہ سال سے مسلسل بلا تغیر و تبدل کام کر رہے ہیں۔ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ اس حلقے میں باری باری افسروں کو متعین کیا جائے۔ علاوہ ازیں ایک افسر کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ تقریباً دس سال سے مسلسل ایک پوسٹ پر کام کر رہا ہے، باوجودیکہ اس نے شدید قسم کی بدعنوانیاں کی ہیں جن کی بنا پر اس کو بدل دیا گیا ہے، اس افسر کے ساتھ جانبدارانہ سلوک کیا جا رہا ہے۔"

اس مضمون پر مکندی لال نے آپ کے خلاف ہتک عزت دفعہ ۵۰۰ کے ماتحت انبالہ کینٹ کے مجسٹریٹ کی عدالت میں ۳ فروری ۱۹۳۶ء کو دعویٰ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ کافی دن چلا اور پریس نے کافی دلچسپی لی۔ مدعی نے بدعنوانیوں کو تسلیم کیا، جس کی وجہ سے عدالت نے شیخ صاحب کو بری کیا۔

شیخ صاحب نے مسلمانوں کی ترقی کے لئے مسلم ایسوسی ایشن قائم کی تھی جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک چلی، اس کے آپ سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔

شیخ صاحب فارسی زبان کے ماہر ہیں، اتنی نفیس لہجے میں فارسی بولتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ ایرانی نژاد ہیں، آپ کو شعر و شاعری اور ادب سے خاص لگاؤ ہے، کوئی سال ایسا نہیں جاتا، کہ آپ کوئی مشاعرہ نہ کراتے ہوں، ادیبوں اور شاعروں سے آپ کے کافی تعلقات ہیں، چنانچہ حضرت نوح ناروی اور استادی حضرت سائل اور حضرت بیخود دہلوی سے آپ بہت عقیدت رکھتے ہیں، شعراء اور ادیبوں کا طبقہ آپ کی علمی قابلیت کا معترف ہے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ حضرت سائل آپ کی قابلیت کو ہر محفل میں سراہتے تھے۔

آپ شعر فہمی کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ سائل و بیخود جو بڑے تنگ مزاج شاعر مانے جاتے ہیں، مخصوص لوگوں کے علاوہ کسی کو کلام نہیں سناتے تھے۔ مگر وہ شیخ صاحب کو کلام سناتے تھے، چنانچہ شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ آخری وقت میں جب کہ حضرت سائل بہت نڈھال ہو گئے تھے۔ اور ان کو چوکی پر بٹھا کر ہاتھوں ہاتھ ٹاؤن ہال جہاں یوم داغ میں شرکت کے لئے لایا گیا، تو آپ نے حضرت داغ پر ایک نظم سنانے کے بعد حضرت داغ کا شیخ صاحب کو ایک شعر سنایا اور سناتے سناتے آبدیدہ ہو گئے۔ ؎

کعبہ کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو نہیں خبر مری مٹی کہاں کی ہے

آپ نے ایک دن ذکر کیا کہ آخری وقت میں جب سائل صاحب سے ملا تو انھوں نے مجھ کو اپنا یہ ایک شعر سنایا ؎

زینتِ صہبائے عالم جس کی خاکِ در بنے
بے نوا سائل کا یارب اس کے دل میں گھر بنے

آپ نے فرمایا کہ کبھی سائل صاحب موج میں ہوتے تھے اور حضرت داغ کا ذکر ہوتا تھا، تو آپ مزے لے لے کر داغ کا یہ شعر گنگنایا کرتے تھے ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

شیخ صاحب معلومات کا ذخیرہ ہیں، مطالعہ بڑا وسیع ہے، کسی عنوان پر بات کیجیے، دریا بہادیں گے، انداز بیان انتہائی دل کش ہے۔[1] شیخ صاحب ۱۹۵۰ء کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ لاہور میں سکونت اختیار کی۔ کس حال میں ہیں معلوم نہ ہو سکا۔

---

[1] رسالہ آزاد ہندوستان دہلی

حاجی علیجان صاحب

حاجی علیجان کے والد ماجد خواجہ ضیاء الدین کشمیر کے باشندے تھے، جو وہاں کے معزز سوداگر تھے، دہلی میں تجارت کے لئے آئے تھے، ان کے خاندان کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کو دہلی کے ایک بادشاہ کا وزیر کشمیر سے دہلی لایا تھا، یہ ایک خنکار تھے، انھوں نے دہلی میں آنے کے بعد دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور رہائش گاہ نئی سڑک پر بنائی، چنانچہ ان کے صاحبزادے کے نام پر ایک گلی کا نام "گلی حاجی علیجان" رکھا گیا، جو اب تک نئی سڑک پر موجود ہے۔

حاجی علیجان صاحب کو سرسید کی پھوپھی بیاہی گئی تھیں، یہ سرسید کے پھوپا تھے، آپ کی دہلی میں ۱۸۵۷ء سے قبل چاندنی چوک میں پٹوے کی دکان تھی، کڑھی ہوئی ٹوپیاں فروخت کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں جبکہ لارڈ ہارڈنگ پر گھنٹہ گھر چاندنی چوک دہلی میں بم پھینکا گیا تھا، اس وقت یہ موتی کا کٹرہ چاندنی چوک کے قریب ایک کوٹھے پر کاروبار کرتے تھے، اس کے بعد خاص موتی کے کٹرہ کے بالاخانہ پر چلے گئے وہاں تجارت شروع کی، ۱۹۲۲ء میں نئی سڑک پر ایک کوٹھی بطور شاخ تعمیر کی جو کوٹھی حاجی علیجان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کوٹھی کے بالاخانہ پر مہمان خانہ تھا۔ حاجی علیجان ۱۳۰۰ھ میں اپنے فرزند عبدالرحمٰن، عبدالحمید اور عبدالرشید کے ہمراہ دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچے، وہیں مقیم ہوئے، سو برس سے زیادہ عمر پائی، ۱۳۰۲ھ میں مکہ معظمہ میں فوت ہوئے اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔

حاجی علیجان صاحب کے چار صاحبزادے عبدالعزیز صاحب، عبدالرحمٰن صاحب، عبدالحمید صاحب اور عبدالرشید صاحب ہوئے۔ عبدالعزیز صاحب نے میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے علوم دینی کی تحصیل کی، علم حدیث پر پورا عبور حاصل تھا، ان کو دہلی کا علمی طبقہ اچھی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کی علمی قابلیت کا معترف تھا۔ مفتی صدرالدین صاحب سے بھی قریبی تعلق تھا، ان کے ہاں مفتی صاحب کی آمد و رفت رہتی تھی، ادبی نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی، لیکن اس نوک جھونک

میں اکثر ان کی بات باوزن قرار دی جاتی تھی، مولانا امام بخش صہبائی شہید فرنگ بھی ان کی علمی ذہانت کے قائل تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

عبدالعزیز صاحب کے دو صاحبزادے محمد احمد اور عبدالواحد تھے۔ یہ دونوں صاحبزادے تجارت کرتے تھے، ان کے زمانے میں تجارت کو کافی ترقی ہوئی اور تھوڑے دنوں میں خاندان کی مالی حالت اچھی ہوتی چلی گئی، یہ دونوں اشخاص دہلی میں فوت ہوئے۔

محمد احمد صاحب کے صاحبزادے عبدالباقی صاحب تھے، جو فہیم وذکی اور متواضع تھے، مذہب سے خاص لگاؤ تھا، نماز باجماعت پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے، غریبوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ دینی مدارس میں چندہ بھی دیتے تھے، ان کا انتقال بھی دہلی میں ہوا۔ عبدالباقی صاحب کے دو فرزند مصطفےٰ اور مرتضیٰ ہوئے، دونوں کراچی میں کاروبار کر رہے ہیں۔

عبدالواحد صاحب مخیّر اور متقی تھے، ان کو اپنے دادا سے بہت محبت تھی اور دادا بھی ان کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھتے تھے، ان کو حج کا بڑا شوق تھا، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور یہ حج کے لئے نہیں جا سکے اور دہلی میں فوت ہوئے، نرینہ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

عبدالرشید صاحب نے سید محمد محدث کانپوری اور مولانا مظہر حسین سے حدیث پڑھی ۱۳۰۰ھ میں اپنے والد حاجی علیجان صاحب کے ہمراہ حجاز مقدس پہنچے، مکہ معظمہ میں کاروبار میں مصروف ہوئے، ۱۳۱۶ھ کو مکہ معظمہ میں انتقال ہوا۔

عبدالرشید صاحب کے صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ ہوئے، ان دونوں حضرات کی زندگی کا بیشتر حصہ مکہ معظمہ میں گذرا، اور تجارت میں ہی زندگی بتائی۔ مکہ معظمہ میں دونوں فوت ہوئے، عبیداللہ صاحب کا انتقال ۱۳۷۸ھ میں ہوا۔

عبداللہ صاحب کے صاحبزادے محمد اسماعیل صاحب اور محمد اسحاق صاحب ہوئے۔ اسماعیل صاحب ۱۳۱۷ھ کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، حافظ عمر بیگ سے قرآن مجید حفظ کیا، فارسی مولوی مشتاق احمد کانپوری، اور حدیث مولوی مظہر حسین سے تحصیل کی، مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، زندگی کا زیادہ حصہ اسی مقدس سرزمین میں گذارا، ۱۳۳۸ھ میں شادی کی، اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، مکہ معظمہ میں تجارت کرتے ہیں۔

اسحاق صاحب ۱۳۲۳ھ کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولوی نیاز احمد صاحب جانشین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے حاصل کی، قرآن مجید حافظ احمد بیگ صاحب اور قاری عبد الغنی مصری سے حفظ کیا۔ فارسی کی کتابیں منشی احمد حسین صاحب فیض آبادی سے پڑھیں۔ تفسیر مولوی مقبول حسین سبحانی سہارنپوری سے تحصیل کی، شیخ ابوبکر خوقیر سے احادیث کا درس لیا، تعلیم کے بعد کاروبار میں مصروف ہوئے، ۱۳۴۹ھ کو دہلی میں شادی کی، چھ لڑکے یعقوب، حسن، حسین، عبد الرشید، عبد الحمید اور عبد الرحمٰن، تین لڑکیاں ہوئیں۔

عبد الحمید صاحب کا بھی زندگی کا بیشتر حصہ مکہ معظمہ میں گزرا، تجارت میں زیادہ مصروفیت رہی، مکہ معظمہ میں ۱۳۲۸ھ میں فوت ہوئے، لاولد رہے۔

عبد الرحمٰن صاحب دہلی میں ستارے کا کام کرتے تھے، بڑے محنتی اور جفاکش انسان تھے، ان کا دہلی میں مشہور تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ حج بیت اللہ کے لئے حجاز مقدس گئے اور اپنے خاندان کے لوگوں کے ہمراہ مکہ معظمہ میں تجارت کرنے لگے، ۱۳۰۷ھ کو وہیں فوت ہوئے، حاجی عبد الرحمٰن اور ان کے بھائی عبد العزیز نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا۔

عبد الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے حاجی عبد الغفار، حاجی عبد الستار، عبد الجبار، اور عبید الرحمٰن ہوئے اور ایک صاحبزادی زوجہ قاری احسان الحق صاحب ہوئیں۔

حاجی عبد الغفار صاحب دہلی میں گلی حاجی علیجان نئی سڑک میں پیدا ہوئے، آپ نے صرف ونحو کتب معانی مولوی حمایت اللہ صاحب سے پڑھیں، مشکوٰۃ المصابیح سید مولوی شریف حسین خلف حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے تحصیل کی۔ سید شریف حسین صاحب اپنے والد ماجد کے لحاظ و شرم کی وجہ سے مسجد کے بجائے گلی میں بیٹھ کر پڑھاتے تھے۔ آپ نے بعض کتب حدیث دوسرے اساتذہ سے پڑھیں۔ صحیحین میاں نذیر حسین صاحب نے پڑھائی، ان اسباق میں مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی آپ کے ہم سبق تھے، ان کی جماعت کے لوگ سلسلے وار قراۃ کرتے تھے۔ رمضان شریف کے مہینے میں قراۃ پڑھنے والے پنجابی اور یوپی کے لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ میاں صاحب نے اس جھگڑے کو نمٹانے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ نہ میں یوپی والوں کو پڑھاؤں گا اور نہ ہی پنجابیوں کو، بلکہ صرف دہلی والے پڑھیں، چنانچہ دہلی والوں میں قراۃ پڑھنے کا فخر عبد الغفار صاحب کو حاصل ہوا۔ اس زمانے میں میاں صاحب نے

ہدایہ کا پڑھانا چھوڑ دیا۔ مگر مولوی عبدالغفار صاحب کی خواہش پر منظوری دیدی تھی، چنانچہ میاں صاحب نے ہدایہ یا تو ان کو پڑھائی یا مولانا محمد حسین بٹالوی کو۔

اس زمانے میں مٹی کے چراغ کے علاوہ بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ مولوی عبدالغفار صاحب مٹی کے چراغ کی روشنی میں پڑھتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی۔

اخلاق وسیرت کے اعتبار سے مولوی عبدالغفار صاحب مرجع انام تھے اور کاروبار کے اعتبار سے ان کی کوٹھی کی بڑی ساکھ تھی، آپ نے جو دکان چار روپے ماہوار کرایہ پر لی تھی، وہ ترقی کرتے کرتے شاندار کوٹھی یا بہت بڑی فرم کی صورت اختیار کر گئی۔ آپ آل انڈیا اہل حدیث کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے[۱]۔

ان حضرات کا اس قدر اعتماد تھا کہ ہندوستان کے رئیس و امراء، نواب بھی ہزاروں کا نہیں بلکہ لاکھوں کی ہنڈی دیا کرتے تھے اور ان کی ادائیگی حجاز مقدس میں ہو جاتی تھی، چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال جب ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں حج کو گئیں تو انھوں نے ایک لاکھ روپے کا معاملہ ان سے کیا، جس کا ذکر روضۃ الریاحین کے ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ کے ایک خط میں ہے:

"احتیاطاً عبدالغفار تاجر دہلی سے ایک رقعہ لکھوا لیا گیا، کیونکہ انھوں نے اپنے آدمیوں سے ایک لاکھ روپے تک دلا سکنے کا وعدہ کیا تھا، ان کے گماشتہ کو بلا کر روپیہ طلب کیا تو گماشتہ نے کہا آج تو ناممکنات سے ہے، دو ایک دن میں دے سکتا ہوں۔"

چنانچہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ کے خط میں مذکور ہے[۲]:

"روپیہ حاجی عبدالغفار دہلوی نے حسب وعدہ فراہم کر دیا۔"

ملا واحدی صاحب نے حاجی عبدالغفار صاحب کی مقبولیت اور اثرات کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو "اخبار جنگ کراچی" ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء میں چھپا ہے:

"دوسری عالمگیر جنگ میں انگریزی حکام نے ہر جگہ وارڈ کمیٹیاں بنائی تھیں اور

[۱] تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۹۸ [۲] روضۃ الریاحین دفتر دوم ص ۲۱۷

ہر محلے کا ایک میر محلہ مقرر کیا تھا، لیکن یہ میر محلہ ایسے بااثر نہیں تھے، جیسے ان سے پہلے اللہ کے بنائے ہوئے میر محلہ ہوتے تھے۔ میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دلّی میں بے تاج کا بادشاہ حکیم عبدالمجید خاں کو دیکھا۔۔۔ میرے ہوش سنبھالنے کے وقت میرے محلے کے میر محلہ مرزا انعام بیگ تھے اور میرے برابر کے محلہ سوئی والان کے میر ملن، ان دونوں کا طوطی بولتا تھا۔ یہ اہل محلہ کے قصے قضیے خود چکاتے تھے، انھیں کچہری عدالت نہیں کرنے دیتے تھے، محلہ ان کا عاشق تھا، جو قصے قضیے میر محلہ نہ چکا سکتے تھے، وہ پھر حاجی عبدالغفار کے پاس جاتے تھے، حاجی عبدالغفار میر محلہ نہیں میر شہر تھے، یہ کام حکیم عبدالمجید کے بس کا نہیں تھا، اس کام کی عقل حاجی عبدالغفار ہی کو عطا ہوئی تھی، حاجی عبدالغفار حاجی علیجان کے پوتے تھے، حاجی علیجان کی ایمان داری کا اسی طرح شہرہ تھا، جس طرح آج کل پاکستانی ملاوٹ کرنے والے بے ایمانوں کا شہرہ ہے۔ دلّی والے کسی کی ایمانداری پر طنز کرتے تھے تو کہتے تھے "میاں جاؤ، حاجی علیجان نہ بنو" حاجی علیجان کی دیانت ضرب المثل تھی، حاجی علیجان کا بہت بڑا کاروبار تھا، اور اب بھی ان کا خاندان دلّی، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں کاروبار کر رہا ہے، حاجی عبدالغفار نے دہلی میں تارکشی کا مل بھی جاری کیا تھا مگر وہ نہیں چلا۔ اسی مل والے مکان میں پھر دفتر "مخزن" اور دفتر "ہمدرد کامریڈ" رہا اور اس میں گاندھی جی نے اکیس روز کا برت رکھا تھا۔ حاجی عبدالغفار کے زمانے تک اس خاندان کی اتنی ساکھ تھی اور شاید اب بھی ہو کہ لوگ حج کو جانے لگتے تھے تو جتنا روپیہ انھیں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں خرچ کرنا ہوتا تھا وہ سب کا سب حاجی عبدالغفار کی دکان میں جمع کرا دیتے تھے اور مکہ معظمہ کی دکانوں سے روپیہ مل جاتا تھا۔ حاجی عبدالغفار کے ہاں روزانہ بعد مغرب نواب ضمیر مرزا، خواجہ عبدالمجید رئیس اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے آنریری پروفیسر، شیخ عبدالرزاق اور مسٹر عبدالخالق وغیرہ آ کر بیٹھتے تھے"۔[1]

[1] جنگ کراچی ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء

کوٹھی حاجی علیجان، کارخانہ، حوض والی مسجد نئی سڑک اور حاجی عبد الغفار کے بارے میں "صاحب یادگار دہلی" تحریر کرتے ہیں:

"کوٹھی حاجی علیجان بڑی نامی کوٹھی ہے ہر قسم کا اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا، اور ٹوپیاں وغیرہ قیمتی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ حوض والی مسجد بہت خوشنما اور اچھی بنی ہوئی ہے، اس مسجد کے متعلق تین دکانیں جس کا کرایہ تقریباً تیس روپیہ ماہوار ہے، اس مسجد کے مہتمم حاجی عبد الغفار نبیرہ حاجی علیجان مرحوم ہیں، آگے گلی حاجی علیجان ہے، اس میں ان کا کارخانہ اور مکانات ہیں، اس وقت اس میں حاجی عبد الغفار صاحب رہتے ہیں، حاجی صاحب نہایت دیندار، باوضع، خوش اخلاق، بامروت شخص ہیں۔ آپ کی صفائی معاملہ کی دور دور شہرت ہے۔"[۱]

حاجی عبد الغفار کے ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنما حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی، پیر جی عبد الصمد صاحب دہلوی، نواب فیض احمد خان صاحب رئیس دہلی، علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، خواجہ عبد المجید صاحب دہلوی اور مولانا شوکت علی، محمد علی صاحبان سے قریبی تعلقات و مراسم تھے۔

حاجی عبد الغفار صاحب کو کتب بینی کا شوق تھا، چنانچہ آپ کا ایک کتب خانہ تھا جس میں قلمی و مطبوعہ نایاب و بیش قیمت عربی، فارسی اور اردو کی کتابیں تھیں۔ یہ کتب خانہ کوٹھی حاجی علیجان کے بالائی حصے پر تھا۔ حاجی عبد الغفار صاحب کی زندگی میں ہی یہ کتب خانہ مسجد حاجی علیجان کوچہ خان چند، نئی سڑک متصل گھنٹہ چاندنی چوک دہلی میں منتقل ہوگیا تھا، جو ہنگامہ ۱۹۴۷ء کی نذر ہوا۔ فسادیوں اور لٹیروں نے کتابیں لوٹیں اور جلائیں اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا کتب خانہ بیدردی کے ساتھ ضائع کیا۔

حاجی عبد الغفار صاحب نے پہلا حج ۱۲۹۶ھ میں اپنے چچا عبد الرشید کے ہمراہ کیا، دوسرا حج ۱۳۲۵ھ کو نواب بہاولپور کے ساتھ کیا، تیسرا حج ۱۳۵۷ھ میں فرمایا، حج سے فارغ ہو کر ۱۳۵۸ھ

---

[۱] یادگار دہلی ص ۱۲۲

میں واپس جہاز میں آ رہے تھے کہ عدن کے پاس مئی ۱۳۵۸ھ کو فوت ہوئے اور میت سمندر کو سونپ دی گئی۔

ان حضرات کی حجاز مقدس سے دہلی میں آمد و رفت رہتی تھی اور اب بھی ہے، اس خاندان کے افراد کا اب تک یہ طریقہ رہا ہے کہ اپنے دہلی کے خاندان میں شادی بیاہ کرتے ہیں، سعودی عرب کے خاندانوں سے رشتہ ناطہ نہیں جوڑا۔

حاجی عبدالغفار صاحب کے صاحبزادے حاجی محمد صالح اور حاجی محمد زبیر صاحب تھے۔ حاجی محمد صالح صاحب دہلی میں پیدا ہوئے، قاری فضل الدین صاحب سے مسجد کوچہ نٹوان میں قرآن مجید حفظ کیا اور قراۃ قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی سے سیکھی، قاری صاحب کوچہ احاطہ کالے صاحب بلیماران دہلی میں آ کر رہے تھے۔ حاجی صاحب اسی مکان میں قراۃ سیکھنے کے لئے جاتے تھے۔

عربی فارسی کی کتابیں حافظ عبداللہ غازی پوری، مولوی احمد اللہ صاحب شیخ الحدیث، مولوی عبدالسلام صاحب بستوی، علامہ مولوی بشیر الدین صاحب سہسوانی سے مسجد کوچہ خان چند متصل گھنٹہ گھر چاندنی چوک دہلی میں پڑھیں۔

خلافت کی تحریک میں حصہ ہی نہیں لیا، بلکہ خلافت کمیٹی بنانے والوں میں آپ بھی تھے۔ خلافت کمیٹی کی پہلی میٹنگ سر سید کے مکان کوچہ چیلان میں ہوئی تھی، جس میں پانچ حضرات نے شرکت کی تھی اور یہی پانچ حضرات خلافت کمیٹی کے پہلے ممبر بنے، جس میں مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ حاجی محمد صالح صاحب بھی تھے۔

حاجی محمد صالح صاحب کے قول کے مطابق وہ کانگریس کے کبھی ممبر نہیں بنے لیکن خاموشی کے ساتھ ان کے پروگراموں میں حصہ لیتے رہے۔ کاروباری لوگ ہیں۔ کاروبار کو مقدم سمجھا اور اس میں ہی زیادہ وقت دیا۔ البتہ دینی اور جماعتی کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے۔ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نائب صدر اور آل انڈیا جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور خزانچی مقرر ہوئے، اور مدرسہ امینیہ کے بھی عرصے تک خزانچی رہے۔

حاجی محمد صالح صاحب سیاسی اور مذہبی محفلوں میں وقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اصلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اور اصلاحی مضامین و پوسٹر شائع کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے

چوٹی کے لیڈروں اور رہنماؤں سے ان کے تعلقات ہمراسم ہیں، تقریباً پورا خاندان کانگریس کا سخت ترین حامی ہے، آپ کی اس وقت ۸۵ برس کی عمر ہے، کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار دہلی میں حاجی علیجان والوں کا خاندان رہتا ہے۔ ایک وسیع حویلی ہے جس میں ان کی رہائش ہے۔

حاجی محمد صالح صاحب کے اکلوتے صاحبزادے محمد سلیم صاحب ہیں، انھوں نے حوض والی مسجد نئی سڑک دہلی میں قاری خادم علی صاحب سے قرآن مجید پڑھا اور مولوی عبدالسلام بستوی سے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد اپنے والد کے ہمراہ کاروبار میں لگ گئے، آپ جمعیتہ العلماء صوبہ دہلی کے نائب صدر ہیں۔

محمد سلیم صاحب انتہائی متواضع، خلیق اور ملنسار ہیں، اپنے والد ماجد کی طرح یہ بھی ہر سیاسی و مذہبی محفل میں ہر دلعزیز ہیں، کانگریسی بھی ہیں، لیکن مسلک کے معاملے میں کسی سے الجھتے نہیں ہیں۔ گفتگو میں متانت اور سنجیدگی ہے حاجی محمد صالح صاحب عمر کے اعتبار سے کاروبار میں زیادہ دل چسپی نہیں لیتے، کافی کمزور ہو گئے ہیں، ان کی جگہ ان کے صاحبزادے سلیم صاحب خوش اسلوبی کے ساتھ کاروبار کو چلا رہے ہیں۔ آپ کی شادی عبدالباقی صاحب کی دختر سے ۱۹۴۷ء میں ہوئی جس سے ایک صاحبزادے محمد نسیم اور تین لڑکیاں ہوئیں۔

محمد نسیم نے عریک اسکول اجمیری گیٹ دہلی سے ۱۹۷۱ء میں ہائر سیکنڈری اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ہونہار اور سعادت مند نوجوان ہیں۔ زبیر صاحب نے حوض والی مسجد میں قاری فضل الدین صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا، مختلف مقامات پر علماء سے دینی تعلیم حاصل کی۔ آپ حوض والی مسجد نئی سڑک میں رمضان شریف میں قرآن مجید سناتے تھے اور عبدالستار، عبدالرشید، عبدالرحمٰن اور عبدالواحد نے بھی اسی مسجد میں محراب پڑھی۔ کوٹھی حاجی علیجان دہلی میں تجارت کرتے تھے۔ ستر برس کی عمر میں دہلی میں فوت ہوئے۔ کوٹلہ فیروز شاہ کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ ان کے تین فرزند عمیر، سالم اور سلیم ہیں

اسلم صاحب کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار دہلی میں ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے، قرآن مجید مسجد حوض والی نئی سڑک دہلی میں پڑھا اور مسجد کوچہ خان چند، چاندنی چوک میں دینی تعلیم پائی، اس کے بعد کوٹھی حاجی علیجان میں تجارت میں لگ گئے، ۱۹۶۸ء میں حج کیا، محمد علی صاحب، سکنہ

بھوجلہ پہاڑی دہلی کی لڑکی سے شادی ہوئی جن سے تین صاحبزادے محمد سلمان، محمد فرحان اور محمد ریحان اور تین لڑکیاں ہوئیں۔

عبیدالرحمن صاحب کاروبار کم کرتے تھے لیکن زیادہ وقت عبادت الٰہی میں لگاتے تھے۔ مکہ معظمہ میں زیادہ قیام رہا، دہلی آتے جاتے تھے، — ان کی نرینہ کوئی اولاد نہیں تھی، ایک لڑکی تھی جس کے علاج کے لئے ایبٹ آباد کے علاقے (پاکستان) میں گئے اور وہیں ۱۳۷۴ھ میں انتقال ہوا۔

عبدالستار صاحب کی پیدائش دہلی میں ہوئی، ان کی زندگی کا بھی بیشتر حصہ مکہ معظمہ میں گذرا، یہ بھی تجارت پیشہ تھے اور تجارت میں ان کو تجربہ تھا، ان کے دور میں اس خاندان نے سعودی عرب میں دولت، ثروت اور عزت و وقعت کے اعتبار سے بہت ترقی کی اور مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ مدینہ منورہ میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے اور زیادہ وقت مسجد نبوی میں گذارتے تھے، مدینہ منورہ میں ان کی دکان بھی۔ مکہ معظمہ میں ۱۳۲۹ھ کو فوت ہوئے اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے، ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

عبدالجبار صاحب بچپن میں ہی حجاز مقدس پہنچ گئے تھے، انھوں نے دینی تعلیم کی تحصیل سید محمد محدث کانپوری اور مولانا مظہر حسین سے کی اور تجارت میں مصروف ہوگئے اور کاروبار اس قدر چمکا کہ سعودی عربیہ کے اونچے تاجروں میں شمار ہونے لگے۔ ہندوستان کے حاجی اپنی امانتیں حاجی علیجان کی کوٹھی دہلی میں جمع کرا دیتے تھے اور ہنڈیاں لے کر یہ حضرات حجاز مقدس پہنچ جاتے اور ان سے وصول کرتے۔ یہ سلسلہ مکہ معظمہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ مدینہ منورہ میں بھی جاری تھا، جس سے حاجی صاحبان کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا، اور عبدالستار و عبدالجبار کی فرم کی دھاک بیٹھ گئی، اسی زمانے میں اسی خاندان کی دوسری فرم حجاز مقدس میں عبداللہ، عبیداللہ کے نام سے تھی، اس کی بھی مقبولیت اور اعتماد کا یہی عالم تھا۔ دہلی کی فرم نے حاجی عبدالغفار صاحب کے نام سے شہرت پائی اور اپنی دیانت داری کا سکہ جمایا۔

نواب حاجی حسین خاں صاحب رئیس حسن پور نے ۱۹۰۳ء میں حج کیا تھا، انھوں نے اپنے سفرنامے میں ان حضرات کی دیانت داری اور ہمدردی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

”جدہ سے تا مدینہ شریف کبھی پیسہ ہمراہ لے کر نہ جائے بلکہ ہنڈوی دہلی، مرادآباد

سے کرائے۔ حاجی عبید الرحمٰن صاحب بڑے خلیق و لئیق آدمی ہیں، ان سے روپیہ لینے کے علاوہ ہر قسم کی امداد ملتی ہے، خاص کر مجھ کو ہر قسم کی امداد فرمائی۔ میں ان کا بیحد ممنون و مشکور رہوں۔ روپے یا قلتی کے علاوہ حافظ صاحب نے فرمایا کہ جس قدر روپے کی اور ضرورت ہو، آپ بلا تکلف مجھ سے لے جائیں۔ ایسے ہی حافظ صاحب کے بھائی عبد الستار و عبد الجبار ہیں، جنھوں نے حوالہ بمقام دہلی دیا تھا، یہ سب بھائی علیجان صاحب مرحوم کے پوتے ہیں۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ میں ان کی دکانات متعدد ظروف مراد آباد و دیگر اشیاء ہندوستان مثل دری، قالین وغیرہ کی ہیں اور دہلی میں جو کارخانے ہیں اس سے تو سب واقف ہیں۔"

حجاز مقدس میں اس خاندان نے تجارت میں اعتماد و بھروسہ پیدا کرنے کے ساتھ انگریزوں کی غلامی کے خلاف بھی قدم اٹھائے، چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے حجاز مقدس میں غالب پاشا سے ملاقات کرانے میں اس خاندان کے ایک فرد حافظ حاجی عبد الجبار صاحب نے حصہ لیا جس کا ذکر حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم و مغفور نے "نقش حیات" میں کیا ہے:

"مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر کاروبار کرتے ہیں مگر دہلی کے تاجر حاجی علیجان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے، تجارت بھی ان کی بڑے پیمانے پر ہے اور دینداری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے، اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اس خاندان کا حضرت سید احمد شہید اور ان کے متبعین مجاہدین ستیانہ وغیرہ سے قدیمی تعلق ہے، اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبد الجبار سے (جو کہ اس خاندان میں معمر اور سمجھ دار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے) ملے اور ان سے معاملات کا ذکر کر کے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی، انھوں نے اس وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو تسبیحوں کی تجارت کرتے تھے اور ترکی و عربی زبان سے واقف تھے اور وہاں کے ترکی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے بلایا اور حضرت شیخ الہند کے ساتھ کر دیا۔ وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرائی اور جو باتیں حضرت

شیخ الہند نے کہیں۔ اس کا ترجمہ کر کے غالب پاشا کو سمجھایا۔"
عبدالجبار صاحب مکہ معظمہ میں ۱۳۲۲ھ میں فوت ہوئے، جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں، ان کے دو صاحبزادے عبدالوہاب اور عبدالباری ہوئے۔

عبدالباری صاحب دہلی میں ۱۳۲۲ھ کو پیدا ہوئے، بچپن میں مکہ معظمہ چلے گئے تھے، مدرسہ صولتیہ میں فارسی وعربی کی تعلیم مولوی اصغر افغانی، مولوی محمد سعید اور قاری عبداللطیف سے پائی، اس کے بعد تجارت میں لگ گئے۔ کاروبار ہی میں زیادہ وقت لگاتے ہیں۔

ان کی عبید الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی سے دہلی میں ۱۳۳۸ھ میں شادی ہوئی، جن سے دو صاحبزادے محمد یحییٰ محمد امین اور تین لڑکیاں ہوئیں۔

مولوی عبدالوہاب صاحب ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، ۲۰ سال کی عمر میں مکہ معظمہ پہنچے، وہیں سکونت اختیار کی اور تعلیم وتربیت بھی وہیں پائی[1] اس زمانہ میں مکہ معظمہ میں ہندوستانی عالم بھی کافی تھے، زیادہ تر ان سے فیض یاب ہوئے، اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے اہل علم حضرات سے بھی استفادہ کیا اور علوم دینی مدرسہ صولتیہ اور مدرسہ اتحاد وترقی میں حسب ذیل علماء سے تحصیل کئے:

قاری محمد بیگ دہلوی، مولوی مظہر حسین اعظم گڈھی بھوپالی، مولوی عبدالستار کتبی، مولوی مشتاق احمد کانپوری، مولوی عبید اللہ سندھی، قاری عبداللہ، خواجہ عمر لطفی، شیخ حبیب اللہ شنقیطی، اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے علاوہ سند حدیث مجاہد اعظم سید احمد شریف سنوسی (شیخ سنوسی) محدث الشام سید بدر الدین الحسنی، محدث المغربی سید عبدالحیٔ کتانی، شیخ ابوبکر خوقیر سے حاصل کی۔

مولانا عبدالوہاب حجاز مقدس میں ہندو پاک کے اہل علم کا مستقل مرکز تھے۔ حاجی علیجان جن کی کوٹھی دہلی میں، ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے دونوں انقلابات میں لوگوں کی اعانت کے لئے یکساں محل اعتماد رہی۔ یہ امتیاز خاص مکہ مکرمہ کی دکان کو بھی آج تک حاصل ہے۔

[1] تراجم علماء حدیث ہند ص ۲۰۰

شیخ عبدالوہاب کا مکان جس طرح شیخ سنوسی کی مجلس خاص رہا۔ اسی طرح ان کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی کا مرکز رہا۔ شیخ نے ان دونوں سے استفادہ کیا۔ تیسری عالمی شخصیت روسی مجاہد موسیٰ جاراللہ کی تھی جن کے سب سے بڑے دوست شیخ عبدالوہاب صاحب تھے۔

علامہ سلیمان ندوی اور شیخ عبدالوہاب ایک دوسرے کے نہایت قدرشناس تھے۔ قیام مکہ میں سید صاحب کی اکثر مجلس شیخ صاحب کے مکان میں ہوتی تھی۔ مولانا علی میاں کا سفر کا بیشتر وقت ان کے نادر کتب خانے میں گذرتا تھا، یوں اپنے مسلک میں سلفی تھے۔ مگر بکمال اعتدال فرمانے لگے تھے:
"اصل میں دونوں جانب دلائل اتنے قوی ہیں کہ فیصلہ دشوار ہے۔"

مولانا محمد یوسف صاحب تبلیغی جماعت والے حج کو تشریف لائے، تو مولوی عبدالملک صاحب سے فرمایا "میرے لئے صحت اور حسن خاتمہ کی دعا کرا دو، اور کچھ پڑھنے کے لئے بھی دریافت کرو" مولانا نے درود شریف کی کثرت کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کی۔

شیخ صاحب نہایت حلیم اور حد درجہ متواضع تھے۔ ان کے ہم عمر ابن عم، شیخ اسماعیل کا کہنا ہے کہ ساری عمر کسی پہ خفا نہیں ہوئے، حتیٰ کہ نوکر پر بھی" اردو اور عربی کے قدیم و جدید ادب پر نظر تھی، ترکی بھی آتی تھی جو ہندوستان میں ایک دفعہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہاں خالدہ خانم کی ترجمانی میں کام آئی۔ مولانا ابوالکلام کے لئے ان کا گھر، اپنا گھر تھا۔ شیخ نے ہی سب سے پہلے "ترجمان القرآن" کی یہ غلطی پکڑی کہ مولانا اپنی تفسیر میں "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کا باب مطلق حذف کر گئے۔ مگر قلم کا جادو ایسا ہے کہ آدمی سب کچھ پڑھ جاتا ہے اور اس کو محسوس نہیں ہوتا[۱]

آپ نے بعض کتابوں مثلاً علل الحدیث لابن ابی حاتم المسوی امام ولی اللہ دہلوی کی اشاعت کی۔ مدرسہ الحدیث مکہ معظمہ کے قیام و ترقی میں بھی کوشش کی اور حجاز مقدس کے دوسرے مدارس کی ترقی و اصلاح کے لئے سعی کرتے رہے، ان کو تجارتی کاموں سے فرصت ملتی تو کتب بینی کرتے تصنیف و تالیف میں بھی دلچسپی لی اور حسب ذیل کتب تصنیف کیں:

مجموعہ رسائل حج اردو، اس میں اسرار حج، حج نبوی، ادعیہ حج شامل ہیں، البلد الامین اردو

[۱] (مضمون مولوی عبدالملک اخبار "صدق جدید" لکھنؤ، مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۵ء)

(تاریخ مکہ معظمہ)، تسہیل درایہ الموطا کا مقدمہ، المصطفیٰ کا ترجمہ، النصحۃ الدہلویہ شاہ ولی اللہ کے حالات عربی میں۔

۱۹۵۳ء میں دہلی، لکھنؤ وغیرہ مقامات کا سفر کیا، وہاں کے علماء اور اہل قلم حضرات سے ملاقات کی۔ کتب خانے دیکھے اور ڈیڑھ سال کے بعد مکہ معظمہ واپس پہنچے۔

ان کی شادی ۱۳۳۲ھ میں دختر عبداللہ صاحب سے ہوئی۔ بارہ تیرہ سے زیادہ بچے ہوئے، لیکن محمود صاحب کے علاوہ کوئی زندہ نہیں رہا۔

ان کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا، اچھا خاصہ علمی اور نادر کتابوں کا کتب خانہ بن گیا تھا، جس میں اردو، فارسی اور عربی کی قلمی و مطبوعہ کتابیں ہیں۔ یہ کتب خانہ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے محمود صاحب کی تحویل میں آیا۔ حضرت العلامہ مولانا محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ اور مولوی محمد شمیم نائب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے اس کتب خانے کو دیکھا تھا، یہ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اس کتب خانے کا ذکر حضرت العلامہ مولانا مولوی سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نے اپنے ایک مضمون "حجاز کے کتب خانہ" میں کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:[1]

"تیسرا کتب خانہ "بیت دہلوی" کی ملکیت ہے اور جس کو ہمارے دوست مولانا عبدالوہاب صاحب نے اپنے شوق سے جمع کیا، یہ علم کے شائق اور نوادر کتب کے عاشق ہیں اور خود بھی علم و آگاہی رکھتے ہیں اور مجھے مسرت ہے کہ میرے اور موصوف کے درمیان پہلے ہی سے تعلقات غائبانہ خط و کتابت سے قائم تھے اب یہ شنیدہ دیدہ ہو کر اور بھی زیادہ مستحکم ہو گئے۔ یہ کتب خانہ ابھی اپنے نوجوان اور فاضل مالک کے زیر سایہ نشو و نما پا رہا ہے، اس کتب خانہ میں متعدد نادر کتابیں ہیں، ازاں جملہ امام حمیدی کی الجمع بین الصحیحین کی دوسری جلد ہے۔ میری نگاہ میں شیخ نصیف کے کتب خانہ میں اس کی پہلی جلد اور اس میں دوسری جلد ایک ہی نسخہ کی دو متفرق جلدیں ہیں۔"

[1] مقالات سلیمان جلد دوم ص ۳۴۹

مولانا عبید اللہ سندھی نے بھی اپنے حالات زندگی میں اس کتب خانے سے علمی مدد لینے کا اعتراف کیا ہے :

"مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی خاندان نے علمی امداد دی، سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی حاجی علیجان والے، دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی مرحوم، تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔"

مولوی عبدالوہاب صاحب نے ڈیڑھ سال بیمار رہنے کے بعد ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ کو مکہ معظمہ میں انتقال کیا اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔

محمود صاحب ۱۳۳۵ھ کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ الفلاح میں دینی تعلیم پائی اور انگریزی کی بھی تحصیل کی، تعلیم پانے کے بعد تجارتی لائن اختیار کی۔ اس کے بعد رابطہ عالم اسلامی کے قیام کے بعد مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ محمود صاحب کی شادی مولوی عبدالباری صاحب کی صاحبزادی سے ۱۳۵۲ھ میں ہوئی، جن سے ایک فرزند فرید اور تین لڑکیاں ہوئیں۔

یہ خاندان ہندوستان و پاکستان میں حاجی علیجان والوں کے نام سے مشہور ہے، اس خاندان کے اکثر افراد میں علم اور تمول پایا جاتا ہے لیکن تمول نے شہرت پائی اور علم و فضل دب کر رہ گیا۔

یہ خاندان مسلک وعقیدے کے اعتبار سے اہل حدیث ہے اور دہلی میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، حضرات احناف کے ساتھ جو مقدمے بازی دہلی کے اہل حدیث حضرات کی ہوئی، ان میں یہ خاندان پیش پیش رہا اور ہائی کورٹ میں جس قدر اپیلیں ہوئیں، ان کی کوششوں کا دخل رہا۔ اس کے علاوہ اسلامی کاموں اور معاملات میں بھی یہ خاندان دلچسپی لیتا ہے۔

اس خاندان میں مولوی عبدالوہاب صاحب شوق ترقی پسند اہل حدیث تھے، حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مداح اور معترف تھے، ان کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ شاہ ابو شرف مجددی کو انھوں نے اپنا کلام دکھایا۔ ان کے کلام میں اثر ہے، زبان میں سلاست اور روانی ہے ؎

جلوہ ہر شے میں ہے خدا تیرا ذرہ ذرہ ہے آئینہ تیرا
تو ہے نزدیک رگِ جان سے پھر بھی ملتا نہیں پتہ تیرا

میرے پروردگار حشر کے دن　　　مجھ کو ہے صرف آسرا تیرا
شوقؔ دنیا تو قید خانہ ہے
دل یہاں کیسے لگ گیا تیرا

کام مجھ سے ہی یار کا نکلا　　　مدعی سے نہ مدعا نکلا
منکشف حال جب ہوا دل کا　　　یہ تو عالم ہی اک نیا نکلا
کھیل سمجھے ہوئے تھے عشق کو ہم　　　یہ حقیقت سے بھی سوا نکلا
مجھ کو بیکار کر دیا دل نے　　　آدمی یہ تو کام کا نکلا
پھر سوا تیرے اور تھا ہی کیا
دل سے جب میرے ماسوا نکلا[1]

---

[1] جناب شوقؔ کا کلام اگر پڑھنا ہے تو "حجاز مقدس کے اردو شاعر" میں ملاحظہ فرمائیں۔

شاہ محمد عمر اخوندجی دہلوی

مولانا حافظ شاہ محمد عمر صاحب بن مولانا فرید الدین شہید فرنگ ۱۹ر شعبان ۱۲۷۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگ اخوند برہان شاہ عالم کے زمانے میں غلام قادر کے ہمراہ دہلی آئے۔ اتفاق سے شاہ عبدالقادر صاحب سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ آئے تھے غلام قادر کے ساتھ دہلی کو لوٹنے کے لئے، لیکن مولانا عبدالقادر صاحب کی ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنا ارادہ بدل لیا اور مولانا کے معتقد ہوگئے اور تعلیم بھی حاصل کی، چنانچہ اخوند برہان صاحب فرمایا کرتے تھے ہم آئے تھے دہلی کو لوٹنے، اور شاہ کی نظر نے ہم کو لوٹ لیا۔ اخوند برہان صاحب خانم کے بازار میں کھیوہ صاحب کی مسجد میں تشریف فرما ہوئے، علیل ہوئے تو ان کے علاج کے لئے دہلی کے مشہور طبیب حکیم الٰہی بخش صاحب آئے، مسجد میں بہت بے آرام تھے، اس لئے حکیم صاحب ان کو اپنے گھر فراشخانہ میں لے گئے[1] وہیں یہ فوت ہوئے اور مہندیوں میں شاہ ولی اللہ صاحب کے احاطے میں دفن ہوئے۔[2]

شاہ محمد عمر صاحب کے والد ماجد مولانا فرید الدین صاحب دہلی کے شاہی واعظ تھے، آپ کو بہادر شاہ ظفر نے جامع مسجد دہلی میں وعظ کہنے کے لئے مامور کیا تھا۔ آپ نے دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا۔ فتویٰ جہاد پر علماء کے ساتھ انھوں نے بھی دستخط کئے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد، انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر شہید ہوئے۔ آپ صاحب تصنیف تھے، آپ کی مشہور کتاب "سیف المسلول علی من انکر اثر قدم الرسول" ہے۔

حافظ محمد عمر صاحب کے نانا شاہ عبدالعزیز بن حکیم مولوی الٰہی بخش ابن حافظ محمد جمیل تھے۔[3] ان کا لقب شاہ مقبول احمد تھا، آپ نے ۹ سال کی عمر میں اخوند برہان سے قرآن مجید حفظ کیا مولانا

[1] ریاض الانوار [2] واقعات دار الحکومت دہلی دوم ص ۵۹۲ [3] کلیات جدولیہ فی احوال اولیاء اللہ

شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھنے کے بعد شاہ عبدالعزیز اور مولانا اسحاق سے کتب حدیث پڑھیں اور کتب تصوف اکثر ارباب باطن سے اخذ کیں اور اکثر ارواحِ بزرگان سے فیض اولیسہ حاصل کیا، بڑی سخت ریاضتیں کیں، اور خرقہ خلافت قادریہ سید شاہ محمد غوث قادری سے حاصل کیا، صاحب زہد و تقویٰ اور جامع علوم شریعت و طریقت تھے، آپ ۱۰ر جون ۱۲۹۶ھ میں فوت ہوئے، آستانہ خواجہ باقی باللہ میں جانب شمال و مشرق ایک چھوٹی سی چار دیواری میں مدفون ہیں، ان کی تاریخ وفات یہ ہے:[1]

شیخ کامل عاشق حق حضرت عبدالعزیز ۔۔۔ چوں بصدر خلد با صد راحت و آرام خفت

سال و ماہ و روز و تاریخ وفاتش چرخ پیر ۔۔۔ عشرۂ ماہ محرم بود دوشنبہ بود گفت

آپ کی مشہور کتابیں "محمد قا الصحائف" اور "ریاض الانوار" ہے۔ شاہ حافظ محمد عمر صاحب نے بارہ سال کی عمر میں ۱۲۸۳ھ کو قرآن مجید حفظ کیا، اسی سال محراب سنائی، اس کے بعد دہلی کے مشہور و فاضل علماء سے علوم دینی کی تحصیل کی۔ اسی اثناء میں ان کو جناب اخوند عبدالعزیز صاحب نے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا، جملہ اشغال اور اوراد کی تعلیم دینے کے بعد جمادی الاول ۱۲۹۱ھ کو خرقہ خلافت عطا فرما کر تولیت نامہ جانشین مرحمت فرمایا اور سراج الحق کے لقب سے نواز کر اپنا جانشین مقرر کیا۔ ہر سال دسویں محرم کی شام اور گیارہویں کے روز اپنے مرشد کا عرس کرتے تھے نفیس بریانی پکاتے تھے، صدہا آدمی کھاتے اور لے بھی جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر پانچویں، دسویں، گیارہویں، بارہویں، سترہویں، اکیسویں اور ستائیسویں کو ختم کرتے اور شیرینی تقسیم فرماتے تھے۔ پہلے سال بھر میں تین وعظ کہا کرتے تھے، اول عشرہ محرم میں اپنی مسجد میں، دوسرا ۱۲ر ربیع الاول کو قدم شریف میں اور تیسرا ۲۷ رجب کو اپنی مسجد میں۔ مولوی محمد یعقوب صاحب کے انتقال کے بعد لوگوں کے اصرار پر ہر جمعے کو، بعد نماز جمعہ اپنی مسجد میں وعظ کہنے لگے تھے، جس میں ہندو مسلمان امیر و غریب شرکت کرتے تھے اور خط اٹھاتے تھے[2]

قدم شریف میں ربیع الاول کے شروع بارہ دنوں میں ہر روز بلاناغہ دو وقت صبح و شام مجلس، وعظ اور ختم ایصال ثواب بہ روح سرور کائنات فرماتے تھے اور بارہویں تاریخ کو خاص

[1] واقعات دارالحکومت دوئم ص ۵۲۶

اہتمام کرتے تھے، ختم قرآن اور فاتحہ کا انتظام نہایت وسیع اور پاکیزہ طور پر عمل میں آتا تھا۔ دہلی کے بہترین نعت خواں اور حافظ اپنی مناجات خوانی اور قرأۃ کا کمال دکھاتے تھے۔

آپ ہر جمعرات کو بلا ناغہ خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر ایصال ثواب فرماتے تھے۔ اور فاتحہ کے بعد حمد و ثنا، نعت و مناقبت خوانی کرنے کے بعد شیرینی تقسیم فرماتے تھے، خانقاہ کی مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا، اور ایک درجہ سے دو درجے کی مسجد بنوائی۔

باوجود نشست و برخاست میں سخت تکلیف ہونے کے شاہ صاحب اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں ہر سال شرکت کرتے تھے۔

شاہ محمد عمر صاحب کا قد چھوٹا تھا اور جسم بھاری ہونے کی وجہ سے تناسب اعضا میں فرق آگیا تھا، پھر بھی چہرہ بڑا نورانی تھا اور بات چیت بڑی محبت سے کرتے تھے۔ شہر کے ہندو مسلمان ان کے اخلاق و روحانیت کے گرویدہ تھے۔ آپ قادری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کا مشرب نہایت وسیع تھا۔

دہلی کی درگاہ قدم شریف کی مسجد و حریم اور مجلس خانہ بوسیدہ ہو گئے تھے اور خاص طور پر مجلس خانہ کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، جناب حاذق الملک حکیم محمد عبد المجید خاں صاحب اور مولانا قاری حافظ محمد عمر صاحب نے دو ڈھائی ہزار روپے کے صرفے سے اس کی مرمت کرائی، جس کا حسب ذیل اشعار کا کتبہ داہنی درگاہ کے دروازے پر لگا ہے ؎

بسال بست و نہم بعد یک ہزار و سہ صد — ز ہجرت شہ کونین ہادی بر حق

بدرگہ قدم پاک آں شہ لولاک — کہ ہست مرجع خلق و رشک ہر جوسق

حریم و مسجد و مجلس سرائے را ترمیم — نمود شاہ محمد عمر سراج الحق

دو شنبہ بستم ذیقعدہ بود کانجا مید — بنائے کار بتوفیق قادر مطلق

بروح پاک مرایں صاحب نشان قدم

درود باد صباح مساز رب فلق

شاہ محمد عمر صاحب اندور میں بھی کچھ عرصے رہے۔ بڑے خلیق متواضع اور منکسر المزاج اور بافیض بزرگ تھے ——— زہد و ورع میں مشہور تھے۔ ——— دہلی کی مقتدر ہستی تھیں۔

دہلی میں شاہ حافظ محمد عمر صاحب کا خاندان قدیم زمانے سے ہے۔ فراشخانے میں اخوندجی کی گلی اسی خاندان کے نام سے مشہور رہے۔

شاہ حافظ محمد عمر صاحب ۱۳۳۶ھ میں دہلی میں فوت ہوئے ــــــ آپ صاحب تصنیف بھی تھے ــــــ ان کی ایک کتاب "الاستشفاع والتوسل باثار الصالحین وسید الرسل" کافی مشہور ہوئی۔

جناب حافظ محمد عمر صاحب

حافظ صاحب کے آباؤ اجداد قدیمی پلول کے باشندے تھے، انکے والد ماجد اللہ بخش صاحب ایک خدا ترس بزرگ تھے، پلول کے مڈل اسکول کے سامنے مسجد کی ایک چھوٹی سی دکان میں بساط کا کام کرتے تھے اور ایک مشین بھی رکھی ہوئی تھی اس سے کپڑے سیکر دیتے تھے۔ ان کے چار صاحبزادے محمد ابراہیم، محمد عمر، محمد یاسین وغیرہ تھے، محمد ابراہیم بساط کا کام کرتے تھے۔ اور اسی دکانداری میں انھوں نے اپنی زندگی بتائی۔ محمد یاسین صاحب پنساری کی دکان چلاتے تھے اور سب سے چھوٹے بھائی پرچونے کی تجارت کرتے تھے۔ حافظ صاحب نے پلول کے مڈل اسکول میں آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی، اس اسکول میں فارسی اور انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، حافظ صاحب کو فارسی میں کافی عبور حاصل تھا۔ فارسی کے کافی اشعار ان کو یاد تھے۔

حافظ صاحب نے سب سے پہلے جوتے کا کام شروع کیا، اس کے بعد بساط کا کاروبار دہلی کے ایک حافظ لوہارے کے بھائی کی شرکت میں کیا۔ حافظ صاحب کو دکانداری میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ دکان چل نکلی اور پلول کے بساطی کے دکان داروں کو اس دکان نے پیچھے بٹھادیا تھا۔ تو اس دکان کے مالک کو جو ایک ہندو تھا، لالچ آیا، اس نے دکان کو خالی کرانے کی دھمکی دی، اس کا اصل مقصد دکان خالی کرانا نہیں تھا بلکہ وہ دکان میں اپنی شراکت چاہتا تھا۔ حافظ صاحب جھگڑے اور مقدمہ بازی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بالآخر انھوں نے بادلِ نخواستہ پہلی شراکت ختم کی اور مالک دکان کے ساتھ شرکت کی۔ حافظ صاحب کے والد ماجد نے پلول کے مشہور رئیس قاضی صاحبان کے خاندان کی زمین پر ایک چھوٹا مکان بنا رکھا تھا، اس میں یہ خود اور ان کی اولاد رہتی تھی، جب کاروبار نے ترقی کی تو حافظ صاحب نے اس مکان کی رہائش کو ترک کر دیا اور محلہ قاضی واڑہ میں حافظ محمد یاسین علی صاحب رئیس پلول کے مکانات کے قریب ایک بہت بڑا مکان خریدا، اور اس میں سکونت اختیار کی

۱۹۲۰ء میں جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو حافظ محمد عمر صاحب، سید محمد یعقوب جعفری

اور جناب مامون الرشید صاحب پسر حافظ محمد یاسین علی صاحب کے ساتھ خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور انگریزوں کے خلاف تقریریں کرنی شروع کر دیں۔ پلول خلافت کمیٹی کے صدر سید محمد یعقوب جمعدار، جنرل سکریٹری حافظ محمد عمر صاحب اور سرگرم و قابل اعتماد ساتھی مامون الرشید صاحب تھے۔

سید محمد یعقوب صاحب فوج میں جمعدار تھے، ترک موالات کی تحریک چلی تو فوجی ملازمت چھوڑ کر خلافت کمیٹی میں شامل ہو گئے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ دو مرتبہ جیل بھی گئے۔ انگریز چاہتا تھا کہ مسلمان خلافت کی تحریک میں حصہ نہ لیں، اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا، چنانچہ جمعدار یعقوب صاحب کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے ان کی ۲۵ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ ان کو بار بار فوجی افسران کی طرف سے اطلاع آتی تھی کہ تمہارا روپیہ جمع ہو رہا ہے وہ وصول کر لو لیکن انھوں نے ہر بار لینے سے انکار کیا حالانکہ ان کی مالی حالت انتہائی خستہ تھی، آٹھ بچے اور دو میاں بیوی، دس افراد کے گذارے کے لئے کوئی سبیل نہیں تھی، جب آخری بار ان کو فوجی افسران نے اطلاع دی کہ تمہارا پندرہ سو روپے جمع ہو گیا ہے اس کو وصول کر لو۔ مامون الرشید صاحب نے جب یہ چٹھی دیکھی تو انھوں نے اور حافظ محمد عمر صاحب نے ان پر بیحد زور ڈالا کہ یہ پیسہ ہمارے ملک کا ہے، اس کو مت چھوڑو، دشمن کیوں کھائے، اگر تم نہیں لوگے تو یہ پیسہ مسلمانوں کے مقابلے میں خرچ ہوگا، بہت اصرار کرنے کے بعد انھوں نے وہ روپیہ منگایا، اور اس روپے سے اپنے چھوٹے بھائی کو پرچونے کی دکان کرا دی تھی، اس سے بھی اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ دونوں گھروں کا گذارہ ہو سکے، خوددار آدمی تھے۔ ہاتھ پھیلانا ان کی خو میں داخل نہیں تھا، معاشی پریشانی نے ان کو نڈھال کر دیا تھا، صحت نے جواب دے دیا تھا، حالانکہ بہت اچھے تن و توش کے آدمی تھے، پلول کے مشہور پہلوان تھے، پلول میں ان کی کوئی جوڑ نہیں تھی۔ آخری دنوں میں ان کے ایک زہریلا زخم ہو گیا تھا، جس نے ان کو تین دن کے اندر موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔ آخر دم تک قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے، اور سیاسی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔

مامون الرشید صاحب نے بھی ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات میں حصہ لیا، اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے جناب خواجہ غلام السیدین، شفیق الرحمن قدوائی، سید محمد جعفری صاحب ایڈیٹر "اخبار ملت دہلی" اور

سید محمد ٹونکی وغیرہ کے ساتھ علیحدگی اختیار کی، اور جامعہ ملیہ علی گڈھ میں جوڈگی والی کوٹھی میں قائم ہوا تھا داخلہ لیا۔ اس جامعہ کے پہلے پرنسپل رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی صاحب مقرر ہوئے، اس کے بعد خواجہ عبدالمجید صاحب پرنسپل بنے، حافظ فیاض الدین صاحب خزانچی تھے، مولانا اسلم جیراجپوری صاحب تاریخ اور عبدالحیٔ صاحب دینیات پڑھاتے تھے۔

مولانا محمد علی صاحب نے جامعہ ملیہ علی گڈھ میں ایک پروپگنڈہ کلاس قائم کی تھی جس کے طلباء ملک کے مختلف حصوں میں انگریزوں کے خلاف فضا پیدا کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے، چنانچہ جس پارٹی کو یو۔پی میں تقریریں کرنے کے لئے مقرر کیا تھا، اس میں تین اشخاص ڈاکٹر محمد اشرف (کمیونسٹ)، سید محمد ٹونکی اور ماموں الرشید صدیقی تھے۔ اس پارٹی نے دہرہ دون، مسوری، بنارس، مرزا پور، غازی آباد، الہ آباد اور کانپور وغیرہ میں تقریریں کیں۔ یہ واقعات ۱۹۲۱ء کے ہیں۔

ماموں الرشید صاحب ان سیاسی کاموں میں اس قدر مگن ہو گئے تھے، کہ ان سے تعلیم بھی چھوٹ گئی تھی، انھوں نے پلول کے ٹدل اسکول سے ٹدل کیا تھا، میٹرک عربک ہائی اسکول اجمیری گیٹ دہلی میں پاس کیا، اس کے بعد مسلم یونی ورسٹی میں داخل ہوئے، اور بعد میں جامعہ ملیہ قرول باغ میں آٹھ مہینے معلمی کی۔ ان کے والد حافظ محمد یامین صاحب ۲۹ سال تک پلول کی میونسپل کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے، اور بارہ سال تک آنریری سب رجسٹرار کے فرائض انجام دئے۔ ماموں الرشید صاحب، سید محمد یعقوب جمعدار اور حافظ محمد عمر صاحب پلول کی تحریک آزادی کے بنیادی پتھر تھے، انھوں نے اس وقت انگریز کی مخالفت کی جس وقت اس کے خلاف کوئی آواز تک اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

حافظ محمد عمر صاحب بہترین مقرر تھے۔ مولود شریف اور شہادت کا بیان کرانے کے لئے مدعو کئے جاتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ محرم کے عشرہ کے روز اپنے گھر پر شاندار دعوت کرتے تھے اور شہادت کا بیان بھی کرتے تھے۔ شیعہ حضرات بھی اپنی مجلسوں میں شہادت کا بیان کرانے کے لئے حافظ صاحب کو بلاتے تھے۔ حافظ صاحب کو کتب بینی کا بیحد شوق تھا۔ دکان میں فالتو وقت میں کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ حافظ صاحب پلول میونسپل بورڈ کے ممبر بھی منتخب ہوئے تھے اور خلافت کمیٹی کے بعد کانگریس میں شامل ہوئے، اس کے بعد مسلم لیگ میں شمولیت کی۔ پلول کے حکام ان کو بڑی

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پلول میں جو بھی لیڈر خواہ وہ خلافت کا ہوتا، یا کانگریس اور مسلم لیگ کا، حافظ صاحب کے ہاں قیام کرتا تھا۔

حافظ صاحب نے پہلی شادی اپنے عزیزداں میں کی تھی، ان سے جب کوئی اولاد نہیں ہوئی تو دوسری شادی دہلی کی مسماۃ شفیق النسا، بنت شیخ عبدالغفور صاحب سے ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے کی، جب ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہوا، تو آپ نے پلول چھوڑ کر محلہ چوڑی والان گلی حکیم جی والی میں (جہاں آپ کے سسرال کے لوگ رہتے تھے) سکونت اختیار کی، بعد میں آپ نے اسی محلے کی گلی تخت والی میں سکونت تبدیل کی اور جامع مسجد پر دکان لے کر جوتے کا کاروبار شروع کیا۔ دہلی کے سیاسی اور اہل علم حضرات آپ سے پہلے سے واقف تھے، دہلی میں آنے کے بعد اور تعلقات قائم ہو گئے۔ مجھ سے بھی حافظ صاحب سے ملاقات ہوئی اور تعلقات بڑھتے بڑھتے ایسے بڑھے کہ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگے، اور سیاسی کاموں میں کبھی کبھی میرے ساتھ شمولیت کر لیتے تھے، تقریر بھی میرے ساتھ جامع مسجد کے اسٹیج سے دہلی میں شروع کی۔

۱۹۴۸ء میں جامع مسجد کے شمالی دروازے کے بائیں طرف کی دکانوں میں آگ لگی جس میں حافظ صاحب کی بھی دکان تھی۔ یہ آگ معمولی نہیں تھی بلکہ بڑی زبردست آگ تھی، تمام مال جل کر راکھ ہو گیا تھا اور ایک اچھی رقم دکان میں رکھی ہوئی تھی وہ بھی نذر آتش ہوئی، ۱۹۴۷ء کو ایک سال نہیں گذرا تھا کہ حافظ صاحب کو یہ دوسری زبردست پریشانی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کو بھی انھوں نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا، ایمان داری، دیانت داری کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، جس کا دینا تھا اس کی دیر سویر ایک ایک پائی ادا کی۔ کسی کا کچھ باقی نہیں رکھا۔

آگ لگنے کے کچھ عرصے کے بعد روئی کا کاروبار ماسٹر جمیل صاحب کی شراکت میں کیا۔ اس کے بعد حافظ صاحب کو ایک اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ؎

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

آزادی ملنے کے بعد ایسا بھی وقت آیا کہ دہلی میں کیا ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا کوئی میلہ یا تہوار امن و امان سے نہیں گذرتا، ۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو کمرہ بنگش دہلی پر کسی شرپسندی نے تعزیئے پر گوبر پھینکا تھا، شری کو گرفتار کرنے کے بجائے سالار عبدالستار احراری کو گرفتار کیا، یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء میں بادہ ٹوٹی

پر تعزیوں کی بے حرمتی ہوئی، تو جامع مسجد پر بطور احتجاج تعزیے نہیں اٹھائے۔ اسی درمیان میں ایک مسلمان سوشلسٹ لیڈر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پہنچے، اور وہاں لوگوں سے کہا میں نے بارہ ٹوٹی پر ایس پی جگن ناتھ کو معطل کرادیا ہے اور تعزیوں کی بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف جلد کارروائی کی جائے گی، اس لئے تم لوگوں کو چاہئے، تعزیے اٹھالو۔ اتفاقیہ طور پر میں بھی وہاں پہنچ گیا، جب ان کی یہ گفتگو سنی تو میں نے ان سے کہا، اگر یہ بات صحیح ہے تو سامنے سیڑھیوں کے نیچے ڈپٹی کمشنر صاحب کھڑے ہیں، ان سے اس کی تصدیق کرادیجئے، اگر تم تصدیق کرادو گے تو ان لوگوں کو یقیناً تعزیے اٹھالینے چاہئیں، چنانچہ یہ حضرت کچھ جواب دئے بغیر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے اور حافظ عزیز حسن بقائی صاحب کے دفتر میں چلے گئے، وہاں سے انھوں نے حکام کو بھڑکانا شروع کردیا، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد پولیس نے لوگوں پر لاٹھی چارج شروع کردیا، ایک شخص سخت مجروح ہوا، جس سے کافی اشتعال پھیلا —— دوسری اکتوبر کو ۴۲ اور ۵ اکتوبر کو ۱۲۱ گرفتاریاں ہوئیں، جس میں ۴۶ کے قریب جامع مسجد کے دکاندار تھے، مجھ امداد صابری اور حافظ محمد عمر صاحب کا بھی ان گرفتار شدگان میں شمار تھا۔ گرفتاریاں انتقامی جذبے کے تحت کی گئی تھیں، شرافت اور انسانیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان دکانداروں میں تین بزرگ تو ایسے تھے، جن کو پولیس کو گرفتار کرنا نہیں چاہئے تھا، اگر وہ شرافت کو کام میں لاتی۔

ایک بزرگ عبدالحکیم عرف ببوا، جامع مسجد کے چوک پر ٹٹی کے برتنوں کی دکان کرتے تھے، ان کی عمر پچھتر سال کی تھی، جسم کا نصف حصہ فالج زدہ تھا، ہاتھ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ اسی طرح محمد صدیق عرف بھنڈی ۹۵ سالہ جو چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ چھمی عرف چھوٹے کباب فروش کی بھی یہی حالت تھی، ان کی عمر بھی ۸۵ سال کی تھی۔ یہ لوگ گرفتار شدگان میں تھے۔

۱۶۳ آدمیوں کی ضمانت چھٹے روز ہوئی۔ عدالت میں ڈیڑھ دو مہینے چکر لگانے کے بعد حکومت نے یہ مقدمات واپس لئے۔

حافظ صاحب کمزور طبع آدمی نہیں تھے، اس گرفتاری کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہمارے جلسوں میں ان کی تقریریں بدستور جاری رہیں، چنانچہ ہم ان کا نام اپنے جلسوں کے مقررین میں دے دیا کرتے تھے اور وہ آکر تقریر بھی کردیا کرتے تھے، لیکن یہ حقیقت تھی کہ ان کے حالات ایسے نہیں تھے

کہ وہ گرفتاریاں دیں، عدالتوں کے چکر لگائیں اور سزائیں بھگتیں، لیکن ہمارا ایک پوسٹر ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو شائع ہوا، جس کے ذریعے سنی مجلس اوقاف کی بدعنوانیوں پر روشنی ڈالنے اور فیروز آباد کے فرقہ وارانہ فساد کی مذمت کرنے کے لئے ایک جلسہ ۲۴ ستمبر کو منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا تھا مقررین میں امداد صابری، ماسٹر نورالدین، حافظ محمد عمر صاحب اور توفیق فاروقی کے نام تھے۔ توفیق فاروقی صاحب جلسے کے لاؤڈ اسپیکر کی اجازت لینے کے لئے جامع مسجد پولیس چوکی پر پہنچے، انچارج چوکی ہر پھول سنگھ نے اجازت دینے سے انکار کیا، زیادہ اصرار کیا تو اس نے گرفتاری کی دھمکی دی۔ میں بھی پولیس چوکی پر پہنچ گیا تھا، انچارج کا ہم نے جب یہ رویہ دیکھا تو ہم گرفتاری کے لیے تیار ہو گئے، چنانچہ انچارج نے ماسٹر نورالدین صاحب اور حافظ محمد عمر صاحب کو چوکی پر بلوا کے ہم چاروں کو گرفتار کر لیا، اور دو مقدمے ایک تعزیرات ہند کی دفعات $\frac{107}{151}$ کے تحت، دوسرا پنجاب سیکورٹی ایکٹ کی دفعات 9/7 کے تحت قائم کئے، ۲۵، ۲۵ ہزار روپے کی دو دو ضمانتیں چاروں سے طلب کیں، ضمانتوں کے منظور کرنے میں بے حد پریشان کیا، نور دز لگا دئے، اور استغاثہ میں ہم پر وہ الزامات لگائے جس کا نہ سر تھا اور نہ پیر تھا۔ وہ گوش گذار کیجئے:

"۲۳ ستمبر کو اردو بازار کے سنگھاڑے کے جنوبی دروازے پر جہاں مذکورہ پوسٹر لگا ہوا تھا، یہ چاروں آدمی بیک وقت اور بیک آواز یہ کہہ رہے تھے کہ فیروز آباد کے مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے دسہرے پر جو ظلم کئے ہیں اور بہت کشت و خون کیا ہے اور بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار کیا ہے اور گورنمنٹ بھی ہندوؤں کا ساتھ دینا چاہتی ہے اور مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتی ہے، اس لئے کل پبلک جلسہ دسہرے کے ایام میں کر کے انتقامی صورت حالات پیدا کریں گے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف انتقام لینے پر مجبور کریں گے مسمیان ناظم عسکری (ملازم سنی مجلس اوقاف) بابو لال اور رام کشن موجود تھے، جنھوں نے پبلک میں منافرت پیدا کرنے سے منع کیا، اور ہر چہار نے یکے بعد دیگرے کہا انتقامی جلسہ ضرور کیا جائے گا، اور یہاں کے مسلمانوں

کو فیروز آباد کے مسلمانوں پر کئے گئے ظلموں کا بدلہ لینے پر مجبور کیا جائے گا،
لہٰذا میں سب انسپکٹر نے بموجودگی گواہان کہا کہ وہ ایسا جلسہ اور تقریر نہ
کریں، کیونکہ اس سے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور فریقین
میں منافرت پیدا ہونے کا احتمال ہے، اشتعال کرنے سے باز نہیں آئے۔
اور کہا اس قسم کے اشتہار کافی تعداد میں چھپوائے ہیں اور بہت جگہ
چسپاں کئے ہیں، ان الفاظ سے فوری نقص امن کا اندیشہ کا احتمال تھا
جس کی وجہ سے ہر چہار ملزمان کو گرفتار کر لیا۔"

یہ دونوں مقدمے پولیس قطعاً چلانا نہیں چاہتی تھی، چونکہ راقم الحروف امداد صابری عرصے سے سرکاری سنی مجلس اوقاف کی بداعمالیوں کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہا تھا اور ۱۶ر ستمبر ۱۹۶۰ء کو ایک عظیم الشان مظاہرہ سنی مجلس اوقاف کے دفتر دریا گنج میں ہو چکا تھا، اس لئے سنی مجلس اوقاف کے ذمے دار لوگوں نے افسران پولیس پر زور ڈالا، چنانچہ اس مقدمے کے اہم گواہ ناظم عسکری صاحب تھے۔ یہ دونوں مقدمے ایک سال دس مہینے چلے، چونکہ دونوں مقدمے بے بنیاد اور جھوٹے تھے، مقدموں میں قطعاً جان نہیں تھی، استغاثہ کی کہانی مہمل تھی۔ دونوں گواہ بابو لال اور رام کشن کی شہادتیں ایسی ہوئیں جو کسی بھی صورت سے اعتبار کے قابل نہ تھیں، چنانچہ ۱۶ر جولائی ۱۹۶۶ء کو عدالت نے دونوں مقدمات کا فیصلہ سناتے ہوئے چاروں اشخاص کو بری کر دیا۔ یہ دونوں مقدمے جناب ایم ایم اگروال صاحب مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں تھے، ان مقدمات کی پیروی ہماری طرف سے جناب کدار ناتھ چٹکارا ایڈوکیٹ فرما رہے تھے۔

۱۹۵۵ء میں کرنل ناصر دہلی آئے تھے، جن کے خلاف مولانا سمیع اللہ صاحب قاسمی نے جامع مسجد دہلی میں مظاہرہ کیا تھا، حکومت اس مظاہرے کی وجہ سے محتاط ہو گئی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں کرنل ناصر صاحب آنے والے تھے، ان کے خلاف غالباً دہلی میں کچھ آواز اٹھی، ان آواز اٹھانے والوں میں حافظ صاحب کو بھی سمجھا گیا۔ اکتوبر میں مولانا سمیع اللہ صاحب، مولانا ابواللیث صاحب اور محمد مسلم صاحب ایڈیٹر اخبار "دعوت" دہلی کے ساتھ حافظ محمد عمر صاحب بھی نظر بند کر کے جیل بھیج دئے گئے۔ کرنل ناصر کے دہلی سے جانے کے بعد ان لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔ یہ حضرات جیل میں دس روز رہے۔ اتفاق کی بات ہے

اس مرتبہ میں بھی ایک مزدوروں کی تحریک کے سلسلے میں تہاڑ جیل میں تھا، اور ان حضرات سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ گویا اس مرتبہ بھی حافظ صاحب نے میرا جیل کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

حافظ صاحب کو شہادت کے بیان کرنے کا بیحد شوق تھا، اور ان کو شہادت کے بیان پر کافی عبور حاصل تھا، انھوں نے دہلی میں بیس بائیس سال کے عرصے میں شاید تین یا چار مرتبہ شہادت کا بیان کیا ہوگا۔ میں ایک مرتبہ ان کے ہمراہ حوض سوئی والان کی مسجد میں گیا تھا، جہاں انھوں نے شہادت کا بیان فرمایا تھا۔ حافظ صاحب کی گفتگو بھی بڑی دل چسپ ہوتی تھی جہاں وہ بیٹھ جاتے تھے سننے والے اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے، اگر وہ اٹھ جاتے تو لوگ ان کو جانے نہیں دیتے تھے، بات بات میں لطیفے اور موقع و محل پر دل چسپ واقعات سنانے کا ملکہ ان کو حاصل تھا۔ دہلی میں ان کے ہر طبقہ خیال کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ اخبار پڑھنے کا بیحد شوق تھا، ترقی پسند اور آزاد خیال اخبار کو پسند کرتے تھے، جب تک "نئی دنیا" دہلی جاری رہا اس کو پڑھتے رہے، دل میں قومی درد تھا۔ ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ ہنسنے اور ہنسانے والا آدمی عین بقر عید کے روز ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق ۷ فروری ۱۹۷۱ء کو گلی تخت والی محلہ چوڑی والان دہلی میں فوت ہو گیا۔ قبرستان مہندیان میں آرام فرما ہیں۔ تین صاحبزادے محمد مسطبین، محمد مرسلین، محمد مسلم، سات لڑکیاں اور ایک بیوہ چھوڑیں۔

حافظ صاحب کو شعر و شاعری سے بھی تعلق تھا، کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ مجھے انھوں نے ایک نظم جو "سیاسی لوگوں کے کردار" سے متاثر ہو کر لکھی تھی، "آزاد ہندوستان" میں شائع کرنے کے لئے دی، جو ۳ نومبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں چھپی تھی، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

محبت کس کو کہتے ہیں کسے کہتے ہیں غمخواری
ستم کرنا مرا مسلک روا مجھ کو دل آزاری

میں وہ مردِ مسلماں ہوں جو ہر سانچہ میں ڈھل جائے
مجھے ہر بات آتی ہے چہ روباہی چہ عیاری

کسی کو موت آجائے کوئی گھل گھل کے مرجائے
شکم پورا اپنا ہو جائے بذلت ہو یا بخواری

مولوی عنایت اللہ دہلوی

مولوی صاحب دہلی میں ۱۵ر نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد ہندوستان کے مشہور مورخ و ادیب شمس العلماء مولوی منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی تھے۔ آپ نے دہلی، الہ آباد، اور علی گڈھ کے مشہور اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی، اور علی گڈھ کالج سے بی اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد، کالج لائبریرین مقرر ہوئے، کچھ دنوں ریاضی کی پروفیسری کی، ۱۹۰۰ء میں جونپور کی عدالت ججی میں منصرم اور ۱۹۱۵ء میں ریاست گوالیار کے شعبہ فنانس کے انڈر سکریٹری مقرر ہوئے۔

آپ کو اپنے والد بزرگوار اور سرسید مرحوم اور علی گڈھ کالج کے پروفیسروں کی صحبت میں رہ کر ترجمہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، انھوں نے مشہور و معروف انگریزی ادیبوں اور مورخوں کی کتابوں کے آسان و سلیس ترجمے کیے اور اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اپنے دور میں ترجمہ کرنے والوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔

سرسید کی فرمائش پر آپ نے پہلا ترجمہ "پریچنگ آف اسلام" مصنفہ ڈاکٹر آرنلڈ کا "دعوت اسلام" کے نام سے کیا، اس کے بعد آپ کا دوسرا شاہکار "اندلس کا جغرافیہ" ہے۔ اندلس کے متعلق ایسی نادر اور بے نظیر کتاب کسی زبان میں نہیں تھی۔ "پریچنگ آف اسلام" کے ترجمے پر سید مرحوم نے ان کو ایک ہزار روپیہ دیا تھا۔

یہ دونوں کتابیں اس پائے کی تھیں کہ اگر مولوی صاحب اور کوئی کتاب بھی نہ لکھتے یا ترجمہ نہ کرتے تو یہ دونوں کتابیں ہی ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی تھیں۔

ڈوزی کی مشہور عالم تاریخ "الاندلس" کا بھی آپ نے ترجمہ کیا۔ فرانس کے معروف مصنف کیتوادو، انگلینڈ کے مشہور مصنف شکسپیئر کے ناولوں کے ترجمے بھی آپ نے کیے اور تاریخ مغل کی

چار جلدوں اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی سوانح عمری کی ترجمہ کرنے کی عزت بھی آپ کو حاصل ہوئی۔

آپ کی ترجمے کی شہرت اس قدر ہوئی کہ جب حیدر آباد میں دارالترجمہ قائم ہوا، تو سرکار نظام نے ۱۹۲۰ء میں ان کو دارالترجمہ کا ناظم مقرر کیا[1] چودہ سال تک بڑی قابلیت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دے کر ۱۹۳۴ء میں اس سے سبکدوش ہوئے۔

اپنی نظامت کے زمانے میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، وہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے، چنانچہ سید محی الدین قادری زوران کے بارے میں لکھتے ہیں[2]:

"شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی کے فرزند عنایت اللہ دہلوی عرصے تک اس کے ناظم رہے، اور نہایت اعلیٰ پایہ کے مترجم تھے۔ دارالترجمہ کے لئے چار کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اندلس پر ان کی ایک کتاب اور تائیس کا ترجمہ اردو ادب میں اضافے کا باعث ہوا۔"

مولوی صاحب کے ترجمے کی یہ خوبی ہے کہ ادق سے ادق کتاب کا ترجمہ اس قدر سلیس، آسان، عام فہم اور بامحاورہ ہوتا ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیں لیکن کوئی الجھن نہیں ہوتی۔

مولوی عنایت اللہ صاحب خود بھی قابل ولائق شخصیت تھے، اور ان کے والد کے بھی ہندوستان کے علمی و ادبی طبقے سے تعلقات تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کا ہر اہل علم اور مشہور آدمی مولوی صاحب کی عزت کرتا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی سے مولوی منشی ذکاء اللہ مرحوم کے انتہائی قریبی تعلقات ہی نہیں بلکہ گہری دوستی تھی، جس کی بنا پر ان کے صاحبزادے سے مولانا حالی محبت کرتے تھے اور شفقت سے پیش آتے تھے، چنانچہ جب دہلی کالج کے لئے چندہ کرنے کی تجویز ہوئی اور مولانا حالی سے اس سلسلے میں مشورہ لیا گیا تو انھوں نے اپنے صاحبزادے کو لکھا کہ جو تجویز میں لکھ رہا ہوں اس کے بارے میں مولوی عنایت اللہ سے مشورہ کرو۔

تجویز یہ ہے کہ آپ ایک تصویر غازی الدین کے متعلق میاں محمد عنایت اللہ صاحب کی رائے

[1] دکن میں اردو ص ۵۹،   [2] داستان ادب اردو

سے بنوائیے جس میں دہلی کے مسلمانوں کی پست حالت اور غازی الدین فیروز جنگ کے مقبرے کی کیفیت اور خان موصوف جو خاندان نظام کے جد اعلیٰ ہیں، ان کا تعلق حضور میر عثمان علی خاں کے ساتھ ظاہر کر دیا جاوے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عزیزی محمد عنایت اللہ صاحب اس کام کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے، اور تصویر مذکور اپنی نگرانی میں مصور سے تیار کروا سکیں گے۔ اگر ایسی تصویر حسب دلخواہ تیار ہو جاوے اور اس کے اندر ایک ایک دو دو شعر مناسب موقع کے درج کر دئے جائیں۔[۱]

مولوی صاحب کو علم موسیقی سے بھی لگاؤ تھا، آپ نے جونپور کے قیام کے زمانے میں علم موسیقی کے بارے میں تحقیقات کی اور موسیقی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، اور ایک مضمون "فن موسیقی کا بہرا استاد" رسالہ "مخزن" میں طبع کرایا تھا جو بہت پسند کیا گیا اور اس کو موسیقی کے جاننے والوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

آپ کو کتابیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا، اپنی آمدنی کا معقول حصہ کتابوں کی جستجو اور خریداری میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی لائبریری میں نادر کتابیں تھیں۔

آپ نے اخباری دنیا میں بھی قدم رکھا تھا، بقول مولانا حالی ۱۸۹۴ء میں آپ کو "تہذیب الاخلاق" کی ایڈیٹری کے لئے بلایا گیا تھا اور مولانا حالی کے ساتھ بنگلے میں رہتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ آپ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے جس سے انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔

مولوی صاحب نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کے بھی ترجمے کئے:

(۱) یونانی شہنشاہی (۲) پیرک اور ایلتھنز کا دور اقبال (۳) قسطنطین اعظم (۴) چنگیز خاں (۵) جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق (۶) سلامبو (۷) تائیس (۸) ڈوانٹے کا جہنم۔ (۹) ہیملٹ وغیرہ۔

ان کے علاوہ آپ کی نجم السحر، خواب پریشاں، اور ہر دو یاس طبع زاد کتابیں ہیں۔

[۱] مکتوبات حالی دویم ص ۹۰

ہرودیاس ایک رونگٹے کھڑے کردینے والی داستان ہے جس میں سلومی کا حسن، بدی کا بے پناہ حسن تھا، اس کا ناچ رقص گناہ تھا اس کا جذبۂ محبت کوہ آتش فشاں کی طرح تند اور لاوے کی طرح جھلس دینے والا تھا، اس کے سانس میں زہر تھا اور بوسے میں موت۔ وہ یوحناں کے لبوں کو چوسنا چاہتی تھی مگر یہ خدا رسیدہ بزرگ آ ے اور اس کی ماں کو نصیحت کرتا تھا۔ حاکم ربع الطیفس کے حکم سے ایک عظیم الشان دعوت میں ناچی اور اس انعام میں اس نے یوحنا کا سر مانگا، اس خون آلود سر کو طشت میں اٹھا کر سلومی نے اس کے لبوں کو دیوانہ وار چوما۔

نجم السحر میں پانچ ہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی، تو رب عمون کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سر فلک محلوں میں آنکھیں کھولیں، پروان چڑھی جوان ہوئی اور پھر اس کی داستان عشق شروع ہوئی جو حد درجہ المناک ہے۔ ساحرہ آشتی کا جادو، توران کے مظالم، کیفر کی پر اسرار ہستی، شمعون نجومی کی سحر آفرینی۔ غرض اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنف سے نہیں بچا۔ سب پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۳۹ء میں آپ دہرہ دون میں مقیم تھے اور ہمہ تن علمی مشاغل میں منہمک تھے کہ ۳۰ برس کی عمر میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو وہیں فوت ہوئے۔

حکیم غلام نجف خاں

حکیم صاحب کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، شیخ قطب الدین صاحب ان کے اجداد میں تھے، جو حضرت شیخ سلیم چشتی فتحپور سیکری کے پوتے تھے لیکن بعض مؤرخوں نے ان کو شیخ سلیم کا دختر زادہ لکھا ہے، جیسے مؤلف "اقبال نامہ جہانگیری" نے یہ عبارت تحریر کی ہے:

"شیخ قطب الدین فتحپوری دختر زادہ شیخ سلیم فتحپوری کو اعلیحضرت (جہانگیر) نے کوکلتاش قطب الدین کا خطاب عنایت کیا ہے"۔

لیکن "سیر المتاخرین" کا مولف ان کے بارے میں یہ لکھتا ہے:

ملا قطب الدین کوکلتاش جو شیخ چشتی کا پوتا ہے بنگالہ کا صوبیدار کیا"۔ [1]

شیخ قطب الدین کا شمار اکبر کے امراء میں بھی تھا لیکن جہانگیر سے جس قسم کا قریبی تعلق تھا، وہ اکبر سے نہ تھا۔ جہانگیر کو ان کی والدہ نے ایام طفولیت میں پرورش کیا تھا۔ جس کی وجہ سے جہانگیر ان سے اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا اور انتہائی قابل اعتماد ساتھی اور دوست سمجھتا تھا۔ چناں چہ جہانگیر نے شاہزادگی کے زمانے میں جب اپنے والد اکبر سے روگردانی کی اور مقابلے پر آگیا تو اس نے اکثر مقامات پر اپنا قبضہ کر لیا تھا جس میں سے بعض مقامات اپنے مخصوص دوستوں میں تقسیم کر دئے تھے تو شیخ قطب الدین کو صوبہ بہار کا انتظام سونپا۔ [2]

اکبر کے انتقال کے بعد جب جہانگیر نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو پہلے جشن میں ہی جہانگیر نے شیخ قطب الدین کو اپنی عنایات سے نوازنا شروع کر دیا۔ پنجہزاری کا منصب اور خلعت فاخرہ عطا کرنے کے بعد بنگال اور اڑیسہ کا صوبیدار مقرر کیا اور روپوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

[1] سیر المتاخرین ص ۳۰۹ [2] تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد ششم ص ۵

چنانچہ جہانگیر "تزک جہانگیری" میں لکھتا ہے:

"قطب الدین خاں کو کہ برسوں سے اس مبارک دن کی آرزو میں تھا، کہ طرح طرح کی عنایتوں سے سرفراز ہوا، اول اس کو منصب پنجہزاری ذات سواروں کا دیا، پھر خلعتِ خاص شمشیر مرصع اور خاصہ گھوڑا زین مرصع سے عنایت کر کے حکومت بنگالہ واڑلیسہ کہ پچاس ہزار سوار کی جگہ ہے اس کو عنایت کی اور باعزت تمام بڑے لشکر کے ساتھ اس طرف روانہ کیا اور میں نے دو لاکھ روپے اس کو خرچ کے لئے مرحمت فرمائے۔ اس کی والدہ کے بارے میں میرا مقولہ ہے کہ میں ان کا ایام طفولیت کا پرورش یافتہ ہوں، اس وجہ سے مجھ کو ان سے اس قدر محبت و انس ہے کہ اپنی والدہ سے اس قدر نہیں ہے۔ والدہ قطب الدین میری حقیقی والدہ کی جگہ ہیں۔ میں قطب الدین کو اپنے بھائیوں، فرزندوں سے کم دوست نہیں سمجھتا۔ تین لاکھ روپے میں نے اس کے ہمراہیوں کو عنایت کئے۔"[۱]

جب شیخ قطب الدین صاحب کی والدہ کا انتقال ہوا تو جہانگیر نے ان کی نعش کو کندھا دیا اور چند روز اس نے کھانا نہیں کھایا اور کپڑے بھی نہیں پہنے۔ اس حزن و ملال کی کیفیت کو جہانگیر نے "تزک جہانگیری" میں بیان کیا ہے:

"ماہِ ذیقعدہ میں والدہ قطب الدین خاں کو کہ جو میری والدہ حقیقی کی جگہ تھیں اور بڑی محنت سے مجھ کو پرورش کیا تھا۔ انھوں نے سرائے فانی سے ملک جاودانی کی طرف سفر کیا۔ میں نے تھوڑے دور تک ان کی نعش کو کندھا دیا، اور کئی دن کھانا نہیں کھایا، اور کپڑے بھی نہیں بدلے۔"[۲]

علی قلی خاں المعروف شیر افگن خاں جو نور جہاں کا خاوند تھا، اس کو جہانگیر نے بنگال میں جاگیر دیگر بنگال بھیجدیا تھا، جب وہاں سے اس کے بارے میں جہانگیر کے پاس اطلاع آئی کہ اس کا طریقہ وفادارانہ نہیں ہے بلکہ باغیانہ ہے تو شیخ قطب الدین کو بنگال کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔

[۱] تزکِ جہانگیری ص ۳۷ [۲] ایضاً ص ۴۱

اور چلتے وقت جہانگیر نے ان کو ہدایت کر دی تھی کہ اگر وہ خیر خواہ ثابت ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اگر فتنہ پرور ثابت ہو تو ہمارے پاس بھیجدینا اور ہمارے پاس آنے سے اگر پس وپیش کرے تو سزا دینا۔ جب شیخ قطب الدین بنگال پہنچے تو انھوں نے اس کے طور وطریقے اچھے نہیں پائے، انھوں نے اس کو اپنے پاس بلوایا۔ وہ نہیں آیا اور پہلو تہی کرنے لگا، توان حالات سے انھوں نے جہانگیر کو مطلع کیا۔ جہانگیر سے ان کو یہ جواب آیا، کہ شیر افگن خاں کو ہمارے پاس روانہ کردو، اگر اس کے اطوار سے بد اندیشی کا اظہار ہو، تو ہم نے چلتے وقت تم کو جو حکم دیا تھا، اس کے مطابق سزا دو۔

اس فرمان کے آتے ہی قطب الدین خاں بے توقف بردوان پہنچے، جب شیر افگن خاں کو ان کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ دو نوکروں کے ساتھ ان سے ملنے آیا۔ ملاقات کے وقت آدمیوں کا ہجوم ہو گیا تھا، جس نے اسے گھیر لیا تھا، اس پر شیر افگن خاں نے کہا یہ کیا طریقہ اور سلوک ہے۔ شیخ صاحب نے لوگوں کو منع کیا اور ان کو ہٹا دیا۔ تنہا اس سے باتیں کرنے لگا۔ شیر افگن خاں پہلے ہی ان کا مقصد سمجھ چکا تھا۔ اس نے ان پر تلوار سے دو تین وار کیے، جس سے قطب الدین صاحب کی آنتیں نکل پڑیں، انھوں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چلا کر کہا، حرامخور کو جانے نہ دینا، چنانچہ ان کے ساتھیوں نے گھیر کر اس کا ڈھیر کر دیا[1] جب یہ واقعہ جہانگیر نے سنا تو اس کو بے حد رنج وافسوس ہوا۔

شیخ قطب الدین صاحب کے صاحبزادے شیخ محمد فرید صاحب تھے جو عہد جہانگیری، اور شاہجہانی کے امراء میں تھے۔ منصب پنج ہزاری ذات پنج ہزاری سوار سے سرفراز تھے، ان کی خواہش کے مطابق جہانگیر نے چار ہزار بیگہ اراضی موضع مولیا میں سکونت اور آباد کرنے کے لیے ان کو مرحمت فرمائی۔ اس زمین میں انھوں نے ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس کا نام جہانگیر کے نام پر شیخو پور رکھا، کیونکہ ان کے والد اکبر شاہزادگی کے زمانے میں شیخو کہا کرتے تھے[2] شیخو پور ضلع بدایوں میں ہے۔

شیخ فرید اپنے باپ کی طرح جنگجو تھے، انھوں نے عہد شاہجہانی میں کافی معرکوں میں حصہ لیا۔ چند واقعات یہ ہیں:

(۱) نظام الملک کے قلعہ گوار لیار میں مقید ہونے کی صورت میں بھی ساہو نے نظام الملک کے

[1] اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷ [2] آثار الصنادید ص ۳۶

کے خاندان کے ایک مجہول النسب لڑکے کو نظام الملک بنا کر جنگ جاری رکھی، اور فوج جمع کر کے اس ولایت کے دور نزدیک کے قلعوں اور محلات کو اپنے تصرف میں کر لیا۔ اور ملک میں شورش مچادی۔ ساہو کو تنبیہ کرنے کے لئے خاندوران بہادر، خادرخاں، خان زماں اور شائستہ خاں وغیرہ کو اڑتالیس ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ کل فوج میں بیس ہزار سوار خان زماں کی سرداری میں تھے اور سید شجاعت خاں اور بہادر خاں روہیلہ اس کی رفاقت میں تھے۔ ان کی فوج بندی کر کے بادشاہ نے حکم دیا کہ احمد نگر کی طرف جلد جا کر پہلے چار کونڈہ جو ساہو کا وطن ہے پائمال کیا جائے۔ بعد میں کوکن جا کر کوکن کو اس کے قبضے و تصرف سے نکالیں اور شائستہ خاں، اللہ وردی خاں کو قلعہ خیز وناسک کو فتح کرنے کے لئے متعین کیا۔

شائستہ خاں نورونہ سے دو روز قبل گلمیز میں گیا۔ اور اس کے پرگنوں کو ساہو کے بیٹوں، اور مخالفوں کے قبضے سے نکالا، جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ ناسک پہنچ گئے ہیں تو شیخ فرید بن قطب الدین خاں کو وہاں کا تھانیدار بنا کر بھیجا[1] شیخ فرید کے پہنچتے ہی مخالفین نے ناسک کو خالی کر دیا اور کوکن چلے گئے۔[2]

(۲) قلعہ مئو کوٹ اور جگت سنگھ کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ۱۵ شعبان ۱۰۵۱ھ کو خان ظفر جنگ کتل نور پور کے نیچے روانہ ہوا، اور پہاڑ کے نیچے قیام کیا۔ اور اپنے دونوں بیٹوں سعد اللہ اور عبد اللہ اور ذوالفقار خاں کو برق اندازوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ پہاڑ کے اوپر پڑاؤ کریں۔ جب یہ پہاڑ پر گئے تو وہاں جنگل تھا۔ لشکر کے ٹھیرانے کے لئے جنگل کا کاٹنا ضروری تھا، اس کی اطلاع ظفر جنگ کو دی گئی، کہ اس اثنا میں مخالفوں نے پانچ ہزار تفنگچی، کماندار پیادوں کے ساتھ بھیجدئے۔ یہ خبر سن کر سعید خان بہادر نے اپنے بیٹے لطف اللہ اور بعد میں شیخ فرید اور سرانداز خاں کو مدد کے لئے روانہ کیا[3] انھوں نے معرکے میں حصہ لیا۔

(۳) آخر ذالحجہ ۱۰۵۵ھ کو شاہزادہ مراد بخش پچاس ہزار سوار اور دس ہزار تفنگچی، تیراندازوں اور بہت سے توپ خانوں کے ساتھ بلخ اور بدخشاں کو تسخیر کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اور علی مردان کے

[1] سیر المتاخرین ص ۳۰۹ [2] تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد ہفتم ص ۲۰۳ [3] ایضاً ص ۲۹۵

ساتھ سات فوجیں سات سرداروں کی کمان میں بھیجیں۔ سات سرداروں میں نجابت خاں، قطب الدین، مرزا خاں، شیخ فرید، عبداللہ خاں، ذوالقدر خاں اور ملتفت خاں تھے۔ ہر ایک سردار کے ساتھ سات امیر مقرر کئے، جن کے ساتھ سات لاکھ روپے اور دو ہزار گھوڑے تھے[1]۔ ان لوگوں نے معرکوں میں شرکت کی اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔

شیخ فرید صاحب کا انتقال شیخوپور میں ہوا۔ وہیں ان کا مزار ہے۔

حکیم غلام نجف خاں شیخوپور میں پیدا ہوئے، اپنے خالو میر سید علی صاحب کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں شیخوپور سے دہلی آئے اور کٹرہ دینا بیگ گلی قاسم جان لال کنواں میں مقیم ہوئے۔ میر صاحب پہلے انگریزی حکومت میں تحصیلدار تھے۔ بعد میں گورنر جنرل بہادر کے میر منشی مقرر ہوئے۔

حکیم صاحب نے طب حکیم صادق علی صاحب ابن اکمل الحکما حکیم شریف خاں صاحب سے تحصیل کی اور نسخہ نویسی اور علاج و معالجہ کے گر حاذق الملک حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی خدمت میں سیکھے، ان کی حکیم صاحب سے قریبی قرابتداری تھی، حکیم صاحب کی بہن ان سے بیاہی گئی تھیں۔ اسی رشتہ داری کی بنا پر مرزا غالب اپنے ایک خط میں جو انھوں نے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا تھا، مبارکباد دی تھی:

> "میاں تم کو مبارک ہو حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین تھا، اٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ۔ اور ہر ہفتہ میں ایکبار کچہری میں حاضر ہوا کرو، چنانچہ وہ کچھے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آرہے۔ صفدر میرے پاس آیا تھا۔ یہ اس کی زبانی ہے جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہ احتیاط جا نہیں سکتا۔"[2]

حکیم احسن اللہ صاحب کی کوششوں سے حکیم غلام نجف خاں شہر کے مشاہیر اطبا میں شمار ہونے لگے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے "عضد الدولہ اعتماد الملک حکیم غلام نجف خاں بہادر" کا خطاب پایا۔ اس کے بعد سرکار کمپنی بہادر سے عہدہ طبابت پر مامور ہوئے۔

[1] تاریخ ہندذکاءاللہ جلد ہفتم ص ۳۲۹ [2] اردوئے معلیٰ ص ۶۷

قدرت الٰہی کی طرف سے حکیم صاحب نے ایسا دست شفا پایا تھا کہ وہ امراض جن کو ڈاکٹر لادوا اور لاعلاج کہتے تھے آپ کی معمولی توجہ سے زائل ہو جاتے تھے۔[۵۷]

حکیم صاحب کے مرزا غالب سے اچھے تعلقات تھے، بلکہ مرزا غالب کو حکیم صاحب بزرگانہ درجہ دیتے تھے۔ چنانچہ مرزا غالب نے حکیم صاحب کے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے اور ایک شخص کی سفارش بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"حکیم غلام نجف خاں سنو اگر تم نے مجھے بنایا ہے یعنی استاد اور باپ کہتے ہو یہ امر ہے از روئے تمسخر تو خیر، اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو۔ بھائی انصاف کرو اس نے حکیم احسان اللہ خاں سے رجوع کی اور وہ تمہارے بھائی بھی ہیں اور تم کو ان سے استفادہ بھی ہے، اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا تو ان کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ ہے، ابتداء میں ان سے پڑھے ہو۔ پس یہ غریب سوائے تمہارے اگر گیا تو تمہارے ہی علاقہ میں گیا۔ وہ بھی گھبرا کر اور خفقان سے تنگ آکر۔ اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق توجہ زیادہ فرماؤ اور بدل اس کا معالجہ کرو۔ الطاف کا طالب غالب۔"

حکیم غلام نجف خاں صاحب کا انتقال دہلی میں ہوا اور قدم شریف میں آرام فرما ہیں۔

غلام نجف خاں صاحب کے صاحبزادے حکیم ظہیر الدین صاحب نے بھی دہلی میں حکمت میں بڑا نام پایا تھا۔ اور لقمہ اجل بننے والے مریضوں نے اللہ کی عنایت سے ان کے ہاتھ شفا پائی، حکیم ظہیر الدین صاحب نے دو شادیاں کیں پہلی شادی شیخوپور میں اپنے خاندان میں کی، ان سے حکیم رضی الدین احمد صاحب اور چار لڑکیاں ہوئیں، دوسری شادی پہلی بیوی کے فوت ہونے کے بعد محمد میر صاحب کی بہن نور جہاں سے کی، ایک لڑکے ریاض الدین ہوئے جو والد کی حیات میں جوانی میں انتقال کر گئے تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ حکومت کی طرف سے ان کو خاں صاحب کا خطاب ملا تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے تھے اور دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی کئی سال تک رہے۔

[۵۷] واقعات دار الحکومت جلد دوم ص ۶۰۸

حکیم رضی الدین صاحب ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا دہلی کے معززترین رؤسا میں شمار تھا۔ فارسی و عربی کے بہترین ماہر تھے۔ ۲۹ سال تک دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور ۱۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے پرانے فولو تھے، پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی اور اینگلو عربک ہائی اسکول کمیٹی کے ممبر عرصے تک رہے، عمدۃ الحکماء اور زبدۃ الحکماء کی کلاسوں کے پرچے معائنہ کرتے تھے۔ آٹھ سال تک سکنڈ کلاس اور ایک سال تک فسٹ کلاس مجسٹریٹی کی۔ سب رجسٹرار کے آفس میں بھی کام کیا۔ شفاء الملک کا خطاب حکومت برطانیہ کی طرف سے ملا تھا[1]۔

حکیم صاحب ہیضے کے مرض کا علاج کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیے خود ہیضے کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے علاج کیا، انتہائی کوشش کی کہ ایک قطرہ پیشاب کا آجائے، لیکن موت کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایک قطرہ پیشاب آکر نہیں دیا۔ اور حکیم صاحب نے ۷، ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات "واقعات دارالحکومت دہلی" میں درج ہے[2]:

رضی الدین احمد خاں بہادر	تمہارا کیوں کے جھیلیں رنج فرقت
یہ کیا معلوم تھا کہنی پڑے گی	تمہاری اور مجھے تاریخ نہفت
پڑیں ایسے سخن گوئی پہ پتھر	تمہارا میں نکالوں سال رحلت
کہاں سے لاؤں پتھر کا کلیجہ	کروں کس دل سے اس میں غور و فکرت
تلاش مادے کا ہوش کس کو	کہاں وہ فکر کی اس غم میں جودت
مگر اتنا تو کہہ دیتے ہیں اب بھی	تمہاری تا نہ رہ جائے شکایت
رہے گی یاد، لیکن سوگ کے ساتھ	شفاء الملک کی ناگاہ رحلت
۸۶	۱۲۴۸ + ۸۶ ۔۔۔ ۱۳۳۴ھ

حکیم رضی الدین صاحب کے صاحبزادے حکیم ناصر الدین خاں عرف چنو میاں تھے، جو نوجوانی اور شباب کے عالم میں جوان صالح کا ایک بہترین نمونہ تھے۔ لوگوں کو نہ صرف اپنے بے نظیر اخلاق بلکہ اپنے لاجواب علاج معالجے سے دہری گراں بار منت سے ممنون احسان فرماتے تھے۔ باپ کی سیرت اور ان کے نام کو انھوں نے

[1] آثار دہلی ص ۴۸، [2] واقعات دارالحکومت جلد دوم ص ۱۸۲

قائم ہی نہیں رکھا بلکہ چار چاند لگائے۔ آپ کو حاذق الملک حکیم محمود خاں صاحب کی طرح قومی کاموں میں دل چسپی تھی، ۱۹۱۸ء میں اردو کانفرنس دہلی میں ہوئی۔ اس کے روح رواں آپ تھے کٹرہ آدینہ بیگ خاں کا دروازہ جو مغلیہ کے دور کے آخر میں بنا تھا، اس پر چنو میاں کا قبضہ تھا۔ یہیں ان کا دولت خانہ شفا منزل ہے اور مطب بھی وہیں تھا[1]

چنو میاں صاحب بدایوں میں اسپیشل مجسٹریٹ رہے۔ اسلامیہ انٹر کالج بدایوں کے پریذیڈنٹ بنائے گئے۔ دہلی میں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر عرصے تک رہے۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن کے والی کے طبیب خاص مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو یونانی اینڈ آریو ویدک انڈین بورڈ آف میڈیسن کا ممبر نامزد کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ساؤتھ انڈیا کا دورہ کیا اور ہندوستان کی مختلف جگہوں پر گئے اور گورنمنٹ کو رپورٹ پیش کی۔ دہلی کے طبیہ کالج کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے، آخر میں ہندوستان کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے آنریری فزیشن مقرر کئے گئے۔ تاحیات اس اعزاز پر فائز رہے۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اور حضرت روشن چراغ دہلی سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے، ۲۲ جون ۱۹۵۸ء کو فوت ہوئے۔ اور وصیت کے مطابق درگاہ روشن چراغ دہلی میں دفن ہوئے۔

چنو میاں کی شادی ہمایوں سلطان عرف عائشہ بیگم بنت سلطان زماں بیگ سے ہوئی، جن سے دو صاحبزادے احسن اللہ فاروقی، محمد اجمل فاروقی اور دو صاحبزادیاں حور جہاں اور سلطان جہاں ہوئیں۔ سلطان جہاں صاحبہ نے بی اے تک تعلیم پائی۔

احسن اللہ فاروقی ۱۲ جون ۱۹۲۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، ۱۹۴۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی سے میٹرک کیا۔ ان کے اساتذہ چودھری مقصود صاحب ہیڈ ماسٹر، ظفر صاحب اور تجمل حسین صاحب وغیرہ تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جائداد کی دیکھ بھال میں لگ گئے، اجمل فاروقی صاحب نے اسی اسکول سے ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کیا۔ اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے انٹر تک تعلیم حاصل کی۔

---

[1] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص ۷۰۱

جناب نواب قطب الدین محدث دہلوی

مولانا نواب قطب الدین محدث بن نواب غلام محی الدین بن شاہ حاجی صاحب دہلی کے قدیمی باشندے تھے، ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد دہلی کے رئیس تھے، بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کا تعلق تھا۔ دہلی میں وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا انتقال ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۶ء کو ہوا، اس روز بہادر شاہ ظفر نے دربار میں حکم دیا کہ حسب ضرورت اور دیگر ضروری سامان جنازہ کی تیاری کے لئے ان کے گھر بھیجدیا جائے، چنانچہ سامان بھیجا گیا۔ ۶ نومبر ۱۸۴۶ء کے ماتمی جلسے میں ان کے صاحبزادے فخر الاسلام نواب قطب الدین خان بہادر کو خلعت شش پارچہ اور ان کے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کی طرف سے عطا کیا گیا۔[1]

نواب صاحب نے کچھ کتابیں شاہ حسین صاحب سے پڑھیں، حدیث فقہ کی تحصیل مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے کی، چوتھے دن اپنے استاد شاہ اسحاق کی پیروی و تقلید کرنے، اللہ کی مخلوق کو ہدایت پہنچانے اور رہنمائی کرنے کے لئے وعظ فرمایا کرتے تھے، آپ کی وضع اور لباس اور رہن سہن کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ فقہ و حدیث کے جید عالم تھے، ترجمہ کرنے میں کمال حاصل تھا۔ نیک سیرت اور نیک اطوار بزرگ تھے، کتب بینی کا بیحد شوق تھا، نادر کتابیں ان کے پاس کافی تھیں۔ اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اکثر رسائل عام فہم زبان میں انھوں نے لکھے جس کو عام آدمی بھی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا تھا، مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ سلیس و شستہ اور صاف زبان میں تین جلدوں میں کیا جو بیحد مقبول ہوا، چنانچہ صاحب "آثار الصنادید"

---

[1] بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ص ۱۰۳

تحریر کرتے ہیں:

"جب اس کتاب کا چھاپہ ہوا باوجود مبسوط ہونے کے خلق نے ہاتھوں ہاتھ خریدا، اور ہر روز رواج دین اور تقویت شرع مبین میں مصروف رہتے ہیں"۔

بلبلی خانہ بازار سیتارام میں ۱۱۴۸ھ مطابق ۳۶، ۱۷۳۵ء میں ایک مسجد آپ کے استاد شاہ حسین صاحب نے تعمیر کی جس میں گنبد نہیں ہے صرف برجیاں ہیں اور دوہرے دالانوں کی ہے، اندر کے دالان میں ممبر کے پاس محراب پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے "ہو المستعان مسجد ملتِ حنفیہ"۔ دالانوں کے ہر دو جانب ایک حجرہ ہے۔ اس مسجد میں تہہ خانہ بھی ہے، مسجد کے عقب میں دکانیں ہیں۔ پہلے اس میں مدرسے کا مکان بھی تھا، جو شکستہ ہو گیا، چنانچہ ایک پتھر ۱۹۱۹ء کو صحن مسجد میں رکھا ہوا تھا، جس میں یہ شعر کتبہ تھا ؎

سالِ مکان بزرگ ساخت بازیب و زین   مدرسہ و مسجدے کردہ بنا شاہِ حسین

لیکن مسجد کی چھت کے دیوار میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے "مسجد المعروف بہ نواب قطب الدین خاں مرحوم"۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد میں نواب صاحب نے کافی ترمیم کرائی ہوگی اور رد و بدل کیا ہوگا جس کی وجہ سے یہ مسجد ان کے نام منسوب ہو گئی۔ شاہ حسین کی قبر صحن مسجد میں تھی جس کے اطراف میں سنگ سرخ کی جالیاں تھیں۔ جو صاف کر دی گئی تھی مسجد سے ملی ہوئی نواب قطب الدین صاحب کی حویلی ہے اور یہ گلی بھی نواب صاحب کے نام سے مشہور ہے [۱]

نواب صاحب ذاتی شرافت کے ساتھ علمی صحبت سے بھی مملو تھے [۲] فقیہ محدث و مفسر کے ساتھ قاطع شرک و بدعت بھی تھے، چنانچہ سر سید مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"اتباع شریعت میں سب پیشروانِ مسلک دین سے آپ کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے وضع لباس میں اپنے استاد عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے ان کو نہ دیکھا ہو ان کو دیکھے۔ اخلاق و حلم علاوہ فضل و کمال علمی کے ایسا آپ کی ذات میں جمع ہے کہ اوروں میں کم پایا گیا۔ ان دونوں فنون میں تو غل تکمیل بہم پہنچایا۔ تقویٰ اور ورع کا تو حساب نہیں، آپ کے اجداد والا تبار عالی خاندان والا

[۱] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دویم ص ۳۲۴ [۲] آثار دہلی ص ۲۰۰ [۳] آثار الصنادید ص ۶۰

دو دمان تھے ہمیشہ پیشگاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے، زمان آخر میں بھی آپ کو تقرب سلطانی سے وہ عزت وجاہ حاصل تھا جیسا کہ آپ کے علم وفضل کے شایان تھا"

آپ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت وعقیدت تھی اور حج بیت اللہ کا بھی بیحد شوق تھا۔ چنانچہ اکثر تیسرے چوتھے سال حج کو تشریف لے جاتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ ہجرت کر کے حجاز مقدس پہنچے اور آپ نے ۱۲۸۹ھ مطابق ۳-۱۸۷۲ء کو مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ اور جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں۔

آپ کا ہر ہم عصر آپ کی قابلیت واخلاق وسیرت کا معترف نظر آتا ہے، چنانچہ مؤلف حدائق حنفیہ نے آپ کے متعلق لکھا ہے:

"راقم نے بھی دہلی میں ۱۲۷۶ھ مطابق ۶۰-۱۸۵۹ء میں آپ کی زیارت کی بیشک آپ صورت وسیرت میں آیات ربانی میں سے ایک آیت تھے مگر افسوس آپ سے استفادہ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا"

آپ کی تفسیر، حدیث اور فقہ پر حسب ذیل تصانیف ہیں:[1]

(۱) جامع التفاسیر، (۲) ظفر جلیل ترجمہ حصن حصین، (۳) مظہر جمیل (۴) مجمع الخیر، (۵) جامع الحسنات، (۶) خلاصہ جامع صغیر، (۷) ہادی الناظرین، (۸) فقہ سلطان (۹) معدن الجواہر (۱۰) وظیفہ مسنونہ۔ (۱۱) تحفۃ الزوجین (۱۲) احکام الضحیٰ (۱۳) فلاح دارین، (۱۴) تنویر الحق، (۱۵) توقیر الحق، (۱۶) تحفۃ العرب والعجم، (۱۷) احکام العیدین، (۱۸) رسالہ مناسک (۱۹) خلاصۃ النصائح، (۲۰) گلزار جنت، (۲۱) تنبیہ النساء، (۲۲) حقیقۃ الایمان، (۲۳) مراد المعاد، (۲۴) تذکرۃ الصیام (۲۵) تذکرۃ الربا وغیرہ۔

نواب قطب الدین محدث دہلوی کے صاحبزادے جناب نصیر الدین خاں صاحب تھے۔ نصیر الدین صاحب کے انتقال کے بعد اولاد نرینہ باقی نہ رہی۔

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۹

نواب قطب الدین صاحب کی دو پوتیاں تھیں، ان میں سے ایک مولوی بشیر الدین صاحب مؤلف "واقعاتِ دار الحکومت دہلی" کی خوش دامن تھیں ـــــ دوسری چھوٹی مرزا ایوب بیگ، اور داؤد بیگ کی والدہ تھیں، جو انتہائی دیندار اور نماز روزے کے فرائض بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرتی تھیں۔

نواب مولانا قطب الدین کے تقدس کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری پشت تک تقویٰ اور دینداری باقی رہی۔

حضرت مولانا کرامت اللہ صاحب دہلوی

مولانا کرامت اللہ صاحب کے دادا رامپور کے پرانے باشندے تھے، آپ کے والد کفایت اللہ صاحب چار برس کی عمر میں دہلی آگئے تھے اور اپنے ہمراہ اپنے صاحبزادے کرامت اللہ کو بھی لے آئے تھے اور دہلی میں آکر محلہ سوئی والان میں مقیم ہوئے۔ مولوی کرامت اللہ صاحب کے دادا، اور والد زردوزی کا کام کرتے تھے، ان کے والد کی شادی دہلی میں ہوئی، جس سے ایک صاحبزادے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

مولانا صاحب ۱۸۵۷ء سے دس سال قبل ۱۸۴۸ء کو محلہ سوئی والان دہلی میں پیدا ہوئے تیرہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، بیس سال کی عمر میں تمام دینی علوم حاصل کرلئے تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا یعقوب نانوتوی سے حدیث کی سند حاصل کی معقول وغیرہ مولانا سید احمد صاحب دیوبندی اور مولانا سعید الدین دہلوی (جو سینٹ اسٹیفن کالج آگرہ کے پروفیسر تھے) سے حاصل کی اور ریاضی کی کتابیں مولانا محمد حسن سنبھلی اور مولانا عبد العلی رامپوری سے پڑھیں۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد باڑہ ہندو راؤ باغیچی اچھے جی میں سکونت اختیار کی۔ اور مدرسہ حسین بخش میں پانچ برس تک درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے ۱۳۰۴ھ میں روانہ ہوئے اور زیارت سے مشرف ہو کر ۱۳۰۵ھ میں حرمین شریفین کی حاضری دی۔ اور حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور خلافت کی سند حاصل کی۔ حج سے واپسی کے بعد چند روز مدرسے میں تعلیم دی، اس کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ جاری کیا۔ فجر کی نماز کے بعد باڑہ ہندو راؤ کی مسجد شیخان میں مثنوی شریف کا درس اپنے پیرو مرشد کے طریقے کو جاری کرنے کے لئے دیتے تھے۔ آٹھویں دن جمعہ کو مدرسہ حسین بخش میں وعظ فرماتے تھے۔

کافی عرصے کے بعد مدرسہ حسین بخش کے وعظ میں نزاعی شکل پیدا ہوئی، تو آپ نے کوچہ

قابل عطار کی مسجد میں وعظ کہنا شروع کر دیا۔ آپ کا وعظ موثر ہوتا تھا، دلوں کو تڑپا دیتے تھے اور لوگوں پر بے حد رقت طاری ہو جاتی تھی۔

مولانا کرامت اللہ صاحب اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی طرح دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، ان کے پاس جو کچھ آتا مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ دل دکھانے کو بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ دشمن کی کبھی برائی نہیں کی، دعا ہی فرماتے کہ اللہ اس کو نیک بننے کی توفیق عطا کرے۔

باڑہ ہندو راؤ کا ایک شخص آپ کی ہر وقت برائی کرتا رہتا تھا اور ناشائستہ الفاظ کہتا تھا۔ اور تکلیف پہنچانے کے درپے رہتا تھا، قضاء عنداللہ وہ چوری کے الزام میں گرفتار ہو گیا ـــــ تھا بے قصور، پولیس تفتیش کرنے کے لئے اس کو علاقے میں لے کر آئی، تفتیش کنندہ پولیس آفیسر نے مولانا سے اس شخص کے بارے میں معلوم کیا کہ یہ شخص کس چال چلن کا ہے۔ ہمارا اس پر شک ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ یہ شخص خاندانی ہے۔ میں اس کے باپ دادا، اور اس کے پورے خاندان کو جانتا ہوں اور بچپن سے اس سے واقف ہوں کہ یہ ایسی حرکت قطعاً نہیں کر سکتا۔ میرا دل اور اس کا چال چلن یہ کہتا ہے کہ یہ بالکل بے قصور ہے۔ پولیس آفیسر مولانا کا بڑا معتقد تھا، اس نے مولانا کے کہنے کو صحیح سمجھا۔ تھانے میں روزنامچہ کی خانہ پوری کرنے کے لئے پہنچا تو وہاں اصل ملزم گرفتار ہو کر آچکا تھا۔ اس نے اس چور سے حالات و واقعات معلوم کئے تو اس نے پہلے شخص کو رہا کر دیا۔ اور یہ سمجھا کہ واقعی مولانا صحیح کہتے تھے، کہ یہ بے قصور ہے۔

آپ کا ایک غریب مرید جو غالباً گوالیار کا رہنے والا تھا، مولانا کے ہاں مقیم ہوا، اور بیمار ہو گیا۔ آپ نے دیکھا تو اس کو سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ رات کا وقت تھا، اس پر غشی طاری تھی، آپ نے اس کے پاؤں کپڑے سے سہلانے شروع کئے، جب اس کا بخار کم ہوا، اور ہوش میں آیا تو اس نے دیکھا کہ پیر صاحب اس کے پاؤں سہلا رہے ہیں۔ شرمندہ ہوا، اور فوراً اٹھ کر پاؤں پکڑے اور کہا حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ مجھے گناہگار بنا رہے ہیں۔ میں اس قابل کہاں ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں۔ مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے۔

مولانا کو نذرانوں سے بہت نفرت تھی۔ لوگ ہزاروں روپے لاتے۔ لیکن آپ منظور نہ فرماتے اور یہ کہہ کر واپس کر دیتے تھے کہ خدا نے مجھ کو سب کچھ دیا ہے۔ اللہ کا فضل ہے مجھ کو اس کی حاجت

نہیں ہے۔

ایک عورت نے جس کا چاہ رہٹ میں ایک وسیع اور قیمتی ساٹھ ستر ہزار روپے کا مکان تھا اس نے آپ کے نام وقف کر دیا اور اس کا متولی بنا دیا۔ آپ نے کچھ عرصے اس کا انتظام کیا۔ اس کے بعد آپ اس کی تولیت سے سبک دوش ہو گئے، اور فرمایا کہ میں اس علت میں نہیں پڑتا۔ نہ معلوم میری اولاد کیسی ہو اور اس کا کیا حشر کرے۔ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ آپ کو لوگوں نے بہت کچھ سمجھایا لیکن آپ نے نہیں مانا۔

مولانا کرامت اللہ صاحب کا انتقال دہلی میں اپنے مکان باڑہ ہندو راؤ میں ۱۹۲۸ء کو ہوا۔ آپ کا مزار قبرستان حضرت خواجہ باقی باللہ میں ہے۔ آپ کے جنازے کی نماز میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب نے پڑھائی جو حضرت مولانا کرامت اللہ صاحب کے پیر بھائی تھے۔

مولانا کرامت اللہ صاحب کے تین صاحبزادے تھے، مولوی محمد حنیف، مولوی محمد احمد اور مولانا مسعود احمد صاحب۔ مولوی محمد حنیف چالیس سال کی عمر میں مولانا کے سامنے انتقال فرما گئے تھے۔ مولانا محمد احمد صاحب، ۱۹۴۷ء کے فسادات میں باڑہ ہندو راؤ میں شہید ہوئے۔ مولانا مسعود احمد صاحب، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد کراچی چلے گئے، خلیق، متواضع اور بردبار ہیں اور اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

شیخ کریم احمد صاحب بانی مدرسہ کریمیہ دہلی

شیخ کریم احمد صاحب کے والد ماجد کا نام وزیر الدین تھا، عرفیت جیرو تھی۔ گلی سرخ پوشاں محلہ چوڑی والاں انہی کے نام سے جیرو کی پہاڑی کہلاتی تھی، ان کا مکان اسی گلی میں تھا، اور تقریباً یہ گلی انہی کی ملکیت تھی۔ یہ شہر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ پاپوش کے مشہور تاجر تھے۔ چاندنی چوک میں ان کی دکان تھی۔ مفتی صدر الدین صدر الصدور آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے ان کے گہرے مراسم و تعلقات تھے، وزیر احمد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے شیخ کریم احمد صاحب، مشتاق احمد صاحب نثار احمد صاحب اور دوسری اہلیہ سے نذیر احمد صاحب اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ کریم احمد صاحب سرخ پوشاں میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا، اس لئے تعلیم پر توجہ نہیں ہوئی۔ ہندی میں ٹوٹے پھوٹے دستخط کر لیا کرتے تھے۔

انھوں نے ابتداء میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ پاپوش کا کام کیا۔ دہلی میں دو بڑے قوی الجثہ جسیم و خوب صورت بربرے بکروں کی خوب پرورش کی اور ایک چھوٹی سی گاڑی پر چاندی کا پترہ چڑھوایا اور حیدر آباد دکن لے گئے۔ اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور شہر بھر میں دھوم مچ گئی یہاں تک کہ نواب محبوب علی خاں والئ دکن تک اس کی اطلاع ہوئی۔ انھوں نے ان کو طلب کیا۔ شیخ کریم احمد صاحب نے اس گاڑی کو نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔ اس کو دیکھ کر نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ مصاحبین سے انعامات دینے کے لئے کہا۔ نہ معلوم کریم احمد صاحب کو کیا سوجھی کہ اپنی گاڑی لے کر چل دئے، اور انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔

اس گاڑی کی وجہ سے کریم احمد صاحب کی حیدر آباد کے رؤسا میں رسائی ہوئی، حیدر آباد پہنچ کر انھوں نے پہلے لکھنؤ سے سونے چاندی کی نگینہ والی انگوٹھیاں اور چھلے منگوائے اور

اس سے کاروبار چلایا، اس میں ترقی ہوئی تو زیورات و جواہرات کا کام شروع کیا، امرا، و رؤسا، ان کے گاہک بنے۔ اور یہاں تک شہرت پائی کہ حیدرآباد کے نامور جوہریوں میں ان کا شمار ہونے لگا، اور روپے کی خوب ریل پیل ہوئی۔ محلہ ملک پیٹ میں ان کا مکان تھا۔ اسی مکان میں کاروبار کرتے تھے۔ یہی مکان حیدرآباد کے امیروں اور رئیسوں کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس میں حیدرآباد کے نامی گرامی جوہری ان سے تجارت کرنے کے ساتھ مشورہ بھی لیتے تھے[۱]

کریم احمد صاحب آخری عمر میں حیدرآباد سے دہلی چلے آئے۔ دہلی آنے کے بعد انھوں نے دہلی کی جائیداد کی دیکھ بھال کی۔ کریم احمد صاحب نے شادی کی تھی، لیکن اولاد کوئی نہیں تھی۔ ان کی قدیمی آرزو تھی مدرسہ تعمیر کرنے کی اور دہلی میں ایک مسافرخانہ بنانے کی۔ چنانچہ دہلی میں پہنچنے کے بعد انھوں نے گلی بدلیان محلہ چوڑی والان دہلی میں مدرسہ کے لئے دو مکان خریدے۔ اور بقایا اپنی جائداد تعلیم کے لئے وقف کر دی۔ اور اس کی نگرانی دیکھ بھال کے لئے ایک بوڈی کی تشکیل کی، جو ان کی پاپوش برادری کے معزز اشخاص پر مشتمل تھی۔

چنانچہ شیخ کریم احمد صاحب نے مدرسہ کریمیہ کی تعمیر کا کام غالباً ۱۹۴۳ء میں شروع کیا، تمام تعمیری سامان یہ خود خریدا کرتے تھے، تعمیر کے وقت موجود رہتے تھے۔ مسالہ بنانے میں مدد کرتے تھے۔ مزدوروں اور مستریوں کو مشورہ دیا کرتے تھے۔ ایک ایک دیوار، چھت اور فرش اپنی نگرانی میں بنوایا۔ انتہائی چلن کے آدمی تھے، پیسہ دیکھ بھال و احتیاط کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ فضول خرچی سے ان کی طبیعت کو دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ دہلی کی پاپوش برادری سے ان کا تعلق تھا۔ اس برادری میں بڑے صاحب حیثیت، مخیر انسان اور بڑے نامی تاجر پیدا ہوئے، لیکن اللہ نے ان کے ہاتھوں نہیں بلکہ ان کے ہاتھ سے اس مدرسے کی تعمیر کرائی۔

پچیس سال گذر چکے ہیں۔ ہزاروں طلبا، نے اس مدرسے سے فیض پایا، چھٹی جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے، تین سو سے زیادہ طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ سات آٹھ اساتذہ تعلیم پر مامور ہیں۔ تعلیم مفت دی جاتی ہے۔

[۱] دہلی کی صدیقی برادری کی شخصیتیں

انھوں نے مدرسہ کریمیہ کے ساتھ جگت ٹاکیز جامع مسجد کے پاس ایک زمین دہلی میں مسافرخانہ تعمیر کرنے کے لئے بھی خریدی تھی۔ مدرسہ کے بعد اس کو تعمیر کرانا چاہتے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، اس لئے مسافرخانہ تعمیر نہ ہو سکا۔

کریم احمد صاحب خاموشی کے ساتھ غریبوں کی مدد کرتے تھے، خود اچھا نہ کھاتے اور نہ پیتے تھے، لیکن مغلسوں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کے لئے انھوں نے مہینے مقرر کر رکھے تھے۔ یہ انتہائی عاقل و فہیم اور تجربے کار بزرگ تھے، ان کی تقریباً ہر بات سبق آموز ہوتی تھی۔ وہ پیسے کے بارے میں کہا کرتے تھے:

"انسان اپنی اصلی حالت کو نہ بھولے —— پیسہ ہمارے واسطے نہیں آیا۔ جیسا آیا ہے، ویسا ہی جائے گا۔"

کریم احمد صاحب کا رنگ گہرا اور سانولا تھا۔ اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی ایک آنکھ بے کار ہو گئی تھی، بڑھاپے نے ان کو کمزور کر دیا تھا۔ کمر قدرے جھک گئی تھی۔ سادہ لباس نہیں بلکہ معمولی لباس پہنتے تھے، جس میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ ان کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد فقیر و درویش ہونے کا دھوکہ ہو جاتا تھا۔ اچھے اور نیک کاموں میں اور خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھتے تھے —— چنانچہ دہلی کے مشہور اہل قلم حافظ محمد رحیم صاحب نے اپنے رسالہ "فٹ ویر" کراچی میں ان کی دریادلی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

"میں ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد گیا۔ وہ (کریم احمد صاحب) کئی مرتبہ میری قیام گاہ پر آئے۔ اور دعوت کے لئے بضد رہے، بڑے جزرس آدمی تھے۔ اور ایک کوڑی کو اشرفی کے برابر سمجھتے تھے۔ اس لئے جس نے سنا کہ وہ میری دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حیرت میں رہ گیا۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ ٹال جاؤں، پتھر گھٹی سے وہ اتنی دور رہتے تھے، کہ وہاں تک پہنچنا بھی ایک منزل کو سر کرنا تھا۔ لیکن جب ان کی ضد انتہائی کمال کو پہنچی، تو مجھے جانا ہی پڑا۔ وہ کہنے لگے کہ تم میرے بھائی کے لڑکے ہو، اور میرے ہاں کھانا نہیں کھاؤ گے تو میں عبدالحکیم کو شکایت لکھوں گا، کہ تمہارا لڑکا حیدرآباد آیا اور اس نے میری ایک نہ سنی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دور کے عزیزوں کو بھی سگوں کے برابر سمجھتے تھے۔
مجبوراً مجھے دعوت منظور کرنی پڑی۔ اس دعوت میں انھوں نے دہلی اور حیدر
آباد کے بہت سے لوگوں کو بھی بلایا تھا۔ اور جب ہم نے وہاں پہنچ کر دسترخوان
کی دعوت کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے، اتنی قسم کے کھانے کسی اور ایک دستر
خوان پر کم دیکھنے میں آئے تھے۔ پھر انھوں نے بڑی محبت اور خلوص سے کھلایا۔"
کریم احمد صاحب نے اسّی سال کی عمر میں گلی سرخ پوشاں محلہ چوڑی والان دہلی میں ۱۹۴۶ء کو
انتقال کیا۔ قبرستان حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ میں دفن ہوئے۔

جناب منشی محمد الدین صاحب ایڈیٹر دار العلوم دہلی

منشی صاحب کے والد نظام الدین صاحب تھے جو بہت اچھے عالم تھے، ان کے چار بیٹے مولوی گنج بخش اور منشی محمد الدین وغیرہ تھے۔ مولوی گنج بخش صاحب اپنے دور کے جید عالم تھے، ان کی ساری عمر درس و تدریس میں گذری، اگرچہ انھوں نے اپنی پوری زندگی جنڈیالہ ضلع گوجرانوالہ جیسے چھوٹے سے گاؤں میں گذاری لیکن ان کے درس و تدریس کا فیض اس چھوٹے سے گاؤں سے بہت دور دور تک پہنچا۔

منشی صاحب اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم پانے کے بعد جنڈیالہ سے ملتان گئے۔ دہلی آنے کا واقعہ یہ ہوا۔ حافظ محمد عمر صاحب کتب فروش کو قرآن مجید لکھنے والے اچھے خوش نویس کی ضرورت پڑی، انھوں نے منشی محمد الدین صاحب کا شہرہ سنا کہ وہ بہت اچھے خوش نویس ہیں۔ ملتان میں رہتے ہیں، چنانچہ ان کا پتہ کسی سے معلوم کیا۔ اور ملتان پہنچے، اگست ۱۸۹۰ء میں منشی صاحب کو دہلی لے آئے۔ حافظ صاحب کا پریس اس وقت دریبہ کلاں میں گلاب گندی کی دکان کے سامنے ایک تنگ گلی میں تھا۔ منشی صاحب گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والان میں آکر مقیم ہوئے، اور ایسے مقیم ہوئے کہ دہلی کے ہو گئے۔ انھوں نے اٹھارہ سپارہ لکھے تھے کہ حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا اور قرآن مجید طبع نہ ہو سکا۔

حافظ محمد عمر صاحب کے علاوہ انھوں نے دہلی کے بڑے بڑے پریسوں سے تعلقات قائم کئے، اس زمانے میں انصاری پریس نے عربی، فارسی اور اردو کی مذہبی، علمی اور ادبی کتابیں شائع کرنے میں نام پیدا کر لیا تھا۔ دہلی میں مطبع مجتبائی بھی ایک مشہور و معروف پریس تھا، اس کے مالک مولوی عبد الاحد صاحب بھی ہندوستان کی مانی ہوئی ہستی تھیں، بڑی مستند اور معیاری کتابیں یہ پریس چھاپتا تھا۔ ان پریسوں کے علاوہ کرزن پریس اور کرزن گزٹ اخبار کی بھی دہلی میں دھاک

تھی۔ اس کے مالک مرزا حیرت دہلوی تھے، اس پریس پر تو منشی محمد الدین صاحب پوری طرح حاوی تھے، بلکہ ان کے خاندان کے افراد بھی ان سے متعلق رہے اور اس پریس و اخبار کا ہر چھوٹا بڑا کام ان کے سپرد تھا، چنانچہ مرزا حیرت ۱۵ مئی ۱۹۰۲ء کے کرزن گزٹ میں منشی صاحب اور ان کے خاندان کے افراد کے پریس سے متعلق ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں :

" منشی محمد دین صاحب میرے مطبع میں عرصے تک کام کرتے رہے، نہ منشی صاحب ان کا کل کنبہ جو دہلی میں موجود ہے یعنی ان کے چار بھتیجے منشی غلام رسول، منشی عبد القادر، منشی محمد حسین، منشی عبداللہ ـــــ منشی غلام رسول صاحب نے میرے مقدمہ تفسیر القرآن کا بہت بڑا حصہ لکھا۔ پھر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد عزیزی منشی عبد القادر شاید میری مطبع میں کام کرتے رہے۔ منشی محمد حسین صاحب نے کامل ایک سال تک یا اس سے زیادہ کرزن گزٹ لکھا۔ منشی عبداللہ صاحب مدرسہ میں بھی پڑھتے تھے اور چھٹی کے بعد میرے مطبع میں چٹھوں کی کاپیاں لکھا کرتے تھے۔۔۔ پھر خود منشی صاحب تشریف لائے، صبح کو مطبع میں آتے تھے، اور شام کو تشریف لے جاتے تھے۔ اول پریسوں کی نگرانی یعنی چھپائی وغیرہ کو دیکھنا اور پریس مینوں کو سیاہی، گوندا اور کھٹائی تقسیم کرنا اور جب وہ کاغذ چھاپ چکیں تو ان کاغذوں کو خود گن لینا یا گنوا کے مزدوری کا بل بنا کے مجھے دے دینا۔ دوسرے جو فرمائشیں غیر مطبع کی کتابوں کی باہر سے آتیں وہ بازار سے لے آتے اور ان کے پیکٹ بنا کر ڈاک سے روانہ کرنا۔ تیسرے اخبار کی اشاعت کے دن اگر ضرورت ہو تو اخبار پر چٹیں یا ٹکٹ چسپاں کرنا ـــ ان کاموں کے علاوہ کتابت کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرنا۔ مطبع سے قطع تعلق ہونے کے بعد منشی صاحب کو مطبع سے کام دیتا رہا، چنانچہ خلافت عثمانی ان ہی کے مبارک ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے۔"

آپ کے افضل المطابع، مطبع فاروقی، میو پریس اور دہلی پرنٹنگ سے بھی تعلقات ہو گئے تھے۔ موخر الذکر پریس کے مالک لالہ ٹھاکر داس ان کے بے حد قدر داں تھے۔

دہلی کا کوئی اہل علم ایسا ہوگا جس سے منشی صاحب کے مراسم نہیں ہوں۔ ان کے مولوی کرامت اللہ صاحب، مولوی عبدالحق حقانی صاحب تفسیر حقانی، قاری محمد اسماعیل میرٹھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب، مولوی تلطف حسین صاحب، خواجہ عبدالرحیم صاحب، نواب محمد حسن خاں صاحب، نواب فیض احمد صاحب، مولوی عبدالمجید صاحب، مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا اشرف الحق صاحب اور حکیم اجمل خاں صاحب سے گہرے تعلقات تھے۔ آپ ان حضرات کی محفلوں میں شرکت کرتے اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ ان کی مقبولیت اس قدر تھی کہ دہلی کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کے نام سے واقف تھا۔

منشی محمد الدین صاحب کو قدردان میسر ہوئے اتنے غالباً کسی خوش نویس کو میسر نہیں ہوئے ہوں گے۔ ہندوستان کے مشہور شعرا اور معروف ادیب ان کے فن کی داد دیتے تھے۔ نواب سراج الدین صاحب سائل دہلوی اور مفتی محمد کفایت صاحب نے ان سے اس فن کو باقاعدہ سیکھا۔ ان کے فن کی شہرت ملک کے ہر حصے میں پھیل گئی تھی۔ ایک مرتبہ افسر الملک حیدر آباد، دہلی تشریف لائے اور خود منشی صاحب سے گھر پر ملنے کے لئے آئے، انھیں دو لفظ لکھوانے تھے وہ اپنے سامنے لکھوائے۔ اجرت ایک اشرفی دی۔ منشی صاحب نے لینے سے انکار کیا، کہ آپ مہمان ہیں میں کچھ نہیں لوں گا۔ مگر افسر الملک نے اصرار کیا تو مجبوراً منشی صاحب کو اشرفی لینی پڑی۔

منشی صاحب کو یہ کمال حاصل تھا کہ تمام خطوں میں خواہ وہ نستعلیق ہو، خواہ شکستہ ہو یا نسخ ہو مہارت تامہ رکھتے تھے اور جلی لکھنے میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، قصور اور علی گڈھ کی جامع مسجد کی جتنی لکھائی باری تعالیٰ کے نام اور جو صورتیں ہیں وہ قریباً سب منشی محمد الدین صاحب کے ہاتھ کی ہیں۔ ان کا الف والا قرآن مجید یادگار ہے —— ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔ ان کی فارسی عربی کی شکستہ تحریر گنجان اور لڑی بند ہوتی تھی۔ دوسرا خوش نویس اسی قلم سے ایسی گنجان عبارت نہیں لکھ سکتا تھا۔ ۱۳۳۲ھ میں جب خانہ کعبہ کا غلاف پہلی بار ہندوستان میں تیار ہوا، تو اس پر آیات کریمہ کی خطاطی کی سعادت منشی صاحب کو بھی حاصل ہوئی۔ منشی صاحب اپنے دور کے عالم، صحافی اور خطاطی کے استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔

منشی صاحب خیالات وعقائد کے اعتبار سے پختہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی

ایسی کتاب تحریر نہیں کی جوان کے خیالات کے خلاف اور اخلاق سوز ہوتی تھی، ایک دفعہ انھوں نے آدھی سے زیادہ ایک کتاب لکھ لی، جس وقت ان کو محسوس ہوا کہ وہ ان کے عقیدے کے خلاف ہے تو واپس کردی اور اس کی اجرت بھی نہیں لی۔

منشی صاحب اس اعتبار سے انتہائی خوش قسمت تھے کہ انھیں مولوی ذکاءاللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد، مرزا حیرت، مولوی محمد حسین عارف، منشی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مفتی محمد کفایت اللہ، خواجہ حسن نظامی، آغا شاعر قزلباش اور علامہ مشرقی وغیرہ ادیبوں اور عالموں کی کتابیں لکھنے کو ملیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

دیوان حالی کا پہلا ایڈیشن، الحقوق والفرائض مؤلفہ ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ایڈیشن، ادعیۃ القرآن قرآن مجید مترجم مولوی نذیر احمد صاحب، حمائل شریف رموز اعظم واکمل، عنایت اللہ کا تذکرہ بھی منشی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ مشرقی صاحب نے انھیں پشاور سے بلوایا تھا۔ لکچروں کا مجموعہ مصنفہ مولوی نذیر احمد صاحب لمعات نور، ترجمان القرآن کا پہلا حصہ مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد، قصیدہ بردہ مترجمہ مولوی محمد حسین خاں عارف۔

مولانا الطاف حسین حالی کو تو منشی صاحب پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ان کی ترمیم و تنسیخ کو بلاچون وچرا قبول کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ منشی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ نے مولانا حالی کی وفات پر ایک مضمون لکھا تھا، جو رسالہ "تمدن" دہلی کے شمارے مارچ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا، اس میں انھوں نے منشی محمد الدین صاحب کا تعلق مولانا حالی سے کیا تھا۔ اور ان کے خط وکتابت پر کس قدر اعتبار کرتے تھے، ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق اپنی بھی رائے دی ہے:

> "مرنے سے دو یا تین مہینے پیشتر دہلی میں تشریف لائے منشی کرم اللہ خاں صاحب کے مکان پر فروکش ہوئے۔ اس وقت دہلی میں تشریف لانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ منشی محمد دین صاحب سرتاج خوش نویسان ہند کے خط اور ان کی اغلاط سے پاک کتابت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ منشی محمد دین درحقیقت ایک نستعلیق اور زود فہم آدمی ہیں۔ دیوان کا جدید ایڈیشن لکھوا چکے تھے۔ مگر سابقہ کلام و دیگر مضامین کا بھی جلد چھپوا دینا منظور خاطر تھا، گویا موت کی خبر لا چکے تھے۔"

ملا واحدی صاحب کے رسالہ نظام المشائخ کی ابتدائی دور کی کتابت کئی برس تک انھوں نے کی سینکڑوں کتابوں کے ٹائٹل پیج ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے لکھے ہوئے قرآن مجید اور پنجسورے بھی اچھے ہدیوں میں فروخت ہوتے ہیں، احادیث کی متعدد کتابیں بھی ان کی تحریر کردہ ہیں۔

نوابوں، رئیسوں، راجاؤں اور مہاراجاؤں کی خدمت میں جو لوگ خطوط و درخواستیں اور عرضداشتیں بھیجتے تھے، ان کی کتابت کے لئے منشی صاحب کی خدمت میں جایا جاتا تھا۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ میر محبوب علی خاں یا میر عثمان علی خاں کو جو عریضے بھیجتے تھے، وہ منشی صاحب کے تحریر کردہ ہوتے تھے، مولوی صاحب منشی جی سے کہا کرتے تھے آپ کی خوش نویسی کی برکت ہے کہ میری ساری درخواستیں منظور ہو جاتی ہیں۔

مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کی سرخیاں انھوں نے تحریر کیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" و "البلاغ" کی چھوٹی بڑی سرخیاں یہی لکھتے تھے، مولانا آزاد سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ منشی صاحب کے پوتے اور منشی عبدالقدیر صاحب کے صاحبزادے علاؤالدین خالد مالک حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے مولانا آزاد سے "غبار خاطر" کے پہلے ایڈیشن کے چھاپنے کی اجازت چاہی، تو مولانا نے انھیں دوسرے پبلشروں پر فوقیت دی۔

منشی جی جس زمانے میں مولانا آزاد کی "ترجمان القرآن" کی کتابت کر رہے تھے، اپنے دونوں شاگرد عبدالخالق اور شفاعت احمد کے ساتھ مولانا کے یہاں گئے۔ منشی جی تو سیدھے اندر چلے گئے۔ مگر یہ دونوں باہر رک گئے۔ منشی جی انھیں ڈھونڈھنے باہر آئے، مولانا آزاد بھی پیچھے پیچھے آئے۔ منشی جی نے اپنے شاگردوں سے کہا تم میرے ساتھ اندر کیوں نہیں آئے۔ شفاعت صاحب نے کہا، احتراماً۔ منشی جی نے ان کو ڈانٹا اور کہا کیا مولانا آزاد آدمی نہیں ہیں، اس کے بعد مولانا آزاد ان دونوں کو اندر لے گئے اور ان کی چائے سے تواضع کی۔ منشی جی اپنے شاگردوں میں کسی قسم کا احساس کمتری پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔

منشی جی کے زمانے میں دہلی میں چند نامی خوش نویس محمد قاسم لدھیانوی، منشی ممتاز علی اور غلام رسول وغیرہ تھے، ان سے منشی جی کے اچھے تعلقات تھے اور وہ ان کے فن کے انتہائی مداح اور قدرداں تھے، انھوں نے ان کی خطاطی پر کبھی کوئی مخاصمانہ تنقید نہیں کی بلکہ منشی ممتاز علی کے لکھے ہوئے قرآن مجید "خاتم المصاحف" کی تلاش میں تھے کسی شخص نے خریج کے فرموں سے مکمل کیا بکلام

میدان کو دکھایا اس کو پچاس روپے میں خریدا۔ منشی صاحب نے یہ کلام مجید اپنی صاحبزادی آمنہ خاتون کے جہیز میں دیا تھا، حکیم ذکی صاحب کے پاس یہ قرآن مجید کسی صورت سے پہنچ گیا، بقول منشی عبدالقادر صاحب، حکیم صاحب اس کلام مجید کو دیکھنے کے لئے لے گئے تھے، لیکن والد صاحب مرحوم اور میرے تقاضوں کے انھوں نے واپس نہیں کیا۔

منشی محمد الدین صاحب نے حویلی اعظم خاں دہلی سے ایک ہفتہ وار اخبار "دارالعلوم" ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو جاری کیا۔ ابتدا میں چھوٹے سائز پر شائع ہوا، ۳ دسمبر ۱۹۰۱ء سے بڑے سائز پر آٹھ صفحوں پر نکلنے لگا۔ ایڈیٹر و مالک منشی محمد الدین صاحب تھے، سالانہ چندہ دو روپے چار آنے تھا۔ ناظر پریس حوض قاضی دہلی میں چھپتا تھا مرزا حیرت ایڈیٹر "کرزن گزٹ" دہلی کے خیالات سے اس اخبار کو اختلاف تھا، اس لئے زیادہ مرزا حیرت کی مخالفت کی جاتی تھی۔ غیر ملکی اور ملکی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں، اس اخبار نے تین سال کی عمر پائی۔ اور بند ہو گیا۔

منشی صاحب کبھی کبھی پبلک جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور تقریر بھی کر دیتے تھے، جب اینگلو عربک ہائی اسکول کو دہلی کالج بنانے کی تحریک شروع ہوئی تو اس سلسلے میں پہلا جلسہ مسجد فتحپوری دہلی میں ہوا، جس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کی، اس کے بعد منشی جی نے اور دیگر مقرروں نے تقریریں کیں۔ منشی جی کی بھی تقریر پسند کی گئی۔

۱۹۱۵ء میں علی برادران کی نظر بندی کے خلاف احتجاجی جلسہ گھنٹہ گھر پر ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہوا، جس میں منشی جی نے اپنی تقریر میں حکومت سے معلوم کیا "ہمیں بتایا جائے کہ علی برادران کا قصور کیا ہے جس کی بنا پر انھیں نظر بند کیا گیا ہے" اور پھر غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

منشی جی نے ساری عمر ایک سا لباس پہنا، ان کا روزمرہ کا لباس یہ تھا:

سفید تہبند، سفید کرتا اور سفید صافہ، جاڑے میں روئی کی نیم دار نیم آستیں صدری استعمال کرتے تھے، اوپر سے گاڑھے کی چادر یا شال اوڑھ لیا کرتے تھے۔[1] منشی صاحب کے تین فرزند منشی عبدالقدیر صاحب

[1] منشی جی کے حالات کا زیادہ حصہ "عظمتِ رفتہ" سے اخذ کیا ہے۔

منشی یوسف صاحب اور ضیاء الدین برنی اور دو صاحبزادیاں فاطمۃ الکبریٰ اور آمنہ بیگم ہوئیں۔

منشی عبدالقدیر صاحب ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، ۱۸۸۰ء کو دہلی میں آگئے تھے۔ شاہ جی کے چھتہ چاوڑی بازار کے پرائمری اسکول میں بھی تعلیم پائی۔ مولوی محمد سعید صاحب سعید، مولوی عبدالحکیم، مولوی ذوالفقار علی، ماسٹر دین دیال اور پنڈت بالکشن اکھل سے ابتدائی کتب کی تحصیل کی۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے عربی پڑھی اور مولوی محمد صاحب سے حدیث کا درس لیا، جن کی صاحبزادی بعد میں ان کی نکاح میں آئی۔ ۱۸ بار جیل گئے، گجرات، لال قلعہ، ملتان جیل، لاہور اور دہلی جیل وغیرہ میں رہے، ۱۹۴۲ء میں نظر بند ہوئے، —— میں بھی ان کے ہمراہ دہلی جیل، ملتان جیل، انبالہ اور فیروز پور کیمپ جیل میں رہا۔ منشی جی کو جب دہلی حکومت نے اخبار کا ڈکلریشن دینے سے انکار کیا تو ایک ٹھیلے پر جیسے چلتا پھرتا اخبار کہا جاتا تھا خبریں درج کرنی شروع کر دیں، یہ سلسلہ کافی عرصے تک چلا۔ منشی صاحب بڑے خود دار، دیانتدار اور وضعدار بزرگ تھے۔ جامع مسجد اردو بازار میں "عبدالقدیر والاخوانہ" کے نام کتب خانہ کھولا، یہ دکان جہاں مجلس احرار کا دفتر تھا، وہاں تھی۔ اس دکان پر سیاسی، ادبی اور شعراء کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ خوش نویسی انھوں نے اپنے والد سے سیکھی، جس کو پیشہ نہیں بنایا۔ دہلی کے اچھے خوش نویسوں میں شمار تھا۔ پارلیمنٹ کے باہر کے دروازے کے دائیں جانب جو سنگ بنیاد ڈیوک آف کناٹ نے رکھا تھا، وہ منشی عبدالقدیر صاحب کا لکھا ہوا ہے، اس میں سنہ عیسوی کی تاریخ ہے۔ دوسرا سنگ بنیاد انڈیا گیٹ کے نیچے تھا، جس میں ہجری تاریخ تھی۔ ۱۹۴۷ء گڑبڑ کے زمانے میں حکومت کے کسی محکمے نے اس ہجری سنہ کے پتھر کو نکلوا کر دوسرے پتھر پر عیسوی سنہ لکھوا کر لگوا دیا ہے، جو بد خط ہے۔

ان کو دہلی سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کے بھائی اور صاحبزادے سب پاکستان چلے گئے تھے، یہ تن تنہا دہلی میں رہتے تھے، دو تین مرتبہ کراچی گئے، ان کے صاحبزادوں اور بھائیوں نے بے حد کوشش کی کہ یہ پاکستان میں مستقل ہو جائیں لیکن انھوں نے دہلی میں تنہا رہنا پسند کیا۔

خوش نویسی میں بھائی یوسف صحیح معنی میں اپنے والد کے جانشین ہیں، جو اپنے طرز کے خود موجد ہیں، ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب ہے، انھوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم پائی، اس منفرد باکمال خطاط نے خط نستعلیق کو ایک ایسا حسن عطا کیا ہے جو فن کی معراج ہے۔ خط نستعلیق کو امام ویردی کے بعد یوسف صاحب جیسا کوئی اور باشعور فنکار میسر نہیں آیا۔ آپ نے خوش نویسی اور آرٹ کے لطیف امتزاج سے

ایک نئی راہ کھولی، وہ پرانی طرز کے ذاتی طور پر بڑے دلدادہ ہیں اور اس میں کمال حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی مگر ان کے جدید طرز نے بڑی مقبولیت حاصل کی یہ پرانے قواعد طور طرز کے پابند نہیں بلکہ آرٹ کے نقطہ نظر سے جو زیادہ حسین نظر آئے وہی ان کا قاعدہ ہے۔ نئی دہلی کی سکریٹریٹ و انڈیا گیٹ اور دیگر عمارات پر انھوں نے اردو کے ساتھ تیرہ زبانوں میں خطاطی کے علاوہ تزئین کاری کی ہے۔ پاکستان کے سکوں پر عربی زبان میں ترکی طغریٰ میں "حکومت پاکستان" ان ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس یکتائے فن کو اردو عربی، ہندی، انگریزی اور گجراتی وغیرہ زبانوں پر یکساں دست رس رہی ہے۔[1]

لیکن بھائی یوسف سے کام لینا معمولی کام نہیں ہے بڑا ہی مشکل کام ہے، بڑی مشکل سے قبضے میں آتے ہیں، بیسیوں چکر لگواتے ہیں، ناواقف دو چار چکر لگا کر تنگ آکر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن قدرداں اور ان کی عادتوں سے واقف ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ البتہ دہلی میں جب بھائی یوسف تھے، ایک صاحب کے ہاتھ میں اُن کی کل تھی وہ ذات شریف مولانا رشیدیہ کتب خانہ والے تھے، ان کی سفارش کا ان پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ جن کے ساتھ مولانا رشیدیہ چلے جاتے تھے۔ ان کا کام بھائی یوسف فوراً کر دیا کرتے تھے۔ بھائی یوسف کی دوستی مولانا رشیدیہ سے فٹ بال کے میدان سے شروع ہوئی تھی، بھائی یوسف مولانا رشیدیہ کے کھیل پر فریفتہ تھے۔ ان کے کھیل کی "تعریف و توصیف" ہر وقت ان کی زبان پر ہوتی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ ان کا کہنا ٹالتے نہیں تھے۔ پچھلے سال کراچی گیا، بھائی یوسف سے مولانا رشیدیہ کا ذکر آیا تو ان کی جان میں جان آگئی بہت دیر تک ان کے لطیفے سناتے رہے۔

ضیاء الدین احمد برنی صاحب دہلی میں ۳ فروری ۱۸۹۰ء کو پیدا ہوئے۔ سینٹ اسٹیفنز کالج سے ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے کیا، ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی کے "ہمدرد" میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۱۴ء کے وسط تک کام کرتے رہے، ۱۹۱۶ء میں لالہ دیانرائن نگم کے اخبار "پرتاپ" کی کچھ عرصے تک ایڈیٹری کی۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۵ء تک سرکاری ملازمت کی۔ آخر ۱۹۴۵ء میں "الہلال" بمبئی کی چند مہینے تک ایڈیٹری کے فرائض انجام دے، ۱۹۵۵ء سے کراچی سے "کتابی دنیا" رسالہ جاری کیا جو ابتدا، ۱۹۶۹ء تک چلتا رہا۔ تعلیمی مرکز ۱۹۴۸ء میں جاری کیا۔

[1] کتابی دنیا کراچی جولائی ۱۹۶۷ء

مئی ۱۹۶۹ء میں مَیں کراچی میں تھا، ۶ مئی کے اخبار "جنگ" میں پڑھا، ۴ مئی کو پانچ بجے سوا نو بجے جناح ہسپتال میں جناب ضیاء الدین برنی کا انتقال ہوگیا۔ افسوس میں اُن کے جنازے میں شامل نہ ہو سکا ــــــ برنی صاحب نے خوش نویسی کی طرف توجہ نہیں دی، ان کا رجحان تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرنے کی طرف تھا، چنانچہ ان کی حسب ذیل تصانیف تھیں، جو زیادہ تر ترجمہ ہیں:

(۱) مولوی ذکاء اللہ (۲) کیوپڈ و سائیکی (۳) سی ایف اینڈ ریوز (۴) رومانس آف دی اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس بمبئی (۵) اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں (۶) سید جمال الدین افغانی (۷) ترکوں کی پسند (۸) عظمت رفتہ۔

منشی محمد الدین صاحب کے دونوں صاجزادے خوش نویس ہی نہیں تھے بلکہ ان کی صاجزادی فاطمۃ الکبریٰ کو قدرت نے اس فنِ شریف سے نوازا تھا، جنھوں نے بطور فن خوش نویسی میں کمال حاصل کیا تھا۔ خوش نویسی سیکھنے کے سلسلے میں اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کا نام لیا جاتا ہے مگر کلام پاک کی کتابت کی سعادت اور پورے قرآن مجید لکھنے کی عزت پہلے کسی اور خاتون کے حصے میں نہیں آئی۔ انھوں نے جس دور میں خراج تحسین حاصل کیا وہ زمانہ جناب محمد قاسم لدھیانوی، منشی ممتاز علی اور منشی عبدالغنی جیسے بڑے بڑے صاحب کمال بزرگوں کا تھا، لیکن خط نسخ کو انھوں نے نسوانی قلم کی لچک سے ایک خاص حسن دیا جو اعجاز تصور کیا گیا۔ مولوی فتح محمد صاحب جالندھری کے ترجمہ والی حمائل شریف ان ہی کے زورِ تحریر کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح متعدد حمائلیں اور قرآن مجید ان کے قلم سے نکلے۔ ۱۳۵۴ھ میں شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمہ اور موضح القرآن کے ساتھ انھوں نے حمائل شریف خود لکھی اور خود ہی شائع کی، اس حمائل کی فنی خوبیوں کی وجہ سے مکتبہ جامعہ دہلی نے اسے اپنی مطبوعات میں شامل کر لیا تھا۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ (۱۹۰۷ء)، سورت (۱۹۱۸ء) ۱۹۲۸ء کے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے اجلاس میں، اور دیگر اسلامی اداروں نے متعدد نقرئی و طلائی تمغوں سے اعتراف خدمت کیا، ۱۹۲۷ء میں نظام دکن نے تاعمر وظیفہ سے نوازا۔ ہز ہائی نیس بیگم بھوپال نے از راہ قدر دانی اپنی جڑاؤ پہنچیاں مرحمت فرمائیں۔ ساتھ ہی وظیفہ بھی جاری کیا، اسی طرح ریاستہائے ٹونک، دتیہ، مانا ودار، مانگرول اور جونا گڑھ وغیرہ نے بھی از راہ خسروانہ ہمت افزائی کی۔ محترمہ اپنے فن میں یکتائے روزگار تھیں، بلکہ ایسی مہذب، متمدن، دیندار، پاکیزہ اور عابدہ عورتیں شاذ نظر آتی ہیں، ان کی

شخصیت اپنی خداداد قابلیت اور اوصاف کی بناء پر لاثانی تھی ——— پابندِ صوم و صلوٰۃ و شریعت اور زہد و تقویٰ میں بھی ان کی مثال فی زمانہ مشکل سے ملے گی۔

فاطمہ صاحبہ کی تمنا تھی وہ معربی کلام پاک جلی حروف میں اس طرح لکھیں کہ وہ روایتی اسلوبِ نگارش کا بھی حامل ہو، اور ساتھ ساتھ تلاوت کرنے والوں کے پڑھنے میں بھی آسانی کا موجب ہو معربی اور جلی حروف میں یہ قرآن مجید مع آٹھ پاروں کے ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے، جو ۱۹۴۷ء میں اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جب دہلی کو انسانیت سوز فسادات نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دلی کے اجڑنے کے ساتھ محترمہ بھی اپنے چھوٹے بھائی مشہور زمانہ استاد محمد یوسف کے ساتھ پاکستان ہجرت کر کے کراچی چلی گئیں ــ سالہا سال کی محنت شاقہ سے کتابت کردہ مذکورہ قرآن مجید کی کاپیاں اور پلیٹیں دلی پرنٹنگ ورکس میں خوش قسمتی سے محفوظ رہیں، جو پاکستان ہائی کمشنر کے ذریعے پہنچ گئی تھیں، یہ نادر تحفہ جلد ہی اردو اکیڈمی سندھ کے زیرِ اہتمام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آجائے گا۔

فاطمہ صاحبہ کو ابتدائی عمر ہی سے سماجی اور انسانی بہبود کے کاموں سے دل چسپی رہی ہے اور فلاحی کاموں اور تحریکوں میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا ہے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والیوں میں محترمہ اہلیہ سر عبدالقادر اور بیگم اکرام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، پچھلے تیس سال سے محترمہ کا دائرۂ عمل تبلیغی ہو گیا تھا۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لئے زندگی وقف کر رکھی تھی۔ وہ انگریزی سامراج کی شدید مخالف تھیں، وہ اسرائیلی جارحیت کو امنِ عالم کے لئے ایک چیلنج تصور کرتی تھیں۔ کسی کام میں بھی سچائی کے خلاف مصلحت بینی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ شاعری کی طرح خوش نویسی کا فن بھی دیدہ و دل کا خون مانگتا ہے، جن لوگوں نے یہ نذر پیش کی انھیں کمال نصیب ہوا۔ محترمہ نے اس فن سے اپنی والہانہ لگن کی بدولت گھر کی چہار دیواری میں رہ کر وہ عزت و عظمت حاصل کی جو کسی بھی مسلمان خاتون کے لئے باعثِ رشک ہو سکتی ہے، لیکن محض رشک کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، وہ عظمت حاصل کرنے کے لئے عظیم کام کا جذبہ اور حوصلہ شرط ہے۔ کتنی بابرکت ہوتی ہیں وہ ہستیاں جن کے دم سے جہل کو عرفان، غلامی کو آزادی، اور بدی کو نیکی سے ہمکناری حاصل ہوتی ہے، اس قابلِ احترام خاتون نے ۸۴ سال کی عمر پائی تھی۔ اور ۱۹ دسمبر ۱۹۶۷ء منگل کے روز مطابق ۱۶ رمضان المبارک بوقت ساڑھے بارہ بجے رات کو کراچی میں یوم بدر کو اپنی زندگی کا آخری سانس لیا اور داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۱]

[۱] کتابی دنیا کراچی نومبر دسمبر ۱۹۷۱ء

مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنے اخبار "صدق جدید" لکھنؤ میں محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کی وفات کے بعد اُن کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:

"فاطمۃ الکبریٰ پاک و ہند کی مشہور ترین عربی خطاطہ ہیں مرحومہ کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تین حمائلیں چھپ چکی ہیں، ایک "فتح الحمید" کے نام سے مشہور ہے، دوسری ان کے ایک عزیز نے چھپوائی تھی اور تیسری خود انھوں نے چھپوائی۔ یہ تینوں حمائلیں عربی خطاطی کا بہترین نمونہ ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے پنجسورے اور دہ سورے بھی لکھے تھے۔ انھوں نے مرحومہ حضرت بیگم بھوپال کو اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پنجسورہ بھی پیش کیا تھا، جس کی قدردانی انھوں نے یوں کی کہ مرحومہ کے لئے جڑاؤ پہنچیاں بھیجیں، ایک پنجسورہ حضور نظام کے لئے بھی لکھا گیا تھا اور نظام نے ان کے لئے تاحیات منصب مقرر کر دیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا کفایت اللہ وغیرہ مرحومہ کے فن کے بڑے قدردان تھے، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان حمائلوں اور پنجسوروں کو ان کے لئے وسیلۂ نجات بنائے۔ آمین۔"

بابو مدن گوپال ایڈوکیٹ

بابو مدن گوپال کے والد ماجد منشی رام نرائن تھے، یہ ماسٹر پیارے لال آشوب کے چھوٹے بھائی تھے، انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور ایم۔اے کا امتحان دہلی کالج کے طالب علم کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی سے دیا۔ تمام ہندوستان میں ان کا تیسرا نمبر تھا۔ بابائے اردو علامہ عبدالحق صاحب اپنی تالیف "مرحوم دہلی کالج" میں تحریر کرتے ہیں:

"مدن گوپال دہلی کالج ہی کے طالب علم تھے، لیکن کالج ٹوٹنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے میں کامیاب ہوئے۔"

علامہ صاحب کی یہ رائے درست نہیں ہے کہ مدن گوپال صاحب نے دہلی کالج کے ٹوٹنے کے بعد ایم اے کا امتحان دیا۔ کالج ۱۸۷۷ء میں ٹوٹا ہے اور بابو مدن گوپال نے امتحان ۱۸۷۳ء میں دیا ہے، چنانچہ "اکمل الاخبار" دہلی کے شمارے ۱۶ر اپریل ۱۸۷۳ء میں بابو صاحب کے امتحان میں پاس ہونے، اور اس سلسلے میں سائم صاحب پرنسپل دہلی کالج نے جو تقریر کی تھی اس کو نقل کیا ہے:

"حکم چند کا جانشین لالہ مدن گوپال ایم۔اے آنرز کے امتحان انگریزی زبان میں دوسرے درجے میں کامیاب ہوا۔ اس کا ہندوستان میں تیسرا نمبر ہے، بھروسے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر علم زبان کا کاغذ اس لحاظ سے بنایا جاتا کہ شمالی ہندوستانی طالب علم ایم۔اے کا امتحان دے رہے ہیں تو مدن گوپال اول درجے میں اول نمبر رہتا۔ ممتحن صاحب نے یہ خیال نہیں کیا کہ یہ شخص عربی دان ہے اور ان کے سوال سنسکرت سے متعلق تھے۔ اس وجہ سے یہ شخص تیسرے نمبر پر رہا۔ پھر بھی اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جو طالب علم ہمارے ہاں سے گیا وہ پاس ہوگیا۔ اگر کوئی اور طالب علم ہوتا تو اس سیوم نمبر کو بھی فخر کا باعث سمجھتا۔ اس شخص کی لیاقت

کے سبب سے پنجاب یونیورسٹی کمیٹی کے رکن نے سفارش کی ہے کہ اس کو "پنجاب میکلوڈ فیلوشپ" ملے۔ میں یہ بھی خوشی سے بیان کرتا ہوں کہ اس شخص نے اس بات پر کمر باندھی ہے کہ پریم چند رائے کا امتحان آئندہ سال میں دے۔ اس سے بڑھ کر کوئی درجہ ہندوستان میں نہیں ہے، مجھ کو قوی امید ہے کہ یہ شخص اس کو بھی حاصل کرے گا۔۔ جس وقت کرنیل ینگ صاحب نے لالہ مدن گوپال کو تمغہ دیا تو یہ کہا۔۔ "تم شہر دہلی کی عزت ہو، تم کو تمھاری کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں" بعدہٗ انھوں نے انگریزی زبان میں ایک تقریر کی، جس میں حکم چند اور مدن گوپال کو سند ملی تو ینگ صاحب نے فرمایا، آؤ ہم تم سے ہاتھ ملائیں۔"

اس مسرت میں "اکمل الاخبار" بھی شامل ہوا۔ اور اس نے اپنی خوشی و مسرت کا ان الفاظ میں اظہار کیا:

" اکمل الاخبار۔ ہم یہ اتحاد دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اس جلسے میں بہت سے صاحبان انگریز اور میم صاحبہ لالہ مدن گوپال سے گفتگو کر رہے تھے، اگر ایسے چند اور مواقع ہو، تو ہندوستانیوں کی اور انگریزوں کے ارتباط کی شکل اور ہی کچھ نظر آئے۔"

دہلی سوسائٹی کے سرگرم ممبر بابو مدن گوپال صاحب بھی تھے جو سوسائٹی کی مٹنگوں میں شامل ہوتے تھے۔ علمی بحثوں اور اس وقت کے اصلاحی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس زمانے میں دو تین اصلاحی مسئلے بڑی اہمیت رکھتے تھے، غیر ممالک کا سفر، بیوہ عورتوں کی شادی، چھوٹی عمر کی شادی، اور تعلیم نسواں۔ مصلحین قوم ان مسائل پر بڑی توجہ دیتے تھے، چنانچہ ۹ فروری ۱۸۷۵ء کی سوسائٹی کی مٹنگ میں لالہ رام کشن داس کا مضمون "شادی صغرسنی"، پڑھا گیا۔ مضمون سنانے کے بعد ممبران نے اس پر تبصرہ کیا، جس میں بابو مدن گوپال نے بھی حصہ لیا۔[۱]

ماسٹر سری رام صاحب ایم۔ اے نے فرمایا مضمون بہت عمدہ ہے مگر مضامین لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، اس پر عمل بھی ہو تو کچھ فائدہ ہے، اگر دو چار آدمی مل کر اس میں پیش قدمی کریں

[۱] رسالہ دہلی سوسائٹی جنوری ۱۸۷۲ء لغایت جون ۱۸۷۲ء

تو مناسب ہے اس پر لالہ مدن گوپال صاحب ایم۔ اے نے فرمایا کہ ابھی ایسی تہذیب نہیں ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ابھی تو صرف مضامین لکھے جائیں۔ اس کے بعد لالہ لچھمن داس صاحب اسسٹنٹ سکریٹری نے رائے دی کہ فوائد تو بڑی عمر میں شادی کرنے کے سب پر روشن ہیں مگر اس پر کوئی عمل نہیں کرتا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں جو کہ اس کے فوائد سے آگاہ نہیں ہیں اور وہ اپنے شوہروں کو اپنے بچوں کی چھوٹی عمر میں شادیاں کرنے پر مجبور کرتی ہیں، یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ یہ مضمون چھاپا جائے اور عورتوں کو پڑھایا جائے۔ تاکہ وہ بھی آگاہ ہو جائیں۔

۲۹ فروری ۱۸۷۶ء کی میٹنگ میں سوسائٹی کے سکریٹری پادری تاراچند کا استعفیٰ پیش ہوا۔ منظوری کے بعد رائے صاحب سنگھ نے لالہ مدن گوپال صاحب کا نام سکریٹری کے لئے پیش کیا، جو منظور کر لیا گیا۔ اور طے پایا کہ ان کو انگریزی چٹھی کے ذریعے اس تقرری کے بارے میں مطلع کیا جائے۔

بابو مدن گوپال کا اس زمانے میں ترقی پسند لوگوں میں شمار تھا، نقصان دہ رسموں کے سخت مخالف تھے، چنانچہ ۲۶ر اگست ۱۸۷۶ء کی سوسائٹی کی میٹنگ میں انھوں نے ایک کتاب "رتناکر شیشو" مصنفہ پنڈت بشیشر ناتھ صاحب پیش کی۔ اور ممبران کو بتایا کہ پنڈت صاحب نے بواسطوں سے ثابت کیا ہے کہ ہندوؤں کو سمندر کے پار جانے کی کسی طرح ممانعت نہیں ہے، میرے نزدیک ایسی کتاب آج کل کے زمانے میں جب کہ نوجوان لوگ انگلستان جانے کے لئے راضی ہیں اور ہر قسم کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کتاب بڑا کام دے گی۔ اور ان لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ سمندر پار جانا دھرم کھونا ہے، سیدھے راستے پر لے آئے گی۔ کرنیل ڈبلیو جی ڈیوس صاحب بہادر کمشنر دہلی پریسیڈنٹ نے فرمایا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو گورنمنٹ میں بھیجیں۔ اس کے بعد بابو مدن گوپال صاحب نے کہا، میری رائے میں سوسائٹی کی طرف سے اس کا اردو میں ترجمہ ہونا مناسب ہوگا —— سب ممبران نے اس کی تائید کی۔[1]

اسی میٹنگ میں بابو مدن گوپال صاحب نے اپنا ایک مضمون "معلم زبان" پڑھا، جس میں بتایا تھا کہ جس وقت دنیا میں زبانیں رائج نہیں تھیں تو انسان کی حالت کیا تھی، دنیا میں کس طرح

[1] رسالہ دہلی سوسائٹی جولائی ۱۸۷۶ء لغایت دسمبر ۱۸۷۶ء

زبان پھیلی اور کس زبان کا کس زبان سے قریبی تعلق ہے، چنانچہ انھوں نے اہل فارس اور اہل ہند کو ایشیا میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے، اسی وجہ سے فارسی و سنسکرت میں بڑی مناسبت پائی جاتی ہے۔

یہ مضمون بڑا معلوماتی و علمی تھا۔ سنانے کے بعد اس پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ رائے جیون لال صاحب نے کہا جو کچھ بابو مدن لال صاحب نے لکھا ہے وہ درست ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں دو لڑکوں کو تنہائی میں رکھا گیا اور ان کی دائی کو حکم دیا کہ ان کے سامنے کوئی لفظ نہ بولیں، جب یہ لڑکے بڑے ہوئے تو بالکل گونگے تھے۔ اور اپنا مطلب انگلیوں اور اشاروں سے ادا کرتے تھے۔ منشی حکم چند صاحب نے کہا فارسی اور سنسکرت میں البتہ بڑی مناسبت پائی جاتی ہے مگر اس کا سبب کیا ہے کہ عربی اور فارسی اور سنسکرت کے الفاظ ایک سے نہیں۔ اس کا جواب بابو مدن گوپال صاحب نے دیا کہ میرے مضمون سے صاف واضح ہے کہ عربی دوسری خاندان کی شاخ ہے اور سنسکرت اور فارسی ایک خاندان سے متعلق ہے۔

اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگی کہ ماسٹر پیارے لال کے خاندان کے افراد نے دہلی سوسائٹی کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور اس کے مقاصد کو پھیلانے کے لئے کافی کوشش کی ہے اس خاندان کے افراد میں ماسٹر چندو لال اور بابو مدن گوپال بھی تھے، جنھوں نے سوسائٹی کے سکریٹری کے فرائض انجام دئے۔

بابو مدن گوپال نے الہ آباد کی سند وکالت ہائی کورٹ حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں وکالت شروع کی۔ پھر ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئے اور لاہور میں وکالت کا سلسلہ جاری کیا، پنجاب و دہلی کے سربرآوردہ وکیل سمجھے جاتے تھے۔ کئی قانونی کتابیں ریونیو ایکٹ، پنجاب ٹیننسی ایکٹ لکھیں، پروفیسر جیوانز کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا، پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے زمانے میں ڈاکٹر لیٹنر کے بڑے معین و مددگار تھے۔[1]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" بابو مدن گوپال صاحب کی مزید تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۱۷۰

"آنریبل رائے بہادر مدن گوپال صاحب ایم اے بیرسٹرایٹ لا کس پایہ کے لائق ہوئے کہ اردو میں صرف علم منطق پر ہی نہایت عمدہ رسالہ نہیں لکھا، بلکہ قانونی کتابوں کے ترجمے کے علاوہ میونسپل ایکٹ، کورٹ ایکٹ، ایکٹ مزارعان پنجاب، ایکٹ لگان پنجاب، لوز ایکٹ پنجاب وغیرہ بناکر تیار کر دئے اور اپنی روشن دماغی اس قدر ثابت کی کہ آپ متواتر چھ سال تک پنجاب لیجسلیٹو کے ممبر رہے اور اپنی حسن کارگذاری سے رعایا اور حکام دونوں کو راضی رکھا، چیف کورٹ ججی کے علاوہ ویسرائے کی کونسل میں داخل ہونے والے تھے کہ اکیاون برس کی عمر میں چل بسے"[1]

بابو مدن گوپال صاحب کے صاجزادے لالہ سری رام صاحب مؤلف "خم خانہ جاوید" تھے جو ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تعلیم دہلی اور لاہور میں ہوئی، ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ایم اے کی ڈگری انگریزی میں حاصل کر کے منصف کے عہدے پر فائز ہوئے، رجحان ادب کی طرف تھا، اس لئے ۱۹۰۴ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور اردو ادب و شاعری کی خدمت کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

لالہ سری رام صاحب خود شاعر نہیں تھے لیکن بے نظیر سخن فہم، سخن شناس اور شاعر نواز تھے۔ مشہور شاعروں کے ادبی تعلقات اور ان کے حلقۂ تلامذہ کے بارے میں جو تحقیق اور واقفیت ان کی تھی، ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، شعر میں مضمون کی چوری اس پھرتی سے پکڑتے تھے کہ پرانے استاد دنگ رہ جاتے تھے۔ کوئی دیوان یا مجموعہ کلام یا اردو نظم کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو ان کے کتب خانے میں نہ ہو۔ اور ان کی نظر سے نہ گذری ہو۔[2]

لالہ سری رام صاحب کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی اور عقل کا نچوڑ ہوتا تھا۔ دیدہ و دل دونوں ان سے شاداب ہوتے تھے۔ بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کے کلام و بیان میں ایسا چلتا ہوا جادو ہوتا ہے کہ سننے والا مسحور و محو و مستغرق ہو جائے، اس لحاظ سے لالہ سری رام کا نام سر تیج بہادر سپرو،

[1] محاکمہ مرکز اردو ص ۱۵ [2] خم خانہ جاوید جلد پنجم

ڈاکٹر سچدانند سنہا اور سر راس مسعود کے ساتھ لیا جا سکتا ہے، یہ لوگ لاجواب خوش تقریر تھے، گفتگو کے وقت چھا جاتے تھے اور باتوں باتوں میں ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑتے تھے کہ بات چیت باغ و بہار ہو جاتی تھی، بولنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی جادو بیانی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ پرانے سے پرانے واقعات اور چٹکلوں کو ایسے انداز سے پیش کرتے تھے کہ وہ نئے اور پر تاثر بن جاتے تھے۔[۱] لالہ صاحب متواتر شستہ ٹکسالی اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے احباب اور واقعات زندگی کی ایسی مکمل تصویر پیش کرتے تھے کہ ان کی قدرت زبان پر حیرت ہوتی تھی، بات بات میں اردو کے برموقعہ اشعار موتیوں کی طرح ٹانکے چلے جاتے تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا ہزاروں اشعار ان کی نوک زبان پر تھے۔ اس لحاظ سے کسی کا شیوہ گفتار میں ان سے میدان مارنا آسان کام نہ تھا۔

ادب نوازی کا یہ عالم تھا کہ انور دہلوی کا دیوان طالب علمی کے زمانے میں حاصل کر کے شائع کر دیا تھا، اگر یہ دیوان نہ چھپتا تو انور جیسے نغز گفتار شاعر کا کلام تھوڑا بہت لوگوں کو یاد رہتا۔ باقی کلام ناپید ہو جاتا۔ مہتاب داغ کو معقول رقم دے کر خریدا، اور اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔ یادگار داغ کے بعد مرزا داغ کا جو کلام منتشر حالت میں تھا "ضمیمہ یادگار داغ" کے نام سے طبع کرا کر شائع کیا۔[۱] مرزا محمد تقی بیگ مائل کا مجموعہ مرتب کیا۔ ان کے ادب نوازی کے کئی طریقے تھے، ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جس نومشق شاعر کو دیکھتے کہ اس نے اچھی طبیعت پائی ہے، اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ معاش کا بندوبست کرتے۔ شہر اور باہر کے مشاعروں میں اسے ساتھ لے جاتے، ادبی حلقوں میں تعارف کراتے، اکثر ایسا بھی ہوا، کہ کسی شخص نے اپنی تالیف یا تصنیف دکھائی اور ان کو پسند آ گئی تو اس کی طباعت کے لئے مدد کر دیا کرتے تھے۔

لالہ سری رام دوستی کو بڑے اخلاص کے ساتھ نبھاتے تھے۔ ہمدرد اور فیاض انسان تھے، بہت سی بیواؤں اور یتیموں اور نادار طلباء کی معقول مدد کرتے تھے، اور وصیت میں بھی اس کا لحاظ رکھا تھا۔ احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ دہلی کی مشہور و معروف ہستی حکیم اجمل خاں اور ان کے عزیز، والیٔ خاندان لوہارو، مولانا الطاف حسین حالی، سید احمد صاحب دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ"، آغا شاعر

[۱] نقوش لاہور کا شخصیات نمبر دوم، مضمون ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ص ۱۳۱۱

دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن راسخ اور شہرۂ آفاق اینگلو انڈین شاعر اور ناول نگار کپلنگ وغیرہ آپ کے دوستوں میں تھے۔ کپلنگ کے مراسم اور تعلقات کا ذکر بڑی مسرت سے کیا کرتے تھے، کپلنگ نے دہلی میں انہی کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔

لالہ سری رام کا کتب خانہ ادب اور آرٹ کا عجائب گھر تھا۔ فارسی، عربی، اردو اور ہندی کی کتابیں ہزاروں تھیں۔ قلمی کتابیں بھی سینکڑوں تھیں۔ ان میں بہت سی باتصویر تھیں۔ ایک بڑی تعداد ان کتابوں کی تھی جو کمیاب اور نایاب تھیں۔ یہی کیفیت قلمی تصویروں کی تھی۔ خطاطی یعنی مختلف رسم الخط کے نمونے قطعوں، وصلیوں اور مرقعوں کی شکل میں کافی تھے۔ پرانے شاہی فرمانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔

انھوں نے انتقال سے قبل وصیت کی تھی، اس کے مطابق یہ کتب خانہ بنارس یونیورسٹی کو دیا گیا اور تمام کتابیں فہرست میں باقاعدہ درج ہو کر لائبریری کے ایک کمرے میں رکھی گئیں۔ اب اس کی کیا حالت ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

لالہ سری رام صاحب کا تاریخی کارنامہ "تذکرہ "خم خانہ جاوید" ہے، یہ اردو شاعروں کا جامع تذکرہ ہے۔ اس کی چار جلدیں وہ اپنی زندگی میں شائع کر گئے تھے اور باقی جلدوں کا میٹر فراہم کر کے ان کی اشاعت کا انتظام کر گئے تھے، تذکرہ کی تکمیل کا اہتمام بھی وصیت میں کیا تھا اور اس کی ترتیب وغیرہ کے لئے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کو نامزد کیا تھا، چنانچہ کیفی صاحب نے تذکرہ "خم خانہ جاوید" کی پانچویں جلد مرتب کر کے ۱۹۴۰ء میں چھپوائی۔ وصیت کے خلاف عدالتی کارروائی ہوئی۔ اس میں یہ معاملہ الجھ گیا اور بقایا جلدیں طبع نہ ہو سکیں۔

ان کے عمر کے آخری سال بیماری کے رنج و غم اور درد و عذاب میں بسر ہوئے۔ خانگی تنازعوں نے ان کی خوشیوں کے سوتوں پر خاک ڈال دی تھی، ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو وفات پائی[۱]۔

---

[۱] نقوش کا لاہور نمبر ص ۹۳۰

مولوی سیّد محمود بخاری امام جامع مسجد دہلی

سید محمود بخاری ابن سید محمد بخاری ابن سید احمد علی بخاری ابن امیر جیون بخاری ابن سید عبد الکریم بخاری ابن سید عبد الرحمٰن بخاری ابن عبد الغفور شاہ بخاری ثانی ابن سید عبد الشکور بخاری ابن سید عبد الغفور بخاری کے مورث اعلیٰ سید جلال الدین بخاری تھے۔

سید عبد الغفور اپنے وقت کے مشہور اولیاء اللہ تھے، ۱۶۵۵ء میں جب جامع مسجد بن کر تیار ہوگئی تو شاہ جہاں بادشاہ نے سید عبد الغفور شاہ کا شہرہ سن کر شاہ بخارا کی معرفت طلب کر کے منصب امامت جامع مسجد پر ممتاز کیا۔ بادشاہ نے جامع مسجد میں پہلی نماز دوگانہ عید الفطر امام صاحب کی اقتداء سے ادا کیا، پھر اپنے دستِ خاص سے خلعت بیش بہا، خطاب امام السلطان اور جاگیر شاہی عطا کی۔ امام صاحب کو تمام علماء میں تقدم اور تکلم میں خطاب خاص سے مخاطب کیا جاتا تھا، اور شاہی مخصوص لباس کے ساتھ وزراء اور امراء کی طرح باریابی ہوتی تھی۔

عالمگیر بادشاہ نے اپنے عہد میں امام صاحب کے سابقہ اعزاز میں یہ مزید اضافہ کیا کہ اپنی تخت نشینی اور تاج پوشی کی رسم انہی کے ذریعہ ادا کرائی۔ یہ دستور بہادر شاہ کے وقت تک قائم رہا، چنانچہ بہادر شاہ کی رسم تاج پوشی امام وقت میر احمد صاحب کے ہاتھوں ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سید محمد صاحب خلف میر احمد صاحب جو سر سید احمد خاں دہلوی کے خالہ زاد بھائی تھے امام مقرر ہوئے۔ سید محمد صاحب کے صاحبزادے سید محمود بخاری، سید احمد بخاری اور سید حامد بخاری ہوئے۔

سید محمود بخاری ۱۴ رشوال ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے علماء سے دینی علوم تحصیل کئے، عربی فارسی بہترین جانتے تھے، شعر و شاعری سے بچپن سے شوق تھا اور فن عروض میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فن عروض پر جو کتابیں اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں، ان میں زحافات کی تشریح واضح

نہیں کی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آپ نے ایک کتاب "منتہی العروض" اور اس کے ساتھ "مثنوی تحفۃ الشعراء" تالیف کی، جو ۱۸۸۳ء، مطابق ۱۳۰۰ھ میں مطبع چشمۂ فیض دہلی میں باہتمام منشی مہاراج چھپی۔

رسالہ "منتہی العروض" نثر میں ۶۶ صفحات پر اور "مثنوی تحفۃ الشعراء" نظم میں ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے، ان دونوں کے صفحات ملا کر ۸۶ صفحات ہوتے۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے کورس میں داخل تھی[1]۔

"منتہی العروض" و "مثنوی تحفۃ الشعراء" کی تالیف کا سبب جناب سید محمد صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے:

"واضح ہو کہ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل تعلیم میں عروض بھی داخل ہے اور طلباء یونیورسٹی کے سوا اکثر نا لقین شعراء کو بھی اس کی خواہش رہتی ہے مگر باوجود پڑھنے اور محنت کرنے کے عروض کے مسائل ان کے ذہن نشین نہیں ہوتے۔ سبب اس کا سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ جس قدر اردو زبان میں اس فن کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں زحافات کا بیان جو سخت ضروری ہے اور عروض کی جان ہے وہ نہایت قاصر اور غیر منقسم ہے، اردو کے تمام مؤلفین نے زحافات کے بیان میں دو قسم کی فروگذاشت کی ہے۔

"ایک یہ کہ ہر ایک زحافات کی تعریف جداگانہ بطور فہرست کے لکھی ہے اور ایک زحاف کو دوسرے زحاف سے کچھ ربط نہیں دیا اور ان کے باہمی تعلقات کو کچھ بیان نہیں کیا۔ اور کسی قاعدہ کے تحت میں ان کو ضبط و انحصار کے ساتھ نہیں لکھا۔ اور اسی باعث سے ہر ایک شخص کو ان کا فرداً فرداً یاد کرنا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے، اگر ان زحافات کو کسی قاعدے کے تحت میں ضبط و انحصار سے بیان کرتے تو یہ دقت رفع ہو جاتی اور زحافات کے یاد کرنے میں نہایت سہولت ہو جاتی...

"علم عروض ایک ایسا علم ہے جس کی ہر شاعر کو موزوں طبع ہو یا نہ ہو ضرورت ہے اگر موزوں بھی شاعر ہے، یہ ممکن نہیں کہ وہ ناموزوں شعر کہے مگر جو بحریں آب لس

[1] یہ دہلی ہے ص ۸۹

میں مشابہ ہیں اور جنھیں تفاوت قدر قلیل ہے، ان میں موزوں طبع شاعر سے یہ ممکن نہیں کہ وہ ناموزوں شعر کہے۔ عظیم بیگ عظیم نے جو سودا کے شاگرد ہیں۔ اور مشاق شاعر ہیں یہی دھوکا کھایا ہے، ان کی غزل جس کے بعض شعر بحر رجز میں اور بعض رمل میں۔ علاوہ اس کے موزوں طبع شاعروں کو بھی یہ قدرت حاصل نہیں ہوتی کہ وہ جس بحر میں چاہیں شعر کہیں۔ وہ تمام بحروں پر حاوی نہیں ہوتے بلکہ صرف انہی چند مروجہ بحروں میں جن سے ان کے کان اور طبائع آشنا ہیں قدرت رکھتے ہیں۔ اور باقی غیر مروجہ بحروں میں جو ان کے طبائع غیر مانوس ہیں، قادر نہیں ہوتے۔ بعض بحریں ایسی سخت ہیں کہ ان میں شعر کہنا تو در کنار موزوں پڑھنا بھی دشوار ہے۔ سعدی کے اس شعر کو ؎

دانی چہ گفت مرا آن بلبل سحری

تو خود چہ آدمیٔ کز عشق بے خبری

" جس سے سنا دانی کہ چہ گفت پڑھتے سنا اور اکثر گلستاں کے سخنوں میں بھی اسی طرح لکھا دیکھا، اگر چہ کاف کے بڑھانے سے شعر ناموزوں ہو جاتا ہے مگر اس سبب سے کہ یہ بحر غیر مروجہ ہے اور طبائع اس سے ناآشنا ہیں، موزوں طبع شاعروں کو بھی اس کی ناموزونیت کی خبر نہیں ہوتی اور نیز جب تک تمام بحور کے ارکان اور ان کی ترکیب اور ان کے زحافات معلوم نہ ہوں، تقطیع حقیقی اور غیر حقیقی میں امتیاز ممکن نہیں۔"

مثنوی تحفۃ الشعراء میں حمد و ثنا، نعت رسول کے بعد شعر کی تعریف کی ہے اور اس کے بعد ارکان کے اجزا، ارکان کی ترکیب، بحروں کے نام، بحروں کے ارکان، بحروں کی قسمیں اور بہت سے اجزا زحافات کی تعریف مع امثلہ و محل استعمال اور رباعی کا بیان منظوم کیا ہے۔ ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا کروں حمد ایزد متعال — راہ دور اور فکر بے پر و بال
عقل یہاں گم ہے، نارسا ہے بیاں — نطق الکن، اور لال زبان
تھک اس راہ سے پھرے کتنے — چل کے یاں سر کے بل گرے کتنے

کس کو دعویٰ ہے وصف سبحان کا　　　تنگ یہاں قافیہ ہے سبحان کا

جبکہ فرمائے شان میں اس کی　　　سید جن و انس لا احصی

مولانا الطاف حسین حالی نے اس کتاب پر تقریظ لکھی تھی، جس کے آخر میں فرماتے ہیں :

"جہاں تک رسالہ منتہی العروض کو میں نے دیکھا ہے، میرے نزدیک وہ اکثر اعتبار سے ان دونوں تعریفوں کا مستحق ہے، بظاہر اس رسالے میں عروض کی کوئی ضروری بات فروگذاشت نہیں ہوئی اور زحافات کا بیان جو اکثر فارسی رسالوں میں بھی پورا پورا بیان نہیں ہوا۔ اس رسالے میں بوجہ استیفا لکھا گیا ہے، پھر زحافات کا باب جو اکثر کتابوں میں نہایت منتشر طور پر لکھا گیا ہے، اس رسالے میں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسے ضبط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اس کے یاد کرنے میں میرے نزدیک ضرور مدد دے گا۔ مثنوی کی نسبت یہ لکھنا کافی ہے کہ نظم میں عروض یا کسی اور فن کا بیان کرنا جس قدر دشوار ہے وہ سب پر ظاہر ہے، باوجود اس کے مصنف نے بہت صفائی اور بے تکلفی سے عروضی مباحث اس میں بیان کئے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ اس صاف و شفاف نظم کے ذریعے سے طلباء کو عروض کی ضروری باتیں بہ آسانی یاد ہو سکیں گی۔"

محمود صاحب کی دلی تمنا اور خواہش تھی کہ حجاز مقدس پہنچے۔ اور وہیں فوت ہوں۔ دہلی کے قیام کے زمانے میں وہ جامع مسجد کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ ۱۳۰۴ھ میں ہجرت کر کے حجاز پہنچے اور مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی، چار پانچ حج کئے اور ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو مکہ معظمہ میں فوت ہوئے[1] اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔

سید محمود بخاری صاحب کے دو فرزند سید مسعود بخاری اور سید سعید بخاری اور تین صاحبزادیاں فاطمہ بیگم، سعیدہ بیگم اور صغریٰ بیگم ہوئیں۔ سید مسعود لاولد فوت ہوئے۔ سید سعید برطانیہ کے زمانے میں محکمہ بی اینڈ ٹی میں ملازم تھے، قیام پاکستان کے بعد لاہور اور بعد میں کراچی چلے گئے، ریٹائرڈ ہو کر،

[1] یہ دہلی ہے ص ۱۱۷

آج کل 116/E جہانگیر روڈ ویسٹ کراچی میں مقیم ہیں، صاحب اولاد ہیں۔ فاطمہ بیگم صاحبہ حیات ہیں، ان کے شوہر محمد فداء اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے فرزند تھے۔ کئی سال ہوئے کراچی میں انتقال ہوا۔ للعولہ گذرے

جناب امام سید احمد بخاری کو اردو اور فارسی کے مشہور شعراء کے اکثر اشعار یاد تھے، وہ ادبی مجالس اور خاص خاص مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے، میل ملاقات اور علم مجلسی میں اس درجہ یگانہ تھے کہ جس سے ایک مرتبہ ملاقات ہوجاتی، اسے اپنا بنا لیتے، جس محفل میں جا بیٹھتے اپنی دل کش باتوں سے مجلس کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے، مخصوص احباب میں سے جو گھر آتے ان سے کافی دیر تک تبادلہ خیال کرتے، بعض اوقات اکابرین کے تاریخی حالات و واقعات اس طرح بیان کرتے گویا ان کے مخاطب کے سامنے تاریخ کا کوئی باب کھلا ہوا ہو۔ آپ کو حکومت برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا ہوا تھا، آپ کی کوئی تصنیف نہیں ہے، لیکن ایک غیر مطبوعہ "یورپ کا سفرنامہ" تھا جو انھوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں اپنے سفر یورپ کی یادگار میں لکھا تھا، جو تلف ہوگیا۔ اس کے علاوہ ان کے گھریلو روزنامچے اور مختلف یادداشتیں جن کو وہ آخر وقت تک بالالتزام لکھتے رہے۔ ان کے مسودات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو امامت کے پنج وقتہ فرائض اور دوسری مصروفیات سے وقت اور فرصت ملتی اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً صنف ادب میں ان کی کوئی نہ کوئی یادگار ضرور ہوتی۔ آپ دہلی میں ۹ اور ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کی درمیانی شب کو فوت ہوئے اور بائیں جانب زیر دروازہ شمالی جامع مسجد میں سپرد خاک ہوئے۔

امام سید احمد صاحب کی پہلی اہلیہ بنت مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" سے جناب سید حمید بخاری صاحب اور دوسری اہلیہ خدیجہ بیگم بنت مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی سے سید رشید بخاری، سید بشیر احمد اور سید عزیز احمد اور ملکہ بیگم زوجہ خواجہ رحمت اللہ ہوئیں۔ ——— امام سید حمید صاحب کو علمی ذوق ہے اور تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ ہے، چنانچہ آپ کی تصانیف "فلسفہ تعلیم الاسلام" اور "سواطع القرآن" ہے۔ آپ جامع مسجد کی امامت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ ان کے دو صاحبزادے سید عبداللہ بخاری اور سید عبیداللہ بخاری اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ سید عبداللہ بخاری نائب امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اور سید عبید اللہ بخاری کو ادبی ذوق ہے، خسرو شاعری سے بھی تعلق ہے اور عمدہ شعر کہتے ہیں۔[1]

امام سید حامد بخاری اپنے بڑے بھائی امام سید احمد صاحب کی نیابت کرتے تھے اور ان کو میر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد امیر الدین خطاط سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ خط نسخ کے ایک ماہر خطاط تھے، ان کے خط کا نمونہ جناب یوسف بخاری صاحب کی کتاب "خطاطی اور ہمارا رسم الخط" میں موجود ہے۔ جناب سید حامد بخاری کی چودہ اولادوں میں سے جناب یوسف بخاری، سید محمد بخاری اور سید محمود بخاری زندہ رہے۔

جناب یوسف بخاری صاحب دہلی میں یکم اکتوبر ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں، لیکن خاندانی روایات کے باعث علوم السنہ شرقیہ سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے خانگی اور نجی طور پر منشی فاضل کا امتحان دیا۔ اردو ادبیات کا شروع ہی سے شوق تھا۔ ابتدا میں ترجمہ اور افسانہ نگاری کی طرف رجحان تھا، بعد ازاں انشاء پردازی کی شاہراہ اختیار کی۔ ان کی پہلی کتاب "موتی" ہے، بعد میں آپ نے (۲) یہ دہلی ہے (۳) بازگشت (۴) جھلکیاں (۵) شہزادہ گوہر (۶) نیلم جوہری (۷) فقیروں کا بادشاہ (۸) کامیاب لڑکا (۹) خطاطی اور ہمارا رسم الخط (۱۰) رسوم دہلی (۱۱) ہماری پہیلیاں (۱۲) سرور غالب' تالیف و تصنیف کیں۔

۱۹۳۶ء میں ان کے دل میں قومی خدمات کا جذبہ موجزن ہوا، چنانچہ آپ پروونشل مسلم لیگ دہلی کے کئی سال تک جوائنٹ سکریٹری اور آفس سکریٹری رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسل کے بھی رکن رہے اور قیام پاکستان کے بعد کراچی میں بھی نواب زادہ لیاقت علی کی وفات تک مسلم لیگ میں حصہ لیتے رہے، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلم لیگ کی مختلف تحریکوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۶ء میں آزاد ہند فوج کے کپتان عبدالرشید کی سزا پانے کے خلاف مظاہرے کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور جیل کی چار دیواری میں بند کیے گئے۔

[1] حجاز مقدس کے اردو شاعر ص ۲۵۵

اپریل ۱۹۵۹ء میں یوسف بخاری صاحب کا ان کی علمی لیاقت اور سابقہ ادبی خدمات اور تجربات کے پیش نظر ترقی اردو بورڈ کراچی میں تقرر کیا گیا۔ انھوں نے معاون مشیر ادبیات، ٹیکنیکل اسسٹنٹ اور قرطاس نویس کی حیثیت سے کام کیا۔ ترقی اردو بورڈ کی ایما پر انھوں نے مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور کتاب "رسوم دہلی" کی از سر نو تدوین کی اور مقدمہ نگاری اور ترتیب فرہنگ کا کام انجام دیا۔ ترقی اردو بورڈ کی شائع شدہ مطبوعات جذبات نادر، مراۃ العروس، منتخب الحکایات، منازل السائرہ اور بچوں کی کہانیوں کی طباعت ان کی نگرانی میں ہوئی۔ اردو نامہ سہ ماہی کی ترتیب، طباعت و اشاعت کا فرض انجام دینے کے علاوہ انھوں نے کئی عمدہ مضامین لکھے، ۱۹۶۹ء میں آپ نے حج کیا، حجاز مقدس میں آپ سے راقم الحروف امداد صابری سے ملاقات ہوئی۔ اور کافی وقت ان کے ساتھ گذرا۔

جناب یوسف بخاری صاحب کی اہلیہ سعیدہ خاتون کا انتقال ۷ اپریل ۱۹۶۶ء کو کراچی میں ہوا۔ اس کے بعد سے آپ شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے، تھوڑی سی مدت میں آپ کا کراچی کے اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ آپ اب تک تقریباً چھ سو اشعار پر مشتمل غزلیں اور قطعات کہہ چکے ہیں۔ ایک نظم جس کا عنوان "دہلی کو سلام ہے۔ ملاحظہ ہو[1]:

اے صبا کہیو میرا خسروِ خوباں کو سلام — ایک مہجور کا اس صاحبِ عرفاں کو سلام
نام سے جس کے ہے رونق پہ ابھی ہشت بہشت — اسی خسرو کو اسی ترکِ غزل خواں کو سلام
خاک میں جس کی پڑے سوتے ہیں خواجہ بائیس — ہاں اسی وادیِ فردوس بداماں کو سلام
آج بھی جس کی اذاں گونجتی ہے کانوں میں — مسجد جامع کی محرابِ درخشاں کو سلام
چوک[2] کو جس کے دیا خونِ شہیداں نے رنگ — اسی دلی کو اسی جانِ گلستاں کو سلام
جس کے کوچوں میں تھی اوراقِ مصور کی شبیہ — تیر مرحوم کے اس شہرِ نگاراں کو سلام

[1] حجاز مقدس کے اردو شاعر ص ۳۵۶

[2] چاندنی چوک

خاک نے جس کی نمایاں کئے کچھ لالہ و گل — غالبِ خستہ کے اس شہرِ خموشاں کو سلام
جس کے انفاس نے دی شعر کو اک تازہ حیات — مومن و داغ کے لب ہائے غزل خواں کو سلام
جس میں ہر ایک تھا اخلاص و وفا کا پیکر — اردو بازار کے اس مجمعِ یاراں کو سلام
وطنِ پاک کی خاطر جو سلاسل جھیلے — ان رفیقوں کو سلام، اس درِ زنداں کو سلام

جس کے خونِ تاب نے روشن کئے یادوں کے چراغ
یوسفِ زار کے اس اخترِ تاباں کو سلام[1]

---

[1] مجموعہ کلام، اختر انصاری

مولانا مظہر الدین صاحب "الامان" اور "وحدت" کے مدیر

حضرت مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد قصبے کے معروف و مشہور اہل علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم قصبے کے معروف استادوں سے پائی، اس کے بعد آپ دیوبند چلے گئے۔ اور مدرسہ دارالعلوم میں داخلہ لیا اور وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ آپ نے اس خیال سے کہ علمی قابلیت بڑھے اور لیاقت میں اضافہ ہو۔ کانپور اور علی گڈھ کے مسلم الثبوت اساتذہ مثل حضرت العلامہ مولانا احمد حسن کانپوری اور دیگر شہرہ آفاق علماء سے مزید تعلیم حاصل کی۔

آپ کی علمی استعداد اور خداداد قابلیت کو دیکھ کر مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب نے مدرسے میں درس و تدریس دینے کے لئے مقرر کیا۔ جہاں آپ نے عرصے تک تعلیم دی، اس کے بعد کانپور کے مدرسہ الٰہیات میں مدرسی پر مامور ہوئے۔

مولانا مظہر الدین صاحب کا بچپن سے ہی خدمت خلق اور اسلامی ہمدردی کا جذبہ تھا، اس لئے انھوں نے درس و تدریس سے علیحدگی اختیار کی اور صحافت کے میدان میں کود پڑے۔ آپ کا تقرر اخبار "الہلال" کلکتہ میں معاون مدیر کی حیثیت سے ہوا۔ آپ نے عرصے تک کلکتے کے مشہور و معروف حریت پرور اخبار "جمہور" میں بھی کام کیا جس کی ادارت قاضی عبدالغفار صاحب کرتے تھے۔

اخبار "مدینہ" بجنور کے مالک مولوی مجید حسن خاں صاحب نے مولانا کی ذہانت اور کارکردگی کی تعریف سنی، تو آپ کو اخبار مدینہ کی ایڈیٹری کے لئے بلوایا۔ اس زمانے میں اخبار مدینہ کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ مولانا کی زور قلم کا نتیجہ تھی۔

مولانا مظہر الدین صاحب فطرتاً آزاد طبع واقع ہوئے تھے۔ ملازمت کی زنجیروں میں جکڑنے کو

پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اپنا اخبار جاری کرنے کا، اور ان کا نظریہ تھا کہ قلم کا دور اور جذبات کا اظہار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خود مختار نہ ہو۔

چنانچہ مولانا مظہر الدین صاحب نے بجنور سے ۱۹۱۹ء کو ہفتہ وار اخبار "دستور" جاری کیا اور اس کی ادارت خود کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خلافت کی تحریک اور پہلی جنگ عظیم نے تلاطم پیدا کر رکھا تھا۔ اس وقت مولانا کا بے باک قلم چوکا نہیں اور دھڑلے سے نکتہ چینی کی۔ مولانا کو حکومت نے اپنے رعب اور دبدبے سے دبانا چاہا مگر مولانا بھلا کب استبدادی حکومت سے مرعوب ہو سکتے تھے۔ قلم برابر چلتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کی ضمانت حکومت نے ضبط کر لی، اور اخبار بند ہو گیا۔۔۔۔ مولانا مظہر الدین صاحب اس اخبار کے بند ہونے کے بعد نگینہ گئے اور منشی ضمیر احمد صاحب رئیس نگینہ کے مشورے سے نگینہ سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی تجویز ہوئی، اخبار کے جاری کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، حیثیت کے مطابق منشی جی نے ان کو فراہم کرنے میں مدد کی۔ اخبار کا نام شاہ امان اللہ والیٔ افغانستان کے نام کی مناسبت سے اخبار "الامان" رکھا جو ۱۹۲۱ء میں وجود میں آیا۔ اس اخبار کے شائع ہونے سے جہاں اخباری دنیا میں ایک باوقار اخبار کا اضافہ ہوا وہاں عوام میں بھی ایک زندگی پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں عوام میں یہ اخبار مقبول ہو گیا، اور جب اس نے شہرت حاصل کر لی تو ہفتہ وار کے بجائے ہفتے میں دو بار کر دیا۔ ایک اخبار کے انتظام کے لئے جو ذرائع حاصل ہونے چاہئیں، اس کے لئے نگینہ موزوں جگہ نہ تھی اس لئے مسیح الملک جناب حکیم اجمل خاں صاحب کے مشورے سے مولانا مظہر الدین صاحب نے ۱۹۲۲ء میں دفتر "الامان" دہلی میں منتقل کر دیا۔

ہفتہ وار اخبار میں تازہ بتازہ اور نوبہ نو خبریں شائع نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ ہفتہ وار اخبار خبروں کے لئے نہیں بلکہ خیالات کی ترجمانی کے لئے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہندوستانی عوام کو دنیائے اسلام کی اور ہندوستان بھر کی خبروں سے باخبر رکھنے کے لئے آپ نے ۱۹۲۸ء میں اخبار "وحدت" جاری کیا۔ اخبار الامان اور وحدت اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کا حلقہ علی الصباح ان کے دیکھنے کے انتظار میں رہتا تھا اور جس وقت تک ان اخبارات کو پڑھ نہیں لیتا تھا ان کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔

خلافت کمیٹی کو قوت دینے اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے میں مولانا مظہر الدین صاحب اور ان کے

اخبار الامان اور وحدت کسی اخبار سے پیچھے نہیں رہے۔ مولانا نے کل ہند خلافت کمیٹی قائم ہونے کے بعد بجنور میں خلافت کمیٹی کی تشکیل کی، جس کے صدر مولانا مظہر الدین صاحب منتخب ہوئے۔ اس ضلع کی تحریک کا اثر صوبہ یوپی پر پڑا، اور تھوڑے دنوں میں ہی ضلع بجنور کی خلافت کمیٹی نے ۳۵ ہزار روپیہ خلافت فنڈ میں بھیجا۔

مولانا مظہر الدین صاحب نے دامے درمے سخنے مسلم لیگ کی خدمت کی۔ ان کے دونوں اخبار الامان و وحدت مسلم لیگ کے پروپیگنڈے کے لئے وقف تھے۔ مولانا آل انڈیا مسلم لیگ کے اجتماعات ہی میں نہیں بلکہ بہت سے صوبائی، شہری اور دیہی اجتماعات میں شرکت کرتے تھے اور مسلم لیگ کی تقویت و استحکام میں حصہ لیتے تھے۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر تھے، ضلع مسلم لیگ اور یوپی مسلم لیگ صوبہ کی کونسل کے ممبر تھے اور جمعیۃ العلماء کانپور کے جنرل سکریٹری تھے۔

مولانا مظہر الدین صاحب دو مرتبہ اپنے شوق و محبت اور ادائے فریضہ کے خیال سے زیارت حرمین شریفین کے لئے گئے، آپ کا حجاز مقدس میں بے حد احترام کیا گیا، اور سلطان ابن سعود والئ حجاز نے اپنا مہمان بنا کر عزت بخشی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں فلسطین کانفرنس قاہرہ مصر میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس کے خرچ کا بار ایک ہزار روپے سے زیادہ مولانا نے خود ہی برداشت کیا، پھر مولانا نے ممالک اسلامیہ شام، عراق اور لبنان کی سیاحت کی۔ اور وہاں کے مسلمانوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے حالات و سیاست سے آگاہ کیا۔ ان ممالک میں مولانا کا جو احترام اور خدمات کا اعتراف کیا گیا وہ وہاں کے اخبارات میں شائع ہوا۔ مولانا نے مجاہدین فلسطین کی ہمدردی کے خیال سے دمشق، مصر، حلب و شام اور دیگر مقامات مقدسہ کا سفر کیا اور اپنے ذاتی مشاہدات و حالات سے ہندوستان کے مسلمانوں کو فلسطین کے واقعات و حالات سے باخبر کیا۔

مولانا نے ایک درسگاہ شیرکوٹ میں دینی تعلیم کے لئے قائم کی تھی، اس کے مصارف کے وہ خود کفیل تھے۔ آپ ایک بلند پایہ اخلاق کے مجسمہ تھے، متواضع مہمان نواز، دوستوں کے ساتھ رفاقت کرنے والے، عزیزوں کو نوازنے والے اور غریبوں کے ساتھ امداد کرنے والے۔ اور صاحب تصنیف تھے، جن میں آپ کی مشہور تصانیف شیر دل خاتون، سندھ کی راجکماری،

کامنی یا رائے پتھورا کی بیٹی، الحجاب اور حیاتِ کامل تھیں۔

۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو دن کے بارہ بجے دو آدمیوں نے اگر دفتر میں جبکہ مولانا صاحب اخباری کام میں مصروف تھے شہید کر دیا ——— جناب سید سردار علی تائب نقشبند دہلوی نے حسب ذیل تاریخی قطعہ مولانا کی شہادت پر تحریر کیا ؎

وہ مظہرِ دیں، دین کا جانباز سپاہی
وہ فخرِ وطن، گنج گراں، مایۂ ملت

وہ مردِ مجاہد وہ حق آگاہ و حق اندیش
وہ جس کا قلم کاشفِ اسرارِ حقیقت

وہ حق کا طرفدار، وہ خوددار و وضعدار
تھی جس کی زبان ابرِ گہر بارِ صداقت

جو جھک نہ سکا شوکتِ اغیار کے آگے
اور قوم سرفراز رہی جس کی بدولت

کام آگئی ایامِ شہادت میں وہ اُس کی
جذبات میں ڈوبی ہوئی تقریرِ شہادت

گو وہ نہیں دنیا میں مگر اُس کی صدائیں
گونجیں گی فضاؤں میں ابھی تا بہ قیامت

قربان ہوا قوم پہ وہ قوم کا سرباز
خالق نے کیا اس کا مقام اُس کو عنایت

اے رحمتِ حق ہے ترے دامن میں وہ گل آج
تھی جس کی ابھی گلشنِ ہستی کو ضرورت

اُس کو تو حیاتِ ابدی ہوگئی حاصل
صد حیف مگر ملتِ مغموم کی قسمت

تاریخِ شہادت کا خیال آتے ہی تائب!
ہاتف نے ندا دی "شرف اندوزِ شہادت"
۱۳۵۸ھ

قاضی معز الدین احمد صاحب مالک آزاد کتاب گھر دہلی

قاضی معز الدین احمد صاحب کے مورثِ اعلیٰ ملا عبد الصمد بخارا سے محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آئے اور دہلی کے قریب قصبہ کوتانہ میں قیام کیا۔ وہیں ان کو جاگیر عطا کی گئی۔ کسی دور میں خاندان کا کوئی بزرگ قاضی مقرر ہوا۔ گلی کوتانہ سوئی والان دہلی میں ان کا قیام تھا، ۱۸۵۷ء میں خاندان معتوب ہوا، جاگیر ضبط ہوئی، بڑی کوشش کے بعد خطا معاف ہوئی تو ان کے بزرگوں کو پنجاب میں ملازمت دی گئی۔ ان کے والد قاضی محتشم الدین احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے غالباً افسر مال تھے، ۱۹۰۱ء میں دہلی آئے پھر یہیں سکونت اختیار کی۔

قاضی معز الدین احمد صاحب ۱۹۰۹ء میں کوچہ پنڈت دہلی میں پیدا ہوئے۔ دو ڈھائی سال کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد اور بہنوں نے پرورش کی، زندگی میں ان پر کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب بالکل تندرست رہے ہوں۔ نزلہ، کھانسی، بخار کی بدولت ہر سال دو تین ماہ بیمار رہتے تھے۔ ہر وقت مرض کے حملے کا ڈر لگا رہتا تھا۔

تعلیم پہلے پرانے طرز کی شروع ہوئی، فارسی کی چند کتابیں اور عربی کی صرف ونحو والد مرحوم اور ایک مولوی صاحب سے پڑھیں، لیکن گھر میں جدید تعلیم کا رواج ہو چکا تھا بڑے بھائی انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس لئے پرانا سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کیمبرج اسکول دہرہ دون میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر سنسکرت اسکول سے میٹریکولیشن کا امتحان ۱۹۲۷ء میں پاس کیا، سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں فسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ ایک طرف اپنی بیماری دوسری طرف والد کی علالت اور پھر ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب کو ان کا دنیا سے رخصت ہو جانا بس ایک بڑا سانحہ تھا ——— ایک بھائی مدراس میں ملازم، دوسرے جرمنی میں زیر تعلیم، گھر پر یہ اور ان کی بڑی ہمشیرہ اور ان کے دد

لڑکے اسر پہ ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑا۔ بہر حال وقت گذر گیا اور جو بیتنی تھی وہ بھی بیت گئی، تعلیم کا سلسلہ منقطع تو نہ ہوا، تعلیم بھی جاری نہ رہی، دو سال ضائع ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انٹرمیجیٹ کلاس میں داخلہ لیا، ۱۹۳۲ء میں انٹر کر کے بی اے آنرز (فلسفہ) میں داخل ہوئے۔ پہلے دو سال کے امتحانات پاس کئے لیکن تیسرے سال حاضریاں کم ہو گئیں، امتحان میں شرکت ممکن نہ ہوئی۔ بڑے بھائی قاضی نظام الدین احمد مرکزی سرکار کے دفتر میں کلکتے میں ملازم تھے، انھوں نے علاج کے لئے کلکتہ بلایا، پھر اسلامیہ کالج کلکتہ میں داخل ہونے پر اصرار کیا، چنانچہ بی اے کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کر کے ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا۔ سیاسی کاموں میں ایسے گھرے کہ امتحان نہ دے سکے۔

ان کے اساتذہ قاری حافظ محمد یحییٰ صاحب پانی پتی، مولوی محمد اسحاق دہلوی، حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی، ڈاکٹر سید ظفر الحسن (علی گڑھ) ہمایوں کبیر، ڈاکٹر رادھا کشن (سابق صدر) اور ہندی فلسفے کے مشہور ماہر ایس۔ این داس گپتا وغیرہ تھے۔

علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں احمد صاحب کا کمرہ سیاست سے دل چسپی رکھنے والوں کا مرکز تھا۔ اخبار، رسالے اور سیاسی کتابیں جن کو پڑھتی ہوتیں وہ آ بیٹھتا۔ مولانا محمد علی، شوکت علی گاندھی جی کی تقریروں اور تحریروں پر تبصرے ہوتے تھے، نہرو اس وقت تک مقبول نہیں ہوئے تھے، لیکن سوشلزم اور کمیونزم کے خیالات کی ابتداء ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر اشرف ہندوستان آگئے تھے۔ اور کبھی کبھی ان کے کمرے میں بھی چلے آتے تھے۔ اس وقت کی مذہبی اور کانگریسی فضا سے مایوس ہوتے تھے۔ احمد صاحب تھوڑی بہت مسولینی اور ہٹلر کی تعریف کرتے تو اس کو پسند نہ آتی، ایک مرتبہ ان کو ایک کتاب انگارے پڑھنے کے لئے دی اور جس انداز کی انھوں نے اس کتاب کی تعریف کی اس سے یہ متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خدا اور مذہب کی مخالفت لوگ خود نمائی کے لئے زیادہ کرتے ہیں، کسی علمی تحقیق کی بناء پر نہیں۔ جب کسی لڑکے کو کسی کمیونسٹ کے ساتھ دیکھا جاتا تھا تو اس کو "دہریہ" کہا جاتا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں اس وقت کا یہ ماحول تھا۔

کلکتے کی زندگی بڑی ہنگاموں کی زندگی رہی۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس ہوئی تھی، جناح صاحب نے کانفرنس کی صدارت کی تھی اور جواہر لال نہرو نے اس کا

افتتاح کیا تھا۔ بنگال میں اسٹوڈنٹ تحریک کو چلانے کے لئے اسٹوڈنٹ فیڈریشن قائم کی گئی اور احمد صاحب کو اس کا صدر منتخب کیا، جب صوبہ بنگال کے طلبار کی کانفرنس ہوئی تو اس میں احمد صاحب کو بھی مدعو کیا۔ سرت چندر بوس صدارت کر رہے تھے، اس اجلاس میں ان کو بنگال پروونشل اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی صدارت کی ذمہ داری سونپی گئی جس کو انھوں نے پانچ سال تک خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا، جلسے، جلوس اور طلبار کی ہڑتالوں کی تنظیم بہت عمدگی کے ساتھ کی۔ بمباروں کی رہائی کی تحریک میں فیڈریشن نے خاص طور پر حصہ لیا۔ احمد صاحب کے صدر ہونے کے بعد نیتاجی سبھاش چندر بوس جیل سے رہا ہو کر آگئے تھے۔ احمد صاحب نے ان سے ملاقات کی۔

احمد صاحب کلکتہ گئے تو یہ خواہش لے کر گئے تھے کہ مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ چنانچہ دوستوں کے ساتھ ان کے مکان پر گئے، ملاقات ہوئی، بعد میں یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ آخری ملاقات اس شام کو ہوئی جب وہ رام گڈھ کانگریس کی صدارت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ مولانا آزاد سے ملاقات کا سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا، جس میں سیاسی اور دوسرے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ دہلی آنے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران بنگال کی سیاسی حالت کافی نازک تھی، ان کے سب ساتھی یا تو روپوش ہو چکے تھے یا جیل جا چکے تھے۔ احمد صاحب کا تعلیمی سلسلہ ختم ہو ہی چکا تھا۔ مالی دشواریوں کی وجہ سے ۱۹۴۱ء میں دہلی لوٹ آئے۔ یہاں آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی کچھ ذمہ داریاں سنبھالیں اور ایک سال سکریٹری کے فرائض انجام دئے۔ اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنائے گئے۔

کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۱ء میں یہ طے کیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم جس میں روس ملوث تھا، عوام کی جنگ ہے، اس میں جمہوری طاقتوں کی فتح اور فسطائی طاقتوں کو شکست ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محکوم اقوام آزاد ہو جائیں گی۔ ایک دوسرا فیصلہ یہ بھی تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد کرانے کی کوشش کرنی چاہئے اور کانگریس مطالبۂ پاکستان تسلیم کرے اور لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارٹی نے ان مسلمانوں کو جو کمیونسٹ پارٹی میں شریک تھے، اس کی اجازت دی کہ اگر وہ چاہیں تو لیگ میں شرکت کر کے

پارٹی کی اس تحریک کو کامیاب بنائیں، چنانچہ احمد صاحب اور ان کے چند ساتھی ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ میں شریک ہو گئے، نواب زادہ لیاقت علی خاں نے خوش آمدید کہا۔ احمد صاحب صوبہ مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر منتخب ہوئے اور ان کے کمیونسٹ ساتھی انیس ہاشمی سکریٹری مقرر ہوئے۔

مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس جو غالباً اپریل ۱۹۴۷ء کو دہلی کے امپیریل ہوٹل میں ہوا تھا۔ جس میں ملک کی تقسیم کی اسکیم پر مہر تصدیق کی گئی تھی۔ ملک تقسیم ہوا تو احمد صاحب اپنے وطن میں پناہ گزین ہوئے۔ دو سال زندگی بڑی کش مکش میں گذری، تین سال کے بعد مکان فروخت کرنا پڑا۔ اور اس رقم سے آزاد کتاب گھر کے نام سے کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔

۱۹۵۲ء میں بارہ بنکی کے مشہور خاندان کے ایک مشہور صحافی اور ادیب چودھری رحم علی الہاشمی کی بڑی لڑکی سے شادی کی۔ اردو کی کتابوں کا کاروبار اس دور میں کیسے چلتا جبکہ مالی حالت خراب ہو اور گھر کا بوجھ رفیقۂ حیات پر پڑا ہوا ہو۔ ان کی اہلیہ مسلم یونیورسٹی اسکول میں ٹیچر ہیں، کچھ عرصے کے بعد یکے بعد دیگرے کوئی نہ کوئی کام ان کو ملتا رہا، ۱۹۶۹ء سے روسی سفارت خانے میں ملازم ہیں

آزاد کتاب گھر کی طرف سے تقریباً پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں "تاریخ زبان اردو" مؤلفہ ڈاکٹر مسعود خاں طبع ثانی۔ "مختصر تاریخ ادب اردو" مؤلفہ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ "دیوانِ غالب" مرتبہ مالک رام۔ "اردو زبان کے لسانیاتی پہلو" مؤلفہ ڈاکٹر نارنگ۔ "مجموعہ آہنگ" مجاز لکھنوی۔ "فیروزاں" جذبی۔ "دکھنی ادب پر چند مقالات" اور "تذکرہ غوثیہ" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خالد صاحب اس کتب خانہ کے مستقل منیجر ہیں۔ مولوی سمیع اللہ صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے ان کی جگہ لی ہے، کافی ادیبوں اور بک سیلروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور چونچیں لڑتی رہتی ہیں۔ خالد صاحب ہنس مکھ اور ملنسار آدمی ہیں۔ اور لوگوں کے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

جناب منشی ممتاز علی صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی

منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی میرٹھ کے رہنے والے تھے جو اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ دہلی میں آنا جانا رہتا تھا۔ اور لال قلعے میں بھی رسائی تھی۔ فن خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔

اندر کوٹ میرٹھ میں ۱۸۶۳ء میں مولانا ہاشم صاحب نے مطبع ہاشمی جاری کیا۔[1] بعد میں اس میں منشی ممتاز علی صاحب نے شراکت کی۔ اس پریس میں عربی کی درسی کتابیں چھپتی تھیں۔ مولانا محمد ہاشم صاحب سے مولانا قاسم نانوتوی کے ذاتی تعلقات تھے اور خاص طور پر مولانا ہاشم صاحب کو مولانا قاسم صاحب سے عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ مولانا قاسم صاحب میرٹھ تشریف لائے۔ مطبع میں قیام کیا۔ درمیان گفتگو کتابوں کی تصحیح کا ذکر چھڑا۔ مولانا نے آمادگی کا اظہار کیا، کچھ دنوں کے بعد معاوضے کا مسئلہ آیا، تو وہ ایک ہفتے تک ٹالتے رہے اور اس کے مذہبی پہلو پر غور کرتے رہے۔ آخر ایک روز آپ نے ۲۵ روپیہ ماہانہ معاوضہ خود تجویز کیا۔ اس معاوضے کو مولانا ہاشم صاحب بہت کم سمجھتے تھے۔ مولانا قاسم صاحب سے دوبدو بات کرنے کی ہمت نہیں تھی، چنانچہ وہ اس سلسلے میں دیوبند پہنچے۔ اہلیہ مولانا قاسم صاحب سے ملے، ان سے کہا یہ معاوضہ بہت کم ہے، میری ہمت نہیں پڑتی جو اس کے بارے میں بات کروں، چنانچہ میں آپ کو جو رقم بھیجا کروں، اس کا علم مولانا کو نہ ہو۔ نہیں معلوم مولانا صاحب کی اہلیہ اس بات پر کیسے راضی ہو گئیں، چنانچہ وہ رقم بذریعہ منی آرڈر پہنچنے لگی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ڈاکیہ رقم لے کر پہنچا، اس وقت مولانا بھی موجود تھے، ان کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس کا بہت برا مانا اور وہ رقم اسی وقت ڈاکیہ سے واپس کرا دی۔ مولانا قاسم صاحب تصحیح کے کام میں آزاد تھے، ان پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی، جب دیوبند سے تشریف لاتے تصحیح فرما دیا کرتے تھے۔

[1] اختر شہنشاہی ص ۲۸۸

ہاشمی پریس کامیابی کے ساتھ چلنے لگا۔ منشی ممتاز علی صاحب نے سوچا، یہ کاروبار اگر دہلی میں ہو تو بیحد مقبول ہو، اور آمدنی بھی اس سے زیادہ ہو۔ چنانچہ منشی صاحب نے اس خیال وارادے کا ذکر مولانا ہاشم صاحب سے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ پریسوں میں دستی پریس ہوتے تھے۔ ہاشمی پریس میں بھی چار پانچ دستی پریس تھے، چنانچہ منشی ممتاز علی صاحب باہمی فیصلے کے مطابق دو دستی پریس میرٹھ سے لے کر دہلی چلے آئے۔ اور چوڑی والان میں مطبع مجتبائی، ۱۸۶۰ء کو قائم کیا۔ دہلی میں آنے کے بعد منشی ممتاز علی صاحب نے ایک حمائل لکھی جس کی تصحیح مولانا قاسم صاحب نے فرمائی، جو مطبع مجتبائی دہلی میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی۔ مولانا صاحب نے حمائل کے طبع ہونے کے دو تاریخی قطعات فرمائے:[1]

حمائل کز شرف دارد شرف بر حاصل کانہا
کہ ایں جا است و بجان است صد گونہ بلا زانہا
نوشت و طبع زد نزہت رقم ممتاز علی قاسم
صحیحش کرد زاں گردید تعویذ دل و جانہا

چھاپی وہ حمائل کہ اگر جان کے لب ہوں
بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغوب چھپی ہے
میں نے بھی کہا کہ مدح میں اور کیونکہ نہ کہئے
کہتے ہیں بتکرار عدد خوب چھپی ہے
۶۴۳
ایک راحت دل، راحت دل پر ہے مضاعف
۶۴۳ ۶۴۳
کیا لکھی کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے
۱۲۸۶ھ

کیا کہئے حمائل کے بہت خوب ہے یہ چھاپی
۱۲۸۶ھ
کیا کہتے ہیں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے
۱۲۸۶ھ

منشی ممتاز علی صاحب ۱۸۸۶ء میں مع اپنی چار صاحبزادیوں عائشہ بیگم، کلثوم بیگم، زینب بیگم، اور رقیہ بیگم کے ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچے۔ اور مطبع مجتبائی مولوی عبدالاحد صاحب کے ہاتھ فروخت کیا۔

جناب ایوب قادری صاحب نے اپنی تصنیف "مولانا محمد احسن نانوتوی" میں تحریر فرمایا ہے:

"مولانا قاسم نانوتوی مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح وغیرہ کے سلسلے میں ملازم ہو گئے....
منشی ممتاز علی ہجرت کے ارادے سے گئے، اس لئے وہ مطبع میرٹھ ختم کر کے گئے تھے ____
۱۲۸۵ھ میں منشی ممتاز علی صاحب ہجرت کے ارادے سے حجاز گئے مگر دوسرے سال ہندوستان واپس آ گئے۔"[2]

[1] حمائل شریف مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ص ۱۳۱، [2] مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۲۱۴

قادری صاحب کو معلومات صحیح نہیں ملی۔ مطبع مجتبائی میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب نے قائم نہیں کیا۔ وہاں ہاشمی پریس تھا جس کے اصل مالک مولوی ہاشم صاحب تھے۔ اس میں شراکت منشی ممتاز علی صاحب نے بعد میں فرمائی تھی۔ "اختر شہنشاہی" میں اس کا ذکر ہے۔ منشی ممتاز علی صاحب نے دہلی میں آنے کے بعد مجتبائی پریس ۱۸۷۶ء میں قائم کیا، اس کا بھی ذکر اختر شہنشاہی میں ہے، اس میں اس کا مقام اجرا، دہلی لکھا ہے میرٹھ نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ مطبع میرٹھ میں ختم کر کے ہجرت فرما کے حجاز مقدس پہنچے، بلکہ انھوں نے دہلی کا مطبع مجتبائی فروخت کر کے ہجرت فرمائی، چنانچہ قادری صاحب نے اپنی اسی تصنیف کے صفحہ ۱۶۱ پر تحریر فرمایا ہے کہ:

> "مطبع مجتبائی دہلی (مولوی عبدالاحد صاحب نے) پانچسو روپے میں خریدا کیونکہ منشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے"۔

اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ منشی صاحب دوسرے سال ہندوستان واپس آگئے۔ وہ ہجرت کرنے کے بعد ہندوستان نہیں آئے، حجاز مقدس میں ہی فوت ہوئے۔

رقیہ بیگم عمدہ خوش نویس تھیں، عربی تحریر میں ان کا جواب نہیں تھا۔ منشی عبدالحمید صاحب نبیرہ منشی ممتاز علی صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے بہت سے قطعات لکھے تھے جو ان کے والد منشی عبدالغنی صاحب کے پاس تھے، جس پر کتبہ رقیہ بیگم لکھا ہوا تھا۔ اس بات کی تصدیق مجھ کو مولوی محمد سلیم صاحب، مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی زبانی ہوئی۔ انھوں نے حسب ذیل ایک تاریخی واقعہ ۱۹۵۲ء کے پہلے حج میں سنایا تھا۔

محمد افضل ہربی افغانستان کے باشندے تھے، انھوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ سے تعلیم پائی تھی، یہ وہ بزرگ تھے جن کی خطاطی کا جواب تمام عرب میں نہیں تھا، جس وقت حرم شریف میں باب عباس کے قریب کی جگہ در و دیوار پر طغرے اور عبارت لکھنے کے لئے سلطان عبدالعزیز خاں کے زمانے میں خطاطوں کی تلاش ہوئی، تو مولانا محمد افضل ہربی نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ میں اس مبارک کام میں حصہ لینا چاہتا ہوں، چنانچہ مولانا نے کوشش فرمائی، حکم آیا کہ ہر خطاط اپنا نمونہ لکھ کر بھیج دے۔ اس پر ہربی صاحب نے کہا، نمونہ بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے، ایک مقام بتا دیا جائے، وہاں عبارت لکھ دوں گا۔ دوسرے خطاط

اس کو دیکھ لیں اور جو فیصلہ کریں مجھے منظور ہو گا۔ چنانچہ جب وہ عبارت ان خطاطوں نے دیکھی تو سب نے متفقہ طور پر کہا کہ آغا جلی، اس قدر موزوں خوش خط ہم نہیں لکھ سکتے۔ ہر بی صاحب کسی خطاط کو نہیں جانچتے تھے، لیکن اگر انھوں نے کسی کا سکہ مانا تو رقیہ بیگم کا۔ ان کے خط کو دیکھ کر جھک جاتے تھے۔ رقیہ بیگم مولانا رحمت اللہ صاحب کی معتقد تھیں۔ مولانا محمد سلیم صاحب کو انھوں نے خطاطی سکھائی۔

منشی ممتاز علی صاحب نے مکہ معظمہ میں ایک عربی النسل عورت سے شادی کی تھی، جب یہ ہجرت کر کے حجاز مقدس پہنچے تو ہندوستان میں ان کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد ہوئی یا نہیں، اس سے ان کے خاندان والے واقف نہیں ہیں۔ البتہ جب منشی عبدالغنی صاحب حجاز مقدس حج کے سلسلے میں پہنچے تو مکہ معظمہ میں اپنے والد منشی ممتاز علی صاحب کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ اس وقت اپنی دوسری والدہ کو انھوں نے دیکھا تھا۔ منشی ممتاز علی صاحب مکہ معظمہ میں فوت ہوئے، جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں۔

منشی ممتاز علی صاحب کے دو صاحبزادے ایک منشی مشتاق علی صاحب اور دوسرے منشی عبدالغنی صاحب تھے۔ مشتاق علی صاحب کھڑکی تفضل حسین میں رہتے تھے، وہیں کتابت کرتے تھے، ان کی تمام عمر قرآن مجید لکھنے میں صرف ہوئی، بہترین عربی کے خوش نویس تھے۔ جناب مفتی شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر "دین دنیا" دہلی نے ان سے جلی خط کے سپارے لکھوائے تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا، ان کی صاحبزادی فاطمہ بیگم کی شادی مولوی نور محمد صاحب تاجر کتب سے ہوئی۔ جو اپنے خاوند کے ساتھ ہنگامہ ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی چلی گئیں۔

جناب منشی عبدالغنی صاحب اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے تھے، یہ بھی اپنے زمانے کے مشہور و معروف خوش نویس تھے، باپ کی طرح انتہائی خود دار، وضعدار و ملنسار، خوش اخلاق، معاملہ فہم، نہایت لائق و فائق، تیز طبع، خاص کر متنوع و تفنن خطوط گوناگوں میں بے نظیر تھے۔ انھوں نے کھڑکی تفضل حسین کلاں محل میں مطبع مصطفائی جاری کیا تھا، اس کے مالک تھے[۱] اس میں مذہبی و علمی

[۱] آثار دہلی ص ۳۵

کتابیں، قرآن مجید وسپارے چھپتے تھے۔ اہل کمال میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، وہ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے، خلاف طبع بات ان کے لئے برداشت کے قابل نہیں ہوتی۔ وہ بڑی سی بڑی طاقت کی پرواہ نہیں کرتے اور کسی کے سامنے جھکتے نہیں۔ بے نیاز ہوتے ہیں۔ اور اپنے فن پر ان کو ناز ہوتا ہے۔

کرزن دربار میں میر محبوب علی خاں والیٔ حیدرآباد دہلی آئے ہوئے تھے۔ لیڈلو کیسل، جہاں پر راشننگ کا دفتر تھا، وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ منشی عبدالغنی صاحب سوا گز لمبا اور پون گز چوڑے طغرے پر ایک قطعہ لکھ کر چوکٹے میں لگا کر ان کو پیش کرنے کے لئے لے گئے۔ رسائی نہ ہو سکی۔ اور پیش کرنے کا موقع نہیں ملا تو واپس آ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے صاحبزادے عثمان علی خاں مرحوم والیٔ حیدرآباد دکن دہلی آئے، اس وقت ان کو موقع مل گیا، طغرہ پیش کیا۔ نواب صاحب نے معلوم کیا اس کی قیمت کیا ہے۔ ان کا یہ پوچھنا تھا کہ ان کے ماتھے پر شکن پڑ گئے، فوراً طغرہ اٹھایا اور یہ کہہ کر چلے آئے، قیمت معلوم کرتے ہیں ہم سے۔ ۱۹۴۷ء سے دو یا تین سال قبل ان کا گھر پر انتقال ہوا، فیروز شاہ کوٹلے کے قریبی قبرستان میں مدفون ہیں۔

منشی عبدالغنی صاحب کے چار صاحبزادے پہلی بیوی سے منشی عبدالحمید صاحب، عبدالحفیظ صاحب اور دوسری بیوی سے عبدالرشید صاحب اور عبدالقدیر صاحب ہوئے۔ عبدالحمید صاحب سب سے بڑے فرزند ہیں۔ یہ ۱۹۰۳ء کو کھڑکی تفضل حسین میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد سے خوش نویسی سیکھی۔ اور اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ دہلی میں چھٹی کلاس میں تعلیم پا رہے تھے کہ تحریک ترک موالات شروع ہو گئی۔ اس اسکول سے علیحدہ ہو کر آزاد قومی درسگاہ کوچہ بلاقی بیگم میں داخلہ لیا۔ ساتویں جماعت کا امتحان دینے کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا۔ اس کے بعد سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر اخبار "ریاست" دہلی کے ہاں کارٹونسٹ اور ڈیزائن کا کام بیس سال تک کیا، چھتہ چھپا میم میں رہتے ہیں۔ حمید آرٹسٹ صاحب کی دکان اردو بازار جامع مسجد پر ہے، اچھے خوش نویس ہیں اور بہترین مصور اور آرٹسٹ ہیں۔ بڑے مستغنی المزاج، ملنسار اور خلیق آدمی ہیں۔ عبدالحفیظ، عبدالرشید اور عبدالقدیر ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں پاکستان چلے گئے۔

حافظ منیر الدین صاحب منیرؔ دہلوی

آپ دہلی کے قدیم باشندے تھے، محلہ چھتہ لال میاں نزد تیراہا بہرام خاں میں سکونت رکھتے تھے۔ دہلی کی قریشی برادری سے تعلق ہے، اور قریشی برادری کے چودھریوں میں شمار تھا۔ شیخ حفیظ الدین عرف بادشاہ مرحوم کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اور دہلی کے شہرۂ آفاق بزرگ حضرت مولانا شاہ ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں اور ان کے خاص معتمد لوگوں میں سے تھے، چنانچہ صاحب "سوانح حیات شاہ ابوالخیر" منیرؔ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جناب حافظ حاجی منیر الدین صاحب دہلی میں حضور کے خاص معتبر قدیمی خادم ہیں، بہت ہی خلوص سے خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور اب اسی طریقے پر قائم ہیں، حضور کو اپنے اشعار سنا کر محظوظ کرتے تھے۔ آپ نے حضور کا مرثیہ بھی کہا ہے۔ تاریخیں و قصائد بھی کہے ہیں۔" (ص ۲۵۳)

چنانچہ شاہ ابوالخیر صاحب کی تاریخ وفات بہت سے شاعروں نے لکھی، لیکن منیرؔ صاحب کی حسب ذیل تاریخ مقبول اور پسندیدہ قرار پائی ؎

چلو لے کر وہاں جہاں ہے منیرؔ!
مرقدِ فخرِ اولیائے جہاں
۱۳۴۱ھ

منیرؔ صاحب کو شعر و شاعری سے خاص شغف تھا۔ مولانا مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن راسخؔ مرحوم دہلوی کے تلمیذ رشید تھے۔ گوشۂ تنہائی و گمنامی کو پسند کرتے تھے۔ شریعت کے بڑے پابند تھے۔ آپ کی غزل اول سے آخر تک مذہبی رنگ میں ہوتی تھی۔ دوسرے رنگ کی غزل کو تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اور اپنی غزل بھی پڑھتے تھے۔ مگر جب کسی کو اپنا ہم رنگ و ہم نوا نہ پایا، تو مشاعروں میں جانا ترک کر دیا۔

شاعروں کا طور وطریق رہا ہے کہ جب وہ اپنی زور کلامی پر آتے ہیں، تو خدا کو بھی نہیں بخشتے اور نکتہ چینی کئے بغیر باز نہیں آتے، چنانچہ آج سے چالیس سال پہلے اقبال ڈے عربک کالج اجمیری گیٹ میں ہوا۔ حافظ صاحب نے بھی اس میں شرکت کی، جہاں ساغر نظامی صاحب نے اپنی ایک غزل پڑھی جس کا ایک مصرع یہ تھا ؂

آج ڈھانا ہے مشیت کا نظام اے ساقی

اسے سن کر حافظ صاحب کے دل پر ایک چوٹ لگی، اور صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے مشاعرے سے واپس چلے آئے۔ اور اس مصرع کا حافظ صاحب پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ آپ نے اس کی تردید میں اپنی ایک غزل فرمائی جس میں کے کچھ اشعار یہ ہیں ؂

خاک شاعر ہے تیرا خاک ہے جام اے ساقی — کہ بہکنے لگ گئے مے خوار تمام اے ساقی
کوئی کہتا ہے کہ ڈھانا ہے مشیت کا نظام — کہ مکمل نہیں قدرت کا نظام اے ساقی
یہی عنوان اگر ہے تیرے مے خانہ کا — مے کدہ پر تیرے، اور تجھ کو سلام اے ساقی
ہجو اللہ و نبی سن نہیں سکتے ہرگز — روح کا جسم میں جب تک ہے قیام اے ساقی
احترام احدیت ہے ہمارے دل میں — ہم ہیں احمد کے ہی سوجان سے غلام اے ساقی
شعر الحاد نما بر لب مسلم توبہ — یہ ہے اک غیرت و عزت کا مقام اے ساقی

سب ہیں ارباب جہاں گوش بر آواز منیر
یہ غزل ہو گئی مقبول انام اے ساقی

حافظ منیر صاحب کو اساتذہ کرام کی مشہور غزلیات پر مصرعے لگانے میں مہارت حاصل تھی بولانا راسخ کا ایک نعتیہ شعر ہے ؂

مجھے خدمت ساربانی پہ رکھ لے — الٰہی کوئی شہ سوار مدینہ

حافظ صاحب نے اس شعر پر یہ مصرعے لگائے ؂

کبھی جاؤں مکہ سے لے کر مدینہ — کبھی جاؤں لے کر مدینہ سے مکے
گذر جائے یوں عمر بس جاتے آتے — مجھے خدمت ساربانی پہ رکھ لے
الٰہی کوئی شہ سوار مدینہ

حافظ منیر الدین صاحب حضرت مولانا الیاس مرحوم و مغفور کی تبلیغی جماعت کے ایک پرانے دلدادہ و گرویدہ تھے۔ "درجات کلمہ طیبہ" کے نام سے آپ نے ایک کتاب لکھی تھی، جو طبع نہیں ہوئی۔ ان کی تبلیغی مصروفیت و مشغولیت کا اندازہ ان کے چند اشعار سے لگائیے ؎

آج کل اپنا ہے تبلیغی جماعت میں شمار
قوم و ملت کے لئے در در پھرا کرتے ہیں ہم
ہو بھلا دونوں جہاں میں رہبر تبلیغ کا
حضرت الیاس کے حق میں دعا کرتے ہیں ہم

مرنے والے کا ہمیں سے نام زندہ ہے منیر
فیضِ راسخ کو جہاں میں رونما کرتے ہیں ہم

حافظ منیر الدین صاحب خلیق و باوضع متقی اور مفید خلائق بزرگ تھے۔ غالباً ۱۹۵۶ء میں ۶۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ حافظ صاحب نے چار صاحبزادے اور لڑکیاں چھوڑیں۔ کلام میں پختگی اور سلاست ہے ؎

کیا چیز ہے کوثر، مئے انگور کے آگے
زاہد کو ہے تلقین کہ کچھ اس کا مزا دیکھ
کعبہ کی ہے تحقیر، تو بُت خانہ کی توقیر
میخانہ پسندیدہ ہے مسجد کے سوا دیکھ
یارب ہے زبوں حال منیر جگر افگار
اک چشم کرم جانب مصروف بکا دیکھ
لحد میں خاک کا بستر ہے سونا صبح محشر تک
تجھے عادت ہے اے نازک بدن عمدہ بچھونے کی
غم عصیاں میں رہنا چشم تر از بس غنیمت ہے
عجب ترکیب ہے یہ دفترِ عصیاں کے دھونے کی

سید ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

سید ناصر نذیر فراقؔ بن سید محسن علی بن سید فیاض علی کا سلسلہ نسب سید ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے جو حضرت امام زید شہید بن امام زین العابدین کی اولاد میں تھے۔ سید ابوالفرح واسطی کے بیٹے سید عوض سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آئے اور بلگرام اور بارہ تک پھیلے۔ آپ کے جد اعلیٰ کی جاگیر سکندر لودھی کے عہد میں قصبہ لونی سے گڈھ میکتشر تک تھی اور آپ کے اکثر بزرگ منصب دار اور ہفت ہزاری و پنج ہزاری گذرے ہیں، چنانچہ سید محمد شاہ کے عہد میں ہفت ہزاری منصب دار تھے اور آپ کے دادا سید فیاض علی تک کی جاگیرداری باقی تھی۔ جب مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی اور ان کے امراء اخلاقی طور پر گرتے چلے گئے، تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں اس جاگیر کا خاتمہ ہوا۔

جناب فراقؔ کے والد ماجد سید محسن علی صاحب کے پاس سندات اور فرامینِ شاہی موجود تھے۔ انھوں نے پریوی کونسل لندن میں مسٹر جوزف فرانسیس وکیل کی معرفت استغاثہ دائر کر دیا تھا، لیکن اسی اثناء میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء دہلی میں شروع ہو گئی اور مسٹر جوزف مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے۔ لندن سے کاغذات کو منگوانے والا نہیں تھا، وہیں رہ گئے۔[۱]

فراقؔ صاحب کے والد ماجد سید محسن علی صاحب نے اپنے والد سے خط نستعلیق سیکھا جو میر پنجہ کش رضوی کے شاگرد تھے۔ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے کتب حدیث پڑھیں۔ موسیقی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس فن کو آپ نے میر ناصر احمد صاحب سے سیکھا۔ اس وقت ان کے اجداد کی سکونت پھاٹک حبش خاں میں تھی۔ میر محسن علی خان صاحب کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے کئی برس بعد رئیس دھرم پور نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

جب سید محسن علی صاحب کی شادی خاندان خواجہ میر دردؔ میں ہو گئی، تو آپ نے نقشبندیہ

[۱] میخانۂ درد ص ۲۳۱

کے سلوک کو اپنے خسر میر امام الدین ناصری اور شاہ احمد سعید و شاہ عبد الغنی مجددی سے حاصل کیا۔ شعرو شاعری سے دلچسپی بچپن سے تھی، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کا کلام اپنے والد سید فیاض علی صاحب کو اور اردو کا کلام مومن خاں دہلوی کو دکھاتے تھے، ملال تخلص تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل آپ نے دو دیوان ایک اردو دوسرا فارسی کا مرتب کر لیا تھا، جو اس آزادی کی جنگ کے دوران دہلی میں تلف ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا، اگر کوئی دوست شعر کہنے کا تقاضا کرتا تھا تو جواب دیتے تھے بھائی شعر و شاعری کا لطف لال قلعہ اور شہر کی آبادی کے ساتھ گیا کہاں جا کر غزل پڑھیں اور کسے سنائیں ـــــ دہلی میں آپ یکم رجب ۱۳۳۰ھ کو فوت ہوئے، اور تاریخ وفات جناب ناصر نذیر فراق صاحب نے یہ فرمائی [۱]

والدی ماجدی خجستہ سیر	میر محسن علی چوں رحلت یافت
جان من سوختہ ز نار الم	دل من داغ رنج و حسرت یافت
خوش بیاں، خوش کلام و خوش تقریر	در ازل بہرہ فصاحت یافت
در طریقت کمال حاصل بود	در شریعت چو استقامت یافت

ہاتف نجیب از فراق حزیں
سال او گفت عیش و جنت یافت
۱۳۳۰ھ

سید محسن علی صاحب کی شادی شمس النساء بیگم دختر میر امام الدین ناصری سے ہوئی، جن سے جناب سید ناصر نذیر فراق صاحب ۱۶ اگست ۱۸۶۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد اور جلیل القدر اساتذہ سے جملہ دینی علوم و فنون حاصل کیے۔ فن طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، یہ فن حکیم بدر الدین صاحب دہلوی اور حکیم محمود علی صاحب دہلوی سے تحصیل کیا۔

فراق صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد رئیس دھرم پور نے اپنے صاجزادوں کے لئے اتالیق اور اپنا طبیب خاص مقرر کیا اور بڑی قدر دانی کی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد جب رئیس فوت ہو گیا تو آپ نے ملازمت ترک کر دی اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ دہلی چلے آئے اور کوچہ چیلان میں بارہ دری خواجہ میر درد میں سکونت اختیار کی اور حکمت شروع کر دی۔

فراق صاحب کو فقر و درویشی نے مستغنی کر دیا تھا، اس لئے امراء اور دولت مندوں سے

[۱] میخانۂ درد ص ۲۳۴

تعلقات نہیں رکھتے تھے، طبیعت نہایت حق گو پائی تھی۔ آخر عمر تک اسی طریقے پر کاربند رہے اور اپنے بزرگوں کی وضع کو نبھایا۔

فراقؔ صاحب کو اولیائے کرام اور بزرگانِ دین سے بے پناہ عقیدت تھی، بچپن سے ہی اس عقیدت کا اظہار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ایک درویش جو فراقؔ صاحب کے مکان میں رہتے تھے۔ ان سے انھوں نے کہا کہ مجھے حضرت علیؓ کی زیارت کرا دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ دیکھو آج جب تمھارے والد سو جائیں تو چپکے سے ان کے منہ سے چادر ہٹا کر دیکھنا تم کو حضرت علیؓ کی زیارت ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ میں تو اپنے والد کا منہ روزانہ دیکھتا ہوں۔ میں تو حضرت علیؓ کی زیارت کرنی چاہتا ہوں۔ درویش صاحب نے کہا تمھارے باپ کی صورت حضرت جیسی ہے، رات کو ہمارے کہنے کے مطابق عمل کرو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنے والد کے منہ سے چادر اٹھائی تو حیرت زدہ رہ گئے، اور خوف کے مارے چیخ اٹھے اور لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑے۔ چیخ کی آواز سے ان کے والد اٹھ گئے، تو انھوں نے ان کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

چنانچہ آپ اسی عقیدت کی بنا پر حضرت اللہ بخش تونسی سجادہ نشین خواجہ محمد سلیمان تونسی کی خدمت میں تونسہ گئے اور ان سے بیعت کی۔

فراقؔ صاحب "مخزن" کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے، جب مخزن بند ہو گیا تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا ——— سر عبدالقادر کی فرمائش پر ایک ناول "المورکھا" لکھنا شروع کیا، مخزن بند ہوا تو ان کی ہمت بھی ٹوٹ گئی، پھر اور لوگوں کے اصرار پر اسے مکمل بھی کر لیا۔ مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ البتہ مولانا محمد حسین آزاد کی ناتمام تصنیف "ڈرامہ اکبر" کی تکمیل ان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

"ساقی" کے لئے بھی انھوں نے لال قلعے کی جھلک قسط وار لکھی، بڑی پیاری زبان لکھتے تھے ——— آپ شاعری اور نثر نگاری میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی نظم و نثر کی دھوم غیر ممالک تک میں ہو گئی تھی۔ آپ نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کے قدرداں ہندوستان کے علاوہ عدن، جدہ، افریقہ اور دیگر ممالک میں تھے۔ آپ نے دہلی کی قدیم تہذیب مغلیہ کے دور پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

"دہلی کا آخری دیدار" آپ کی مایہ ناز تالیف ہے، جس میں اب سے سو سال پہلے کی دہلی کی سوسائٹی، دہلی والوں کے رسم و رواج، شہزادوں و شہزادیوں و امراء کے مشاغل اور غرباء کی طرزِ معیشت، لال قلعے کی چہل پہل، چوک کی گہما گہمی، برسات کی نشیلی رت میں پھول والوں کی سیر جس میں بادشاہ و رعیت، ہندو مسلمان برابر کا حصہ لیتے تھے، تہواروں کی رنگ رلیاں، حتیٰ کہ سودا سلف بیچنے والوں کی صدائیں تک ہیں۔

اس کتاب کے علاوہ آپ کی تصانیف دہلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ، لال قلعہ کی ایک جھلک، سات علاقوں کی کہانیاں، بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، چاند، دکن کی پری، مضامین فراق اور میخانہ درد، ہے۔ موخر الذکر کتاب میں حضرت خواجہ میر درد کے خاندان کے حالات درج ہیں۔

ان کا سرخ و سپید رنگ، سفید کھلواں ڈاڑھی، گول چہرہ، بھاری ڈیل، انگشتیا گندے پڑا ہو فرغل، سر پر کبھی صافہ کبھی ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی پہنتے تھے۔ آخر عمر میں ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا، باوجود رعشے کے خود ہی لکھتے تھے۔ ان کی تحریر قسمت کی تحریر ہوتی تھی جو پڑھنے میں نہ آتی تھی ——— جناب فراق کا انتقال فالج کے مرض میں ۱۲ر فروری ۱۹۳۳ء کو ہوا۔

جناب فراق کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا، میخانہ درد پر جو تاریخی قطعہ کہا ہے وہ یہ ہے:

تاریخ طباعت می جستم از شوق و تکلف می گفتم

ایں نسخہ لسان سنبل و ریحان غیرت دردم طبع شدہ

خود روح جناب خواجہ گفتہ پاسِ ادب بگذار فراق

از جانب من تسطیر بکن میخانہ دردم طبع شدہ

۱۳۴۴ھ

جناب میر ناصر علی صاحب ایڈیٹر صلائے عام دہلی

میر صاحب رائے پور میں، ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوئے، آپ کا سلسلہ نسب امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان عالموں کا خاندان تھا۔ آپ کے والد ماجد مولانا ابوالمنصور تھے۔ شروع عمر کا حصہ لکھنؤ میں گذرا، کچھ عرصے کے بعد دہلی آگئے اور دہلی سے پھر اپنے والد ماجد کے ساتھ رائے پور تشریف لے گئے، دس سال کی عمر تک وہیں رہے، وہیں قرآن شریف پڑھا۔ مولوی نجم الدین صاحب دہلوی نے عربی و فارسی کی تعلیم دی، تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ کے والد صاحب کے ایک ملنے والے نے آپ کی قابلیت دیکھ کر حضرت نظام الدین اولیاء کی بستی کے ایک مدرسے میں پندرہ روپے ماہوار پر مدرس مقرر کرایا۔ آپ جب تعلیم پاتے تھے تو اس پر زیادہ سختی کی جاتی تھی۔ میر صاحب اس قسم کی سزاؤں کا ذکر فرمایا کرتے تھے کہ والد صاحب خود تو نہیں لیکن ان کے چھوٹے بھائی نصرت علی سے پٹوایا کرتے تھے، جس سے ہمیں بہت غیرت آتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی پڑھنا کفر تھا، لیکن میر صاحب کو انگریزی پڑھنے کا شوق تھا، انھوں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دی وہ بھی چوری چھپے۔ ایسی بات بھلا کیسے چھپ سکتی تھی، ظاہر ہوگئی۔ پہلے ان کے والد ماجد مولوی ابوالمنصور صاحب نے خوب خبر لی، اس کے بعد مولوی نجم الدین صاحب نے گوشمالی کی۔ میر صاحب نے اسی میں خیریت سمجھی توبہ کرلی، جب انگریزوں کے خلاف جذبہ کم ہوا تو بہت رد و کد کے بعد میر صاحب کو انگریزی پڑھنے کے لئے دہلی گورنمنٹ اورینٹیل کالج میں داخلہ کرایا گیا، ۱۸۶۷ء میں انٹرنس کے امتحان میں فسٹ آئے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد آپ کی شادی میر احمد علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ امتحان پاس کرتے ہی آپ کو نان پارہ ضلع بہرائچ میں ایک ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد محکمہ نمک شمالی ہند میں منتقل کر دئے گئے، ۱۹۰۸ء تک اس محکمے میں رہے۔ آپ کی خدمات کے

صلے میں گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۹۰ء میں خان بہادر کا خطاب دیا۔ فرخ نگر میونسپل کمیٹی کے متواتر ۱۶ برس تک نائب صدر رہے، محکمہ نمک سے پنشن پانے کے بعد آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا، مجسٹریٹی کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ریاست پٹودی میں مشیر کی ضرورت ہوئی۔ آپ کو چیف منسٹر کی حیثیت سے پٹودی میں لگایا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک آپ پٹودی کے دیوان رہے۔

میر صاحب کو اپنے والد مولوی ابوالمنصور صاحب سے انتہائی محبت و عقیدت تھی، ان کی خوشنودی کو اپنے لئے باعث نجات دارین خیال کرتے تھے۔ باپ کو بھی بیٹے سے روحانی تعلق تھا۔ چنانچہ میر صاحب ایک خط میں جو انھوں نے اپنے صاحبزادے کو لکھا تھا، اس تعلق کا ذکر کیا ہے:

"بڑھاپے کی وجہ سے اب کے بیماری میں زیادہ اندیشہ رہا اور خاص اس وجہ سے کہ بیماری زیادہ ٹھہری، دو ڈھائی مہینے برابر دست آئے اور آخر ش نزلہ زکام ہو گیا۔ ایک دفعہ رات کو گھبرا کے نیچے چلا گیا، عورتوں کو جگایا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ مر رہا ہوں اور والد ماجد مرحوم نے مجھے زمین پر سے اٹھا کر گود میں لیا۔ اور زبانِ مبارک سے فرمایا "افسوس کیسا لڑکا مر رہا ہے"۔ یہ آواز میرے کان میں صاف آئی۔ اور ابھی وہ بٹھائے ہوئے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں گھبرا کر نیچے گیا اور یہ خواب سب عورتوں سے بیان کیا۔ میں نے کبھی والد ماجد کو اپنی طرف سے اس قدر خوش نہیں دیکھا۔ باپ کا خوش ہونا میری نگاہ میں ہزار بہشت اور لاکھ نعمت سے بہتر ہے، جس محبت و پرورش و الطاف سے میں نے ان کی زبان سے یہ لفظ سنے میں قیامت تک نہیں بھولنے کا۔ قیامت میں یہی لفظ میری نجات کا ذریعہ ہوں گے، اب مجھے کامل یقین ہے کہ دین دنیا میں میرا بیڑا پار ہو گیا۔ اس کا ثبوت دیکھ لو کہ جس کا باپ بیٹے سے خوش ہو اس کی خوش نصیبی میں کیا شک ہے، رہا دنیا کا معاملہ، یہ بھی میرے باپ کے صدقے میں ایسا گذرا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ اب میں خوش ہوں۔ میں اپنے خواب کی یادگار بھیجتا ہوں تم اس خط کو رکھ چھوڑنا کہ میرے اعتقاد کا گواہ رہے"۔

۱۸۷۹ء میں "تیرھویں صدی" رسالہ آگرے سے جاری ہوا، جس کے ایڈیٹر و مالک مولانا ناصر علی خاں صاحب

تھے، جو اس رسالے میں سرسید کے رشحاتِ قلم پر تنقید کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید مرحوم علانیہ لکھتے تھے کہ مسلمانوں کے عقائد مذہبی میں تاویل و ترمیم مناسب ہے، اس کے خلاف میر صاحب نے اخبار میں احتجاج کیا اور ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ اس بحث کے علاوہ تیرھویں صدی میں میر صاحب نے خود بھی دادِ سخن دی اور ایسے ایسے گراں قدر مضامین لکھے کہ سنجیدہ طبقہ میر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا۔ تیرھویں صدی میں جو لٹریچر میر صاحب نے پیش کیا، اس پر اردو انشاپردازی آج تک ناز کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ مہدی حسن مرحوم جو میر صاحب سے خاص عقیدت رکھتے تھے چپ نہ رہ سکے اور تیرھویں صدی کے متعلق یہ اظہار کیا:

"میں آپ کے لٹریچر کا اس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں تھا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے اور پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا، یعنی تیرھویں صدی میں دادِ سخن دی۔ تہذیب الاخلاق کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس حسنِ سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھہرائی، سچ یہ ہے وہ اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہلِ قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے، لیکن میں کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس وقت انشاپردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے آپ کا ادبی مذاق اور خاص طرح کا مادہ اختراعی دراصل آپ کے اولیات کے داخل ہونے کے لائق ہے۔"

جنوری ۱۸۸۱ء کو آگرہ محلہ نئی بستی سے ادبی رسالہ "افسانہ ایام" نمودار ہوا، ۴۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک مولوی خواجہ یوسف علی سکریٹری کمیٹی قانون آگرہ مدرس اول عربی گورنمنٹ کالج تھے۔ مطبع آگرہ اخبار میں طباعت ہوتی تھی، سالانہ چندہ دس روپے تھا۔ اس کے ایڈیٹر مرزا ناصر علی صاحب تھے۔

"اس رسالہ جاری کرنے کی غرض یہ تھی کہ اس گئے گذرے زمانے میں بقائے نام کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور یہ محنت جو مسائل دینی و دنیوی کے کمال اظہار کے لئے ہو رہی ہے بیکار نہ جائے۔ یہ کام قوم کی بھلائی و بہبودگی کے لئے اپنے ذمے لیا ہے، جو اب تک

انجام پایا ہے اس میں ذاتی غرض شامل نہیں ہے"۔

"ناصری" ۱۸۸۸ء کو نصرت المطابع سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مقالہ افتتاحیہ میں میر صاحب فرماتے ہیں:

"مدت سے یہ شکایت ہے کہ اعلیٰ لٹریچر کا کوئی پرچہ ایسا نہیں نکلتا، جس میں ہمارے ملک اور زبان کی ترقی کے پورے سامان ہوں۔ یہ شکایت مٹانے کے لئے ناصری پرچہ دہلی سے نکالا جاتا ہے، پرانے اخباروں کی بے قدری میں نیا پرچہ نکالنا گویا بے قراری میں برق رخسار کا تماشہ ہے لیکن جس طرح بیدک کے علاجوں میں گرمی کا علاج گرمی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح نئے پرچوں کا نکلنا اخباروں کی ترقی عجیب سامانوں میں ہے۔ یہ نہیں تو بڑی وجہ اس پرچے کے نکالنے کی یوں سمجھئے کہ عموماً ہندوستان کے اخباروں کی مردی حالت ہی اس بات کی متحرک ہوئی کہ ایک پرچہ نکالا جائے، جو اس فن کی آبرو کا سبب ہو"

ناصری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مزاح کا عنصر زیادہ تھا۔ مرزا حیرت دہلوی اس کے خاص مضمون نگار تھے، خدا معلوم یہ کب بند ہوا۔

ناصری کے بعد میر صاحب نے مارچ ۱۹۰۸ء کو "صلائے عام" ماہانہ پرچہ دہلی سے نکالا۔ اس رسالے کا تمام کام میر صاحب خود ہی کرتے تھے، خود ہی کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے اور خود ہی ڈاک کے جوابات لکھتے تھے۔ صلائے عام کی کبھی اتنی آمدنی نہیں ہوئی کہ اس کا خرچ نکل سکتا۔ سو سوا سو روپے ماہوار کا مستقل خرچ تھا، جسے میر صاحب انتہائی وضعداری سے آخر دم تک نبھا گئے۔ نہ کبھی صلائے عام میں اشتہار شامل کئے گئے۔

یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں بند ہوا، ۲۴ برس تک صلائے عام نے جو اردو کی خدمت کی ہے تاریخ ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ "مضمون پریشان" اور "محشر خیال" اپنی خوبیوں کے اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ آج قوم کا خدائے نثر لٹریری دنیا میں جہاں تک پاکیزہ اور سلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ بے مثل فصاحت اور وقیع انشاء پردازی کا تعلق ہے، اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز ہے۔ صلائے عام کے ارتقائی دور میں ہر دور کی امتیازی خصوصیت بیان کرنے کے لئے بسیط مقالوں کی

ضرورت ہے ــــــ "محشرِ خیال" کی توضیح میر صاحب کی زبانی سنئے :

"مضمون پریشان کو میں زلفِ حسیناں سے تشبیہ دیتے دیتے تھک گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے مضمون جو فقیروں کی گدڑی کی طرح الگ الگ ہوں۔ کیا آشفتہ مزاجوں کے دامن و گریباں کے پرزوں سے مشابہ نہیں ہو سکتے، جو فصلِ گل میں شوق سے اڑائے جاتے ہیں، اس خط شوق سے نہیں ملتے جسے یار ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینکدے۔ اس مضمون کو اس ہار سے کیوں نہ تشبیہ دی جائے جو رات کو یار کے گلے سے ٹوٹ گیا ہو، جس کے موتی صبح کو سیج پر بکھرے ملے۔ یہ بھی جانے دیجئے، اس طرح کیوں نہ کہئے ع

کسی کے منہ سے جھڑیں پھول بات کرنے میں

اگر آپ کو زلفِ حسیناں ہی سے تشبیہ زیادہ پسند ہے تو مضمون پریشان کو گیسوئے جاناں میں دلِ صدچاک کا کاشانہ سمجھئے ؎

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

بکھرے موتی ڈورے میں نہیں تو پوٹلی میں باندھ کر ایک جگہ رکھ دئے ہیں کہ کھوئے نہ جائیں۔ یہ تشبیہ پسند نہ ہو تو "مضمون پریشان" کو غالب کے اس شعر کی شرح سمجھئے ؎

نالہ پابندِ نے نہیں
فریاد کی کوئی لے نہیں"

میر صاحب کے ہاں تاریخی محفلیں جمتی تھیں۔ مولوی بشیر احمد صاحب، مولوی اشرف حسین صاحب، خضر دہلوی، حضرت سائل دہلوی، لالہ سریرام صاحب مصنف "خم خانۂ جاوید" وغیرہ کی صحبت شعر و سخن گرم رہتی تھی۔ مولوی بشیر الدین صاحب کے بعد یہ پرانی صحبتیں درہم برہم ہو گئیں۔ میر صاحب صاف دل، سچے آدمی تھے، جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا، مکاری سے نفرت تھی، راست بازی کی وجہ سے نقصان بھی اٹھائے۔

ایک مرتبہ آپ کے علاقے میں کمشنر دورے پر آیا، نمک دفتر کا معائنہ کیا، حساب و کتاب دیکھ کر کہا میر صاحب آپ صاف نہیں رکھتے، جگہ جگہ کاٹا چھانٹی کرتے ہیں۔ آپ نے کہا مجھے مکاری آتی نہیں،

یہ کانٹا چھانٹی تو میری ایمانداری کی دلیل ہے جہاں غلطی دیکھتا ہوں فلرز کر دیتا ہوں۔

میر صاحب کا قد جوانی میں لمبا ہوگا، ضعیفی کے تقاضے سے کمر ذرا جھک گئی تھی، بدن دُھرا تھا۔ رنگ کھلا ہوا۔ گندمی چہرہ صاف ابھرا ہوا، اور پُر رعب تھا، بلند اور چوڑی پیشانی تھی، بھویں جدا، اور نازک ہلالی شکل کی، آنکھیں نہ بڑی نہ چھوٹی۔ رہنے سہنے کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ کھانے میں کوئی تکلف برتا نہیں جاتا تھا، معمولی کھانا دونوں وقت کھا لیتے تھے۔

میر ناصر علی صاحب کا انتقال ۱۲ر جون ۱۹۳۳ء کو دہلی میں ہوا۔ اپنے والد ماجد مولانا ابوالمنصور کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ہر اخبار، رسالہ اور ادیب نے ماتم کیا، اور رسالہ "ساقی" دہلی نے ۱۹۳۳ء میں ایک ناصری نمبر نکالا۔

مولوی نصرت علی قیصرؔ ایڈیٹر "ناصر الاخبار" دہلی

مولوی نصرت علی صاحب کا تعلق قصبہ سید آباد عرف رائے پور مضاف قنوج کے خاندانِ سادات سے تھا، شجرۂ نسب امام جعفرِ صادق سے ملتا ہے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ سید عبدالغفور تھے، جو سکت پور کے قاضی تھے، ان کے خاندانی شاہی عطیات وہیں ہیں۔ ان کے دادا سید محمد علی ناگپور کی رزیڈنسی کے میر منشی تھے، شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، ناظر تخلص تھا۔ مولوی نصرت علی کے والد ماجد ہندوستان کے مشہور و معروف مناظر حضرت ابوالمنصور مرحوم تھے۔ یہ تمام خاندان شیعہ تھا، لیکن آپ کا گھرانہ سُنّی ہے۔ آپ کے والد ماجد مولوی ابوالمنصور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں دہلی چلے آئے تھے۔ ہنگامے کی وجہ سے سواری کا انتظام نہ ہو سکا تھا۔ دونوں صاحبزادے میر ناصر علی ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی اور مولوی نصرت علی اور اہلیہ مولانا ابوالمنصور نے پیدل سفر کیا، جب جنگ کا خاتمہ ہوا، اور شہر میں امن و امان ہو گیا تو میر مداری کی گلی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لیا۔ اور وہیں رہائش اختیار کی۔

مولانا نصرت علی، ۱۱ر شوال ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بڑے بھائی میر ناصر علی تھے۔ آپ ان سے تین برس چھوٹے تھے —— علوم دینی، فقہ اور احادیث میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ — فارسی، عربی، ترکی اور ہندی کے ماہر تھے۔

مولانا ابوالمنصور صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۰۳ء میں آپ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ دستار بندی میں علمی و ادبی طبقے نے شرکت کی۔ اور شعراء بھی اس تقریب میں شریک ہوئے چنانچہ حکیم ارشد احمد راشد فاروقی تھانوی نے اپنے قصیدے میں اس کا اظہار فرمایا، جو اسی موقع پر کہا گیا تھا ؎

ملا جانشین ان کا وہ ذی وقار　　　کہ تھے جیسے مرحوم اہلِ صفا

ہے اسم شریف ان کا نصرت علی — خرد مند ذی عقل اور ذی حیا
ہیں مرحوم کہ وہ قدم بہ قدم — وہی شان ہے اور وہی حوصلہ
انھیں کی یہ دستار بندی کا ہے — ملا ہے انھیں خلعت پر ضیا

بصد شوکت و شان ہوئے جانشیں
ہے اب ارشد خستہ کی یہ دعا

۱۸۷۲ء میں آپ نے دہلی میں انجمن تہذیب کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی، جس کو سوشل کلب کہا جاتا تھا۔ اس انجمن کے صدر آپ تھے۔ گارساں دتاسی نے اپنے مقالات دویم میں لکھا ہے کہ مولوی نصرت علی "النفیع العظیم" کے نام کا ہندوستان سے واحد عربی اخبار نکلتا ہے اس کے ایڈیٹر ہیں۔

مولوی نصرت علی صاحب نے یکم جنوری ۱۸۷۲ء کو کوچہ میر مداری فراشخانہ دہلی سے ایک عشرہ وار "ناصر الاخبار" جاری کیا تھا جو باوقار اخبار تھا۔ تازہ خبریں، مقامی اور غیر ملکی اور علمی و ادبی مضامین معیاری چھپتے تھے، بہت حد تک آزاد خیالی سے کام لیتا تھا، حکومت برطانیہ جو تہذیب ہونے کا دعویٰ کرتی تھی، اس کی قلعی کھولتا تھا، اس کی بعض خبروں کی سرخیاں منظوم ہوتی تھیں۔ ایک خبر کی یہ سرخی تھی:

"ذرا دیکھو عجب تہذیب انگلستان ہے یارو
کہ جو روز بیچ دیتے ہیں یہ اپنی چار آنے میں"

مولوی نصرت علی صاحب کی ہندوستان کے علاوہ ایران، روم، مصر اور انگلستان میں شہرت تھی چنانچہ سلطان روم کی طرف سے آپ کو تمغہ مجیدی عطا ہوا تھا۔

مولوی نصرت علی شاعر تھے، لیکن شعر کم کہتے تھے، قیصر ان کا تخلص تھا۔ رد نصاریٰ میں بھی منہمک رہتے تھے، عیسائی پادریوں سے مناظرے کئے، چنانچہ صاحب روز روشن ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"صاحب طبع سلیم و ذہن مستقیم و عامل باعمل ست و در مباحثہ با علماء نصاریٰ علم اشتہار فراشتہ و کتاب نصرت الاسلام بکمال متانت نگاشتہ"

مولوی نصرت علی صاحب ۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو ریاست جے پور میں فوت ہوئے آپ صاحب تصانیف تھے سو سے زیادہ ان کی کتابیں ہیں جن میں قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:

(۱) مرات السلاطین (۲) نصرت اللغات (۳) جواہر بے بہا (۴) سراب عالم اسباب (۵) تخلیہ (۶) ضیاء النورین (۷) احسن الدلیل (۸) گلدستۂ شاداب (۹) رحمتِ عظیم (۱۰) ذخیرۂ حسنات (۱۱) تاریخ انگلستان (۱۲) تاریخ مدینہ منورہ (۱۳) نصرت العلوم و فنون (۱۴) تاج التواریخ۔

مولوی نصرت علی صاحب اردو میں بہت کم اور فارسی میں زیادہ شعر کہتے تھے [۱]

خواہد اگر کہ مشقِ محبت کند کسے — دل را ہدف بہ تیرِ ملامت کند کسے

در دورِ چشمِ یار، ز مستی گزیر نیست — تا چند پاسِ مذہب و ملت کند کسے

نقدِ مراد حاصلِ مزدورِ عشق نیست — چوں کوہکن اگرچہ مشقت کند کسے

دل دادہ ام بچشم و نگاہی نمی کند — با مردمِ زماں چہ مروت کند کسے

قیصر گر از غمِ شبِ ہجراں شود فراغ
یادے ز ہولِ روزِ قیامت کند کسے

---

[۱] روزِ روشن ص ۵۶۵

حاجی نور محمد صاحب عرف ننواں تیلی دہلوی

حاجی نور محمد صاحب عرف ننواں تیلی کا خاندان دہلی کا دو سو برس سے زیادہ کا پرانا خاندان ہے۔ حاجی صاحب کے والد جمال الدین صاحب متھرا کے کسی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ یہ اپنی اولاد کے ساتھ دہلی آئے اور کالی مسجد کے قریب گلی نقارچیوں میں سکونت اختیار کی۔ ان کے صاجزادے حاجی نور محمد صاحب نے حافظ عبد الرشید صاحب کے والد حافظ عبد العلی سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اور دینی تعلیم بھی انہی سے حاصل کی۔ آپ نے اسی گلی میں اپنا مکان تعمیر کیا اور اس مکان کے سامنے ایک مسجد بنوائی۔ جامع مسجد کے شاہی دروازے میں محراب کافی عرصے تک سنائی، ضعیف العمری کے زمانے میں اپنی تعمیر کردہ مسجد میں محراب سنانے کا سلسلہ جاری کیا، جو آخری دم تک جاری رہا۔ آپکی عرفیت کی مناسبت سے نقارچیوں کی گلی ننواں تیلی کی گلی کہلائی جانے لگی۔

حاجی صاحب عطر اور تیل کا کاروبار کرتے تھے، ان کا عطر دہلی کے شہزادے اور شہزادیاں پسند کرتی تھیں۔ لال قلعے میں ان کے عطر کی کافی کھپت تھی اور معززین شہر بھی ان کے عطر کو استعمال کرتے تھے۔ ان کا عطر ولایت تک جاتا تھا۔ دہلی میں عطر کے دو ہی تاجر تھے گلاب کندی ہندوؤں میں اور حافظ ننواں مسلمانوں میں۔ گلاب کندی کی تجارت اسی پیمانے سے اب تک دریبے میں جاری ہے، لیکن حافظ صاحب کی دوکان صرف بطور یادگار رہ گئی ہے۔

حاجی حافظ نور محمد صاحب کو دینی کاموں سے بڑا لگاؤ تھا، لوگوں کو دینی کاموں کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایسے مسلمان بھی تھے جو مسجدوں کی طرف رخ بھی نہیں کرتے تھے۔ حاجی صاحب کے پاس جو بھی ایسا مسلمان آتا آپ اس سے کہتے کہ جاؤ پہلے مسجد میں ہاتھ پاؤں دھو کر آؤ، تب بات چیت کی جائے گی، جب اس کو مسجد کا عادی بنا لیتے تو اس کو نماز کی تلقین کرتے اور اپنے ڈھنگ سے نماز کی اہمیت کو سمجھاتے۔ اس طرح آپ نے بہت سے بے نمازیوں کو نمازی بنایا اور

خاص طور پر اپنے خاندان کے کافی اشخاص کو دین کی طرف مائل کیا، اور پابندِ صوم وصلوٰۃ بنایا۔

حاجی ننواں تیلی نیک خصلت اور نیک سیرت انسان تھے، جیسے خود تھے ویسے اور لوگوں کو بھی سمجھتے تھے، چنانچہ جو بھی ضرورت مند ان سے قرض لینے آتا، اس کو بلا لکھے پڑھے، بلا کسی تمسک کے روپیہ قرض دیتے تھے۔ اس لین دین پر ان کے لواحقین معترض ہوتے تھے، لیکن یہ جواب دیتے کہ تم میرے معاملے میں مت بولو۔

ایک مرتبہ ایک شخص حاجی صاحب کے پاس آیا، اس نے کہا میرا لڑکا مر گیا ہے، اس کے کفن دفن کے لئے روپے کی ضرورت ہے، قرض عنایت فرمادیں۔ انھوں نے اس کو روپے دیدیئے، یہی صاحب پانچ چھ روز کے بعد دوبارہ آئے اور انھوں نے بتایا میرے دوسرے لڑکے کا بھی انتقال ہوگیا ہے، اس کے لئے بھی روپے کی ضرورت ہے۔ دوبارہ مانگنے پر ان کے منشی کو شک ہوا کہ اتنی جلدی دوسرا لڑکا کیسے مر گیا، اس بناء پر منشی نے حاجی صاحب کو منع کیا کہ اس مرتبہ آپ ان کو روپے نہ دیں، حاجی صاحب نے اپنے منشی کو جھڑک دیا، اور اس کو روپے دیدیئے۔ یہ صاحب ایک مہینے کے بعد حاجی صاحب کے پاس پھر آئے اور حساب صاف کیا اور انتہائی مشکور ہوئے۔ حاجی صاحب صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ ان کی اولاد کی بھی یہی حالت تھی، صبح کے وقت تقریباً ان کا پورا گھر تلاوتِ قرآن مجید میں مصروف رہتا تھا، حج بھی کیا تو تنہا نہیں احباب کو ساتھ لے کر گئے، حکیم اجمل خانصاحب؛ جامع مسجد دہلی کے امام جناب سید محمد صاحب اور ان کے صاحبزادے شمس العلماء سید احمد صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ علماء ومشائخ کی قدر کرتے تھے۔ انتہائی مخیر تھے، کوئی غریب ان کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ ہر وقت ان کا ہاتھ چلتا رہتا تھا۔ —— مولانا محمد حسین فقیر مدرسہ حسین بخش میں پندرہ سال سے وعظ کہتے تھے۔ ایک روز حسین بخش کے نواسے نے آپ کے وعظ کی مخالفت کی تو آپ ممبر سے اتر آئے۔ کریم بخش صاحب پاپوش فروش نے وعظ کہنے پر اصرار کیا، لیکن آپ نہیں مانے، تو ان کو حاجی کریم بخش عرف حاجی نتھو ٹھیکیدار اور حاجی نور محمد عرف ننواں نیلی ترکمان گیٹ کی مسجد میں لے گئے، جہاں انھوں نے ڈھائی سال تک وعظ کہا۔ حاجی ننواں تیلی علماء کے بڑے قدردان تھے۔

۱۸۹۱ء میں میرے والد ماجد مولوی اشرف الحق صاحب کا پادری لیفرائے سے مسجد فتحپوری میں دو روز تک تاریخی مناظرہ ہوا، جس میں پادری صاحب کو تحریری طور پر تسلیم کرنا پڑا کہ انجیل

شریف میں تحریف ہوئی ہے۔ اس مناظرے کا اہتمام وانتظام حاجی نور محمد صاحب نتواں تیلی، میرے چچا برکت اللہؒ اور حاجی غلام اولیاء وغیرہ نے کیا۔ اور اس کا تمام بار انھوں نے برداشت کیا۔ میرے والد ماجد مولوی شرف الحق اور مولوی عبدالسلام صاحب نیازی سے بھی حاجی صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ والد صاحب اکثر ان کی دکان پر جاکر بیٹھتے تھے۔

مولوی امین الدین صاحب جب کشمیری گیٹ کے پاس مسجد پانی پتیان کے صحن مسجد کے گرد دو منزلہ وسہ منزلہ عمارت مدرسہ امینیہ کے لئے تعمیر کرا رہے تھے تو اس کی تعمیر میں بھی آپ نے مالی مدد دی۔ حاجی نور محمد صاحب نے ۹۸ سال کی عمر میں ۱۹۱۲ء کو دہلی میں انتقال کیا اور مہندیوں کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

حاجی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے مولوی حافظ رحیم الدین صاحب، حاجی ابوبکر صاحب، ظہور الدین صاحب اور نذیر الدین صاحب، اور دوسری اہلیہ سے حافظ عبدالغنی صاحب، حاجی احمد علی صاحب اور حافظ محمد علی صاحب ہوئے۔ دونوں بیویوں سے پانچ لڑکیاں ہوئیں۔

حافظ رحیم الدین صاحب دہلی میں گلی حافظ نتواں تیلی میں پیدا ہوئے تعلیم مولوی محمد اسحاق صاحب سے پائی۔ یہ مولوی محمد اسحاق صاحب ملا واحدی اور مولوی ایوب صاحب منطقی کے بھی استاد تھے۔ شروع میں حافظ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب وعظ ساتھ ساتھ کہتے تھے۔ اور باہر بھی ساتھ ہی جاتے تھے۔

حافظ رحیم الدین صاحب نے دہلی میں امتیازی حیثیت حاصل کی تھی، بقول ملا واحدی صاحب "شکل وصورت اور عادات وخصائل میں تیلی نہیں بلکہ شریفوں کے شریف معلوم ہوتے تھے"۔[1]

حافظ صاحب طویل القامت تھے، گٹھیلا جسم خوب صورت ناک نقشہ تھا، گول ٹوپی، تن زیب کا انگرکھا تنگ موری کا پائجامہ اور کامدار کی شاہی جوتی پہن کر نکلتے تھے، تو نگاہیں

[1] میرے زمانے کی دلی ص ۱۸۷

اٹھنے لگیں، لکھا پڑھا واجبی تھا مگر ذہانت وفراست وطباعی کی وجہ سے قابلیت وعلمیت کا زیادہ گمان و خیال ہوتا تھا۔ لوگ شملہ، سیالکوٹ، لکھنؤ، آگرہ، بھوپال اور بمبئی سے وعظ کہنے کے لئے، اور انجمنیں تقریر کرانے کے لئے بلاتی تھیں۔ شہر کے معززین اور اہل قلم حضرات کی مجلسوں کی رونق تھے۔ ہر طبقہ ان کی عزت کرتا تھا۔ علم مجلسی کے ماہر تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو تیلی ہی سمجھا اور تیلی ہی کہا۔ تیلی ان کے نام کا جزو تھا، حافظ رحیم الدین تیلی کے نام سے مشہور تھے۔

آپ نے خلافت کی تحریک میں حصہ لیا، مسلم لیگ کے حامی تھے۔ مسٹر آصف علی صاحب سے میونسپل کمیٹی کے الیکشن لڑے۔ مولانا احمد سعید، مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا شرف الحق صاحب اور مولانا مظہر الدین صاحب شہید ایڈیٹر "الامان" "وحدت" دہلی سے مراسم تھے۔ اور خاص طور سے مولوی عبدالسلام صاحب نیازی سے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ اور دونوں گہرے دوست تھے۔ حافظ رحیم الدین صاحب کا خاندان کافی بڑا تھا، اس لیے مولوی عبدالسلام صاحب کا یہ لطیفہ بہت مشہور ہوا۔

جب حافظ رحیم الدین صاحب کی ہمشیرہ کا انتقال ہوا، تو حافظ صاحب نے مولوی عبدالسلام صاحب کو ان کے انتقال کی خبر دی اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بھی میت کے ہمراہ قبرستان چلیں۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے مذاحیہ انداز میں فرمایا، میاں اللہ خوش رکھے تمہارا خاندان تو کافی بڑا ہے۔ اگر مرنے کا یونہی سلسلہ چلتا رہا اور اس میں میں شامل ہوتا رہا تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ روزانہ تمہارے ساتھ قبرستان جانے کا ہو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر فوراً میت میں شامل ہو گئے اور قبرستان تک پہنچے۔ حاجی صاحب سشن جج کے اسیسر مقرر ہوئے، ان کو پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ الٰہی بخش کے اکھاڑے کے شاگرد تھے۔ گھر پر ۵ من کی مگدر کی جوڑیاں اٹھاتے تھے، محلہ قبرستان میں ہر سال بسنت کا میلہ لگتا تھا۔ عمائدین شہر حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں صاحب کے اصرار پر میلے میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور ۵ من کی مگدر کی جوڑی اٹھا کر دکھاتے تھے۔ دہلی میں اتنے وزن کی جوڑیاں اٹھانے والا کوئی آدمی نہ تھا۔ ——— صاحب "آثار دہلی" حافظ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نہایت با خدا عابد زاہد متقی و پرہیزگار ہیں۔ ہر جمعہ اور تمام رمضان شریف اور بارہ وفات کے شروع بارہ روز جمع کر کے درود شریف پڑھاتے ہیں۔ شیرینی اور کھانے

اور پیسے تقسیم کرتے ہیں۔"

آپ کا انتقال غالباً ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ اور قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے۔

آپ کے چھ کے چھ بھائیوں نے تجارت میں زندگی گذاری۔ آپ کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہوئی۔ ایک صاحبزادی حمید النساء، زوجہ کریم الدین ہوئیں، جن سے محمد ناصر، محمد جمیل اور محمد سلیم ہوئے۔ اور ایک صاحبزادی زوجہ چودھری حافظ رحیم الدین ہوئیں۔ محمد ناصر اپنے نانا کی دکان کو چلا رہے ہیں اور ان کی نشانی کو قائم کئے ہوئے ہیں۔

حاجی ابوبکر کی اولاد عبدالحئی، جلال الدین، معراج الدین ہوئی۔ ظہور الدین صاحب کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہوئی اور نذیر الدین صاحب لاولد رہے۔ حافظ عبدالغنی صاحب کی بھی کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ احمد علی صاحب کے صاحبزادے مقصود احمد، محمد قاسم اور مُنّے میاں ہوئے۔ حافظ محمد علی صاحب کے فرزند محمود علی، مقصود علی، محمد الیاس اور محمد کلیم ہوئے۔ محمد الیاس صاحب نے دہلی میں ایم۔ اے کیا اور منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا، آج کل شاہی بازار سکھر سندھ میں اسٹاکسٹ ہیں اور سکھر کے مشہور تاجر ہیں، غالباً سکھر میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قبل اس خاندان کے افراد کی تعداد ہزار کے قریب تھی۔ اب دہلی میں ۵ سو افراد اس خاندان کے موجود ہیں اور سکھر، لاہور، کراچی اور حیدر آباد سندھ میں بھی مقیم ہیں۔

جناب یوسف جامعی ــــ ایڈیٹر شاہراہ دہلی

یوسف صاحب بھدوڑ ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے، ان کے والد ماجد ملک منیر احمد صاحب تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی کاشتکاری میں گذاری۔ نماز روزے کے سخت پابند تھے، پنج وقتہ نماز باجماعت پڑھتے تھے اور روزہ کبھی انھوں نے کوئی نہیں چھوڑا، حج بیت اللہ کی بڑی تمنا تھی جو پوری نہیں ہوئی، بھدوڑ گاؤں میں فوت ہوئے۔

یوسف صاحب بھدوڑ گاؤں میں ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی اور راکبرپور قصبہ کے بی۔این انٹر کالج سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ہائی اسکول رنگون سے کیا، ۱۹۳۶ء میں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی میں بی۔اے کیا۔ اپنے ساتھیوں میں یوسف صاحب ذہین مانے جاتے تھے کسی امتحان میں فیل نہیں ہوئے، اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ ان کی محنت سے ان کے اساتذہ خوش ہوتے تھے۔ یہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔

دوران تعلیم اس زمانے کی بات ہے جبکہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ تھے۔ اس وقت یوسف صاحب کے ماموں جو رنگون میں تھے وہاں سے انھوں نے ان کے پڑھانے کے اخراجات کے لئے پچاس روپے بھیجے۔ جامعہ ملیہ میں ان دنوں یہ قاعدہ تھا کہ طلباء کے اخراجات کے لئے جو روپے ان کے والدین یا سرپرست بھیجا کرتے تھے وہ شیخ الجامعہ کے پاس جمع ہو جایا کرتے تھے، بعد میں طالب علم کو ایک فارم ملتا تھا، جس پر وہ اپنے خرچ کی ضروریات لکھ کر دیا کرتے تھے اور جو رقم شیخ الجامعہ منظور کرتے تھے وہ طلباء کو دی جاتی تھی، یوسف صاحب نے اپنی ضروریات کے مطابق ۴۵ روپے فارم میں بھرے۔ شیخ الجامعہ نے فارم دیکھ کر یوسف صاحب کو بلایا اور جامعہ کی مالی پوزیشن کا نقشہ رکھ کر سمجھایا، اور پچاس روپوں میں سے پانچ روپے ان کو دئے اور ۴۵ روپے جامعہ کے اسٹاف کے اخراجات کے فنڈ میں جمع کر لئے، جس کو یوسف صاحب نے بخوشی منظور کیا۔

یوسف صاحب کو اپنے اساتذہ سے بے پناہ محبت تھی، جہاں کسی استاد کا نام آیا، ان کا دل ودماغ تروتازہ ہوجاتا تھا اور بلبل کی طرح چہکنے لگتے تھے اور ان کی تعریفوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مجھ کو مولانا اسلم جیراجپوری صاحب کی یہ بات ناگوار گذرتی تھی کہ ان کو جب کبھی ان کی کتابوں کی رائلٹی کی رقم جلدی جلدی ملتی جس کی وصولیابی کی رسیدوں پر ان کو رسیدی ٹکٹ لگانے پڑتے تھے، اس پر وہ ناراض ہوجاتے تھے کہ بار بار ٹکٹ لگواکر پیسہ ضائع کرتے ہو۔ لیکن اس واقعے کے بعد ہی فوراً دوسرا واقعہ سناتے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں مکتبہ جامعہ لٹا، اس میں آگ لگی، تمام کتابیں جل گئیں جس میں رائلٹی والی کتابیں بھی تھیں۔ رائلٹی والوں کو مکتبہ نے رقم دینی شروع کی، تو مولانا اسلم صاحب کو بھی ان کی رقم دینے کے لئے بلوایا، جب ان کو رقم دی جانے لگی تو انھوں نے اس کو لینے سے صاف انکار کیا اور فرمایا جب مجھ کو یقین ہے کہ مکتبہ کی کتابیں جلی ہیں تو میں یہ رقم کیسے لے سکتا ہوں، چنانچہ وہ رقم انھوں نے نہیں لی۔

۱۹۳۶ء میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یوسف صاحب نے مکتبہ جامعہ میں کام شروع کیا۔ وہ مہتمم اشتہارات اور کتابت کے انچارج بھی تھے، انھوں نے اپنے خلوص اور کارکردگی کا بہت اچھا ثبوت دیا، اور بڑی جانفشانی اور سلیقے سے کام کیا۔ ان کا خط پاکیزہ اور صاف تھا، جامعہ کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے مقابلے میں جو جامعی نہ تھے، یوسف صاحب کا انداز فکر اس حد تک مختلف تھا کہ وہ اپنے آپ کو تاحیات مکتبہ سے وابستہ رہنے کو ہی زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے۔[۱]

۱۹۴۴ء میں جب مکتبہ کی مالی حالت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں مکتبہ کے کارکنوں کی میٹنگ ہوئی جس میں اس کی حالت بہتر بنانے پر غور کیا گیا، تو یہی صورت مناسب سمجھی گئی کہ کارکنوں کی تعداد میں کمی کردی جائے، ملازمین کا علیحدہ کرنا معمولی بات نہیں تھی، کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے جامعہ کے طلباء قدیم جو مکتبہ میں ملازم تھے، رضاکارانہ طور پر مستعفی ہوگئے۔ ان لوگوں میں عبداللطیف اعظمی، بدرالحسن، یوسف صاحب اور علاؤالدین خالد جو اگرچہ جامعہ قدیم طلباء میں سے نہیں تھے مگر مکتبہ کے ایک ذمے دار عہدے پر فائز تھے انھوں نے

[۱] کتابی دنیا کراچی نومبر۔دسمبر ۱۹۶۷ء

بھی استعفیٰ دے دیا۔[۱]

استعفیٰ کی مذکورہ وجہ عبداللطیف اعظمی صاحب نے تحریر کی ہے لیکن علاؤ الدین خالد صاحب نے دوسری وجہ بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سماجی زندگی اور نجی زندگی میں کوئی تفریق نہ تھی، ظاہر اور باطن میں یکساں بات کو (یوسف صاحب) جلد سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سامنے والا بھی اتنی ہی جلدی بات سمجھتا ہوگا یہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر ان کے متعلق کوئی بھی سربراہان مکتبہ کے دل میں شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی اور بالآخر انھیں مکتبہ سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔"

یوسف صاحب میں جسارت اور ذہانت کا امتزاج تھا، ان کا اپنا معیار زندگی تھا، وہ خرچ کرنا بھی جانتے تھے اور روپیہ پیدا کرنا بھی ان کو آتا تھا۔ اس لئے مکتبہ کی ملازمت کے ساتھ وہ اپنے معیار کو نبھانے کے لئے فاضل اوقات میں بیمہ کمپنی اور دوسرے ذرائع سے آمدنی کو بڑھانے میں کامیاب تھے۔ وہ لائف انشورنس کمپنی کے چیف ایجنٹ تھے، انھوں نے انشور کرانے کا کام کافی عرصے کیا۔

وہ ادبی ذہن کے مالک ہی نہیں بلکہ تاجر بھی تھے۔ انھوں نے انشورنس کمپنی کے کام کے ساتھ کباڑے کا بھی کام کچھ عرصے کے لئے محمد احمد صاحب کے ساتھ کیا اور ان دونوں کاموں کے ساتھ انھوں نے ۱۹۵۸ء میں آزاد فش مارکیٹ میں مچھلی کا کاروبار بھی بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ آزاد فش مارکیٹ اردو بازار جامع مسجد پر جگت ٹاکیز کے قریب ہے۔ ان کاموں کے بعد ان کو دہلی کا ایک بہت بڑا سیٹھ یا سرمایہ دار ہونا چاہیے تھا، لیکن کام انھوں نے شروع تو کئے مگر کامیابی کی معراج پر نہ پہنچ سکے —— جو سرمایہ دار یا دولتمند بنتے۔

جناب بدرالحسن صاحب اور علاؤ الدین خالد صاحب نے حالی پبلشنگ ہاؤس خرید لیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں خالد صاحب پاکستان چلے گئے اور بدر صاحب دہلی میں رہ گئے۔ خالد صاحب کی جگہ یوسف صاحب نے لے لی، یعنی بدر صاحب کے شریک ہو گئے، لیکن یہ شراکت زیادہ عرصے نہیں چلی۔ اور یوسف

[۱] رسالہ جامعہ دہلی جنوری ۱۹۶۸ء

نے ۱۹۵۰ء میں مکتبہ شاہراہ اردو بازار میں قائم کیا۔ اس میں انھوں نے مکتبہ کے نام سے کتابیں شائع کیں اور دوسرے پبلشروں کی کتابوں سے کام چلایا۔ اپنی زندگی میں یوسف صاحب نے ستر کے قریب دوسرے مصنفوں کی کتابیں چھاپیں، جن میں کافی کتابیں معیاری بھی ہیں۔ انھوں نے اردو ادب میں نئے رجحانات اور نئے اسلوب پیدا کرنے میں بڑی مفید اور دور رس خدمت انجام دی۔ یہ حقیقت ہے بہت سے چوٹی کے ادیبوں کی تخلیقات منظرِ عام پر نہ آتیں اگر مکتبہ شاہراہ ان کی اشاعت کی ذمہ داری نہ لیتا۔ ان کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہی، لیکن پھر بھی کسی معیاری اور مفید کتاب کے شائع کرنے کا مسئلہ ان کے سامنے آتا تو وہ کسی ادیب کو مشکل سے ہی مایوس کرتے تھے، یوسف صاحب جیسے حوصلہ مند ناشر بہت کم ملیں گے، جو نقصانات کی پرواہ کئے بغیر بے جا کود پڑتے تھے۔

یوسف صاحب نے "۱۸۵۷ء کے اخبار اور دستاویز" مرتبہ عتیق صدیقی۔ "خواجہ میر درد" مؤلفہ قدیر احمد۔ "انشاء اللہ خاں انشاء" مؤلفہ ڈاکٹر اسلم پرویز۔ "غالب خستہ کے بغیر" مؤلفہ غلام احمد فرقت کاکوروی، "آپ سے ملئے" مؤلفہ علی جواد زیدی۔ "ناول اور ناول نگار" مؤلفہ ضیاء عظیم آبادی کے ساتھ میری دو کتابیں "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" اور "۱۸۵۷ء کے غدار شعراء" بھی شائع کیں۔

یوسف صاحب نے شاہراہ بکڈپو قائم کرنے کے بعد رسالہ "شاہراہ" دہلی سے ۱۹۵۱ء سے جاری کیا جس کے پہلے پرنٹر پبلشر منشی عبدالقدیر صاحب تھے، کچھ رسالوں کے بعد یوسف صاحب کا نام ایڈیٹر و پرنٹر اور پبلشر میں چھپنے لگا۔ اس کا سالانہ چندہ دس روپے تھا، یوسف صاحب ذہنی اعتبار سے ترقی پسند تھے، عملی طور پر بھی ترقی پسندوں کا ساتھ دیتے تھے، چنانچہ ان کے ساتھ تمام ترقی پسند ادیب تھے جو ان سے قلمی معاونت بھی کرتے تھے۔

یوسف صاحب کو اگر ادیب نہ مانا جائے تو ادیب گر تو کہا جا سکتا ہے، انھوں نے بہت سے ادیبوں کی شہرت میں چار چاند لگائے۔ "شاہراہ" کے سب سے پہلے ایڈیٹر ساحر لدھیانوی، اس کے بعد پرکاش چند ساور وامق جونپوری ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ شاہراہ کی ایڈیٹری کی وجہ سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ شاہراہ میں مضامین بھی معیاری چھپتے تھے۔ میرے دو مضمون "تلامذہ میر" اور "تلامذہ ذوق" بالاقساط شائع ہوئے، جن میں سے ایک مضمون تلامذہ میر نے کتابی صورت اختیار کی اور اقرا اکادمی راولپنڈی

پاکستان کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔ یہ رسالہ ۱۹۶۰ء میں بند ہوگیا۔

یوسف صاحب جامعہ کو کبھی نہیں بھولے، اس کے کاموں میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ انجمن طلباء قدیم کی عمارت مقروض ہونے کی وجہ سے تصرف میں نہیں رہی تھی۔ دہلی اور بیرون دہلی میں کوئی طالب علم ایسا نہ تھا جو یہ رقم ادا کر دیتا مگر یہ عزت و شرف یوسف صاحب کو ہی حاصل ہوا، جنھوں نے تنہا خود اس رقم کو ادا کر کے عمارت کو واگذار کرایا۔

ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، ان میں ہر طبقے، ہر خیال، ہر مذہب و ملت و جماعت و سبھا کے لوگ تھے۔ جن میں وہ مقبول تھے۔ گرچہ ان میں ایسے حضرات بھی تھے جو ان کے خیالات سے اتفاق کرتے تھے اور ایسے بھی تھے جو متفق نہیں تھے لیکن ان کی شخصیت ایسی پرکشش تھی کہ ان پر اتفاق و اختلاف کا اثر نہیں ہوتا تھا اور ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان میں کاروباری لوگ بھی تھے، سیاسی رہنما، ادیب و عالم و صوفی و ملنگی تھے متضاد طبیعتوں اور رجحانات کے مالک تھے، لیکن تھے شیدائی یوسف، ہر ایک کو ان پر اعتماد تھا ——— ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ یہ متضاد طبیعت لوگ کبھی ایک جگہ جمع ہو کر یوسف صاحب کے دفتر میں تبادلہ خیال کرنے بیٹھ گئے، بحث مباحثے کا سلسلہ شروع ہو جاتا، جس میں تلخی بھی بڑھ جاتی تھی، یوسف صاحب سنتے رہتے اور خاموش بیٹھے ہوئے مسکراتے رہتے۔ اگر تلخی حد سے زیادہ بڑھ جاتی تو نرم و گرم اور محبت و پیار سے کام لے کر آپس میں میل ملاپ کرا دیتے ان پر کوئی کتنا ہی غصہ کرتا یا تیزی سے پیش آتا، اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، بے اعتنائی کے ساتھ ہنس کر جواب دیدیا کرتے تھے۔ ان کو میں نے بیس سال کے عرصے میں کسی سے لڑتے ہوئے یا بد کلامی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عجیب باہمت آدمی تھے۔ اگر بفرضِ محال چاروں طرف سے ہزاروں آدمی ان پر تقاضوں کی بھرمار کر دیتے، ان کا ذہن مرعوبیت کا قائل نہ تھا، ان کے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی کے آثار نظر نہ آتے اور وہ ہر ایک کو مطمئن کر کے بھیج دیتے۔ دو ناولٹ جو چیخوف کی تالیف ہے اس کا انھوں نے ترجمہ کیا تھا۔ ان کی یادگار ہے۔

یوسف صاحب کے ساتھ علاؤ الدین خالد صاحب نے کافی زندگی گزاری ہے، یہ بھی جامعہ کے طالب علم تھے اور ان کے ہم پیشہ ناشر تھے۔ ان کی جچی تلی رائے یوسف صاحب کے بارے میں گوش گذار فرمائیں[1]:

"۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں اردو کے چراغ کو جن لوگوں نے روشن رکھنے کی عملی کوشش کی ان میں محمد یوسف صاحب جامعی بھی شامل ہیں، حقیقت میں ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک کا دور ہندوستان میں ہر لحاظ سے اردو کشی کا دور تھا اور ایسے زمانے میں اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کو کوئی شخص اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے یہ بڑی ہمت کی بات تھی۔ کاروبار سے زیادہ اس میں وہ

[1] کتابی دنیا کراچی نومبر و دسمبر ۱۹۶۷ء

ولولہ کارفرما نظر آتا ہے جو زندہ لوگوں کی نشانی ہے اور جن کے دم سے زندگی کا یہ کارواں رواں دواں ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت محمد یوسف جامعی کی تھی"۔ ——— ان کے دوسرے ساتھی عبداللطیف اعظمی جامعی نے رسالہ "جامعہ" جنوری ۱۹۶۸ء میں اپنے اکتیس سالہ تعلق کی روشنی میں یوسف صاحب کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ——— "تیس اکتیس برس کے اس طویل عرصے میں مرحوم کی سیرت و شخصیت کے ہر پہلو کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور مجھے اعتراف ہے کہ وہ ہر معاملے میں کھرے اور مشکل سے مشکل مواقع پر دوست نواز اور مخلص ثابت ہوئے، ان پر مشکل دور بھی گذرا ہے اور فراغت اور فارغ البالی کا بھی مگر دوستوں کی دوستی اور ساتھیوں کی رفاقت کو ہمیشہ یاد رکھا اور تا عمر حقِ دوستی اور حقِ رفاقت کو حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا"۔

مذہبی معاملات اور خاص طور پر مساجد کی مرمت و تعمیر کے سلسلے میں دلچسپی لیتے تھے۔ شاہ بڑا دہلی کی مسجد کی بہت خستہ حالت تھی اس کا صرف دالان تھا، یوسف صاحب نے چار دیواری کھچوائی اس کے بعد جناب اقبال انڈے والوں نے اس کی تعمیر کرائی، اپنے گاؤں بھدوڑ کی مسجد کی مرمت اور سفیدی کرانے میں بھی حصہ لیتے تھے، ان کاموں میں دہلی رہتے ہوئے مدد کیا کرتے تھے۔ گاؤں کی عیدگاہ میں انھوں نے مرمت کرائی اور کافی پیسہ خرچ کیا ——— یوسف صاحب دہلی کی ٹی۔ بی کمیٹی کے ممبر تھے اور کافی عرصے تک رہے، دہلی کے ٹی بی کے مریضوں کی کافی مدد کرتے تھے، جو ٹی بی کا مریض ان کے پاس پہنچ جاتا یا ان کے علم میں آجاتا تھا، اس کو کنز روے کیمپ کے ٹی بی ہسپتال میں داخل کرا دیتے اور دیکھ بھال بھی کرتے تھے، کافی خطرناک مریض ان کی توجہ دینے اور اللہ تعالے کے فضل و کرم کی وجہ سے صحت یاب ہوئے ——— یتیم اور لاوارث بچیوں کی شادی کرانے میں بیحد دلچسپی لیتے تھے، اور غریبوں کی خاموشی کے ساتھ مالی مدد کیا کرتے تھے جس کا کسی کو علم تک نہ ہوتا تھا ——— معلوم دیتا ہے کہ اللہ رب العزت کو ان کی نیکیاں پسند آئیں کہ ۱۰ ار رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۳ ر دسمبر ۱۹۶۷ء کے مبارک مہینے میں فوت ہوئے اور جامعہ نگر دہلی میں دفن ہوئے ——— جناب قاضی رشید احمد صاحب ہاشمی بھی یوسف صاحب کے ملازمت کے زمانے میں مکتبہ جامعہ میں بحیثیت خزانچی کام کرتے تھے، انھوں نے یوسف صاحب کی وفات پر یہ تاریخی قطعہ کہا ؎

یوسف بازارِ اردو کہاں ہیں گامزن	شاہراہِ زندگی طے کرد در چشم زدن
بدھ کا دن ۱۳ ر دسمبر ایک نو چھ سات سن	دسواں روزہ ان کے سر پر باندھنے آیا کفن

انجمن طلبائے قدیم جامعہ کی ایک تعزیتی میٹنگ زیر صدارت جناب عبدالغفار مدھولی منعقد ہوئی، یوسف صاحب کی خدمات، ان کے کردار اخلاق کی مختلف اچھائیوں پر جناب سعید انصاری صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جناب عبداللطیف اعظمی صاحب نے یوسف صاحب کے حالات زندگی پر ایک مختصر سا مضمون پڑھ کر سنایا، جو جنوری ۱۹۶۸ء کے رسالہ جامعہ دہلی میں چھپا، نیز ایک تجویز منظور کی گئی جس میں یوسف صاحب کا جامعہ ملیہ اور انجمن طلبائے قدیم سے گہرے تعلق اور اردو خدمات کا اعتراف کیا گیا

حرفِ آخر

"دہلی کی یادگار ہستیاں" کی کتابت شروع ہوگئی تھی اور مضامین بھی لکھے جانے لگے تھے لیکن کتابت کی رفتار سست رہی جس سے فائدہ یہ ہوا کہ کچھ اور مضامین کا اضافہ ہوگیا۔ کتابوں کے تالیف کرنے کا میرا طریقہ یہ ہے کہ کتابوں کے الگ الگ لفافے بنا رکھے ہیں، جس کتاب کا مواد فراہم ہوا، اس کے لفافے میں ڈال دیا۔ ایک دو لفافے ایسے بھی ہیں، جس میں مختلف قسم کی معلومات ڈال دی جاتی ہے

۸ جون ۱۹۷۱ء کی بات ہے کہ ان لفافوں کو دیکھ رہا تھا، کہ اس میں میر پنجہ کش کے حالات کے بارے میں چند پرچے ملے، ۱۲ جون ۱۹۷۱ء کو ڈاکٹر ناصر الدین صاحب سے ان کے مطب پر ملاقات ہوئی، ان کے پاس "صحیفۂ خوشنویساں" مؤلفہ جناب احترام الدین شاغل جے پوری تھی، جس میں غیر ممالک، اور ہندوستان کے خوشنویسوں کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ اس میں میر پنجہ کش کے علاوہ تیرہ چودہ دہلی کے خوشنویسوں کے حالات بھی ہیں میر پنجہ کش کے حالات بہت مختصر سے ہیں۔ میں نے یہ کتاب ڈاکٹر صاحب سے مستعار لی۔ اور اس سے میر پنجہ کش، ان کے تلامذہ اور معاصرین کے حالات لکھنے میں مدد ملی۔

مولانا محمد ابراہیم زر دوز خلف مولوی محمد عیسیٰ صاحب دہلی کے پرانے رہنے والے ہیں۔ ان کو دہلی کے کافی خاندانوں سے واقفیت حاصل ہے۔ وہ پہاڑی املی پر رہتے ہیں، تو خیال آیا ان سے ملوں میر پنجہ کش صاحب کے حالات ان سے ملیں گے چنانچہ ۵ جولائی کو صبح ان کی دکان پر پہنچا۔ ان سے میر صاحب کے بارے میں معلوم کیا تو ان کو ان کے بارے میں خاص معلومات نہیں تھی۔ حشمت اللہ صاحب احراری، شیخ قدرت اللہ مرحوم کو ان کے مکان سے بلا لائے، ان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جناب امام سید حمید صاحب جامع مسجد شاہی دہلی کی اہلیہ کا اس خاندان سے تعلق ہے۔ حشمت اللہ صاحب کے ساتھ میں میر پنجہ کش صاحب کا مزار دیکھنے گیا۔ مڈل اسکول والا مکان، جو میر پنجہ کش کا پہاڑی املی پر ہے، اس کے باہر چبوترے کے اندر جہاں آج کل صندوقوں کا کام ہو رہا ہے، اس کے ایک کونے میں میر صاحب کا پختہ مزار ہے، جس کے اوپر کے حصے پر ایک سنگ مرمر لگا ہوا ہے، اس پر عبارت لکھی ہوئی ہے

اسی مزار کے پاس ایک پتھر کا کتبہ پڑا ہوا تھا، جو ان کے مکان کے دروازے پر لگا ہوا تھا۔

میر پنجہ کش صاحب کے مضمون کے ساتھ منشی ممتاز علی صاحب کے حالات پر بھی ایک مضمون مرتب کرنا تھا وہ چونکہ میرٹھ کے رہنے والے تھے اور جناب مفتی شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر رسالہ "دین دنیا" دہلی بھی میرٹھ کے باشندے ہیں اور وہ منشی ممتاز علی صاحب کے بارے میں کئی مرتبہ اپنی گفتگو میں ذکر کر چکے تھے۔ اس لئے ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے ان سے ملنا ضروری تھا، چنانچہ ۶ جولائی کو دن کے گیارہ بجے جناب مفتی شوکت فہمی صاحب کے دفتر چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد میں ملاقات کی۔ غرض بتائی تو انھوں نے ہاشمی پریس میرٹھ میں اپنے نانا مولوی ہاشم صاحب سے منشی ممتاز علی کی شراکت اور منشی صاحب کا ہاشمی پریس سے علیحدہ ہو کر دہلی آنا۔ دہلی میں مطبع مجتبائی پریس قائم کرنا۔ اور دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ جانے کے بارے میں بتایا۔ مطبع ہاشمی کا مولانا قاسم نانوتوی صاحب سے کیا تعلق تھا، ان کا پریس میں تصحیح فرمانیکا معاوضہ کیا مقرر ہوا، اس پر بھی روشنی ڈالی۔ یہ تمام باتیں لکھ کر میں سیدھا ساڑھے بارہ بجے جامع مسجد پہنچا۔ وہاں بڑے امام صاحب سید حمید تو تھے نہیں، تو میں نے سوچا لاؤ ان کے صاحبزادے امام سید عبداللہ صاحب ہی سے میر پنجہ کش صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرلوں، چنانچہ ان کے کمرے میں گیا، انھوں نے میر صاحب کی اولاد کا شجرہ بتایا۔ میر پنجہ کش کی قبر کھلوانے، ان کی پنڈلی کے ظاہر ہونے کا واقعہ سنایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر مسجد کے نیچے اتر کر سیڑھیوں کے نیچے پہنچا ہی تھا کہ بڑے امام صاحب سید حمید مل گئے۔ ان کے ساتھ ان کے کمرے پر پہنچا، انھوں نے میر پنجہ کش صاحب کا ایک واقعہ سانڈ سے مقابلہ کرنے کا اور دوسرا مکان کے دروازے کی چھت کے تختوں پر میر صاحب کے تحریر کردہ کلمہ طیبہ کا چشم دید واقعہ کا ذکر کیا ———— رائے چھنامل صاحب کٹرہ نیل والے دہلی کی مشہور ہستی تھیں، ۳۰ جولائی ۱۹۷۱ء کو میں سعید خانصاحب کے کمرے پہاڑی املی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک انگریزی کتاب "بریف ہسٹری آف فیملی آف رائے چھنامل" دیکھی، بہت مسرت ہوئی، یہ کتاب انھوں نے اپنے ایک دوست مسٹر جین سے مستعار لی تھی۔ ان سے میں نے چند گھنٹوں کے لئے لی اور محمد اکرام صاحب ٹائپسٹ سے ان کے حالات ٹائپ کرا کے سعید خانصاحب کو اسی روز واپس کردی۔ یہ کتاب لالہ چھنامل صاحب کے نبیرہ لالہ رادھا من نے تالیف کی، ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے، آکسفورڈ پرنٹنگ ورکس دہلی میں ۱۹۳۰ء میں چھپی، بارہ صفحات پر خاندانی حالات، بقایا صفحوں میں سرکاری سندیں درج ہیں، جو ان کے خاندان کے لوگوں کو سرکار برطانیہ کی طرف سے ملیں۔ اس کتاب میں لالہ چھنامل صاحب، لالہ امراؤ سنگھ، لالہ رام کشن داس، لالہ شیو پرشاد، لالہ جگن ناتھ، لالہ رادھا شام، لالہ لاڈلی پرشاد،

لالہ رام پرشاد، لالہ رادھا کشن، لالہ بالکشن داس اور لالہ رادھا رمن کے فوٹو تھے، ۱۰ر جولائی کو ان کے حالات کا ترجمہ جناب تنویر علوی صاحب پروفیسر دہلی کالج نے کیا۔ لالہ چھنامل والے مضمون میں "واقعات دار الحکومت دہلی"، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، تاریخ عروج سلطنتِ انگلشیہ ہند، غدر کا نتیجہ، اور آثار دہلی سے بھی مدد لی۔

امام عبداللہ صاحب کی ملاقات میں اس بات کا بھی علم ہوا کہ منشی عبدالحمید صاحب جو چھتہ چھیہ میم بازار پہاڑی املی میں رہتے ہیں وہ منشی ممتاز علی صاحب کے پوتے اور منشی عبدالغنی صاحب کے صاحبزادے ہیں، ان سے ۱۱ر جولائی ۱۹۷۱ء کو ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے حالات زندگی کے ساتھ اپنے خاندان کے حالات بھی لکھوائے۔

حافظ محمد عمر صاحب پلولی سے میرے کافی عرصے سے تعلقات تھے، ان کی بے وقت کی موت کا میرے دل پر بے حد اثر ہوا۔ وہ سیاسی آدمی کم تھے مجلسی وادبی و علمی زیادہ تھے، دہلی میں ان کی جو بھی گرفتاریاں ہوئیں وہ اتفاقیہ ہوئیں۔ وہ دہلی میں سیاسی زندگی گزارنی نہیں چاہتے تھے۔ ان کے پلول کے خاندان سے دہلی میں کوئی شخص واقف نہیں تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جناب مامون الرشید صدیقی پلول کے باشندے ہیں اور اسی محلے میں رہتے تھے جس میں حافظ صاحب کا مکان تھا۔ وہ یقیناً ان کے خاندان سے واقف ہوں گے، چنانچہ مامون الرشید صاحب ۱۲ر جولائی ۱۹۷۱ء کو میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں نے ان سے حافظ صاحب کے خاندان کے حالات اور پلول کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ حافظ صاحب کی بائیس سالہ دہلی کی زندگی میرے سامنے تھی، اور کچھ باتیں مجھ کو ان کے بڑے صاحبزادے مسطبین سے معلوم ہوئیں۔ ان سے ان کے حالات زندگی والے مضمون کی تکمیل ہوئی۔

محمد یوسف صاحب جامعی مالک شاہراہ بکڈپو صحافی و ادبی اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گذرا، ۱۹۴۷ء کے بعد جبکہ وہ شمسی کالج محلہ چوڑی والان دہلی میں آباد ہوئے، ان سے قربت حاصل ہوتی چلی گئی۔ شمسی کالج گلی بدلیان کے بالکل قریب ہے جس میں میرا مکان ہے۔ مکتبہ شاہراہ کے قائم ہونے اور رسالہ "شاہراہ" جاری ہونے کے بعد آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ چنانچہ یوسف صاحب نے اپنے مکتبہ کے نام سے میری دو کتابیں "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" اور "۱۸۵۷ء کے غدار شعراء" چھاپیں۔

یوسف صاحب کے خاندانی حالات ان کے صاحبزادے میاں شمیم سے اور کتابی دنیا کراچی نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء اور رسالہ جامعہ دہلی جنوری ۱۹۶۸ء کے مضامین سے (جن کا تعلق ان کی حالات زندگی سے تھا۔) معلوم ہوئے۔ اور جو کچھ معلومات مجھ کو تھی اس کی بنا پر ان کے حالات زندگی والا مضمون مکمل ہوا۔

دہلی میں گڑھ والوں کا خاندان بھی قدیمی اور مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کے افراد کی مغلیہ دربار

میں کافی رسائی تھی سیٹھ راجمید اس اسی خاندان کے بزرگ تھے، جن کا ذکر، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی کتابوں اور روز نامچوں میں آتا ہے لیکن ان میں بہت ہی کم حالات درج ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔

سعید خاں صاحب ایڈیٹر اخبار سوسائٹی دہلی، دہلی کی پرانی تاریخ کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں، فنکاروں، ہنر کشوں اور علمی خاندانوں کے حالات کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان سے گڑھ والوں کے خاندان کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا اگر آپ اس خاندان کے لوگوں سے ملنے جائیں تو میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں گا، چنانچہ ۲ اگست ۱۹۷۱ء کی صبح سعید خاں صاحب میرے گھر پہنچے اور میرے ہمراہ مالیواڑہ میں ست نرائن گڑھ والوں سے ملنے گئے۔

میری لالہ ست نرائن صاحب کی آٹھ نو سال ہوئے ملاقات ہوئی تھی اور وہ مجھ کو اپنے اسی گھر پر لے گئے تھے یہ اس وقت تندرست تھے، چلتے پھرتے تھے، آنکھوں کی بینائی بھی تھی، لیکن اس وقت ان کو دیکھا، تو بینائی ضائع ہو چکی تھی، چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے، اعضا نے جواب دے دیا تھا، اپاہج بنے ایک چھوٹی سی کھٹولی پر لیٹے ہوئے تھے، جس کی ادھوان کا کچھ حصہ کٹا ہوا تھا۔ ہماری آہٹ پا کر اٹھے اور ادھوان کے کٹے ہوئے حصے میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا اور سعید خاں صاحب کا تعارف کرایا اور مقصد بتایا، بڑے تپاک سے ملے، چائے اور مٹھائی وغیرہ سے تواضع کی اور اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات بتلائے۔ اور تین انگریزی کتابیں "دہلی ان ۱۸۵۷ء" مؤلفہ این۔ کے نگم ایم۔ اے، "ہسٹری آف فریڈم مومنٹ" مؤلفہ تاراچند۔ اور "ہسٹری آف دی سو تھ آف ۱۸۵۷ء" دکھائیں۔ ان کتابوں میں ان کے دادا سیٹھ راجمید اس کا ذکر ہے۔ ان تینوں کے اقتباسات ان کے پاس ٹائپ شدہ رکھے ہوئے تھے، جو انھوں نے مجھ کو عنایت کیے۔ ان کے پاس دو ٹائپ شدہ صفحے اور بھی تھے۔ ایک صفحہ وہ تھا، جس میں ان کے دادا سیٹھ راجمید اس کا ذکر بہادر شاہ کے مقدمے میں سرکاری گواہوں نے اپنی شہادت میں کیا تھا۔ دوسرے صفحوں میں ان سرٹیفکٹوں کی نقلیں تھیں جو دہلی کے انگریز مجسٹریٹوں وغیرہ نے ۱۸۲۱ء، ۱۸۲۵ء، ۱۸۵۶ء میں ان کے بزرگ لالہ بخشی رام وغیرہ کو دیے تھے، جن میں ان کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ یہ دونوں ٹائپ شدہ صفحے بھی لالہ ست نرائن صاحب نے مجھ کو مرحمت فرمائے، تین سوا تین گھنٹے ہم دونوں ان کے پاس بیٹھے، ادھوری ملاقات ہوئی تھی، دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔

جتنے عرصے ہم لالہ ست نرائن کے پاس بیٹھے ـــ قدرت الٰہی کے کرشمے اور انقلابات زمانہ کے سبق آموز نقشے سامنے آئے یہی وہ خاندان تھا کہ جن کی طرف بڑے بڑے رئیس اور راجوں کی نظریں لگی رہتی تھیں اور لالہ ست نرائن اسی خاندان کے ایک فرد ہیں جن کی اس خستہ حالی کی ترجمانی یہ شعر کرتا ہے ؎

مرے تغیرِ حال پر مت جا — انقلابات ہیں زمانے کے

میرے قدیمی دوست جناب گلزار باغ احمد صاحب ایڈیٹر "نئی روشنی" کراچی کے صاحبزادے افتخار احمد صاحب کا ایک خط مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۷۱ء کا بھیجا ہوا ۳۱ اگست ۱۹۷۱ء کو موصول ہوا جس میں یہ تحریر تھا:—— "میرے والد محترم جناب گلزار باغ احمد صاحب چودھری نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کی خیریت معلوم کروں۔ اور التماس کروں کہ اگر ممکن ہو سکے جناب حکیم ناصر الدین اور ان کے والد شفاء الملک جناب رضی الدین کی تصاویر اور ان کے بارے میں کچھ مضمون آپ فراہم فرمادیں، جس کے لئے ہم آپ کے مشکور رہیں گے۔ قبلہ چودھری صاحب آج کل علیل ہیں۔ فالج کا اثر ہے، ان کے لئے دعا فرمائیں۔"

اس خط کے آنے سے قبل حکیم ناصر الدین صاحب کے بڑے صاحبزادے احسن اللہ فاروقی سے تقاضے کرتا رہتا تھا کہ اپنے والد اور اپنے بزرگوں کے حالات لکھ کر دید و یا مجھے لکھوا دو۔ یہ وعدہ کرتے رہے۔ اس خط کے آنے کے بعد ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء کو احسن اللہ فاروقی کے مکان کٹڑہ دینا بیگ گلی قاسم جان میں دن کے دس بجے پہنچا۔ فاروقی صاحب سے گفتگو ہوئی، انھوں نے وعدہ کیا کہ دو تین روز میں حکیم رضی الدین اور حکیم ناصر الدین صاحب عرف چنو میاں کے فوٹو اور اپنے خاندان کے حالات پہنچا دوں گا۔ میں نے تین چار روز انتظار کیا جب وہ نہیں آئے تو ۱۵ ستمبر کو ان کے گھر پر پہنچا، یہ گھر پر نہیں ملے، تو ایک پرچہ دے آیا۔

اسی اثناء میں میں نے حکیم غلام رضا خاں صاحب کے خاندان کے حالات لکھنے شروع کئے۔ اور تزک جہانگیری، اقبال نامہ جہانگیری، سیر المتاخرین، آثار الصنادید، آثار دہلی اور واقعات دار الحکومت دہلی کی مدد سے مرتب کر لئے، تو ۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء کو تیسری مرتبہ احسن اللہ فاروقی صاحب کے گھر پر صبح سات بجے پہنچا۔ ان کو تحریر کردہ حالات دکھائے کہ تیار ہیں گلزار باغ احمد صاحب کے تقاضے آرہے ہیں، اگر آپ نے اپنے بزرگوں کے حالات نہیں دئے تو میں یہی تحریر کردہ حالات بھیجدوں گا۔ فاروقی صاحب نے حتمی وعدہ کیا کہ میں آج شام کو حکیم غلام رضا خاں صاحب کے پوتے حکیم رضی الدین اور پڑپوتے حکیم ناصر الدین عرف چنو میاں کے فوٹو اور اپنے بزرگوں کے مطبوعہ حالات آپ کے گھر پہنچا دوں گا، چنانچہ فاروقی صاحب نے وعدہ ایفا کیا اور رات کو اپنے والد حکیم ناصر الدین اور اپنے دادا حکیم رضی الدین کے دو فوٹو اور ایک انگریزی کا چھ صفحہ کا فلس کیپ سائز کا پمفلٹ دے گئے۔ اس پمفلٹ میں ان کے خاندان کے لوگوں کے حالات زندگی درج ہیں، حالات زندگی گرچہ مختصر ہیں لیکن جامع اور کارآمد ہیں۔—— حکیم طالب احمد صاحب مالک قومی دواخانہ کوچہ چیلان دہلی کے صاحبزادے حکیم منظور احمد صاحب سے

تقاضے کرتا رہتا تھا کہ اپنے خاندان کے حالات فراہم کردیں۔ آخر ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے بہت ہی مختصر حالات زندگی اپنے والد صاحب کے بھجوائے۔ اس کے بعد میں ان سے ان کے دواخانہ پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ملا۔ مزید حالات کی کُرید کی جو کچھ ان کو علم تھا وہ انھوں نے لکھوائے، حکیم قلق کے حالات میں نے دیوان قلق، گلستانِ سخن اور بزمِ سخن سے بھی اخذ کیے۔

"دہلی کی یادگار ہستیاں" کی کتابت ہونے کے بعد جن مضامین کا اس کتاب میں اضافہ ہوا ہے ان کے مرتب کرنے کے لئے جن حضرات نے اعانت فرمائی ہے وہ حسب ذیل حضرات ہیں، جن کا میں انتہائی شکرگذار ہوں۔

ڈاکٹر ناصرالدین صاحب، مولانا محمد ابراہیم، جناب سید حمید امام جامع مسجد دہلی، جناب عبداللہ صاحب امام جامع مسجد دہلی، مفتی شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر رسالہ "دین دنیا" دہلی، جناب سعید خانصاحب ایڈیٹر رسالہ "دہلی سوسائٹی" دہلی، جناب تنویر علوی صاحب پروفیسر دہلی کالج، مامون الرشید صاحب، شمیم احمد صاحب مالک شاہراہ بکڈپو دہلی، لالہ ست نرائن گڑھ والے، احسن اللہ فاروقی صاحب، حکیم منظور احمد صاحب، مگن باغ احمد صاحب ایڈیٹر "نئی روشنی" کراچی۔

فیروز آرٹسٹ صاحب علم دوست انسان ہیں اور میرے قدیمی احباب میں ہیں۔ میری تصانیف کے ٹائیٹل پیج کے ڈیزائن کے علاوہ انھوں نے میرے والد ماجد حضرت العلامہ مولانا شرف الحق صاحب صدیقی کا بڑے سائز کا فوٹو تیار کیا۔ تازہ بتازہ مہربانی انھوں نے یہ فرمائی ہے ــــــ کہ "دہلی کی یادگار ہستیاں" کے ٹائٹل پیج کے ڈیزائن کے ساتھ اس کا بلاک بھی خود ہی بنوا کر مجھ کو عنایت فرمایا۔ کن الفاظ سے ان کا شکریہ ادا کروں۔ اس خود غرض دنیا میں ایسے مخلص انسان بھی موجود ہیں۔

امداد صابری۔ محلہ چوڑیوالان۔ دہلی

۳ر فروری ۱۹۷۲ء

ضمیمہ

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے مُخبر

انگریزوں نے دہلی میں جنگ آزادی کے درمیان پہاڑی پر ایک محکمہ مخبری کا قائم کیا تھا جس کے مہتمم ہاڈسن صاحب تھے اور اس کے انچارج منشی رجب علی اور رائے سداسکھ تھے۔ اور مخبروں میں منشی جیون لال، غلام فخرالدین، رائے چھنامل، بلدیو سنگھ، منشی تراب علی، مرزا کالے، پیارے، بہاری لال، گامی خاں، چنی اخبار نویس، مکند لال، پنڈت گردھاری لال مصر، پنڈت ہیرا سنگھ مصر وغیرہ تھے۔

۱۴ر جون ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، لچھو سنگھ علی پور میں تھانیدار تھا، وہ انگریزوں کا حامی تھا۔ اس کا بھائی بلدیو سنگھ شہر میں کوٹیا پل میں رہتا تھا۔ اس کو دو دفعہ مخبری کے جرم میں گرفتار کیا، پہلی دفعہ چھوڑ دیا گیا۔ دوسری دفعہ گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اور کوتوالی کے سامنے اس کی ٹانگ باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا ــــــــ

پیارے لال مدرس تحصیل مظفر نگر جو دہلی میں رخصت لیکر آیا تھا، مخبر تھا اسے توپ سے اڑا دیا گیا[1]

۱۲ر جولائی کو میر حسن علی کو واقو نگاری اور بہاری کو مخبری کے شبے میں پکڑا گیا۔ اور ان کے سر اس طرح کچل دیے گئے کہ ہڈیاں تک چور چور ہوگئیں[2] ــــــــ ۲۸ جون کی بات ہے کہ ایک شخص پکڑا گیا جو محل میں انگریزوں کے اشارے پر سرنگ لگا رہا تھا، اسے سلیم گڈھ میں توپ کے منہ سے اڑا دیا گیا[3] ــــــــ ۳۰ جون کو ایک شخص کشمیری دروازے کے قریب بیٹھا ہوا سرنگ کھود رہا تھا اسے گرفتار کر لیا گیا اور کوتوالی کے سامنے درخت پر سولی دیدی اور منادی کرادی گئی کہ انگریزوں کے بہی خواہوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جائے گا[4]

۲۹ جولائی کو علی پور سے انگریزی لشکر کا ایک حولدار سونے کا کنٹھا گلے میں پہنے ہوئے آیا۔ اس نے لاہوری دروازے کے باہر اپنے بھائی بندوں کو مشورہ دیا کہ اب میں اپنی پلٹن میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر تمھاری مرضی ہو تو انگریزوں سے عرض معروض کر دوں کہ تم ان سے صلح کرنی چاہتے ہو۔ یہ سنتے ہی تلنگے ایسے آگ بھبوکا ہوئے کہ کچوں

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند دوم ص ۶۶۵ [2] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۴۸

[3] غدر کی صبح و شام ص ۱۴۷ [4] ایضاً ص ۱۴۹

سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اور اپنے پہننے کے لیے کنٹھا اتار لیا۔[1]

ایک آدمی قدسیہ باغ میں جوتشی بنا پنڈتوں کے بھیس میں پھر رہا تھا۔ کرنل لارنس کے شبہ میں اس کو پکڑ لیا۔ اس پر زخم پر زخم لگائے گئے لیکن اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، اور اف تک نہیں کی۔ جس پر یقین ہوگیا کہ وہ مخبر ہے، چنانچہ اس کو مار مار کے ختم کر دیا۔[2]

۲۱ مئی کو سوبھا چند کالستھ کے مکان کو لوٹ لیا گیا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ انگریزوں سے ساز باز رکھتا ہے اور انھیں شہر کی فوجی خبریں پہنچاتا رہتا ہے[3] —— ۲۳ مئی کو نرائن داس نہر والے پر تلنگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے گھر میں انگریز چھپے ہوئے ہیں، انھوں نے اس کی گھر کی تلاشی لی۔ گھر میں دو فرنگی نکلے۔ ان کو تلنگوں نے مار ڈالا اور نرائن داس کا گھر لوٹ لیا۔[4]

(۱) منشی جیون لال ذات کے کالستھ تھے، پیشے کے اعتبار سے محرر تھے، ان کے آباؤ اجداد مغلیہ دور میں اچھے عہدوں پر سرفراز تھے۔ ان کے جداعلیٰ راجہ رگھوناتھ اورنگ زیب کے وزیر اعظم تھے۔ ان کے والد گردھاری لال ابتدا میں سر ڈیوڈ آکٹرلونی کے منشی تھے اور اس کے بعد سر چالس مٹکاف کے منشی ہو گئے جبکہ وہ مغلیہ دربار میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت رکھتے تھے —— جیون لال نو عمری کے زمانے میں بھرت پور اور جے پور کے محاصرے کے وقت موجود تھے، جبکہ جون ۱۸۳۵ء میں مسٹر بلیک اسسٹنٹ ریذیڈنٹ مارے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ان بے شمار پنشنوں کے محاسب مقرر ہو گئے جنھیں انگریزی گورنمنٹ بادشاہ کے خاندانوں کو دیا کرتی تھی اور اس طرح ان کی حیثیت ایلچی کی سی ہو گئی تھی جو گورنر جنرل کے ایجنٹ کے پاس سے مغلیہ بادشاہ کے دربار میں خفیہ پیغامات پہنچاتے تھے، برسوں تک بادشاہ کا ان کے خاندان کا براہ راست تعلق رہا اور اس طرح سے وہ بادشاہ کے گرد وپیش کے مختلف افراد اور قلعے کی سازشوں سے واقف تھے۔ دہلی میں جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے دوران یہ شہر میں مقیم تھے اور انگریزوں کو جنگی خبریں بھیجتے تھے۔ انھوں نے خبریں حاصل کرنے کے لئے اپنے علاوہ اور بھی مخبر مقرر کئے تھے، چنانچہ منشی صاحب اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں: —— "باغیوں کی کارروائیوں کی خبریں حاصل کرنے کے ارادے سے میں نے دو برہمنوں گردھاری مصر اور ہیرا سنگھ مصر اور دو جاٹوں کی خدمات حاصل کیں، ان کا کام یہ تھا کہ وہ شہر اور قلعے کی تمام خبریں مجھے لا کر دیا کریں، تاکہ میں سلطنت کے اعلیٰ افسروں کی اطلاع دہی کے لئے سچے واقعات کو قلمبند کر لیا کروں۔" (ص ۹۴) —— چنانچہ منشی جیون لال کو بھی

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۶۹۶ [2] ایضاً [3] غدر کی صبح و شام ص ۱۱۷ [4] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۶۶۳

مجاہدین سمجھتے تھے کہ یہ انگریزوں کے جاسوس و مخبر ہیں۔ اور یہ بھی انگریزوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے، چنانچہ اس کا اقرار انھوں نے اپنے روزنامچے میں کیا ہے:———— "۱۱ مئی کو ایک آدمی آیا جس نے اطلاع دی کہ بدمعاش آپکے متعلق یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ گورنر جنرل کے ایجنٹ کے میر منشی ہیں اور اس لئے گشتنی اور گردن زدنی ہیں۔ اور پھر مجھے مشورہ دیا کہ مکان کو دفاعی حالت کے قابل بنا لینا چاہئے۔ میرا مکان سلطان فیروز شاہ کے زمانے کا تھا۔ اور خالص پتھر کا بنا ہوا تھا اور اس قدر مضبوط تھا کہ قلعہ معلوم ہوتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر دیا گیا، مکان میں تہ خانے بھی تھے جن میں میرے گھر کے آدمی داخل ہو گئے اور وہیں چھپے رہے میں نے آگے پیچھے بغرضِ نگرانی و حفاظت اپنے ملازمین کو مقرر کر دیا اور یہ تاکید کر دی کہ کسی کو داخل نہ ہونے دیا جائے اور اگر کوئی آئے تو اس کی اطلاع مجھے کر دی جائے۔ میرے دل میں یہ خیالات آ رہے تھے کہ تو نے برسوں تک انگریزی حکومت کا نمک کھایا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کی ہمیشہ دعا مانگی ہے اور یہ کہ اب میرے لئے اپنے آقاؤں کی خدمت کرنے کا موقع آ گیا ہے۔ اس پر میں نے شکور کو سر جان مٹکاف اور اپنے دیگر مربیوں اور دوستوں کے پاس یہ معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا کہ مجھے بتایا جائے کہ میں کس طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہوں اس کے ساتھ ہی میں نے چند انگریزوں کے حالات بھی دریافت کرائے جو میرے رفقائے کار تھے اور شہر میں دریا گنج اور کشمیری دروازے کے قریب رہا کرتے تھے۔ ان میں مسٹر ڈیوس، ان کے بھائی ٹامی اور مسٹر بیلے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ میں نے یہ کہلوا بھیجا تھا کہ اگر آپکے پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہ ہو تو میرے مکان میں آ جائے جہاں بفضلِ خدا میں اپنی آنکھ یا جان کی طرح ان کی حفاظت کروں گا۔ اور میں خود ان کی خدمت کے لئے موجود ہوں گا۔ شکور سے میں نے کہدیا تھا انھیں گلیوں میں سے لانا اور خدا نے چاہا تو انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔" (ص ۹۴)———— منشی جیون لال کو انگریزوں کی بربادی کا بہت رنج ہوتا تھا۔ انگریزوں کو نقصان پہنچتا تھا تو صدمے سے ان کو حرکتِ دل بند ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے دہلی میں آکر مجاہدین نے بدلے لینے شروع کئے، قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا، جس وقت اس کا علم ان کو ہوا، تو اس کے بارے میں انھوں نے یہ اظہار فرمایا:———— "شکور نے یہ بھی بیان کیا کمشنر کی کچہری میں گیا تھا، مسٹر نکسن کی لاش کو سڑک پر پڑے ہوئے دیکھا، ان کو نشانہ بندوق بنایا گیا تھا۔ میں نے چیخ و پکار اور رونے کی ایسی خوفناک آوازیں سنیں کہ میرے تمام ہوش و حواس جاتے رہے۔ میرا ملازم یہ واقعات بیان کرتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا میں بھی دہشت میں رہ گیا، معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ میں بھی اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا۔" (ص ۹۲)

منشی جی انگریزوں کی فتح کے لیے بے تاب رہتے تھے، اگر کہیں سے ان کو اس قسم کی اطلاع مل جاتی تو بہت خوش ہوتے تھے۔ ۴ راگست کو ان کو اسی قسم کی ایک خبر ملی تو اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوئی، اس کا ذکر انھوں نے اپنے روزنامچے میں کیا ہے: —— "بدری مصر میرے پاس آیا اور کہا کہ سرجان شکاف چند سواروں کے ساتھ تلواروں میں باغیوں کی سرکوبی کر رہے ہیں اور انھیں آپ کی تکلیف دہ حالت اور دیگر وفادار شہریوں کی تکالیف کا بیحد رنج ہے۔ انھوں نے یہ کہلا بھیجا ہے کہ گھبراؤ نہیں اس لیے کہ انگریز عنقریب دہلی پر قبضہ کر لیں گے، اس خبر سے جو خوشی مجھے حاصل ہوئی وہ اس تازگی کے مترادف تھی جو باغ میں بارش کے چھینٹے کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔" (ص ۲۰۲)

منشی جیون لال کافی پیسے والے تھے، ان سے یکم اگست کو بادشاہ کی طرف سے جنگ میں مالی امداد دینے کا تقاضہ کیا گیا۔ منشی سلطان سنگھ سے پچاس ہزار، اوروں سے ۲۵ ہزار روپے طلب کئے، روپیہ دینے کے بجائے انھوں نے بدمزگی پیدا کی۔ اور حکیم احسن اللہ خاں، لالہ بھولا ناتھ اور دوسرے اشخاص کے ذریعہ بادشاہ سے سفارش کرائی کہ ان سے روپیہ طلب نہ کیا جائے لیکن بادشاہ نے جواب دیا کہ یہ معاملہ جنرل بخت کے ہاتھ میں ہے، میں مداخلت کرنے سے معذور ہوں، لیکن رہائی حاصل کرنے کے لئے کچھ روپیہ ادا کیا جائے۔ لالہ شام لال وکیل ولی عہد نے ان کی طرف سے بہت کوشش کی، اور ...... مرزا الٰہی بخش نے بھی یقین دلایا کہ ان کے پاس روپیہ بالکل نہیں ہے، ان سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ (ص ۱۹۷) —— ۳ راگست کو مرزا مغل خود ان کے پاس روپیہ لینے کے لئے پہنچے۔ انھوں نے ان کو اپنے حالات بتائے کہ میرے پاس روپیہ کہاں ہے، میری تنخواہ معمولی ہے جو ضروریات زندگی پوری کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ میں نے ایمان داری اور دیانتداری سے زندگی بھر کام کیا ہے، دولت جمع نہیں کی۔ مجھے اب تک تنخواہ بھی نہیں ملی۔ مرزا صاحب نے ان سے کہا تم انگریزوں کے پاس خبریں بھیجتے ہو، برہمنوں سے انگریزی راج کی از سر نو قیام کی دعائیں منگواتے ہو۔ اور بادشاہ کی شکست کے امیدوار رہتے ہو، اور سپاہیوں کو "باغی" کے نام سے یاد کرتے ہو۔ غرض اس مرتبہ بھی انھوں نے کچھ نہیں دیا۔ (ص ۲۰۰) —— منشی جیون لال نے اس جنگ میں مالی امداد نہ دینے کی قسم کھائی تھی، مسلسل تقاضوں کے باوجود کچھ نہیں دے رہے تھے۔ نہ دینے کی وجہ مالی کمزوری نہیں تھی بلکہ انگریزوں کی وفاداری تھی، جو ان کو مجبور کر رہی تھی کہ ملک کی آزادی کے سلسلے میں ایک پائی بھی نہ دی جائے، چنانچہ ان کی اس ضد کی وجہ سے مرزا خضر نے ان کی گرفتاری کا حکم ۸ راگست کو جاری کیا۔ اس گرفتاری کے واقعات منشی جی نے اپنے روزنامچے میں لکھے ہیں، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ منشی جی کیوں اس جنگ میں

شاہی فوج کی مدد کرنا نہیں چاہتے تھے ـــــــ "نذر علی جو پہلے مسٹر سائمن فریزر کی ملازمت میں تھے اور اب تھانہ کے منتظم تھے، مبارک شاہ کوتوال کی چٹھی لیکر مجھے گرفتار کرنے کے لئے آئے، ان کے ساتھ سو سپاہی ننگی تلواریں لئے ہوئے تھے، چونکہ دروازہ سقوں کے لئے کھلوایا گیا تھا، اس لئے دروازے کو کھلا پاتے ہی وہ نہایت تیزی کے ساتھ داخل ہو گئے، گھر کی مستورات بیٹھی ہوئی مہاراج لال کی تیمارداری میں مصروف تھیں، جن کی آپریشن کے ذریعہ پتھری نکالی گئی تھی۔ وہ بیحد کرب و تکلیف کی حالت میں پڑے تھے، سپاہیوں کو دیکھتے ہی وہ جان بچانے کے خیال سے اِدھر اُدھر بھاگیں اور زیورات اور پاندان اپنے ساتھ لے گئیں۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا اور پالکی میں بٹھا دیا گیا۔ اور ننگی تلواروں کے گارد کی حفاظت میں مجھے کوتوالی پہنچا دیا گیا، مبارک شاہ سے وہیں ملاقات ہوئی۔۔ انھوں نے میری گرفتاری کے متعلق مرزا خضر کا دستخطی حکم دکھایا میرے علاوہ منشی سلطان سنگھ، چھنن لال اور سنت لال کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ ہمیں دھوکے میں رکھنے کی خاطر حکم میں یہ الفاظ درج تھے۔ کہ ہمیں مشورے کی غرض سے طلب کیا جا رہا ہے، پھر مجھے اور منشی سلطان سنگھ کو مرزا مغل کے روبرو پیش کیا گیا پہنچتے ہی ایک صوبیدار مجھے خنجر سے یہ کہہ کر ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جو انگریزوں کو خبریں پہنچاتا ہے مجھے مجمع نے بچا لیا اور کہا کہ انھیں روپیہ لینے کی غرض سے بلایا گیا ہے، اس سے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا، بعد ازاں مجھے اِدھر مرزا مغل کی پیشی میں لے گئے وہاں میں نے عجیب و غریب قطع کے آدمیوں کی کثیر جماعت دیکھی، ایک جانب مرزا مغل تکیوں سے سہارا لگائے بیٹھے تھے۔ راجہ سالگرام حامد علی خاں حکیم عبد الحق اور بادشاہی دربار کے چند دیگر افسر بھی موجود تھے۔ ان کے بالمقابل باغی فوج کا بریگیڈ افسر کرے سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ لالہ سالگرام (خزانچی)، راجہ اس گوٹہ والا، لالہ گردھاری لال، زورآور چند وغیرہ ۲۵ دیگر مہاجن بھی گرفتار شدہ حالت میں وہاں بیٹھے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ قطار میں بیٹھنے کا حکم ملا، میرے دوست لالہ گھان لال، لالہ ناشی لال، لالہ سنت لال میری رہائی کی کوشش کرنے کی غرض سے وہاں آئے، تھوڑی دیر بعد مرزا احمد جان مرزا مغل کے پاس گئے اور ان کے کان میں کچھ کہا، پھر مرزا مغل نے لالہ سنت لال کو بلایا اور نہایت شفقت و نرمی سے فرمایا کہ اس سے ۵ ہزار روپے لئے جائیں گے جسے فی الفور ادا کرنا چاہئے ورنہ اسے قید کر دیا جائے گا۔ دوسروں سے بھی اسی طرح روپوں کا مطالبہ کیا گیا اور بالآخر ہم غریب منشیوں کو دھمکایا گیا اور توپوں کو ہمارے کندھوں پر رکھ کر چھوڑا گیا۔ مگر ہم خدا کے کرم سے نہایت ثابت قدم رہے ہم نے ارادہ کیا تھا کہ ہم مرنا پسند کریں گے اور ان باغیوں کی دھمکیوں کی کچھ پرواہ نہ کریں گے۔ ہمیں انجام کی کچھ خبر نہ تھی، باغیوں نے صبح سے لیکر ۲ بجے

سہ پہر تک مشورہ کیا، اسی حالت میں مرزا الٰہی بخش بھی خلافِ توقع حضرت خضر کی طرح آ ہر آئے۔ بعینہ جس طرح سے سوکھے ہوئے پتوں میں جان ڈالنے کے لئے ابرِ رحمت یکایک برس جاتا ہے، انھوں نے مجھے دلاسا دیا ... مرزا مغل نے ان سے کہا کہ یہ انگریزوں کو خبریں بھیجتا ہے ... احمد مرزا نے کہا ان سے کثیر رقم وصول کرنی چاہیے یا ان کے مکانات پر قبضہ کر لینا چاہیے، غالباً مشورہ دینے والے کو یہ امید ہوگی کہ قتل کر دئے جانے پر میرا مکان اسے مل جائے گا۔ یہ گفتگو شام تک ہوتی رہی، جو زیورات سپاہیوں نے ۲۳ مئی کو میرے مکان سے ضبط کئے تھے انھیں مرزا مغل کی خدمت میں پیش کیا اور تولنے کے بعد ان کی مالیت کا اندازہ دو ہزار روپے کیا گیا، حکم ہوا کہ یہ رقم اس مطالبے میں سے مہیا کر دی جائے جو مجھ سے لیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد پستول منگائے گئے اور ہمیں ڈرانے کے لئے بندوقیں بھی منگوائی گئیں، لیکن یہ دیکھ کر کہ میرا ارادہ مستقل ہے اور مرزا الٰہی بخش میری مدد پر ہیں مجھے بالآخر ان کے ساتھ جانے کی اجازت دیدی گئی۔ اچھے مرزا صاحب مجھے کمال تلطف اور مہربانی کے ساتھ سیدھے میرے مکان پر لے گئے اور مجھے مشورہ دیا کہ تبدیلِ مکان کر لو، اور کہیں چھپ جاؤ، ورنہ باغی تمھارا پتہ ڈھونڈ نکالیں گے۔" (ص ۲۱۰) —— منشی جیون لال ٹھاٹھ کے ساتھ مخبری کرتے رہے اور ایک چھدام بھی ملک کی بھلائی اور غلامی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے خرچ نہیں کیا، جنگ آزادی کی ناکامی اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد منشی جیون لال جیسے لوگوں کے وارے نیارے ہوئے، خوب نوازے گئے۔ منشی جی میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے لیکن ملک اور قوم میں ان کو اب تک مخبر و جاسوس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ —— منشی جیون لال کا روزنامچہ ڈائری جیسے طرز کا ہے وہ روزانہ خبریں بطور مخبر و جاسوس کے انگریزوں کو بھیجا کرتے تھے کیونکہ اس میں زیادہ تر جنگی واقعات و حالات کا ذکر ہے، جن کا معلوم کرنا انگریزی افسروں کو لڑائی کے لئے مفید اور کارآمد ہوتا تھا۔ منشی جی نے یہ روزنامچہ ایک انگریزی ملازم کی حیثیت سے لکھا تھا، انھوں نے چالاکی کے ساتھ شاہی خاندان اور تمام ہندوستانیوں کی اخلاقی کمزوریاں اس طرح دکھائی ہیں جو دل و دماغ میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ مجاہدین میں جہاں کمزوریاں تھیں، وہاں خوبیاں بھی تھیں، لیکن منشی جی نے ان کی برائیوں کو نمایاں طور پر اجالا ہے اور خوبی ایک بھی نہیں لکھی۔ ان کا مقصد صرف انگریزوں کو خوش کرنا تھا۔[1] منشی جی کا خاندان

[1] منشی جیون لال کے حالاتِ زندگی روزنامچہ جیون لال سے اخذ کئے گئے ہیں۔

جیل پوری میں رہتا ہے۔ مہاراجہ لال اینڈ سنز کے مالک اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) غلام فخر الدین خاں کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ۱۸۴۶ء میں انگریزوں سے سازباز ہو گئی تھی اور مخبری کا کام کرنے لگے تھے، چنانچہ ۴ ستمبر ۱۸۴۶ء کو بادشاہ نے اسی بناء پر ایک حسب ذیل شقہ ان کے نام روانہ کیا تھا[۱] ــــــ "تم راؤ ہندو راؤ اور حسین علی خاں کے ساتھ راجپورہ کی چھاؤنی میں انگریزوں کی کوٹھیوں میں آتے جاتے ہو۔ یہ حد درجہ نامناسب ہے تم کو چاہئے کہ یہ طریقہ چھوڑ دو۔ تمھیں انگریزوں سے ملنے کی کیا ضرورت ہے اگر آئندہ سننے میں آیا کہ تم انگریزوں سے ملاقات کے لئے آتے جاتے ہو تو تمھاری تنخواہ موقوف کر دی جائے گی۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو" ــــــ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دہلی میں گامی خاں اور غلام فخر الدین نے مخبری میں بڑا نام پایا، جب انگریزوں نے دہلی کو فتح کر لیا اور قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع ہو گیا تو زیادہ تر عمائد شہر جن میں بعض بڑے عالی خاندان کے لوگ تھے یہ سمجھ کر الور چلے گئے کہ وہاں دہلی کے آدمی بڑے با اختیار عہدوں پر فائز ہیں ان کی جان بچا لیں گے مگر ان کی جان کے لئے غلام فخر الدین خاں عزرائیل بن کے پہنچا اور ایک ایک کو چن کر گرفتار کرکے لایا۔ ان میں سے کچھ تو گوڑگانواں کے مجسٹریٹ نے درختوں میں پھانسی پر لٹکایا۔ باقی جو دہلی آئے ان کے گلوں میں پھانسی کی رسی پڑی، ان کی ٹاٹ بافی جوتیاں اور سروں کے بنارسی دوپٹے جو پھانسی کے وقت اترے ان کو لیکر پھانسی دینے والا حلال خور نہال ہو گیا، آج کے دن دو چار بوڑھی شریف زادیاں اپنی اولاد کو دیکھنے کے لئے کسی طرح پھانسی کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ ایک دکاندار نے یہ بندوبست کیا تھا کہ جہاں پھانسی ملتی تھی وہاں چند کرسیاں بچھا دیتا تھا، ان کرسیوں پر چند انگریزی افسر پھانسی پانے والوں کی حالت نزع کا تماشا دیکھتے تھے۔ یہ دکاندار ان لوگوں سے کرسیوں کا کرایہ وصول کرتا تھا[۲] ــــــ الور کے لوگوں کی گرفتاری میں غلام فخر الدین کے علاوہ گھنشام جیراسی ایجنسی جے پور اور بہدار مخبروں کا بھی ہاتھ تھا۔ انھوں نے بھی مخبریاں کی تھیں۔ ان گرفتار شدگان میں ۴۰ کے قریب شہزادے تھے۔ جن لوگوں کو پھانسی دی گئی ان میں حسب ذیل حضرات بھی تھے:ــــــ ۱۔ نواب مظفر الدولہ نواب حسام الدین حیدر ابن آغا شفیع جان کے بیٹے تھے۔ جب یہ دہلی سے بھاگے چونکہ ان کی والدہ کی رشتہ داری الور میں تھی، اس کی

[۱] بہادر شاہ کا ایک روزنامچہ ص ۸۵ [۲] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۷۱۳

وہ بے الور پہنچے۔ وہاں سے گرفتار ہو کر گوڑگانواں میں آئے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ فوٹ صاحب کلکٹر گوڑگانواں کے حکم سے ان کو گولی مار دی گئی[1] ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے بادشاہ کے حکم سے سفیر لکھنؤ کو اپنے گھر ٹھیرایا تھا[2]

۲۔ نواب اکبر خاں ابن فیض اللہ خاں بنگش جن کی دو سو پچاس روپے ماہانہ پنشن سرکار کی طرف سے مقرر تھی اور ایک سو روپے پنشن ان کی بیوی کو دی جاتی تھی۔ کرایہ وغیرہ کی آمدنی بھی معقول تھی۔ یہ بچارے بھی جو لوگ الور سے گرفتار ہو کر آئے تھے انہی کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے۔ اور گوڑگانواں میں انھیں بھی پھانسی دیدی گئی۔ ان کے بیٹے فیض محمد خاں عرف بڈھن خاں بچ گئے ——— ۳۔ احمد مرزا خلف محمد حاجی کا شمار شہر کے بڑے لوگوں میں تھا۔ مرزا مغل کے مشیر خاص تھے اور شہزادوں کے پاس بھی ان کی نشست و برخاست تھی، کوچہ چیلان میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ بھی الور سے گرفتار ہو کر آئے اور گوڑگانواں میں آکر جام شہادت نوش کیا ——— ۴۔ حسین مرزا نواب حسام الدین حیدر ابن آغا شفیع خاں کے دوسرے صاحبزادے تھے، بعہدہ نظارت قلعہ شاہی میں متعین تھے۔ ان کے دونوں بیٹے ایک طالع یار خاں دوسرے اصغر یار خاں ایسے حسین نوجوان تھے کہ دلی میں ان کا مثل نہیں تھا۔ جس وقت یہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو لوگ سکتے کے عالم میں رہ جاتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی گرفتاری گھنشام چپراسی ایجنسی جے پور اور سپہدار خاں مخبروں کی اطلاع پر الور میں ہوئی۔ ان کو الور سے ایک سو آٹھ گرفتار شدگان کے ساتھ دہلی بھیجدیا گیا۔ دو مہینے انھوں نے جیل میں مصیبتیں جھیلیں۔ اس کے بعد ان کو پھانسی دیدی گئی۔ ان کے پھانسی پانے سے اہل شہر کو بہت رنج و افسوس ہوا ——— ۵۔ نواب میر خاں پنشندار خلف نواب مرتضیٰ خاں جاگیر دار پلول معہ اپنے نوجوان بیٹے عثمان خاں عرف دھولا الور سے گرفتار ہو کر دلی آئے اور اس جرم میں کہ مرزا عبداللہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے پھانسی دیدی گئی۔ ان کے اہل و عیال پریشان ہو کر جاورہ چلے گئے اور وہیں رہنے سہنے لگے ——— ۶۔ میر محمد حسین میر خیراتی سررشتہ دار محکمہ ایجنٹی کے بیٹے تھے، اور بڑے بھاری بھر کم آدمی تھے اور بہت متمول تھے، پہلے ریاست الور میں مرزا اسفندیار بیگ کے علاقے میں ملازم تھے، اکثر جنرل بخت کے ہاں ان کی آمد و رفت رہتی تھی اور عہدہ پانے کی امید میں قلعے میں بھی جاتے تھے، لاولد تھے۔ الور سے یہ بھی گرفتار ہو کر دہلی آئے۔ دو مہینے کوتوالی میں قید رہے، بعد میں ان کو پھانسی دیدی گئی[3] ———

۷۔ نواب مرزا ماہ رخ بیگ ابن نواب مرزا بیگ عماد جنگ داماد طالع یار خاں مرزا مغل کے ساتھی تھے، یہ بھی الور

[1] غدر کا نتیجہ ص ۵۱ [2] فیصل التواریخ ص ۴۵۹ [3] غدر کا نتیجہ ص ۵۳

سے گرفتار ہو کر آئے اور اپنے سالوں کے ساتھ پھانسی پائی۔ لال کنواں اور فراشخانہ کی جائیداد ضبط ہوئی۔

(۳) بقول منشی ذکاء اللہ صاحب مجاہدین کو صحیح پتہ لگ جاتا تھا کہ شہر میں کون کون انگریزوں سے سازش رکھتا ہے اور کون کون خبریں بھیجتا ہے۔ منشی تراب علی انگریزوں کے مخبر تھے، جنگ کے دوران میں مخبری کرتے تھے، چنانچہ مجاہدین نے مان سنگھ اور تراب علی کو مخبری کے الزام میں گرفتار کیا، حقیقت میں یہ دونوں مخبر تھے[1] ان کو جکڑ بند کر کے وہ قلعے میں لے گئے مگر وہاں جا کر شہزادوں کی سفارش کی وجہ سے چھوٹ گئے۔ —— جنگ کی ناکامی کے بعد دہلی پورا اجڑ چکا تھا، خوف کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، لیکن دو چار گھر تھے جو خالی نہیں ہوئے تھے، جیسے شیخ تراب علی کا مکان میر عاشق کے کوچہ میں اور رائے سکھ لال کا مکان ترکمان دروازے میں —— انگریزی مخبروں نے لوگوں کی کمزوریوں سے بڑے فائدہ حاصل کیے۔ مکانوں پر قابض ہوئے، اور مالک بن گئے۔ مولوی اساس الدین بدایونی کے مکانات زنانہ مردانہ و دیوان خانہ اور دکانیں کٹرہ آدینہ بیگ خاں دہلی میں تھیں، تراب علی سود کا لین دین کرتے تھے، چنانچہ مولوی اساس الدین صاحب نے ان سے قرض لیا اور تمسک استغراقی مکانات کٹرہ آدینہ بیگ خاں کا لکھ دیا، جس طرح اور لوگ دہلی سے چلے گئے تھے۔ اسی طرح مولوی اساس الدین کو بھی دہلی چھوڑنا پڑا، تراب علی صاحب نے مولوی اساس الدین کو مفقود الخبر ظاہر کر کے نالش دائر کر دی اور مکانات پر اطلاع نامہ چسپاں کرا دیا۔ اور ان کو بدایوں میں اطلاع نہیں کرائی اور یک طرفہ ڈگری حاصل کر کے کٹرہ آدینہ بیگ خاں کی جائیداد کم قیمت میں نیلام کرا کے خود خرید لی، اس وقت خریدار کون تھا، جو بولی بولتا[2] انگریزوں نے جامع مسجد واگذار کرنے کے بعد جو کمیٹی بنائی تھی اس کے ممبران میں منشی صاحب بھی تھے —— منشی تراب علی کا خاندان اب بھی کوچہ میر عاشق میں آباد ہے جس میں حافظ ظہور احمد صاحب مالک حاجی ریسٹورنٹ جامع مسجد دہلی ہیں۔

(۴) شاہزادہ مرزا کالے بابر کا بیٹا شاہزادوں کو پکڑنے والا مخبر تھا، یہ شاہزادوں کو پکڑواتا اور ان کو سکھاتا کہ تم حاکموں کے سامنے یہ کہنا کہ ہم بادشاہ کے قریبی رشتہ دار ہیں تو وہ تم کو بادشاہ کے پاس بھیجدیں گے وہاں تمہارے پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی، ان کا اس سکھانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کا رسوخ حکام سے بڑھے کہ وہ بڑے شاہزادے کو ان کے شکار کرنے کے لئے لائے ہیں، غرض دہلی کے آس پاس جتنے شاہزادے ملے ان کی تعداد ۲۹ بیان کیجاتی

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۲۶۴ [2] کنز التاریخ ص ۳۵۰

ہے، پکڑے گئے۔ اور ان میں بوڑھے لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی میں لٹکائے گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا شاہزادہ مرزا قیصر اکبر شاہ کا بھائی تھا اور مرزا محمود شاہ اکبر شاہ کا پوتا وجع مفاصل میں مبتلا تھا۔ اس کی لاش پھانسی میں گولا لاٹھی طرح لٹکی ہوئی تھی[1]

(۵) گامی خاں مخبر ہی نہیں تھا بلکہ بدمعاش آدمی تھا۔ اس کو تباہ و برباد کرنے میں مزہ آتا تھا۔ جب مجاہدین دہلی میں آئے تو اس نے اپنے بھائی بندوں ولی محمد، حسین بخش اور قطب الدین کی دکانوں کو ان کے ہاتھوں لٹوایا۔ دہلی میں سب سے بڑے پنجابی سوداگر یہی تین تھے۔

جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو یہی گامی خاں انگریزوں کا مخبر بنا اور اس نے مخبری کر کے دہلی والوں کو انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی پر چڑھوایا ——— اور پانی پت تک پہنچا ——— اور دہلی والوں کو وہاں سے بھی گرفتار کرایا، چنانچہ سید ظہیر الدین صاحب اپنی تالیف "داستانِ غدر" میں اس کے پانی پت پہنچنے کا ذکر کرتے ہیں:

"یکایک آسمان سے سنگِ حوادث برسنے لگے اور زمین نے فتنۂ تازہ برانگیختہ کئے اور حشرات الارض کی طرح زمین سے ایک بچھو پیدا ہوا، یعنی دہلی سے وہی موذی اوباش مخبروں کا سرغنہ گامی بدمعاش بلائے ناگہانی کی طرح پانی پت میں نازل ہوا۔ اور دارو گیر کا بازار گرم ہوا، اور دہلی والے گرفتار ہونے شروع ہو گئے۔ ادھر ہریست میں نواب حامد علی خاں صاحب اور ان کے سب کنبے کو گرفتار کر لائے ادھر پانی پت میں قیامت برپا ہو گئی۔" (ص ۱۳۴)

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۰۷